تفہیم احکام القرآن

www.KitaboSunnat.com

جلد چہارم

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ معارفِ اسلامی منصورہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.kitabosunnat.com

تفہیمِ احکام القرآن (۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ادارہ معارف اسلامی

یہ ادارہ، اسلامی علوم و معارف کی تحقیق و تصنیف اور اشاعت و ترویج کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد دور حاضر کے عظیم مفکر اور قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں مولانا مرحوم نے لاہور کو اس کا دوسرا مستقر بنایا۔ اب کراچی اور لاہور میں ادارہ معارف اسلامی کے دونوں مراکز داخلی طور پر خود مختارانہ اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے حسب ذیل مقاصد کے لیے کوشاں ہیں:

- ❑- تحقیق اور علمی جستجو کے بعد اسلامی تعلیمات کو جدید ترین اسلوب اظہار کے ذریعے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کرنا۔
- ❑- علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیب نو، تشریح و توضیح اور اشاعت، اسی طرح قدیم علمی خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی ممکن بنانا۔
- ❑- عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لیے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔
- ❑- اسلامی موضوعات پر دور حاضر کے مسلم علما کے نمایاں کارناموں کی دنیا کی اہم زبانوں بالخصوص اردو، عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں تراجم اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ❑- عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن، تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لیے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ❑- تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظام تعلیم کی راہ ہموار کرنے کے لیے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تفہیمِ احکام القرآن

جلد چہارم

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مرتب: مولانا عبدالوکیل علوی

ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب : تفہیمِ احکام القرآن (جلد چہارم)

لوازمہ تصنیفات : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ترتیب وتدوین : مولانا عبدالوکیل علوی

باہتمام : ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور

042-35414677, 35419520

کمپوزنگ : عبدالرحمٰن انور

مطبع : نوید حفیظ پرنٹرز، لاہور

اشاعتِ اول : مارچ ۲۰۱۴ء (۱۱۰۰)

صفحات : ۵۱۲

قیمت : -/[illegible] روپے

تقسیم کنندہ:

مکتبہ معارفِ اسلامی

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ پوسٹ کوڈ نمبر: 54790

فون: 042-35419520-24, 35432476, 35432419

E-mail: imislami1979@gmail.com Web: www.imislami.org

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فہرست

عنوان	صفحہ

عرضِ ناشر ۱۹

باب اوّل: حدود و تعزیرات

فصل اوّل: شرعی حدود، مقصد اور شرائطِ نفاذ

- حدود اللہ کے قریب بھی نہ پھٹکو ۲۳
- حدود اللہ سے تجاوز ۲۴
- حدود حلال و حرام ۲۴
- تحلیل و تحریم کے اختیارات نبیؐ کو بھی نہیں دیے گئے ۲۴
- حرام و ممنوع اشیا کے جواز کی مصلحت و ضرورت ۲۶
- حدود اللہ کا قیام اور مقصد ۲۶
- اصلاحی ہدایات کا لحاظ کیے بغیر حدود اللہ کا نفاذ ۲۸
- شرعی حدود کے نفاذ کے لیے ضروری شرائط ۳۰
  - ۱۔ ماحول کی درستی ۳۰
  - ۲۔ حکمت و اعتدال ۳۲
  - ۳۔ اسلام کی روح کا لحاظ ۳۳
  - ۴۔ وقت اور ملزم کے حالات کا لحاظ ۳۶
- ایک سوال اور اس کا جواب ۳۷
- اس کا خلاصہ ۳۷
- اقامت حدود میں مصلحت کا لحاظ ۳۸

فصل دوم: قصاص و دیت

- کتاب اللہ کی رُو سے انسانی جان کا احترام ۳۹
- قتل بالحق کی قانونی صورتیں ۴۱
- قتلِ عمد اور اس کی سزا ۴۱
- قتلِ خطا اور اس کے احکام ۴۲
- قتلِ خطا کی تعریف ۴۲
- اس کا حکم اور خون بہا کی مقدار ۴۲
- احادیثِ رسولؐ میں اس کا ذکر ۴۲
- خلاصۂ احکام ۴۳
- اس کی اہمیت ۴۳
- کیا ملکی قانون کی کوئی دوسری سزا اس کا بدل ہوسکتی ہے؟ ۴۴
- خون بہا کے قاعدے کی وضاحت ۴۴
- اس حکم کے نازل کرنے کی غرض و غایت ۴۵
- غلط دوا دینے کی صورت میں موت واقع ہوجائے تو خون بہا (دیت) کی مقدار ۴۵
- کفر کے شبے میں قتل ۴۶
- قصاص اور دیت کے احکام ۴۷
- معنی و مفہوم ۴۸
- قصاص کا جاہلی تصور ۴۸
- دورِ جدید کے مہذب لوگوں کا تصور ۴۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل کا معاملہ	۴۹
معروف کیا ہے؟	۴۹
خون بہا وصول کرنے کے بعد زیادتی	۴۹
قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے	۵۰
قصاص اور انصاف کے تقاضے	۵۰
قصاص کس شکل میں لیا جائے گا	۵۰
قصاص ودیت کے بارے میں چند استفسارات اور ان کے جوابات	۵۱
مقتول کے ولی کو مطالبے کا حق	۵۳
قتل میں حد سے گزرنے کی صورتیں	۵۴
انتقام لینے کا مجاز کون ہے؟	۵۴
دیت کا قرآنی حکم	۵۴
ادائیگی کا صحیح طریقِ کار	۵۴
خون بہا کی وصولی	۵۵
غلام آزاد نہ کر سکنے کی صورت میں متبادل	۵۵
فصل سوم: حدِّ زنا	
زنا کے متعلق ابتدائی حکم	۵۷
بعض مفسرین کی غلط فہمی	۵۷
ایک سوال اور اس کا جواب	۵۸
زنا: مفہوم، اس کے قانونی، اخلاقی اور تاریخی پہلو اور اس کی سزا	۵۹
اخلاقاً قابل اعتراض	۵۹
قانوناً مستلزمِ سزا جرم	۶۰
محض زنا کی تعریف	۶۰
یہودی قانون میں زنا بزنِ غیر کے احکام	۶۲

عنوان	صفحہ
حضرت عیسیٰ کے اقوال سے عیسائیوں کا غلط استنباط	۶۳
موجودہ زمانے میں مغربی قوانین اور مسلمان	۶۳
زنا، اسلامی قانون کی نظر میں	۶۳
کیا اسلام انسانی معاشرے کو زنا سے بچانے کے لیے قانونی تعزیر پر انحصار کرتا ہے؟	۶۴
زنا کو کس سال قانونی جرم قرار دیا گیا	۶۵
اس آیت میں کون سی سزا بیان کی گئی ہے	۶۶
زنا بعد احصان کی سزا اور اس کا ثبوت	۶۷
زنا کی قانونی تعریف فقہا کی نظر میں	۶۹
قانوناً فعلِ زنا کے مجرم کو کب مستلزمِ سزا قرار دیا جائے گا؟	۶۹
تعزیر اور اس کے حدود	۷۰
مجرم قرار دینے کے لیے شرائط	۷۰
پہلی شرط	۷۱
دوسری شرط	۷۱
تیسری شرط	۷۱
چوتھی شرط	۷۱
کیا جبری زنا کا مرتکب مجرم ہے؟	۷۲
زانی اور زانیہ کو سزا دینے کا مجاز کون ہے؟	۷۳
اسلامی قانون کی نظر میں سزائے زنا کا دائرہ	۷۴
کیا حکام کے لیے ایسے مجرم کے لیے معافی کی گنجائش ہے	۷۴
کیا یہ جرم قابل راضی نامہ ہے	۷۴
بلا ثبوت حکومت کارروائی کرنے کی مجاز نہیں	۷۵
جرم زنا کا پہلا ممکن ثبوت اور اس کے متعلقہ قانونی اجزا	۷۵

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ

- اسلامی قانونِ شہادت کا منشا کیا ہے؟ ۷۶
- کیا محض حمل کا پایا جانا ثبوت زنا کے لیے شہادت بالقرینہ ہے؟ ۷۶
- کیا گواہوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں ان کو جھوٹے گواہ کی سزا دی جائے گی؟ ۷۷
- واقعاتِ مقدمہ ۷۷
- مجرم کا اقرار جرم ۷۸
- مقدماتِ زنا میں سب سے بڑا مقدمہ [ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ] ۷۸
- دوسرا بڑا واقعۂ زنا [غامدیہ کا واقعہ] ۷۹
- کیا اقراری مجرم سے پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کی؟ ۸۰
- ثبوتِ زنا کے بعد زانی اور زانیہ کو کون سی سزا دی جائے گی؟ ۸۱
- شادی شدہ مرد وعورت کے لیے زنا کی سزا ۸۱
- غیر شادی شدہ کی سزا ۸۱
- ان مسالک کی مؤید احادیث ۸۲
- سزائے تازیانہ ۸۳
- ضربِ تازیانہ کی کیفیت ۸۴
- کوڑا کیسا ہونا چاہیے ۸۴
- مار کی کیفیت ۸۴
- مرد اور عورت کو سزا دینے کی الگ الگ نوعیت ۸۵
- سزا کے لیے گرمی سردی کے اوقات کا لحاظ ۸۵
- جلاد کیسے ہونے چاہییں ۸۵
- مریض مجرم اور بوڑھے زانی کی سزا ۸۵
- حاملہ عورت کو سزا کب دی جائے؟ ۸۶
- سزا کا آغاز کون کرے گا؟ ۸۶
- دورِ جدید کی ضربِ تازیانہ ۸۶
- رجم کی سزا میں مرجانے والے کی تجہیز وتکفین ۸۶
- جانوروں سے فعل بد کے مرتکب کی سزا ۸۸
- فوجداری قانون کے سلسلے میں ترس کھانے کی ممانعت ۸۸
- سزا علی الاعلان دی جائے [اسلام کا نظریۂ سزا] ۸۹
- بدچلنی [زنا] کی صورت میں لونڈی کی سزا ۹۰
- کیا دنیا میں دی گئی شرعی سزا آخرت میں برأت کا موجب ہوگی؟ ۹۱

فصل چہارم: حدِ قذف

- پاک دامن عورتوں پر تہمتِ زنا لگانے والوں کی سزا اور اس کا منشا ۹۳
- منشائے حکم ۹۳
- قذف مستقل اصطلاح ہے ۹۴
- کیا یہ الزام صرف عورتوں پر لگانے تک محدود ہے؟ ۹۴
- حکم کا نفاذ کب ہوگا؟ ۹۴
- فعلِ قذف کے ثبوت کے لیے شرائط ۹۵
- شرائط برائے قاذف ۹۵
- وہ شرطیں جو مقذوف میں پائی جانی چاہییں ۹۵
- فعلِ قذف میں پائی جانے والی شرائط ۹۶
- کیا جرمِ قذف قابل دست اندازی سرکار ہے؟ ۹۷
- کیا جرمِ قذف قابل راضی نامہ ہے؟ ۹۸
- حدِ قذف کے مطالبے کا حق دار کون ہے؟ ۹۸
- حدِ قذف سے بچنے کا راستہ ہے ۹۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
ایسی شہادت پیش نہ کیے جانے کی صورت میں سزا کی نوعیت	۹۹
ایک سوال اور اس کا جواب	۱۰۱
ایک اور سوال اور اس کا جواب	۱۰۱
حد قذف کی مار کی کیفیت	۱۰۲
تکرار قذف میں جمہور فقہا کا مسلک	۱۰۲
قذفِ جماعت کے معاملے میں فقہا کا اختلاف	۱۰۲
قاذف کے لیے اخروی سزا	۱۰۳
تہمت لگانا تباہ کن کبیرہ گناہ ہے	۱۰۳
فصل پنجم: حد سرقہ	
قرآن مجید میں اس کا ذکر	۱۰۵
سرقہ کا نصاب	۱۰۵
نصابِ سرقہ میں فقہا کا اختلاف	۱۰۵
وہ چیزیں جن میں قطعِ ید کی سزا نہیں ہے	۱۰۶
قطعِ ید کے بعد توبہ	۱۰۶
اسلام میں قطعِ ید کی سزا پر اعتراض	۱۰۷
فصل ششم: حرمتِ شراب اور اس کی حد	
مکی سورت میں حرمت شراب کی طرف اشارہ	۱۰۹
شراب اور جوئے کی حرمت	۱۰۹
حرمت شراب کا پہلا حکم	۱۰۹
دوسرا حکم	۱۰۹
بعض لوگوں کے استدلال کی غلطی کا جواب	۱۱۰
چار چیزوں کی قطعی حرمت	۱۱۰
بعض لوگوں کے سوالات اور ان کے جوابات	۱۱۱
حرمتِ شراب احادیث کی روشنی میں	۱۱۱
خلافت راشدہ میں سزا	۱۱۲
حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری	۱۱۲
شراب کی انفرادی اور عالم گیر تباہ کاریاں	۱۱۳
الکوہل آمیز ادویہ کا استعمال	۱۱۳
الکوہل کے مختلف مدارج اور اشکال کا حکم	۱۱۴
الکوہل کا استعمال ادویات میں	۱۱۵
الکوہل سے متعلق ایک سائل کے استفسار کا جواب	۱۱۶
فصل ہفتم: حد محاربہ	
قرآن مجید میں اس کا ذکر	۱۱۹
قاضی یا امامِ وقت کے لیے نوعیتِ جرم کے مطابق سزا دینے کا اختیار	۱۲۰
صالح نظام کو درہم برہم کرنے سے باز آ جائیں تو......	۱۲۰
فصل ہشتم: حدِ ارتداد [مرتد کی سزا]	
دورِ نبوت سے دورِ جدید تک مسلسل ایک ہی حکم	۱۲۱
حکم قتل مرتد کا ثبوت قرآن سے	۱۲۲
حکم قتل مرتد کا ثبوت حدیث سے	۱۲۲
خلافت راشدہ کے نظائر	۱۲۶
مرتدوں کے خلاف خلیفۂ اول کا جہاد	۱۲۸
ائمہ مجتہدین کا اتفاق	۱۳۰
مرتد سے جنگ	۱۳۲
مرتد سے توبہ کا تقاضا	۱۳۲
آیت لا اکراہ فی الدین اور مرتد کی سزا پر ایک اشکال کا جواب	۱۳۳

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
باب دوم: اسلامی معیشت	
فصل اول: معاشیاتِ اسلام	
کیا معاش انسان کا اصل مسئلہ ہے؟	۱۳۷
معاشی انتظام کی خرابی کا سبب	۱۳۸
قرآن کی معاشی پالیسی کا بنیادی قاعدہ	۱۳۸
معاشی مساوات اور اسلام	۱۳۹
بندوں کی تقسیم رزق میں کمی وبیشی کی حکمت	۱۴۰
فصل دوم: اسلامی نظمِ معیشت کے بنیادی ارکان	
اکتسابِ مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق	۱۴۱
مال جمع کرنے کی ممانعت	۱۴۲
خرچ کرنے کا حکم	۱۴۲
زکوٰۃ (صدقات)	۱۴۶
قانونِ وراثت	۱۴۸
غنائمِ جنگ اور اموالِ مفتوحہ کی تقسیم	۱۴۸
اقتصاد کا حکم	۱۴۹
فصل سوم: قرآن کی معاشی تعلیمات	
بنیادی حقائق	۱۵۳
جائز وناجائز کے حدود مقرر کرنا اللہ ہی کا حق ہے۔	۱۵۴
حدود اللہ کے اندر شخصی ملکیت کا اثبات	۱۵۵
معاشی مساوات کا غیر فطری تخیل	۱۵۸
رہبانیت کے بجائے اعتدال اور پابندی حدود	۱۵۹
کسبِ مال میں حرام وحلال کا امتیاز	۱۶۰
کسب مال کے حرام طریقے	۱۶۱
بُخل اور اکتناز کی ممانعت	۱۶۳
زر پرستی اور حرص مال کی مذمت	۱۶۴
بے جا خرچ کی مذمت	۱۶۵
دولت خرچ کرنے کے صحیح طریقے	۱۶۵
مالی کفارے	۱۶۷
انفاق کے مقبول ہونے کی لازمی شرائط	۱۶۸
انفاق فی سبیل اللہ کی اصل حیثیت	۱۶۹
لازمی زکوٰۃ اور اس کی شرح	۱۷۱
اموال غنیمت کا خُمس	۱۷۳
مصارفِ زکوٰۃ	۱۷۳
باب سوم: مسئلہ ملکیت زمین	
فصل اول: اسلام میں انفرادی ملکیت کی حد	
ریاست کی طرف سے زائد ٹیکس	۱۷۷
شرعی احکام کی منسوخی میں حکومت کی حد	۱۷۸
اسلام کا قانون اراضی اور شبہات کا ازالہ	۱۷۸
اسلامی حکومت اور قومی ملکیت	۱۸۰
قرآن اور شخصی ملکیت	۱۸۰
فصل دوم: زمین کی شخصی ملکیت (از روئے حدیث)	
قسم اول کا حکم	۱۸۳
قسم دوم کا حکم	۱۸۵
قسم سوم کے احکام	۱۸۶
قسم چہارم کے احکام	۱۸۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
حقوق ملکیت بربنائے آبادکاری	۱۸۹
عطیۂ زمین من جانب سرکار	۱۹۱
عطیہ زمین کے بارے میں شرعی ضابطہ	۱۹۳
جاگیروں کے معاملے میں صحیح شرعی رویہ	۱۹۴
حقوق ملکیت کا احترام	۱۹۵
فصل سوم: مزارعت کا مسئلہ	
شخصی ملکیت کی نفی کرنے والی احادیث کی حقیقت	۱۹۷
رافع بن خدیج کی روایات	۱۹۷
جابر بن عبداللہ کی روایات	۲۰۰
مزید تائیدی روایات	۲۰۱
تنقید بلحاظ نقد ودرایت	۲۰۲
تنقید بلحاظ عقل ودرایت	۲۰۸
امتناعی احکام کا اصل مفہوم	۲۱۰
رافع بن خدیج کی توضیحات	۲۱۰
جابرؓ بن عبداللہ کی توضیح	۲۱۲
زیدؓ بن ثابت کی توضیح	۲۱۳
سعدؓ بن ابی وقاص کی توضیحات	۲۱۳
ابنِ عباسؓ کی توضیحات	۲۱۴
تحقیق مسئلہ	۲۱۵
فقہا کے مذاہب	۲۱۶
مذہب حنفی	۲۱۷
مذہب حنبلی	۲۱۸
مذہب مالکی	۲۱۹
مذہب شافعی	۲۱۹

عنوان	صفحہ
زمین کے انتظام کے لیے تدابیرِ اصلاح	۲۲۰
۱- زمین داری وجاگیرداری کا معاملہ	۲۲۰
۲- قانونی زراعت پیشگی کا خاتمہ	۲۲۱
۳- زرعی قوانین کی تدوینِ جدید	۲۲۱
۴- شرعی طریقے پر تقسیم میراث	۲۲۲
۵- عشر کی تحصیل وتقسیم کا نظم	۲۲۲
باب چہارم: اسلام اور قانون وراثت	
فصل اول: تقسیمِ میراث کا قانون	
کیا متبنّٰی وارث ہے؟	۲۲۸
وصیت کا قاعدہ	۲۲۹
نادان لوگوں کے مفاد کی حفاظت	۲۳۰
سرکاری املاک میں اجتماعی مفاد کا لحاظ	۲۳۰
ٹیکس عائد کرنے کے متعلق اسلام کا اصولی ضابطہ	۲۳۱
اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات	۲۳۱
میراث کے متعلق قرآن وسنت کے اصولی احکام	۲۳۳
۱۔ میراث کا مسئلہ مورث کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے	۲۳۳
۲۔ میراث کی تقسیم خدمات پر نہیں، قرب پر ہے	۲۳۴
۳۔ قریب ترین رشتہ دار کون ہیں؟	۲۳۴
۴۔ وراثت میت کے قریبی ہونے پر ملے گی	۲۳۴
(الف) حقِ پدری حقیقی ماں، باپ کو ملے گا	۲۳۵
(ب) حقِ ولدیت کے مستحق افراد	۲۳۵
(ج) حقِ زوجیت کا حق	۲۳۵
(د) حقِ اخوت کا حق	۲۳۶
۵۔ قرآنِ مجید کے بیان کردہ حصے دار	۲۳۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
قائم مقامی کے اصول کی غلطی	۲۳۷
پہلا اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۷
دوسرا اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۸
تیسرا اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۸
چوتھا اعتراض اور اس کا جواب	۲۳۹
ایک اور غلط تجویز	۲۳۹
فصل دوم: تقسیم میراث کے قانونی احکام	
مرد اور عورت کا حصہ	۲۴۱
والدین کا حصہ۔ میت کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں	۲۴۲
ترکے میں میاں بیوی کا حصہ [صاحب اولاد اور بے اولاد ہونے کی صورت میں]	۲۴۲
کلالہ	۲۴۳
وراثت کلالہ کا حکم	۲۴۳
کلالہ کے معنی	۲۴۴
ماں باپ شریک بہن بھائیوں کی میراث	۲۴۴
بھائی بہن کے پورے ترکے کا وارث	۲۴۴
وراثت میں اخیافی بھائی بہنوں کا حصہ	۲۴۴
میراث صرف رشتہ داروں کا حق ہے	۲۴۵
شوہروں کی وفات کے بعد اس کے خاندان والوں کو عورت کا وارث بننے کی ممانعت	۲۴۶
تقسیم میراث کے موقع پر آنے والے یتیموں اور مسکینوں کا حق	۲۴۷
وراثت میں دادی کا حصہ	۲۴۷
پوتے کی محرومی وراثت	۲۴۷
فصل سوم: وصیت	
وصیت کے لیے نصابِ شہادت	۲۴۹
جسمانی اعضا عطیہ کرنے کی وصیت کرنا بالخصوص آنکھوں کی	۲۴۹
کیا وارث میت کے جسم کے کسی حصے کو عطیۂ دینے کے مجاز ہیں؟	۲۵۰
کیا پختہ قبر کی وصیت کرنا جائز ہے؟	۲۵۰
قانونِ تقسیم وراثت کے تقرر سے پہلے وصیت کا حکم [قانون وراثت کی دینی حیثیت]	۲۵۱
بذریعہ وصیت کمی یا بیشی	۲۵۱
ادائیگی قرض سے پہلے وصیت کا ذکر، کیوں؟	۲۵۲
وصیت اور قرض میں ضرر رسانی	۲۵۳
اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا اظہار	۲۵۳
قانونِ وراثت کو تبدیل کرنے والوں کے لیے دائمی عذاب کی دھمکی	۲۵۴
مسلمانوں کی جسارت	۲۵۴
انبیاؑ کی میراث	۲۵۴
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مسئلہ	۲۵۵
مطالبۂ میراث کیسے اٹھا؟	۲۵۸
آیت تطہیر میں حضرت علیؓ شامل ہیں یا نہیں؟	۲۶۳
دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے	۲۶۴
دارالسلام اور دارالکفر کے مسلمان کی وراثت	۲۶۵
زرعی جائیدادوں میں تقسیم میراث کا شرعی طریقہ	۲۶۵
یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ	۲۶۶
پہلا خط	۲۶۶
دوسرا خط	۲۶۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ

- مصنف کا جواب ۲۶۸

باب پنجم: انفاق فی سبیل اللہ

فصل اول: انفاق فی سبیل اللہ کے احکام

- انفاق فی سبیل اللہ سے متعلقہ قرآنی آیات ۲۷۳
- انفاق فی سبیل اللہ کے عام احکام ۲۷۵
- انفاق فی سبیل اللہ کی تعریف ۲۷۵
- احکام کی دو قسمیں۔ عام اور خاص ۲۷۶
- اللہ کی یاد کا عام حکم ۲۷۶
- اللہ کی یاد کا خاص حکم ۲۷۷
- انفاق فی سبیل اللہ کا عام حکم ۲۷۷
- انفاق کا خاص حکم ۲۷۷
- انفاق کے عام حکم کی مختصر تشریح ۲۷۸
- سیدھے راستے پر چلنے کی تین شرطیں ۲۷۸
- زندگی بسر کرنے کے دو طریقے ۲۷۹

فصل دوم: خدا کی راہ میں خرچ کے طریقے

۱۔ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے ۲۸۱
۲۔ احسان نہ جتایا جائے ۲۸۱
۳۔ بہتر مال دیا جائے ۲۸۲
۴۔ حتی الامکان چھپا کر دیا جائے ۲۸۲
۵۔ نادانوں کو ضرورت سے زیادہ نہ دیا جائے ۲۸۲
۶۔ مقروض کو پریشان نہ کیا جائے ۲۸۳
۷۔ خیرات میں اعتدال ۲۸۳
- امداد کے مستحقین ۲۸۳

فصل سوم: نیکی کے وہ کام جہاں مال و دولت خرچ کرنا چاہیے

- کفر و اسلام کی کشمکش کے دور میں اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کرنا ۲۸۶
- اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت فقر اور تنگ دستی کا اندیشہ نہ ہونا چاہیے ۲۸۸
- زیادہ سخت حالات میں انفاق کا ثواب زیادہ ہے ۲۸۹
- احسان جتا کر صدقات کو ضائع نہ کریں ۲۹۰
- راہِ خدا میں حتی الوسع چھپا کر خرچ کرنا چاہیے ۲۹۱
- غیر مسلم رشتہ داروں پر مال خرچ کرنے کی اجازت ۲۹۲
- ہمہ وقت دین کی خدمت کرنے والوں کا استحقاق ۲۹۲
- دل کی تنگی سے بچنے اور مال خرچ کرنے کا حکم ۲۹۳
- اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرنا موجب ہلاکت ۲۹۴
- زائد از ضرورت مال خرچ کرنے کا حکم ۲۹۵
- موت آنے سے پہلے انفاق کا حکم ۲۹۷
- اچھی اور بہتر چیز خرچ کرنے کا حکم ۲۹۷
- فی سبیل اللہ خرچ کرنے والوں کی مثال ۲۹۷
- کیسے اخلاق کے لوگ مراد ہیں ۲۹۸
- کون سا مالی خرچ فی سبیل اللہ میں شمار ہوگا ۲۹۸
- انفاق کی ترغیب ۲۹۹
- مشترکہ کاروبار اور انفاق فی سبیل اللہ ۲۹۹

فصل چہارم: ایمان کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی، ذریعۂ نجات

- بھوک میں مبتلا شخص کو استطاعت کے مطابق کھانا نہ کھلانا ۳۰۱

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

عنوان	صفحہ

- مسکین کو کھانا کھلانا مومن جنتیوں کی صفت ہے ۳۰۱
- کیا کھانا کھلانا ہی صرف نیکی کا کام ہے؟ ۳۰۲
- کیا شکریہ زبان سے ادا کرنا ضروری ہے؟ ۳۰۲
- مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب ۳۰۲
- مسکین کی مدد کی فضیلت، حدیث رسول کی روشنی میں ۳۰۳
- غلامی سے چھڑانا ۳۰۴

باب ششم: سود

فصل اول: سود کی مذمت

- سود کے بارے میں قرآن مجید کی پہلی سورت ۳۰۹
- آیت کی تفسیر میں دو اقوال ۳۰۹
- بڑھتا چڑھتا سود کھانے کی ممانعت ۳۱۰
- حرمت سود کی آخری آیت ۳۱۱
- ربٰو کا مفہوم ۳۱۱
- جاہلیت کا ربٰو ۳۱۳
- سود خوار کی حالت ۳۱۳
- سود خوار کی مخبوط الحواس شخص سے تشبیہ ۳۱۴
- نظریے کی خرابی ۳۱۴
- تجارت اور سود میں اصولی فرق ۳۱۵
- [illegible]ات تحریم ۳۱۶
- حرمت سود کی [illegible] ۳۱۷
- سود کے نقصانات ۳۱۷
- اخلاقی و روحانی حیثیت سے ۳۱۸
- تمدنی حیثیت سے ۳۱۸
- معاشی حیثیت سے ۳۱۸

فصل دوم: سود کے متعلقات

- ربٰو الفضل کا مفہوم ۳۲۲
- ربٰو الفضل کے احکام ۳۲۲
- احکام بالا کا ماحصل ۳۲۵
- حضرت عمرؓ کا قول ۳۲۷
- فقہا کے اختلافات ۳۲۷
- جانوروں کے مبادلے میں تفاضل ۳۲۸

فصل سوم: سوال و جواب

- بنک میں رقم رکھوانے کی جائز صورت ۳۲۹
- کیا سود کے بغیر معاشی تعمیر ممکن ہے؟ ۳۲۹
- اسلامی حکومت اسے کیسے حل کر سکتی ہے؟ ۳۳۰
- دارالکفر میں سود خواری ۳۳۱
- حرام کو حلال کرنے کی حیلہ سازی ۳۳۲
- سود اور زمین کے کرائے میں فرق ۳۳۳
- غیر سودی معیشت میں حکومت کو قرض کی فراہمی کا مسئلہ ۳۳۴
- کیا قرض لی ہوئی رقم کی واپسی میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے؟ ۳۳۵
- کیا اللہ تعالیٰ سود دیتا ہے؟ ۳۳۵

باب ہفتم: تجارت

فصل اول: تجارت

- جائز طریقوں سے حلال روزی کمانے کی فضیلت ۳۳۹
- تسعیر (نرخ بندی) کے بارے میں اسلام کی پالیسی ۳۳۹
- سیپ اور دلالی کی شرعی حیثیت ۳۴۰

www.KitaboSunnat.com
" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
❁ آڑھت	۳۴۱
❁ تجارت میں "عرف" کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم	۳۴۲
❁ کاروباری مسائل	۳۴۳
❁ قابل فروخت اشیا پر عورت کی تصویر	۳۴۵
❁ بے پردہ عورتوں کا دکان پر آنا	۳۴۵
❁ مزید کاروباری مسائل	۳۴۶
❁ کمیشن اور نیلام	۳۴۷
❁ پیشگی سودے بازی (بیع سلم) کی شرعی حیثیت	۳۴۸
❁ مسجد میں نیلام کی شرعی حیثیت	۳۴۹
❁ نقد کی قیمت اور، ادھار کی اور	۳۴۹
❁ انشورنس	۳۵۰
❁ بیمے کا جواز وعدم جواز	۳۵۰
❁ انشورنس کو حرمت سے پاک کرنے کی تدابیر	۳۵۱
❁ انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت	۳۵۲
❁ قرض کو تحریر میں لانے کا حکم	۳۵۳
❁ اخلاق و دیانت کے لحاظ سے قابل اعتماد لوگوں کو گواہ بنانے کا حکم	۳۵۴
❁ ہر معاملہ بیع کو ضبط تحریر میں لانے کا حکم	۳۵۴
❁ کاتب (منشی) کو دستاویز تحریر کرنے اور گواہوں کو گواہی پر مجبور نہ کرنے کا حکم	۳۵۵
❁ رہن بالقبض سے متعلقہ مسائل	۳۵۵
❁ ادائے قرض سے عاجز شخص اور اسلامی عدالت	۳۵۶
❁ مسلمانوں کے معاملات میں گواہ مسلمان ہی ہونا چاہیے	۳۵۷
❁ قرض حسنہ کا مفہوم	۳۵۸
❁ اللہ تعالیٰ کو قرض حسنہ دینے والے کا مقام و مرتبہ	۳۵۸
❁ اللہ کی شان کریمی	۳۵۹
❁ چند سوالات اور ان کے جوابات	۳۶۰

باب ہشتم: بنیادی حقوق

فصل اول: انسانیت کو اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق

عنوان	صفحہ
❁ بنیادی حقوق کوئی نیا تصور نہیں	۳۶۵
❁ بنیادی حقوق کا سوال کیوں؟	۳۶۵
❁ دور حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کا ارتقا	۳۶۶
❁ حرمت جان یا جینے کا حق	۳۶۹
❁ معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ	۳۷۰
❁ تحفظ ناموس خواتین	۳۷۰
❁ معاشی تحفظ	۳۷۰
❁ عادلانہ طرز معاملہ	۳۷۱
❁ نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون	۳۷۱
❁ مساوات کا حق	۳۷۱
❁ معصیت سے اجتناب کا حق	۳۷۲
❁ ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق	۳۷۳
❁ سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق	۳۷۳
❁ آزادی کا تحفظ	۳۷۴
❁ تحفظِ ملکیت	۳۷۴
❁ عزت کا تحفظ	۳۷۴
❁ نجی زندگی کا تحفظ	۳۷۵
❁ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق	۳۷۵
❁ آزادئ اظہار رائے	۳۷۶

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
❁ ضمیر واعتقاد کی آزادی کا حق	۳۷۶
❁ مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق	۳۷۷
❁ آزادیِ اجتماع کا حق	۳۷۷
❁ عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت	۳۷۸
❁ شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی	۳۷۸
فصل دوم: اسلامی معاشرے کی تنظیم نو	
❁ کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کردیں تو تاوان عائد ہوگا یا نہیں؟	۳۸۰
❁ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھنے کا حکم	۳۸۱
❁ پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار	۳۸۲
❁ پورے معاشرے کو خراب کرنے والی برائیاں	۳۸۴
❁ عملِ صالح کی اہمیت	۳۸۴
❁ حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین	۳۸۵
❁ حق کا مفہوم	۳۸۵
❁ حق کی نصیحت کرنے کا مطلب	۳۸۵
❁ غفلت کا نتیجہ	۳۸۶
❁ صبر کی تلقین سے مراد	۳۸۶
❁ صبر کی عملی صورتیں	۳۸۶
❁ نبی کا کام قیام عدل	۳۸۷
❁ بقدر استطاعت اللہ سے ڈرنے کا حکم	۳۸۸
❁ مومنین کی صفات	۳۸۹
❁ متقین سے مراد	۳۸۹
❁ راتوں کی عبادت	۳۸۹
❁ حقوق العباد کی پاسداری	۳۹۰
❁ زکوٰۃ کے علاوہ مال میں حق	۳۹۱
❁ سوالات اور ان کے جوابات	۳۹۱
❁ کیا صحابہ کرامؓ پر تنقید جائز ہے؟	۳۹۲
❁ گھریلو زندگی کی خصوصیات	۳۹۳
❁ مہاجر مومن خواتین سے حضورؐ کا بیعت لینے کا طریقہ	۳۹۴
❁ شوہر کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا	۳۹۴
❁ قطع رحمی [سے متعلق اسلامی احکام]	۳۹۵
❁ باغی کے لیے دعائے استغفار کرنے کی ممانعت	۳۹۶
❁ قرعہ اندازی [جواز]	۳۹۷
❁ راجہ کی غائبانہ سلامی کا شرعی حکم	۳۹۸
❁ گری پڑی چیز کو اٹھانا	۳۹۹
فصل سوم: حقوقِ یتامیٰ	
❁ یتیموں کے بارے میں قرآن مجید کے احکامات	۴۰۱
❁ حقوقِ یتامیٰ اور تعدد ازواج	۴۰۳
❁ یتامیٰ کے بارے میں انصاف کی تلقین	۴۰۴
❁ جاہلیت کے دور میں اہلِ عرب کا یتیم کے ساتھ سلوک	۴۰۴
❁ یتیم پر ظلم و زیادتی کی ممانعت	۴۰۶
باب نہم: متفرق احکام و مسائل	
فصل اوّل: اہل بیتِ رسولؐ	
❁ اہلِ بیتِ رسولؐ	۴۰۹
❁ کیا اہلِ بیت میں بیویاں شامل ہیں؟	۴۱۰
❁ ازواج مطہراتؓ کی معاشرتی ذمہ داریاں	۴۱۲
❁ ازواج مطہراتؓ کو اپنے گھروں میں تلاوت قرآن کا حکم	۴۱۳
❁ نبی کا اپنی بیویوں سے علیحدگی کا مسئلہ	۴۱۴

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ

فصل دوم: علم کی اہمیت اور متفرق مباحث

- تحصیل علم کا حکم بصورت ترغیب ۴۱۷
- دیہاتی عوام کی تعلیم و تربیت ۴۱۷
- قومی استحکام کے لیے باشعور عوام کی ضرورت ۴۱۸
- تعلیم کا اصل مقصد ۴۱۸
- ایک غلط فہمی ۴۱۹
- اہلِ علم سے رہنمائی کی اہمیت ۴۱۹
- علم کے بغیر شہادت اللہ کے ہاں معتبر نہیں ۴۱۹
- ایمان اور علم ۴۲۰
- گواہی اور علم ۴۲۰
- وہم و گمان کے بجائے علم کی پیروی کا حکم ۴۲۰
- زمین میں اکڑ کر چلنے کی ممانعت ۴۲۱
- تفرقہ پردازی کے محرکات اور ان کے نتائج ۴۲۳
- شاہراہِ شریعت پر قائم رہنے کا حکم ۴۲۴
- اہلِ ایمان کو مخالفین کی ایذا رسانیوں پر درگزر کرنے کا حکم ۴۲۴
- راعنا کی جگہ انظرنا کہنے کا حکم ۴۲۵
- غیر مسلموں کے معبودوں اور پیشواؤں کو گالیاں دینے کی ممانعت ۴۲۶
- اللہ کے عہد کو پورا کرنے کا حکم ۴۲۶
- فاسق کی لائی ہوئی خبر کی تحقیق کا حکم ۴۲۸
- اہلِ ایمان کو فساق و فجار کی روش سے بچنے کا حکم [کی تلقین] ۴۲۹
- اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے رفاقت و دوستی کی ممانعت ۴۳۰
- اہلِ ایمان کو نظر انداز کر کے کفار کو رفیق بنانے کی ممانعت ۴۳۱
- یہود و نصاریٰ کو رفیق بنانے کی ممانعت ۴۳۱
- اپنی فکر کرنے کا حکم ۴۳۱
- سچے لوگوں کا ساتھ دینے کا حکم ۴۳۲
- انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بننے کا حکم ۴۳۲
- السلام علیکم [شعارِ اسلام] کی ضرورت و اہمیت ۴۳۲
- مغفرت اور جنت کے حصول کے لیے مسابقت کا حکم ۴۳۴
- ایفائے عقود کا حکم ۴۳۴
- اہلِ ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ۴۳۶
- اہلِ ایمان کو صبر کا دامن تھامے رکھنے کا حکم، قرآنی مفہوم کی روشنی میں ۴۳۷
- صبر کا لغوی معنی ۴۳۷
- مومن معاشرے میں ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کا حکم ۴۳۹
- ایمان لانے سے پہلے کھائے پیے پر گرفت نہیں ۴۳۹
- قانونی احکام کے بیان کے بعد مختصر وعظ و نصیحت ۴۴۰
- نبی کو تسبیح کرنے کے حکم سے کیا مراد ہے؟ ۴۴۱
- بدعت، تعریف اور اقسام ۴۴۲

فصل سوم: فنونِ لطیفہ

[مصوری، مجسمہ سازی، شاعری وغیرہ]

- گڑیوں کا حکم ۴۴۷
- اسلام اور سینماٹوگرافی ۴۴۷
- فوٹو کی اسلام میں حیثیت ۴۵۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ
❁ مصوری اور مجسمہ سازی	۴۵۱
❁ کیا حضرت سلیمانؑ نے انبیاؑ اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں؟	۴۵۲
❁ مفسرین کی صراحت	۴۵۳
❁ اہلِ مغرب کی تقلید میں بعض لوگوں کا مصوری اور بت تراشی کو حلال کرنا	۴۵۳
❁ مقلدین مغرب کے استدلال کی غلطی	۴۵۳
❁ ارشادات نبویؐ	۴۵۳
❁ تصویر کے معاملے میں رخصت پائی جانے والی روایات	۴۵۶
❁ ان روایات کی اصل حقیقت	۴۵۷
❁ اس بارے میں امت کے لیے آنحضورؐ کا چھوڑا ہوا ضابطہ	۴۵۷
❁ اکابر صحابہؓ کے مقدس گروہ کا تصویروں کے ساتھ برتاؤ	۴۵۷
❁ دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ	۴۵۸
❁ چند باتیں جنھیں سمجھ لینا ضروری ہے	۴۵۹
❁ امتحان دینے کے لیے فوٹو کھنچوانا	۴۶۰
❁ اشاعت فحش کے جملہ ذرائع و وسائل کا سد باب	۴۶۱
❁ شعر و شاعری، اسلام میں اس کے حدود	۴۶۲
❁ دینی اور شعری مجلسوں میں فرق	۴۶۲
❁ جاہل شعرا کی حالت	۴۶۳
❁ ہدایت یافتہ شعرا کی خصوصیات	۴۶۴
۱-ایمان	۴۶۴
۲-عملِ صالح	۴۶۴
۳-یادِ الٰہی	۴۶۴
۴-حق پرستی	۴۶۴

فصل چہارم: اسلام، طب جدید اور سائنس

عنوان	صفحہ
❁ پوسٹ مارٹم	۴۶۵
❁ پوسٹ مارٹم، شق صدر	۴۶۶
❁ علم طب سے متعلق چند سوالات	۴۶۷
❁ غذاؤں اور دواؤں کی حلت و حرمت	۴۶۸
❁ علم طب میں مسلمانوں کی خدمات	۴۶۹
❁ کیا شدت مرض کی وجہ سے انتہائی کرب میں علاج بذریعہ موت جائز ہے؟	۴۷۰
❁ کیا طبی مقاصد کے لیے لاشوں کی چیر پھاڑ درست ہے؟	۴۷۱
❁ کیا اعضائے انسانی کو عطیۃً دیا جا سکتا ہے خصوصاً جبکہ اس کا مقصد انسانی خدمت ہو	۴۷۱
❁ وصیۃ العینین	۴۷۲
❁ [Evolution] نظریہ ارتقا کے متعلق سوال	۴۷۳
❁ اسلام اور سائنس	۴۷۴

فصل پنجم: آیات محکمات و متشابہات

عنوان	صفحہ
❁ آیات محکمات اور متشابہات کا مفہوم	۴۷۷
❁ محکمات	۴۷۷
❁ متشابہات	۴۷۷
❁ متشابہات سے اہلِ فتنہ کی غیر معمولی دل چسپی	۴۷۸
❁ جب لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم ہی نہیں جانتے تو ایمان کیسے لے آئے؟	۴۷۸
❁ محکمات اور متشابہات کا ایک مفہوم	۴۷۹
❁ اللہ تعالیٰ اور تجسیم: محکمات اور متشابہات کی روشنی میں	۴۸۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عنوان	صفحہ

- جبریل اور انسانی اعمال کی رپورٹ اللہ کے حضور ۴۸۱

فصل ششم: عالمِ برزخ

- عالمِ برزخ اور زندگی ۴۸۳
- موت کے بعد ہی [برزخ میں] جزاوسزا کا آغاز ۴۸۳
- سماع موتی ۴۸۴
- تجہیز و تکفین کیوں؟ ۴۸۴
- مقابر صلحا پر عمارتیں اور مسجدیں تعمیر کرنا ۴۸۵
- اصحاب قبور کے ساتھ ہمارے معاملے کی نوعیت ۴۸۵

فصل ہفتم: کفار و منافقین

- کفار سے عفو و درگزر کرنے کا حکم ۴۸۷
- جن پر اللہ کا غضب ہوا ان سے دوستی کی ممانعت ۴۸۸
- تخریب کاری کے لیے منتخب یا تعمیر شدہ عمارت کے افتتاح کی ممانعت ۴۸۸
- مسجد ضرار کی تعمیر کی غرض وغایت [ایک ناپاک سازش] ۴۸۹
- افتتاح کے لیے آنے کے بجائے مسجد ضرار کو مسمار کرنے کا حکم ۴۸۹
- مشرکین کے معبودوں کو گالیاں نہ دو ۴۹۰
- کیا مسلمانوں کو امتیازی حقوق دینا، غیر مسلموں پر اکراہ ہے ۴۹۰
- آیت لا اکراہ فی الدین اور قادیانیوں کا معاملہ ۴۹۱
- فریبِ دنیا میں مبتلا لوگوں کو نظرانداز کرنے کا حکم ۴۹۲
- ○ کفار کو اللہ کے دین کا مذاق اڑاتے نہ سنو ۴۹۲
- ○ اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو رفیق نہ بنانے کا حکم ۴۹۳
- ○ منافقین کے ساتھ طرزِ عمل ۴۹۳
- جھوٹے مدعیٔ ایمان کا معاملہ ۴۹۴
- نام کے مسلمانوں کو تنبیہ ۴۹۵
- قول و عمل میں مطابقت کا حکم [منافقت سے اجتناب کا حکم] ۴۹۶
- منافق کی نشانیاں ۴۹۷
- کس صورت میں منافقت پر حکمِ کفر لگایا جاسکتا ہے؟ ۴۹۸
- مسلم سوسائٹی میں منافقین کے ساتھ برتاؤ کس طرح کیا جائے ۴۹۹
- جاہلیت کی پکار چھوڑنے کا حکم ۵۰۰
- اسلامی معاشرے اور ریاست میں بگاڑ وفساد برپا کرنے والوں کے لیے حکم ۵۰۱
- جان بچانے کے لیے مجبوراً محض زبان سے کلمۂ کفر کہنا ۵۰۲
- ما انزل اللہ کی اتباع اور دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے کا حکم [اصولی احکام] ۵۰۳
- عذر مجبوری کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت شریعت کی نظر میں ۵۰۸

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عرضِ ناشر

موجودہ اکیسویں صدی میں کفر واسلام کی کشمکش ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہوچکی ہے۔عصری حالات اس جانب اشارہ کررہے ہیں کہ اس کرۂ ارض کی شیطانی قوتیں اپنے پورے لاؤلشکر، جبر وتشدد،ٹیکنالوجی، بربریت اورخون ریزی کے ساتھ حق اور اہل حق کے خلاف اعلانِ جنگ کرچکی ہیں۔اس کے باوجود حق کی آواز کودبانے اوراس کی نشاۃِ ثانیہ کوروکنے میں ناکام نظر آرہی ہیں۔یہ عالمی شیطانی قوتیں اپنی تمام تر سازشوں کے باوجود کہیں بھی کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کرپائیں۔موجودہ کشمکش میں ان قوتوں کے ہاتھ شل ہوچکے ہیں۔بظاہر اسلامی قوتیں کچھ زخم لگنے کے بعد مضمحل نظر آرہی ہیں لیکن دراصل یہ اگلے اور فیصلہ کن معرکے کی تیاری میں مصروف ہیں۔یہ مایوس نہیں ہیں بلکہ تازہ دم ہونے کے لیے اپنے آپ کواور اپنے ذہن کوتیار کررہی ہیں۔

اس صدی کی شیطانی جمہوریت کا ہررخ اور ہرروپ ان اسلامی قوتوں کے سامنے اب عریاں کھڑا ہے۔کمیونزم،لبرل ازم اور سیکولرازم کے تمام ہتھیار اب زنگ آلود ہوچکے ہیں۔وہ وقت بہت قریب ہے جب سرمایہ داری اور نام نہاد مغربی جمہوریت اوراس کی بے خدا تہذیب چاروں شانے چت گرے گی اورحق اپنے پورے دبدبے اور پوری شان وشوکت سے ان شاءاللہ جلوہ گرہوگا۔عالم اسلام کے اکثر حکمران طبقے مغرب کے ایجنٹوں کا کردارادا کررہے ہیں۔وہ وقت ان شاءاللہ جلد آئے گا کہ اس منافق گروہ کوکہیں کوئی جائے پناہ نہ ملے گی۔

کفر واسلام کی اس کشمکش میں نظریاتی وعلمی اور عملی محاذ پر،مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے جوکارنامہ سرانجام دیا ہے،وہ حقیقتاً جدید دور میں وراثت انبیا کا حق ادا کرنے کا مقام ومرتبہ رکھتا ہے۔ان کی برپا کردہ تحریک اس وقت پوری دنیا میں ایسے افرادِ کارتیار کررہی ہے جو مستقبل کی ایک اسلامی ریاست کے قیام اوراس کے امور ومعاملات کوچلانے میں کارآمد ہوں۔اسی مقصد (Cause) کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے ادارے ادارہ معارف اسلامی نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفہیم القرآن اوردیگر تحریروں سے اخذ کردہ احکام القرآن کوپانچ جلدوں میں مرتب کیا ہے۔یہ عظیم الشان کارنامہ محترم جناب مولانا عبدالوکیل علوی (مدظلہ العالی) نے سرانجام دیا ہے۔موجودہ جلد اس سلسلے کی چوتھی کڑی ہے۔اس سے قبل تین جلدیں زیور طباعت سے آراستہ وپیراستہ ہوکر مارکیٹ میں دستیاب ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دراصل پہلے یہ منصوبہ چار جلدوں پر مشتمل تھا۔ بعدازاں جناب مرتب مولانا عبدالوکیل علوی صاحب اور دیگر رفقا کے مشورے سے اسے پانچ جلدوں پر لانا پڑا کیونکہ مرتب کردہ مسودہ اتنا ضخیم اور متنوع تھا کہ ہمیں پانچویں جلد بھی شائع کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس سے قبل پہلی تین جلدوں میں علوم القرآن، ایمانیات، اخلاقیات، عبادات، معاشرت و عائلی احکام وقوانین بیان کیے جا چکے ہیں۔ موجودہ جلد چہارم حدود وتعزیرات، معاشیات، مسئلہ ملکیتِ زمین، قانونِ وراثت، انفاق فی سبیل اللہ، سود، تجارت، بنیادی انسانی حقوق اور چند متفرق احکام ومسائل پر مشتمل ہے۔

اس جلد کی ترتیب وتدوین کے لیے جناب مولانا عبدالوکیل علوی صاحب نے اپنی بیماری اور ضعف کے باوجود شبانہ روز محنت کی ہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا عبدالوکیل علوی (مدظلہ العالی) کو کامل صحت وتندرستی عطا فرمائے اور وہ اسی توانا جذبے کے ساتھ ادارے کے دیگر منصوبوں کے لیے ہمارے ساتھ تعاون فرماتے رہیں۔

میں اس موقع پر تمام رفقائے ادارہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنھوں نے اس منصوبے کی اشاعت وتکمیل میں حصہ لیا۔ خصوصی طور پر برادران پروفیسر ظفر حجازی، مولانا گل زادہ شیرپاؤ، محمد انور گوندل، شیخ افتخار احمد، محمد صدیق، عبدالرحمٰن انور اور ساجد خان شکریے کے مستحق ہیں کہ جن کی انتہائی توجہ اور محنت سے یہ جلد اشاعت کے مراحل سے گزر کر اب آپ کے ہاتھوں میں پہنچی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اس کارِخیر کا اجرِعظیم عطا فرمائے اور ان کی تمام تر مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل کردے۔ (آمین)

ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ پیش کش بھی اہلِ علم اور عام قارئین کی خصوصی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی۔ ہم نے اپنی طرف سے تو حتی الامکان کوشش کی ہے کہ یہ جلد بہترین انداز میں پیش کی جائے۔ پھر بھی اہل نقد ونظر سے التماس ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جہاں بھی کوئی کمی کوتاہی یا سقم محسوس کریں، بلاتوقف اور بلاتردد ہم تک پہنچائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جاسکے۔ اس تعاون کے لیے ہم ان کے شکرگزار ہوں گے۔

حافظ محمد ادریس

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی

منصورہ، لاہور

۳۱/اکتوبر ۲۰۱۳ء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

حدود و تعزیرات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

شرعی حدود، مقصد اور شرائطِ نفاذ

حدود اللہ کے قریب بھی نہ پھٹکو

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔(البقرۃ ۲:۱۸۷) یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے بصراحت بیان کرتا ہے، توقع ہے کہ وہ غلط رویے سے بچیں گے۔

یہ نہیں فرمایا کہ ان حدود سے تجاوز نہ کرنا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ان کے قریب نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے، عین اسی مقام کے آخری کناروں پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اس میں ہے کہ آدمی سرحد سے دور ہی رہے تاکہ بھولے سے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اس حدیث میں بیان ہوا ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ فَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمٰى، يُوْشِكُ اَنْ يَقَعَ فِيْهِ۔ عربی زبان میں حِمٰی اس چراگاہ کو کہتے ہیں، جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کر دیتا ہے۔ اس استعارے کو استعمال کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''ہر بادشاہ کی ایک حِمٰی ہوتی ہے اور اللہ کی حِمٰی اس کی وہ حدود ہیں[1]، جن سے اس نے حرام و حلال اور طاعت و معصیت کا فرق قائم کیا ہے۔ جو جانور حِمٰی کے گرد ہی چرتا رہے گا، ہوسکتا ہے کہ ایک روز وہ حِمٰی کے اندر داخل ہو جائے۔'' افسوس ہے کہ بہت سے لوگ جو شریعت کی رُوح سے ناواقف ہیں، ہمیشہ اجازت کی آخری حدوں تک ہی جانے پر اصرار کرتے ہیں اور بہت سے علما و مشائخ بھی اسی غرض کے لیے سندیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر جواز کی آخری حدیں انھیں بتایا کرتے ہیں، تاکہ وہ اس باریک خطِ امتیاز ہی پر گھومتے رہیں، جہاں اطاعت اور معصیت سے بھی بڑھ کر ضلالت میں مبتلا ہو رہے ہیں، کیونکہ ان باریک سرحدی خطوط کی تمیز اور ان کے کنارے پہنچ کر اپنے

---

1. [لاضرر ولا ضرار کے مفہوم کی روشنی میں] جن چیزوں کی حرمت کا صریح حکم نہیں ہے ان کے معاملے میں اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے دیکھا جائے گا کہ آیا وہ انسان کے لیے مضرت رساں ہیں یا منفعت بخش۔ اگر وہ مضر ثابت ہوں تو وہ حرام ہیں اور منفعت بخش ثابت ہوں تو حلال۔ اسی طرح ان کے طریقہ ہائے استعمال کو بھی اسی قاعدے کے لحاظ سے جانچا جائے گا۔ جو طریقِ استعمال موجب فساد ہو وہ ممنوع ہے اور جو طریق استعمال موجب صلاح ہو وہ مباح ہے۔ (تفہیمات: دوم، ص ۴۵۴، اشاعت پنجم ۱۹۷۰ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آپ کو قابو میں رکھنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن: ج ا،ص ۱۴۷، البقرۃ حاشیہ ۱۹۶)

حدود اللہ سے تجاوز

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ (الاعراف ۷ :۳۱)۔ اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

خدا کو تمھاری خستہ حالی اور فاقہ کشی اور طیباتِ رزق سے محرومی عزیز نہیں ہے کہ اس کی بندگی بجالانے کے لیے یہ کسی درجہ میں بھی مطلوب ہو۔ بلکہ اس کی عین خوشی یہ ہے کہ تم اس کے بخشے ہوئے عمدہ لباس پہنو اور پاک رزق سے متمتع ہو۔ اس کی شریعت میں اصل گناہ یہ ہے کہ آدمی اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے، خواہ یہ تجاوز حلال کو حرام کر لینے کی شکل میں ہو یا حرام کو حلال کر لینے کی شکل میں۔ (تفہیم القرآن: ج ۲،ص ۲۲۔ الاعراف، حاشیہ ۲۱)

حدود حلال وحرام

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۔ (المائدۃ ۵ :۱) بے شک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

اللہ حاکم مطلق ہے، اسے پورا اختیار ہے کہ جو چاہے حکم دے۔ بندوں کو اس کے احکام میں چون و چرا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر چہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں، لیکن بندۂ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے، بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی ہے وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے، اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے، وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیا کی حرمت و حلت کے لیے مالک کی اجازت وعدم اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی قطعاً ضرورت نہیں اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ خدا جس کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور جسے ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے۔ (تفہیم القرآن: ج ا،ص ۴۳۸، المائدۃ، حاشیہ ۴)

تحلیل وتحریم کے اختیارات نبی کریم ﷺ کو بھی نہیں دیے گئے

کسی نبی کو اللہ نے اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ لوگوں کو خدا کے بجائے اپنا غلام اور اپنا بندہ بنائے، بلکہ صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ان کو خدا کے تابع فرمان بنائے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ ۔ (آلِ عمران ۳ :۷۹)۔ [کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ جب اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت بخشے تو وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ کہے گا کہ تم خدا کے بندے بنو]۔ وہ اس لیے نہیں آیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ لوگوں کو اپنی ذاتی خواہشات کی پیروی پر مجبور کرے، اپنی شخصی عظمت و بزرگی کا سکہ ان پر جمائے اور انہیں اپنے پیچھے
کے شکنجے میں کس کر اس قدر بے بس کر دے کہ وہ اس کی رائے کے مقابلے میں خود کوئی رائے رکھنے کے حق سے بالکل دست
بردار ہو جائیں اور اپنے دل و دماغ کو اس کے سامنے معطل کر دیں۔ یہ تو وہی غیر اللہ کی بندگی ہوئی جس کو مٹانے کے لیے نبی بھیجا
جاتا ہے۔ انسان کی گردن میں جتنے طوق انسان نے ڈالے ہیں ان سب کو کاٹ دینا ہی تو نبی کی بعثت کا مقصود ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ
إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ۔ (الاعراف ۷:۱۵۷)۔ [اور یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے
تھے اور ان بندھنوں کو توڑتا ہے جن میں وہ بندھے ہوئے تھے]۔

انسان نے انسان کے لیے فرائض اور حقوق مقرر کرنے اور جائز و ناجائز کی من مانی حد میں ٹھہرانے کے جن اختیارات پر قبضہ کر رکھا تھا ان کو سلب کرنے ہی کے لیے تو نبی مامور کیا جاتا ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ۔ (النحل ۱۶:۱۱۶)۔ [تم کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنی زبان سے جس چیز کو چاہو حلال کرو اور جسے چاہو ممنوع ٹھہراؤ]۔ انسانی حکم اور فیصلے کے سامنے سر جھکانے کی جو ذلت انسان نے اختیار کر لی تھی اس سے نجات دلانے ہی کے لیے تو نبوت قائم کی جاتی ہے، وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ۚ۔ (آل عمران ۳:۶۴)۔ ہم میں سے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اللہ کے بجائے اپنا خدا نہ بنائے]۔ پھر کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ نبی ان کی گردنوں سے دوسروں کا طوق اتار کر اپنا طوق ڈال دے اور تحلیل و تحریم کے اختیارات دوسروں سے چھین کر خود اپنے قبضے میں کر لے اور استبداد کی مسند سے دوسروں کو ہٹا کر خود اس پر متمکن ہو جائے۔ (تفہیمات اول: ص ۱۰۲-۱۰۳)

قرآن کے نزول کا اصلی مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاع حقیقی (Real Sovereign) کا بندہ بنانے کے بعد اس کو رائے اور ضمیر کی پوری آزادی عطا کرے۔ چنانچہ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطور خود اس کے حلال کیے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیے ہوئے کو حرام سمجھا جائے اور اس کے حکم اور اس کی ممانعت کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لیے بمنزلۂ خدا ہے۔ اس قسم کی اطاعت اور محکومی کو قرآن شرک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اور جو لوگ اپنے علما و مشائخ کو، پنڈتوں اور پروہتوں کو، اور حاکموں کو ارباب من دون اللہ (gods other than God) بنا لیتے ہیں، انھیں مشرک ٹھہراتا ہے۔ (تفہیمات اول، ص ۹۹-۱۰۰، جدید ایڈیشن)

حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عام انسان تو درکنار، خود اللہ تعالیٰ کے نبی کی طرف بھی ان کا کوئی حصہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیت نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اُس صورت میں جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید میں نازل ہوا ہو، یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطور خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا مجاز نبی نہیں ہے کجا کہ کوئی اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شخص ہو سکے۔ (تفہیم القرآن: ج ۶، ص ۱۰، التحریم، موضوع اور مباحث)

يَآيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ۔ (التحریم ۶۶:۱)۔ اے نبی تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو، جسے اللہ نے تمھارے لیے حلال کیا ہے۔

اس سے خود بخود یہ مضمون مترشح ہوتا ہے کہ اللہ نے جس چیز کو حلال کیا ہے اسے حرام کرنے کا اختیار کسی کو بھی نہیں ہے، حتیٰ کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی یہ اختیار نہیں رکھتے۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کو نہ عقیدۃً حرام سمجھا تھا اور نہ اسے شرعاً حرام قرار دیا تھا، بلکہ صرف اپنی ذات پر اس کے استعمال کو حرام کر لیا تھا، لیکن چونکہ آپ کی حیثیت ایک عام آدمی کی نہیں بلکہ اللہ کے رسول کی تھی اور آپؐ کے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے سے یہ خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ اُمّت بھی اس شے کو حرام یا کم از کم مکروہ سمجھنے لگے، یا اُمّت کے افراد یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو اپنے اوپر حرام کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس فعل پر گرفت فرمائی اور آپ کو اس تحریم سے باز رہنے کا حکم دیا۔ (التحریم، حاشیہ ۱)

حرام و ممنوع اشیا کے جواز کی مصلحت و ضرورت

www.kitabosunnat.com

شریعت میں جو چیزیں حرام و ممنوع کی گئی ہیں وہ اگر کسی حالت میں جائز ہوتی ہیں تو اس بنا پر نہیں کہ ان کی حقیقت میں کوئی تغیر ہو جاتا ہے، بلکہ اس بنا پر کہ ایک عظیم تر مصلحت و ضرورت ان کے جواز کا تقاضا کرتی ہے۔ وہ مصلحت و ضرورت داعی نہ ہوتی تو وہ حرام ہی رہتیں۔ جب تک اور جس حد تک اس مصلحت و ضرورت کا تقاضا رہتا ہے اس وقت تک اور اسی حد تک وہ جائز ہوتی اور جائز رہتی ہیں۔ اس کے مرتفع ہوتے ہی ان اشیا کی حرمت اپنی جگہ واپس آ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مُردار، خون، سور، شراب اور ما اهل لغير الله به کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ انسانی جان بچانے کے لیے اگر ان میں سے کسی کو عارضی طور پر مباح کیا جاتا تو اس بنا پر نہیں کہ اس وقت مردار مردار نہیں رہتا، یا خون غیر خون ہو جاتا ہے، یا سور بکرا ہو جاتا ہے۔ اس اباحت کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ انسانی جان کی ہلاکت ان حرام چیزوں کے استعمال سے زیادہ بڑی برائی ہے۔ اس بڑی برائی سے بچنے کے لیے جس وقت جس حد تک ان کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے اُسی وقت اور اُسی حد تک ان کو کھا لینا مباح کر دیا جاتا ہے۔ مگر ان کی حرمت برابر تقاضا کرتی رہتی ہے کہ حدِ ضرورت سے ذرّہ برابر تجاوز نہ کیا جائے۔ (تفہیمات: حصہ سوم، ص ۱۰۵، جدید ایڈیشن اگست ۲۰۰۲ء)

حدود اللہ کے قیام کا مقصد

انسان خود اپنا واضع قانون (Legislator) بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ ہو جائے گا اور اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنا لے گا۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں ''حدود اللہ'' (Divine Limits) کہا جاتا ہے۔ یہ حدود زندگی کے ہر شعبے میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمھاری آزادی کی آخری حدیں ہیں، ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لیے ضمنی اور فروعی ضوابط (Regulations) بنا سکتے ہو، مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمھیں اجازت نہیں ہے۔ ان سے تجاوز کرو گے تو تمھاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجیے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حُرمت، جوئے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی (Personal Liberty) محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ (Class War) اور ایک طبقے پر دوسرے طبقے کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی (Family Life) میں اللہ تعالیٰ نے حجابِ شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر، بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعددِ ازواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو منضبط کر لے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں، اور نہ ان گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود، اور ایسے چند مستقل قاعدے مقرر کر کے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند کر دیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس طریقے سے ایک ایسا مستقل ناقابل تغیر و تبدّل دستور (Constitution) بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے ایک صاف، واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوری کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے، اس کی قوتیں غلط راستوں پر ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے۔ اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُر پیچ پہاڑی راستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں، سڑک کے کناروں کو ایسی رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی سلب کرنا ہے؟ نہیں! دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خطرے کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں، اِدھر ہے، تجھے اُس رخ پر نہیں اس رُخ پر مڑنا چاہیے۔ تا کہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔

بس یہی مقصد ان حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لیے زندگی کے سفر کا صحیح رُخ معین کرتی ہیں اور ہر پُر پیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے، تجھے ان سمتوں پر نہیں بلکہ اس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیے۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی: ص ۲۷ تا ۳۰، اشاعت فروری ۱۹۷۸ء)

اصلاحی ہدایات کا لحاظ کیے بغیر حدود کا نفاذ

اس وقت اگر کوئی مسلمان حکومت اسلام کے تمام احکام و قوانین اور اس کی ساری اصلاحی ہدایات کو معطل رکھ کر اس کے قوانین میں سے صرف حدودِ شرعیہ کو نکال لے اور عدالتوں میں ان کو نافذ کرنے کا حکم دے دے، تو جو قاضی یا جج کسی زانی یا سارق یا شارب خمر پر حد جاری کرنے کا حکم دے گا وہ تو ظالم نہیں ہوگا، البتہ وہ حکومت ضرور ظالم ہوگی جس نے شریعت الٰہیہ کے ایک حصے کو معطل اور دوسرے حصے کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ایسی حکومت کو اُس آیت قرآنی کا مصداق سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا ہے: اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ [1] (البقرۃ ۲:۸۵)۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ جو حکومت خود شراب بنانے اور بیچنے کے لائسنس دیتی ہو اور جس کی تقریبات میں خود حکومت کے کارفرما اور ان کے معزز مہمان شراب سے شغل کرتے ہوں ان کے قانون میں اگر شارب خمر کے لیے ۸۰ کوڑے لگانے کی سزا مقرر کر دی جائے تو ہم اسے اسلامی قانون نافذ کرنے والی حکومت کہنے میں حق بجانب ہوں گے۔ میں یہ نہیں مانتا کہ ایک طرف عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط کو رواج دینا، لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ کالجوں میں پڑھانا، عورتوں سے سرکاری دفاتر میں مردوں کے ساتھ کام لینا، ننگی تصویروں اور عریاں فلموں اور فحش لٹریچر کی بے روک ٹوک اشاعت جاری رکھنا، ۱۶ سال سے کم عمر لڑکی اور ۱۸ سال سے کم عمر لڑکے کا نکاح قانوناً ممنوع ٹھہرانا، اور دوسری طرف زنا پر رجم اور کوڑوں کی سزا دینا فی الواقع اسلامی قانون کا اجرا ہے۔ مجھے یہ ہرگز تسلیم نہیں کہ سود اور قمار کو حلال کرنے والی اور ان محرمات کو خود رواج دینے والی حکومت چوری پر ہاتھ کاٹنے کا قانون نافذ کر کے اسلامی قانون نافذ کرنے والی حکومت قرار دی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی عالم دین اس متضاد طرز عمل کے جواز کے قائل ہوں اور ان کے نزدیک شریعت کے ٹکڑے کرنا اور اس کے اجزا میں سے بعض کو ترک اور بعض کو اخذ کر لینا ظلم نہیں بلکہ ایک نیکی ہو تو وہ اپنے دلائل ارشاد فرمائیں۔

دراصل یہ مسئلہ محض اس سادہ سے قانونی سوال پر بحث کر کے حل نہیں کیا جا سکتا کہ موجودہ حالات میں شرعی حدود کا نفاذ

---

[1] کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور روز قیامت شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جائز ہے یا نہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم کو محض احکام ہی نہیں دیے ہیں بلکہ ان کے ساتھ کوئی حکمت بھی سکھائی ہے جس سے کام لے کر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ ایک مدت دراز تک کفر و فسق کی فرمانروائی کے تحت رہنے کے بعد ہمارے ملک میں جو حالات پیدا ہو چکے ہیں ان میں اقامت دین کا کام اب کس طرح ہونا چاہیے۔ جہاں تک میں نے شریعت کو سمجھا ہے اس کے نظام میں اصلاح، سد باب ذرائع اور تعزیر کے درمیان ایک مکمل توازن قائم کیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ ہر پہلو سے تزکیۂ اخلاق اور تطہیر نفوس کی تدابیر ہمیں بتاتی ہے، دوسری طرف وہ ایسی ہدایات ہمیں دیتی ہے جن پر عمل درآمد کر کے ہم بگاڑ کے اسباب کی روک تھام کر سکتے ہیں، اور تیسری طرف وہ تعزیرات کا ایک قانون ہمیں دیتی ہے تاکہ تمام اصلاحی و انسدادی تدابیر کے باوجود اگر کہیں بگاڑ رونما ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا تدارک کر دیا جائے۔ شریعت کا منشا اس پوری اسکیم کو متوازن طریقے سے نافذ کر کے ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے کسی جز کو ساقط اور کسی کو نافذ کرنا حکمتِ دین کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے جواز میں یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ جس جز کو ہم نافذ کر رہے ہیں اس کے نفاذ کا حکم قرآن میں موجود ہے۔ اس استدلال کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکیم کا مرتب کردہ نسخہ کسی اناڑی کے ہاتھ آ جائے اور وہ اس کے بہت سے اجزا میں سے صرف دو چار اجزا نکال کر کسی مریض کو استعمال کرائے اور اعتراض کرنے والے کا منہ بند کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کرے کہ جو اجزا میں استعمال کرا رہا ہوں وہ سب حکیم کے نسخے میں درج ہیں۔ اس کی اس دلیل کا جواب آخر آپ تو یہی دیں گے کہ بندۂ خدا حکیم کے نسخے میں جو مصلحات اور بدرقے درج تھے ان سب کو چھوڑ کر تو صرف سمیات مریض کو استعمال کرا رہا ہے اور نام حکیم کا لیتا ہے کہ میں اس کے نسخے سے علاج کر رہا ہوں۔ حکیم نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرے نسخے میں سے جس جز کو چاہے چھانٹ کر نکال لے اور جس مریض کو چاہے کھلا دے۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شریعت آیا اپنے نفاذ کے لیے مومن و متقی کارکن چاہتی ہے یا فاسق و فاجر لوگ اور وہ لوگ جو اپنے ذہن میں اس کے احکام کی صحت کے معتقد تک نہیں ہیں؟ اس معاملے میں بھی محض جواز اور عدم جواز کی قانونی بحث مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ مجرد قانونی لحاظ سے ایک کام جائز بھی ہو تو یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ حکمت دین کے لحاظ سے وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ کیا حکمتِ دین کا یہ تقاضا ہے کہ احکام شرعیہ کا اجرا ایسے حکام کے ذریعے سے کرایا جائے جن کی اکثریت رشوت خور، بدکردار، اور خدا و آخرت سے بے خوف ہے اور جن میں ایک بڑی تعداد عقیدۃً مغربی قوانین کو برحق اور اسلامی قوانین کو غلط اور فرسودہ سمجھتی ہے۔ میرے نزدیک تو اسلام کو دنیا بھر میں بدنام کر دینے اور خود مسلم عوام کو بھی اسلام سے مایوس کر دینے کے لیے اس سے زیادہ کارگر نسخہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کے ہاتھوں احکام شریعت جاری کرائے جائیں۔ اگر چند بندگانِ خدا پر بھی جھوٹے مقدمے بنا کر سرقے اور زنا کی حد جاری کر دی گئی تو آپ دیکھیں گے کہ اس ملک میں حدود شرعیہ کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور دنیا میں یہ چیز اسلام کی ناکامی کا اشتہار بن جائے گی۔ اس لیے ہم دین کی کچھ خدمت کرنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چاہتے ہیں، اس سے دشمنی نہیں کرنا چاہتے، تو ہمیں پہلے اس امر کی کوشش کرنی چاہیے کہ ملک کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے جو دین کی سمجھ بھی رکھتے ہوں اور اخلاص کے ساتھ اس کو نافذ کرنے کے خواہش مند بھی ہوں۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوگا کہ اسلام کی پوری اصلاحی سکیم کو ہر جہت سے ہمہ گیر طریقے پر نافذ کیا جائے اور اسی سلسلے میں حدود شرعیہ کا اجرا بھی ہو۔ یہ کام بڑا صبر اور بڑی حکمت چاہتا ہے۔ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانا نہیں ہے کہ آج مجلس قانون ساز میں ایک دو نشستیں ہاتھ آ گئیں اور کل حدود شرعیہ جاری کرنے کے لیے ایک مسودہ قانون پیش کر دیا گیا۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی سمجھ لینی چاہیے۔ ایک حالت تو وہ ہوتی ہے جس میں پہلے سے ملک کے اندر اسلامی قانون نافذ چلا آ رہا ہو اور بعد میں بتدریج انحطاط رونما ہوتے ہوتے یہ نوبت آ گئی ہو کہ شریعت کے بعض حصے متروک ہو گئے ہوں اور جن حصوں پر عمل ہو بھی رہا ہو ان کو نافذ کرنے والے بدکردار لوگ ہوں۔ اس حالت میں حکمتِ دین کا تقاضا یہ نہ ہوگا کہ شریعت کے جو حصے نافذ ہیں ان کو بھی چھوڑ دیا جائے بلکہ یہ ہوگا کہ عام اصلاح کی کوششیں کر کے ایک طرف صالح عناصر کو برسر اقتدار لایا جائے اور دوسری طرف شریعت کے باقی ماندہ حصوں کو نافذ کیا جائے۔ دوسری حالت وہ ہے جس میں کفر و فسق کا سیلاب سب کچھ بہا لے گیا ہو اور اب ہم کو نئے سرے سے تعمیر کا آغاز کرنا ہو۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بنیادوں سے تعمیر شروع کرنی ہوگی نہ کہ اوپر کی منزلوں سے۔ (رسائل و مسائل: چہارم، ص ۲۷۱ تا ۲۷۶، اشاعت اپریل ۱۹۸۱ء)

شرعی حدود کے نفاذ کے لیے ضروری شرائط

شرعی سزاؤں کے نفاذ کے لیے وہ ماحول تیار کرنا ضروری ہے جس میں وہ صحیح طور پر نافذ ہو سکیں۔ جہاں پولیس رشوت خور اور عدالتیں بدکردار ہوں اور پورا معاشرہ فحش و بے حیائی میں غرق ہو رہا ہو وہاں یک لخت شرعی سزاؤں کو نافذ کر دینا اسلام کی ناکامی کا اشتہار ساری دنیا میں دے دینے کا ذریعہ بن جائے گا۔ سعودی عرب کی مثال اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہاں بگاڑ کی نوعیت پاکستان کے حالات سے بہت مختلف ہے۔ (مکتوباتِ مودودی: بنام عبدالعزیز مظاہری، از اشرف بخاری، ص ۳۳، اشاعت ستمبر ۱۹۹۷ء)

۱۔ ماحول کی درستی

تعزیرات کے باب میں سب سے پہلے اس قاعدہ کلیہ کو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا اور دوسری شرعی حدیں صرف اسی جگہ نافذ کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہیں جہاں مملکت کا نظم و نسق اسلامی اصولوں پر ہو اور تمدن و معاشرت کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر کی گئی ہو جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اسلام کے اصول اور قوانین ناقابلِ تجزیہ ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ بعض اصول اور قوانین تو نافذ کیے جائیں اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مثلاً زنا اور قذف[1] کی حدود کو لیجیے۔ نکاح وطلاق اور حجابِ شرعی کے اسلامی قوانین اور اخلاقِ صنفی کے متعلق اسلام کی تعلیمات سے ان حدود کا نہایت گہرا ربط ہے جسے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے زانی اور قاذف کے لیے ایسی سخت سزائیں مقرر ہی اُس سوسائٹی کے لیے فرمائی ہیں جس میں عورتیں بن سنور کر بے محابانہ پھرتی ہوں، جس میں برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں اور عشق ومحبت کے افسانے اور شہوانی جذبات کو دائماً متحرک کرنے والے تماشے رائج نہ ہوں، جس میں نکاح کے لیے پوری آسانیاں ہوں اور فسخ وتفریق اور طلاق وخلع کے اسلامی احکام ٹھیک ٹھیک نافذ کیے جاتے ہوں۔ ایسی سوسائٹی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اس امر کی مقتضی ہوتی ہے کہ اس میں معاشرت کا جو معتدل نظام قائم کیا گیا ہے اس کی حفاظت کے لیے سخت سزائیں مقرر کی جائیں اور اتنی سخت سزائیں اس حالت میں ہرگز نامنصفانہ نہیں ہیں جب کہ جائز ذرائع سے صنفی خواہشات کی تسکین آسان کر دی گئی ہو اور معاشرت کے ماحول کو بدکاری کی سہولتوں اور غیر معمولی اسبابِ تحریک سے پاک کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں صنفی جرائم کا ارتکاب صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غایت درجہ کے بدطینت ہوں اور جن کے شر سے خلق اللہ کو محفوظ رکھنے کے لیے نہایت عبرتناک سزاؤں کے بغیر چارہ نہ ہو۔

لیکن جہاں حالات اس سے مختلف ہوں، جہاں عورتوں اور مردوں کی سوسائٹی مخلوط رکھی گئی ہو، جہاں مدرسوں میں، دفتروں میں، کلبوں اور تفریح گاہوں میں، خَلوت اور جَلوت میں ہر جگہ جوان مردوں اور بنی ٹھنی عورتوں کو آزادانہ ملنے جلنے اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا ہو، جہاں ہر طرف بے شمار صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور ازدواجی رشتے کے بغیر خواہشات کی تسکین کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بھی موجود ہوں، جہاں معیارِ اخلاق بھی اتنا پست ہو کہ ناجائز تعلقات کو کچھ بہت معیوب نہ سمجھا جاتا ہو، ایسی جگہ زنا اور قذف کی شرعی حد جاری کرنا بلاشبہ ظلم ہوگا۔ اس لیے کہ وہاں ایک معمولی قسم (Normal Type) کے معتدل مزاج اور سلیم الفطرت آدمی کا بھی زنا سے بچنا مشکل ہے اور ایسے حالات میں کسی شخص کا ابتلائے گناہ ہونا یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ غیر معمولی قسم (Abnormal Type) کا اخلاقی مجرم ہے۔ رجم اور کوڑوں کی سزا درحقیقت ایسے گندے حالات کے لیے اللہ نے مقرر ہی نہیں کی ہے۔

اسی پر حدِ سرقہ کو بھی قیاس کر لیجیے کہ وہ صرف اس سوسائٹی کے لیے مقرر کی گئی جس میں اسلام کے معاشی تصورات اور اصول اور قوانین پوری طرح نافذ ہوں قطعِ ید اور اسلامی نظمِ معیشت میں ایسا رابطہ ہے جس کو منقطع نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں یہ نظمِ معیشت قائم ہو وہاں قطعِ ید ہی عین انصاف اور عین مقتضائے فطرت ہے۔ اور جہاں یہ نظمِ معیشت نہ ہو وہاں چور کا ہاتھ کاٹنا دوہرا ظلم ہے۔ حقیقت میں ہاتھ کاٹنے کی سزا اُس ظالم سوسائٹی کے لیے مقرر ہی نہیں کی گئی ہے جس میں سود جائز ہو، زکوٰۃ متروک ہو، انصاف قیمتاً فروخت کیا جاتا ہو، ٹیکسوں کی بھرمار سے ضروریاتِ زندگی نہایت گراں ہو گئی ہوں اور تمام ٹیکس چند مخصوص طبقوں

---

[1] قذف سے مراد کسی عورت یا مرد پر زنا کی تہمت لگانا ہے اور قاذف وہ شخص ہے جو ایسی تہمت لگاتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے سامان عیش فراہم کرنے پر صرف ہوتے ہوں۔ ایسی جگہ تو چوری کے لیے ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ قید کی سزا بھی بعض حالات میں ظلم ہوگی۔

عام طور پر اسلامی قانون فوج داری کو سمجھنے میں لوگوں کو جو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے پیش نظر تو رکھتے ہیں سوسائٹی کے اس غلط نظام کو جو اس وقت دنیا کے متمدن ممالک میں قائم ہے، اور پھر چوری، زنا، قذف اور شراب نوشی جیسے "عامۃ الورود" جرائم کا موازنہ قطعِ ید، رجم اور کوڑوں کی سزاؤں سے کر کے رائے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موازنہ میں ان کو اسلام کی سزائیں سخت اور ہولناک ہی نظر آئیں گی۔ کیونکہ نیم شعوری طور پر وہ خود سمجھتے ہیں کہ جو حالات اس نظام حیات نے پیدا کر رکھے ہیں ان میں چوری ایک عام چیز ہونی چاہیے، زنا میں بکثرت مردوں اور عورتوں بلکہ بچوں اور بوڑھوں تک کو مبتلا ہونا ہی چاہیے۔ آئے دن مشتبہ طریقوں سے ملنے والے جوڑوں کے متعلق بری خبریں مشہور ہونی ہی چاہییں، بری صحبتوں میں نوخیز نسلوں کو بُری عادتیں پڑنی ہی چاہییں۔ لہٰذا اُن کا دل یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا ہے کہ اگر ان حالات میں اسلامی قانونِ فوجداری رائج کر دیا جائے تو شاید کوئی پیٹھ بھی کوڑوں سے نہ بچ سکے، ہزار ہا آدمیوں کے ہاتھ روزانہ کٹنے لگیں اور ہر روز سیکڑوں آدمی سنگسار کیے جائیں۔

بلاشبہ ان کا یہ خوف بالکل بجا ہے۔ اس بے ہودہ سوسائٹی کے بے ہودہ نظام کو باقی رکھ کر اسلام کے قوانین میں سے محض اس کے قانونِ فوجداری کو نافذ کر دینا ہمارے نزدیک بھی ویسا ہی ظلم ہوگا جیسا وہ خیال کرتے ہیں۔ مگر جس غلطی کو وہ محسوس نہیں کرتے وہ دراصل یہ ہے کہ انھوں نے سوسائٹی کے اس بے ہودہ نظام کو، جس کی بے ہودگیوں سے وہ مانوس ہو چکے ہیں، ایک فطری حالت سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ یہ فطری حالت نہیں ہے بلکہ شیطنت کے غلبے نے اس غیر فطری حالت کو عالمِ انسانی پر مسلّط کر دیا ہے، اور اس حالت کا باقی رہنا بجائے خود ایک ظلمِ عظیم ہے۔ آپ اسلام کے نظام اجتماعی کو من حیث الکل قبول کر کے اس ظلم کا انسداد کیجیے، پھر آپ پر خود روشن ہو جائے گا کہ زنا اور قذف اور چوری اور شراب نوشی انسان کے عام اور فطری مشاغل نہیں ہیں اور انسانوں کی کثیر تعداد کا ان میں مبتلا ہونا متوقع ہی نہیں ہے۔ جو اجتماعی حالات اسلام پیدا کرتا ہے ان میں صرف غیر معمولی قسم کے چند افراد ہی ان افعال قبیحہ کا ارتکاب کر سکتے ہیں اور ان کے لیے صحیح تدارک رجم اور کوڑے اور قطعِ ید ہی ہو سکتے ہیں۔

۲۔ حکمت و اعتدال

دوسری بات جو اس سلسلے میں پیش نظر رکھنی ضروری ہے وہ اسلام کی شانِ حکمت و اعتدال ہے۔ حدود اور تعزیرات کے باب میں اسلام کے احکام کو وہ شخص سمجھ ہی نہیں سکتا جو اس مذہب کی ان خصوصیات سے واقف نہ ہو۔

یہاں ایک طرف ارتکابِ جرائم کے اسباب و محرکات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مٹایا جاتا ہے تاکہ کوئی بندۂ خدا ایسے حالات میں مبتلا ہی نہ ہونے پائے کہ اُسے اپنی طبعی خواہشات و ضروریات کے لیے مجرمانہ طریقے استعمال کرنے پڑیں۔ اور دوسری طرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جرائم کے لیے ایسی سزائیں مقرر کی جاتی ہیں جو نہ صرف اعادۂ جرم سے اس خاص شخص کو روک دینے والی ہوں، بلکہ دوسرے تمام لوگوں کو بھی، جن میں مجرمانہ میلانات پائے جاتے ہوں، ہیبت زدہ کریں۔

ایک طرف اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ جہاں تک ممکن ہو سزا سے بچائے جائیں۔ چنانچہ ثبوت کے لیے شہادت کا معیار بہت سخت رکھا جاتا ہے۔ اجرائے حد سے پہلے کچھ مدت تحقیقات کے لیے معین کی جاتی ہے کہ شاید اس دوران میں گواہوں کی غلطی کھل جائے، قاضیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ لوگوں کو حتی الامکان سزا سے بچاؤ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ''اپنے امکان بھر حد کو دفع کرو''۔ فَإِنَّ الْإِمَامَ أَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ أَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعُقُوْبَةِ۔ ''امام کا معاف کرنے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کرے''۔[1]

دوسری طرف جب جرم ثابت ہو جائے تو مجرم پر ترس کھانا، یا اس کے حق میں کسی قسم کی سعی سفارش قبول کرنا، یا اس کے مرتبے اور خاندان وغیرہ کا لحاظ کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ قرآن کہتا ہے: وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (النور ۲۴:۲) ''اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے دین کے معاملے میں رحم اور شفقت کے جذبات تمھارے دامن گیر نہ ہونے چاہییں''۔ حدیث میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ بنی مخزوم کے معزز گھرانے کی ایک عورت فاطمہ لوگوں کے زیور اور سامان عاریتاً منگواتی اور پھر مکر جایا کرتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا اور جرم ثابت ہو گیا۔ قریش میں کھلبلی مچ گئی کہ کہیں اس کا بھی ہاتھ نہ کاٹ ڈالا جائے۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سفارش کی جرأت کسے تھی۔ آخر کار یہ مشورہ ہوا کہ اُسامہ سے جو حضور کے آزاد کردہ غلام حضرت زید کے بیٹے تھے، سفارش کرائی جائے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے محبت تھی۔ اُسامہ نے حاضر ہو کر سفارش کی۔ سنتے ہی آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور فرمایا: ''کیا تم حدود اللہ کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟'' اُسامہ سہم گئے اور معافی مانگی۔ اس کے بعد آپؐ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: تم سے پہلے جو قومیں تباہ ہوئی ہیں ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی جرم کرتا تو اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی ادنیٰ درجے کا آدمی جرم کرتا تو اس کو سزا دیتے تھے۔ میں تو اس کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹے بغیر نہ چھوڑتا۔[2]

۳۔ اسلام کی رُوح کا لحاظ

ان دو باتوں کو سمجھ لینے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی خود اسلام کی رُوح سے بھی غافل نہ ہو، کیونکہ وہ تمام اسلامی قوانین کی جان ہے۔ اسلام میں سزا کا تصور خیر خواہانہ ہے نہ کہ بدخواہانہ۔ اسلام کسی کو غصہ اور طیش میں نہیں مارتا۔ دشمنی کا جذبہ

---

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۳۸۲، اشاعت سوم۔

[2] تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۳۸۷ اور ص ۴۰۴، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے کسی قانون میں نہیں پایا جاتا۔ یہاں سزا کے اندر ''تطہیر'' کا داعیہ کارفرما ہے۔ یہاں آدمی کو اس لیے سزا دی جاتی ہے کہ ارتکابِ جرم سے اس کے نفس و روح کو جو نجاست لگ گئی ہے اسے دھوڈالا جائے۔ اسے پاک کر دیا جائے تاکہ وہ آخرت کی سزا سے بچ جائے۔ خود مجرم کے اندر اسلام یہ اعتقاد پیدا کرتا ہے کہ اصلی حاکم خدا ہے جس سے تو اپنے کسی فعل کو نہیں چھپا سکتا۔ اور اصلی عدالت آخرت کی عدالت ہے جس میں بہرحال تجھے پیش ہونا ہی پڑے گا اور وہاں کی سزا بڑی رسوا کن ہوگی۔ اگر تو نے دنیا میں اپنا جرم چھپالیا تو اسی گندگی کو لیے ہوئے تو خدا کی عدالت میں حاضر ہوگا۔ لیکن اگر تو نے یہاں خود اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کر دیا تو یہ سزا تجھے پاک کر دے گی اور تو اس طرح خدا کے ہاں پہنچے گا کہ گویا تو نے یہ جرم کیا ہی نہ تھا۔[1] حدیث میں اس مضمون کو یوں بیان کیا گیا ہے:

إِنَّ مَنْ أَصَابَ مِنْ هٰذِهِ الْمَعَاصِيْ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهِ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْهَا شَيْئًا فَسَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ إِلَى اللّٰهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ.

ان گناہوں میں سے کسی گناہ کی نجاست اگر کسی کو لگ گئی اور دنیا ہی میں اس کی سزا بھی اسے دے دی گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ ہو جائے گی۔ لیکن اگر اللہ کی حکمت سے اس کا گناہ چھپا رہ گیا تو معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے۔ وہ چاہے گا تو معاف کر دے گا ورنہ سزا دے گا۔

اس تعلیم نے حیرت انگیز اخلاقی احساس ہمارے ہی جیسے گوشت پوست سے بنے ہوئے انسانوں میں پیدا کر دیا اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ان مثالوں میں آپ کو اسلامی عدل، اسلامی اخلاق اور اس کے عجیب و غریب انقلابی تصورات کی وہ شان نظر آئے گی کہ آپ شاید حیرت سے سوچنے لگیں گے کہ آدمی اتنا بلند بھی ہو سکتا ہے!

ایک مرتبہ ایک چور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا جس نے ایک شملہ چرایا تھا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ''میں نہیں سمجھتا کہ اس نے چوری کی ہوگی۔'' ملزم نے آگے بڑھ کر عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں نے چوری کی ہے۔'' آپ نے اس کے اقرار کو قبول کر کے حکم دیا کہ جاؤ اس کا ہاتھ کاٹو، پھر میرے پاس حاضر کرو۔ چنانچہ ہاتھ کاٹنے کے بعد اسے دوبارہ حاضرِ خدمت کیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اب اللہ سے توبہ کر'' اس نے کہا: ''میں نے توبہ کی''، آپ نے فرمایا: ''جا، اللہ نے تیری توبہ قبول کر لی۔''[2]

ایک اور موقع پر ایک شخص (عمرو بن سمرہ) نے حاضر ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے فلاں قبیلے کا اونٹ چرالیا ہے۔ آپ مجھے پاک کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیلے میں آدمی بھیج کر حقیقت حال دریافت کرائی۔ معلوم ہوا کہ فی الواقع اونٹ غائب ہے۔ اس پر آپ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ جب سزا اس پر نافذ کی گئی تو اس نے کہا:

---

1. اس مقام پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جو شخص خود اپنے آپ کو سزا کے لیے پیش کرے اس کا یہ فعل خود توبہ اور شرمساری کو مستلزم ہے۔ اسی لیے آدمی سزا پانے کے بعد دنیا اور دین دونوں میں گناہ سے پاک ہو جاتا ہے۔ رہا وہ مجرم جو خود نہ آیا ہو بلکہ پکڑا ہوا آیا ہو، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ تھا کہ سزا نافذ کرنے کے بعد اسے توبہ کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ (تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۳۸۵، اشاعت سوم)

2. تفہیم الاحادیث ج ۵ ص ۳۷۶ اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

’’شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے پاک کردیا‘‘۔ پھر اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ’’تو مجھے دوزخ میں لے جانا چاہتا تھا، اللہ نے مجھے تجھ سے بچالیا۔‘‘[1]

اوپر بنی مخزوم کی جس عورت کا قصہ مذکور ہوا ہے اس کے مقدمے کا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ سنایا تو اس کی قوم نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم فدیہ دینے کو حاضر ہیں آپ اسے چھوڑ دیں۔ مگر آپ نے فرمایا: ’’اس کا ہاتھ کاٹو۔‘‘ انھوں نے عرض کیا ہم پانچ سو دینار اس کے ہاتھ کے بدلے میں دیتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اس کا ہاتھ کاٹو۔‘‘ جب ہاتھ کاٹ ڈالا گیا تو اس عورت نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ خدا کے ہاں بھی میرے بچنے کی کوئی صورت ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ’’ہاں اب تو اپنے گناہ سے اس طرح پاک ہو چکی ہے جیسے آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہو۔‘‘[2]

ماعز اسلمیؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ اس نے مسجد میں حاضر ہو کر عرض کیا: ’’یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے زنا کی ہے، مجھے پاک کر دیجیے۔‘‘ آپؐ نے منہ پھیر کر فرمایا: ’’جا توبہ کر اور خدا سے مغفرت مانگ۔‘‘ وہ پھر سامنے آیا اور وہی بات عرض کی۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر سامنے آ کر اپنی بات دہرائی۔ اس طرح چار مرتبہ وہ اقرار کر چکا تو آپؐ نے پوچھا: ’’تو دیوانہ ہے؟‘‘ اس نے کہا نہیں۔ پھر دریافت فرمایا کہ تو نے شراب پی ہے، اُس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا کیا تو شادی شدہ ہے؟ اُس نے کہا ہاں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ شاید تو نے صرف بوس و کنار کیا ہوگا؟ اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا تو ہم بستر ہوا؟ اس نے کہا ہاں، پوچھا کیا تو نے مباشرت کی؟ جواب دیا ہاں۔ اس طرح مباشرت کے ہم معنی کئی الفاظ بول بول کر آپؐ پوچھتے رہے اور وہ اثبات میں جواب دیتا رہا۔ آخر آپؐ نے پوچھا کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے اس کے ساتھ حرام کے طور پر وہ کام کیا ہے جو شوہر حلال کے طور پر اپنی بیوی سے کرتا ہے۔ آپؐ نے پوچھا اس بیان سے تیری غرض کیا ہے؟ اس نے عرض کیا پاک ہونا چاہتا ہوں۔ تب آپؐ نے حکم دیا کہ جاؤ اس کو رجم کر دو۔ اس واقعے کے دو تین دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا: ’’دعا مانگو ماعز ابن مالک کے لیے۔ اس نے توبہ کی اور ایسی توبہ کی کہ اگر پوری قوم پر بانٹ دی جائے تو سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو جائے۔‘‘

غامدیہ کا واقعہ بھی حدیث کے مشہور واقعات میں سے ہے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں زنا کی مرتکب ہوئی ہوں، مجھے پاک کر دیجیے۔ آپؐ نے جواب دیا: ’’جا توبہ کر اور اللہ سے مغفرت مانگ۔‘‘ اس نے عرض کیا: ’’آپ مجھے بھی ماعز کی طرح پلٹانا چاہتے ہیں؟‘‘ میں عرض کرتی ہوں کہ مجھے زنا کا حمل ہے‘‘۔ آپ نے فرمایا: ’’جا جب تک بچہ پیدا نہ ہو جائے اس وقت تک ٹھہر‘‘۔ زچگی ہوگئی تو وہ پھر حاضر ہوئی اور کہا کہ بچہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: ’’اس کو دودھ پلا، رضاعت ختم ہونے کے بعد دیکھا جائے گا۔‘‘ جب رضاعت کا زمانہ ختم ہو گیا تو وہ پھر بچے کو لیے ہوئے آئی اور عرض کیا کہ میں اس سے بھی فارغ ہو چکی ہوں۔ تب آپ نے بچے کو ایک مسلمان کے حوالے کیا کہ اس

---

[1] تفہیم الاحادیث ج ۵ ص ۳۷۶ اشاعت سوم

[2] تفہیم الاحادیث ج ۵ ص ۴۰۰ اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی پرورش کرے اور اس عورت پر رجم کی حد جاری کردی۔ اس واقعے کے بعد کہیں خالد بن ولید کی زبان سے اس عورت کے حق میں برے الفاظ نکل گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: ''خبردار اے خالد! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرے تو بخشا جائے''۔ پھر آپ نے خود اس کی میت پر جنازے کی نماز پڑھائی۔ (دونوں احادیث تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۴۶۶ تا ۴۶۸، اشاعت سوم میں ملاحظہ فرمائیں)

جنگِ قادسیہ کے موقع پر ابومحجن ثقفی شراب نوشی کے جرم میں محبوس تھے۔ جب ہنگامۂ جنگ برپا ہوا تو ابومحجن قید خانے میں تڑپنے لگے اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (اسلامی فوج کے جنرل) کی بیوی سے انھوں نے درخواست کی کہ مجھے معرکہ میں شریک ہونے کے لیے چھوڑ دو۔ اگر میں جنگ میں مارا گیا تو سزا کی حاجت ہی نہ رہے گی اور اگر زندہ رہا تو خود آ کر بیڑیاں پہن لوں گا۔ ایک مسلمان خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو، اس کا وعدہ اتنا وزن رکھتا ہے کہ حضرت سعدؓ کی بیگم صاحبہ کو اس پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نظر نہ آئی، چنانچہ انھوں نے ابومحجن کو نہ صرف رہا کر دیا بلکہ سواری کے لیے حضرت سعدؓ کی بہترین گھوڑی بھی دی۔ جنگ میں اس شخص نے جس کی پیٹھ پر ۸۰ کوڑے لگنے کی سزا تجویز کی گئی تھی، اسلام اور حکومتِ اسلامی کے لیے وہ جانفشانی دکھائی کہ خود حضرت سعدؓ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اور جب معرکہ ختم ہوا تو اس اللہ کے بندے نے اپنے وعدے کے مطابق خود آ کر بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعدؓ نے ان کی اس مجاہدانہ سرفرشی کے صلے میں ان کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ جو شخص خدا کی راہ میں ایسی جاں نثاری دکھاتا ہے میں اس کی پیٹھ پر کوڑے نہیں برساؤں گا۔ ابومحجن نے جواب دیا کہ میں بھی اب شراب نہ پیوں گا۔ کیونکہ اب تک تو یہ توقع تھی کہ تم حد جاری کر کے مجھے پاک کر دو گے مگر تم نے اس توقع کا خاتمہ کر دیا۔

یہ واقعات کسی تبصرے کے محتاج نہیں۔ ان سے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے کہ اسلام میں سزا کا تصور کیا ہے اور اسلام کس طرح جرائم کا سدِباب کرنے کے ساتھ ساتھ مجرموں کے اندر بلند ترین اخلاقی احساسات پیدا کرتا ہے، اور کس طرح اسلام میں مجرموں کو سزا دینے کے بعد ازسرِ نو سوسائٹی کے ایک معزز رکن کی حیثیت دے دی جاتی ہے۔ جو لوگ اس قانون کو وحشیانہ قانون کہتے ہیں وہ خود وحشی ہیں۔ تہذیبِ نفس اور انسانیتِ فاضلہ کے جس بلند مرتبے پر اس قانون نے بنی آدم کو پہنچا دیا اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہاں ملتی ہے؟

۴۔ وقت اور ملزم کے حالات کا لحاظ

اقامتِ حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے۔ زمانۂ جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے قحط کے زمانے میں بھی چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا۔ ملزم کے حالات سے اگر ثابت ہو کہ حقیقت میں وہ چوری پر مجبور ہو گیا تھا تب بھی اس کے ساتھ رعایت کی جاتی ہے۔ مثلاً حاطب ابن ابی بلتعہ کے غلاموں کا قصہ آثار میں منقول ہوا ہے کہ انھوں نے قبیلہ مُزَینہ کے ایک شخص کا اونٹ چرا لیا تھا۔ مُزَنی نے آ کر حضرت عمرؓ سے شکایت کی۔ آپ نے مقدمہ کی تحقیقات کے بعد حکم دے دیا کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ پھر دفعتاً آپ کو ان غلاموں کے حالات کی طرف توجہ ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ تم نے ان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غریبوں سے کام لیا مگر ان کو بھوکا مار دیا اور اس حال کو پہنچایا کہ اگر ان میں سے کوئی شخص حرام چیز کھالے تو اس کے لیے وہ جائز ہو۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؓ نے ان غلاموں کو چھوڑ دیا اور ان کے مالک حضرت حاطب سے اونٹ والے کو تاوان دلوایا۔ اس قسم کی اور متعدد مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قانون اندھا قانون نہیں ہے بلکہ وہ فرق کرتا ہے اس شخص میں جو حقیقتاً ارتکاب جرم پر مجبور ہو گیا ہو، اور اس شخص میں جس نے حقیقی مجبوری کے بغیر جرم کیا ہو۔ اسی بنا پر غیر شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانی کی سزا میں فرق کیا گیا ہے اور اسی بنا پر قحط کے مارے ہوئے شخص اور کھاتے پیتے شخص کی چوری کو ایک مرتبے پر نہیں رکھا گیا۔ (تفہیمات: ج دوم، ص ۳۳۷ تا ۳۴۷، مارچ ۱۹۸۷ء)

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: [تفہیمات حصہ دوم، ص ۳۴۶ میں آپ نے لکھا ہے کہ:] اقامت حدود میں وقت کے حالات اور ملزم کے حالات کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔ زمانۂ جنگ میں حد موقوف رکھی جاتی ہے۔ قحط کے زمانے میں چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاتے۔ مہربانی فرما کر اس مسئلہ کو کتاب و سنت کی روشنی میں مدلل بیان فرما دیں۔ حضرت سعدؓ کا واقعہ حدود اللہ کو توڑنے، چھوڑنے کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔ انھوں نے کتاب و سنت سے کوئی مستحکم دلیل بیان نہیں کی۔[1] اسی طرح حضرت عمرؓ کا حضرت حاطبؓ کے غلاموں کو چھوڑ دینا اور حاطب سے عوض دلوانا بھی نوعیت جرم کی بدلی ہوئی کیفیت پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ مجرموں کو چھوڑ کر غیر مجرم انسان سے عوض دلوانا کیا معنی؟ یقیناً حضرت عمرؓ کے ذہن میں جرم کی نوعیت کچھ سرقہ کی سی نہ ہوگی بلکہ غصب کی سی ہوگی جس کی ضمان ان کے مولیٰ سے لی گئی۔ مہربانی فرما کر اس مسئلے میں کتاب و سنت کے مستحکم دلائل بیان فرما کر ممنون کریں۔

جواب: اس بحث کو اگر آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی کتاب اعلام الموقعین میں فصل فی تغیر الفتویٰ و اختلافھا بحسب تغیر الازمنۃ والامکنۃ والاحوال والنیات والعوائد کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں انھوں نے احادیث و آثار سے بکثرت مثالیں اس امر کے ثبوت میں جمع کی ہیں کہ واقعات و حوادث پر اسلامی احکام کو آنکھیں بند کر کے چسپاں نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کے لیے زمانے اور مقام اور اشخاص متعلقہ کے انفرادی حالات اور دوسری بہت سی چیزوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ آپ نے میری پیش کردہ جن مثالوں پر گرفت فرمائی ہے ان سب پر اور ان کے علاوہ متعدد دوسری مثالوں پر بھی علامہ موصوف نے مفصل بحث کی ہے۔ (رسائل و مسائل: حصہ سوم، ص ۸۸، جون ۱۹۶۷ء)

اس کا خلاصہ

[اس مضمون پر ایک اور صاحب نے اعتراض کیا کہ آپ نے اپنی کتاب تفہیمات میں سرقہ کے جرم پر ہاتھ کاٹنے کی سزا

---

[1] عجیب بات ہے کہ جو لوگ صحابہ پر تنقید کرنے کو ناجائز سمجھتے ہیں وہ خود بے تکلف ان پر تنقید کرتے ہیں۔ کتاب و سنت کی دلیل کے بغیر حدود اللہ کے توڑنے چھوڑنے کا یہ الزام جو حضرت سعدؓ پر لگایا گیا ہے، تنقید کی حد سے گزر کر طعن کی حد کو پہنچ جاتا ہے۔ (مولف)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کوظلم قرار دیا ہے۔مولانا نے اس کا درج ذیل جواب دیا] [یہ] سارا مضمون ان لوگوں کے شبہات کی تردید میں لکھا گیا ہے جو موجودہ تہذیب سے متاثر ہو کر حدود شرعیہ کو ظالمانہ اور وحشیانہ سزائیں قرار دیتے ہیں۔اس سلسلے میں اپنے دلائل دیتے ہوئے میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی قانون فوجداری کی دفعات اس مملکت کے لیے ہیں جس میں پورا اسلامی نظام زندگی قائم ہو نہ کہ اس مملکت کے لیے جس میں سارا نظام کفر کے طریقوں پر چل رہا ہو اور صرف ایک چوری یا زنا کی سزا اسلام کے قانون سے لے لی جائے۔چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا عین انصاف ہے اگر ملک کا معاشی نظام بھی اس کے ساتھ اسلامی احکام کے مطابق ہو،اور یہ قطعی ظلم ہے اگر ملک میں اسلام کے منشا کے خلاف سود حلال اور زکوٰۃ متروک ہو اور حاجت مند انسان کی دست گیری کا کوئی انتظام نہ ہو۔اس ساری گفتگو میں سے اگر کوئی شخص صرف اتنی سی بات نکال لے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کو یہ شخص ظلم کہتا ہے تو آپ خود ہی سوچیے کہ اس کی سخن فہمی کا ماتم کیا جائے یا دیانت کا۔(رسائل ومسائل: چہارم،ص ۱۸، ۱۹، اپریل ۱۹۸۱ء)

اقامتِ حدود میں مصلحت کا لحاظ

اسلام میں اقامت حدود کے لیے جیسے سخت تاکیدی احکام ہیں ان سے کون صاحبِ علم ناواقف ہے۔لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے موقع پر چوروں کے ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا۔(ابوداؤد) اور حضرت عمرؓ نے فرمان جاری کیا کہ جب کوئی فوج دشمن کے علاقے میں جنگ کر رہی ہو اس وقت وہاں کسی مسلمان پر حد جاری نہ کی جائے،کیونکہ اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں کسی شخص پر حمیت جاہلیہ کا غلبہ نہ ہو جائے اور وہ دشمن سے نہ جا ملے۔(اعلام الموقعین ۳: ۲۹، ۳۳)

یہ معاملہ حالت جنگ تک ہی محدود نہیں ہے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعہ افک میں تین مخلص مومنوں پر حدِ قذف جاری فرمائی مگر عبداللہ بن اُبی رئیس المنافقین کو چھوڑ دیا۔ابنِ قیّم اس کی وجوہ بیان کرتے ہوئے ایک وجہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر حد جاری کرنے سے اجتناب ایک ایسی مصلحت کی بنا پر کیا جو اقامتِ حد کی بہ نسبت زیادہ اہم تھی،اور یہ وہی مصلحت تھی جس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے پہلے بھی اس کا نفاق کھل جانے اور اس کی بہت سی موجبِ قتل باتیں سننے کے باوجود اس کو سزا دینے سے اجتناب فرماتے رہے تھے۔وہ مصلحت یہ تھی کہ یہ شخص اپنے قبیلے میں بااثر تھا،اس کی بات ان میں چلتی تھی۔اندیشہ تھا کہ اس پر حد جاری کی گئی تو فتنہ برپا ہو جائے گا۔اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے قبیلے کی تالیف قلب کرنا پسند فرمایا اور یہ مناسب نہ سمجھا کہ اس پر حد جاری کر کے ان لوگوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیا جائے۔(زادالمعاد ۳: ۱۴۱)

(تفہیمات: سوم،ص ۸۲-۸۳،مئی ۱۹۸۰ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

قصاص و دیت

کتاب اللہ کی رُو سے انسانی جان کا احترام

[انسانی جان اللہ تعالیٰ کے ہاں انتہائی محترم ہے۔ اس بنا پر زمین میں جو پہلا انسانی قتل ہوا اس کی اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح مذمت کی] ○

فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ○ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (المائدۃ ۵: ۳۰ تا ۳۲) آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا تا کہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا افسوس مجھ پر! میں اس کوے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل پر یہ فرمان لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی جان بچائی اس نے گویا تمام انسانوں کو زندگی بخش دی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک کوے کے ذریعے سے آدمؑ کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر متنبہ کیا اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجہ کرنے کا موقع مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوے سے پیچھے کیوں رہ گیا، بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ بعد کا فقرہ وہ اپنے کیے پر پچھتایا، اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے۔

چونکہ بنی اسرائیل کے اندر انھی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدمؑ کے اس ظالم بیٹے نے کیا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھے تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائبل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پائی جاتی ہے وہ فرمان خداوندی کے ان قیمتی الفاظ سے خالی ہے۔ البتہ تلمود میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: ''جس نے اسرائیل کی ایک جان کو ہلاک کیا، کتاب اللہ کی نگاہ میں اس نے گویا ساری دنیا کو ہلاک کیا اور جس نے اسرائیل کی ایک جان کو محفوظ رکھا، کتاب اللہ کے نزدیک اس نے گویا ساری دنیا کی حفاظت کی۔'' اسی طرح تلمود میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ قتل کے مقدمات میں بنی اسرائیل کے قاضی گواہوں کو خطاب کر کے کہا کرتے تھے کہ جو شخص ایک انسان کی جان ہلاک کرتا ہے وہ ایسی باز پرس کا مستحق ہے کہ گویا اس نے دنیا بھر کے انسانوں کو قتل کیا ہے۔''

دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر ہے اس پر کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام سے اور ہمدردیِ نوع کے جذبے سے خالی ہے، لہٰذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے، کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جائے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جائے۔ اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے، کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے۔

(تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۴۶۳-۴۶۴، المائدۃ حاشیہ ۵۱، ۵۳ اور ۵۴)

قتل بالحق کی قانونی صورتیں

[سورۃ الانعام میں بالفاظ صریح اس کی ممانعت کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:]

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ (الانعام ۶:۱۵۱)۔ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

[دوسری جگہ بھی انھی الفاظ میں اسے ممنوع ٹھہرایا گیا ہے:]

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)۔ قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔

قتلِ نفس سے مراد صرف دوسرے انسان کا قتل ہی نہیں ہے، بلکہ خود اپنے آپ کو قتل کرنا بھی ہے۔ اس لیے کہ نفس، جس کو اللہ تعالیٰ نے ذی حرمت ٹھہرایا ہے، اس کی تعریف میں دوسرے نفوس کی طرح انسان کا اپنا نفس بھی داخل ہے۔ لہٰذا جتنا بڑا جرم اور گناہ قتلِ انسان ہے، اتنا ہی بڑا جرم اور گناہ خودکشی بھی ہے۔ آدمی کی بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی جان کا مالک، اور اپنی اس ملکیت کو باختیار خود تلف کر دینے کا مجاز سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ جان اللہ کی ملکیت ہے اور ہم اس کے اتلاف تو درکنار، اس کے کسی بے جا استعمال کے بھی مجاز نہیں ہیں۔ دنیا کی اس امتحان گاہ میں اللہ تعالیٰ جس طرح بھی ہمارا امتحان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لے، اسی طرح ہمیں آخر وقت تک امتحان دیتے رہنا چاہیے، خواہ حالاتِ امتحان اچھے ہوں یا بُرے۔ اللہ کے دیے ہوئے وقت کو قصداً ختم کر کے امتحان گاہ سے بھاگ نکلنے کی کوشش بجائے خود غلط ہے، کجا کہ یہ فرار بھی ایک ایسے جرم عظیم کے ذریعے سے کیا جائے جسے اللہ نے صریح الفاظ میں حرام قرار دیا ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آدمی دنیا کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور ذلتوں اور رسوائیوں سے بچ کر عظیم تر اور ابدی تکلیف و رسوائی کی طرف بھاگتا ہے۔

قتل بالحق کی قانونی صورتیں

اسلامی قانون نے قتل بالحق کو صرف پانچ صورتوں میں محدود کر دیا ہے۔ ایک قتلِ عمد کے مجرم سے قصاص۔ دوسرے دین حق کے راستے میں مزاحمت کرنے والوں سے جنگ۔ تیسرے اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرنے والوں کو سزا۔ چوتھے شادی شدہ مرد یا عورت کو ارتکاب زنا کی سزا۔ پانچویں ارتداد کی سزا۔ صرف یہی پانچ صورتیں ہیں جن میں انسانی جان کی حرمت مرتفع ہو جاتی ہے اور اسے قتل کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ (تفہیم القرآن: ج ۲، ص ۶۱۴، بنی اسرائیل، حاشیہ ۳۳، ۳۴)

یعنی انسانی جان جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھہرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب رہا یہ سوال کہ "حق کے ساتھ" کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور دو صورتیں اس پر زائد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی بیان کردہ صورتیں یہ ہیں:

۱۔ انسان کسی دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق قائم ہو گیا ہو۔

۲۔ دینِ حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو۔

۳۔ دارالاسلام کی حدود میں بدامنی پھیلائے یا اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرے۔

باقی دو صورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں وہ یہ ہیں:

۴۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

۵۔ ارتداد اور خروجِ جماعت کا مرتکب ہو۔

ان پانچوں صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے، خواہ وہ مومن ہو، ذمی یا عام کافر۔

(تفہیم القرآن: اول، ص ۵۹۹، ۶۰۰، الانعام حاشیہ ۱۳۱)

قتل عمد اور اس کی سزا

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ (النساء ۴: ۹۳)۔ رہا وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ نے اس کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔

قتل خطا اور اس کے احکام

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○ (النساء ۴: ۹۲)۔ کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الّا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے، الّا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمھاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔ اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمھارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے۔

قتل خطا کی تعریف

اسلامی قانون میں قتل کی چار قسمیں ہیں۔ عمد، خطا، شبہ عمد، اور وہ جو ان تینوں میں سے کسی کی تعریف میں نہ آتا ہو۔ قتل خطا کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کسی قاتلانہ ہتھیار کو کسی دوسری چیز پر چلائے مگر غلطی سے وہ لگ جائے کسی انسان کو جسے وہ مارنا نہ چاہتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فعل چوتھی قسم ہی میں آتا ہے جس میں سرے سے کسی کو ضرر پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، نہ کوئی ضرر رساں چیز جانتے بوجھتے استعمال کی جاتی ہے، بلکہ بھولے سے یا غفلت سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

اس کا حکم اور خون بہا کی مقدار

فقہائے اسلام نے اس چوتھی قسم کا حکم بھی وہی قرار دیا ہے جو قرآن مجید میں قتل خطا کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی اگر مقتول اسلامی حکومت کا شہری ہو تو قاتل کو کفارہ بھی دینا ہوگا اور خون بہا بھی۔ کفارہ تو خود قرآن میں بتا دیا گیا ہے کہ وہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا یا پے در پے دو مہینے کے روزے رکھنا ہے۔ رہا خوں بہا تو اس کی کوئی مقدار قرآن میں نہیں بتائی گئی۔

احادیثِ رسولؐ میں اس کا ذکر

مگر احادیث سے یہ بات بتواتر ثابت ہے کہ قتلِ خطا کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ خوں بہا مقرر فرما دیا تھا جن کی قیمت اس زمانے میں دس ہزار درہم کے برابر تھی۔ [۱۰ ہزار درہم = ۲۲ سیر اور ساڑھے ۱۲ چھٹانک چاندی]۔ (رسائل و مسائل: دوم، ص ۱۷۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوں بہا کی مقدار سو اونٹ، یا دو سو گائیں یا دو ہزار بکریاں مقرر فرمائی ہے۔ اگر دوسری کسی شکل میں کوئی شخص خوں بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار انھی چیزوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے متعین کی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نقد خوں بہا دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا ۸ ہزار درہم مقرر تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے فرمایا کہ اونٹوں کی قیمت اب چڑھ گئی ہے، لہٰذا اب سونے کے سکے میں ایک ہزار دینار، یا چاندی کے سکے میں ۱۲ ہزار درہم خوں بہا دلایا جائے گا۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۸۲-۳۸۳، النساء، حاشیہ ۱۲۲)

خلاصۂ احکام

اس آیت کے احکام کا خلاصہ یہ ہے:

اگر مقتول دارالاسلام کا باشندہ ہو تو اس کے قاتل کو خوں بہا بھی دینا ہوگا اور خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگنے کے لیے ایک غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔ اگر وہ دارالحرب کا باشندہ ہو تو قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا۔ اس کا خوں بہا کچھ نہیں ہے۔ اگر وہ کسی ایسے دارالکفر کا باشندہ ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہے تو قاتل کو ایک غلام آزاد کرنا ہوگا اور اس کے علاوہ خوں بہا بھی دینا ہوگا۔ لیکن خوں بہا کی مقدار وہی ہوگی جتنی اس معاہد قوم کے کسی غیر مسلم فرد کو قتل کر دینے کی صورت میں از روئے معاہدہ دی جانی چاہیے۔

روزے مسلسل رکھے جائیں، بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذر شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ دے تو از سرِ نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

توبة من الله، یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے، یعنی یہ "جرمانہ" نہیں بلکہ "توبہ" اور "کفارہ" ہے۔ جرمانے میں ندامت و شرمساری اور اصلاحِ نفس کی کوئی روح نہیں ہوتی بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بے زاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر اور ادائے حقوق کے ذریعے اس کا اثر اپنی روح پر سے دھو دے، اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے، تاکہ نہ صرف یہ گناہ معاف ہو بلکہ آیندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادہ سے بھی محفوظ رہے۔ کفارہ کے لغوی معنی ہیں "چھپانے والی چیز" کسی کارِ خیر کو گناہ کا "کفارہ" قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے، جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہو اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔

(تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۸۳-۳۸۴، النساء ۱۲۳ تا ۱۲۵)

اس کی اہمیت

یہ خوں بہا کا معاملہ اس لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن مجید میں اس کا حکم دیا گیا ہے اور صاف ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے قتل خطا کی معافی حاصل کرنے کے لیے کفارے کے ساتھ اس کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

کیا ملکی قانون کی کوئی دوسری سزا اس کا بدل ہو سکتی ہے؟

اب اگر ہمارا ملکی قانون قتل خطا کی کوئی دوسری سزا دے، خواہ وہ قید ہو یا جرمانہ، تو یقیناً وہ اس کفارے اور تاوان کا بدل نہیں ہو سکتی جو آخرت میں ایک مسلمان کو خدا کے حضور بریٔ الذمہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔

خوں بہا کے قاعدے کی وضاحت

اس لیے ہم ذرا وضاحت کے ساتھ خوں بہا کے قاعدے کو یہاں بیان کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کو اس سے ٹھیک ٹھیک واقفیت ہو جائے۔

۱۔ خوں بہا ادا کرنے کی ذمہ داری شریعت نے صرف قاتل پر نہیں ڈالی ہے بلکہ اس کے ''عاقلہ'' کو اس کے ساتھ شریک کیا ہے۔

۲۔ ''عاقلہ'' سے مراد فقہائے حنفیہ کی تحقیق کے مطابق ایک شخص کے اعوان وانصار ہیں۔ اگر وہ شخص کسی سرکاری محکمے کا آدمی ہو تو اس محکمے کے تمام ملازم اس کے عاقلہ ہیں۔ ورنہ بدرجۂ آخر خزانہ سرکار اس کی دیت ادا کرے گا۔

۳۔ ''عاقلہ'' پر قتل خطا کی دیت کا یہ بار اس لیے نہیں ڈالا گیا ہے کہ ایک شخص کے گناہ کی سزا سب کو دی جائے، بلکہ اس لیے ڈالا گیا ہے کہ ایک بھائی پر احیاناً جو بارِ گناہ آ پڑا ہے، اس کی ذمہ داری ادا کرنے میں اس سے قریبی تعلق رکھنے والے سب لوگ اس کا ہاتھ بٹائیں، اور تنہا اس پر اتنا بوجھ نہ پڑ جائے کہ اس کی کمر توڑ دے۔ نیز جس خاندان کو اس کی غلطی کی وجہ سے جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی بھی آسانی سے ہو جائے۔ یہ ایک طرح کا صدقہ یا فی سبیل اللہ چندہ ہے جو ہر شخص کی مدد کے لیے اس کے وسیع حلقۂ احباب سے حاصل کیا جاتا ہے جس سے کوئی مہلک غلطی سرزد ہو جائے۔ ہم اس کو اخلاقی انشورنس سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔

۴۔ ''عاقلہ'' سے پورا خوں بہا بیک وقت وصول نہیں کیا جائے گا بلکہ تین سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے لیا جائے گا۔ اگر عاقلہ کی وسعت کو پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فی کس دو تین آنے ماہوار سے زیادہ چندے کا بار کسی شخص پر نہیں پڑ سکتا۔

۵۔ یہ چندہ صرف مردوں سے لیا جائے گا۔ عاقلہ میں عورتیں شامل نہیں ہیں۔

۶۔ خوں بہا لینے کے حق دار مقتول کے وارث ہوتے ہیں۔ جس قاعدے سے میراث تقسیم ہوتی ہے اسی قاعدے سے یہ رقم بھی وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۷۔ مقتول کے وارث ہی خوں بہا معاف کرنے کے حق دار ہیں اور یہ معافی قرآن کی زبان میں ان کی طرف سے قاتل پر صدقہ ہے۔

ان احکام پر اگر کوئی شخص غور کرے تو وہ بلا تامل یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ یہ طریقہ اخلاقی و تمدنی حیثیت سے موجودہ ملکی قانون کی بہ نسبت زیادہ افضل ہے۔ اس میں ایک طرف ۶۰ روزوں کا کفارہ اس شخص کے دل کو پاک کرتا ہے جس کی غفلت یا غلطی سے ایک جان ضائع ہوئی۔ دوسری طرف یہی کفارہ آس پاس کے سب لوگوں کو چوکنا کر دیتا ہے تا کہ وہ ایسی غلطیوں اور غفلتوں میں مبتلا ہونے سے بچیں۔ اس میں ایک طرف خون بہا ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا کہ اس خاندان کے آنسو پونچھے جائیں جس کا ایک فرد قاتل کی غلطی کا شکار ہوا ہے۔ دوسری طرف اس خوں بہا کا بار عاقلہ پر ڈال کر اس کی ادائیگی کو آسان بنا دیا گیا ہے۔ پھر یہ ادائے دیت کی مشترک ذمہ داری ایک طرف عاقلہ کو چوکنا کرتی ہے کہ وہ اپنے فرد کی نگرانی کریں، تو دوسری طرف یہ ہر ہر فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتی ہے کہ وہ ایک ہمدرد اور شریک رنج و راحت برادری سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ ایسی برادری سے جس میں ’’کسے را با کسے کارے نباشد‘‘۔

(رسائل و مسائل: دوم، ص ۱۷۷ تا ۱۷۹، دسمبر ۱۹۸۷ء، بحوالہ ترجمان القرآن: ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ، ستمبر ۱۹۵۲ء)

اس حکم کے نازل کرنے کی غرض و غایت

(اس آیت میں) ان مسلمانوں کا ذکر ہے جو یا تو دارالاسلام کے باشندے ہوں یا اگر دارالحرب یا دارالکفر میں بھی ہوں تو دشمنانِ اسلام کی کارروائیوں میں ان کی شرکت کا کوئی ثبوت نہ ہو۔ اس وقت بکثرت لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی حقیقی مجبوریوں کی بنا پر دشمن اسلام قبیلوں کے درمیان ٹھہرے ہوئے تھے اور اکثر ایسے اتفاقات پیش آجاتے تھے کہ مسلمان کسی دشمن قبیلے پر حملہ کرتے اور وہاں نادانستگی سے کوئی مسلمان ان کے ہاتھ سے مارا جاتا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں اس صورت کا حکم بیان فرمایا جب کہ غلطی سے کوئی مسلمان کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۸۲، النساء حاشیہ ۱۲۰)

غلط دوا دینے کی صورت میں موت واقع ہو جائے تو؟

سوال: ایک پنساری نے غلطی سے ایک خریدار کو غلط دوا دے دی جس سے خریدار خود بھی ہلاک ہو گیا اور دو معصوم بچے [جن کو خریدار نے وہی دوا بے ضرر سمجھ کر دے دی تھی] بھی ضائع ہوئے۔ یہ غلطی پنساری سے بالکل نادانستہ ہوئی۔ خوں بہا اور خدا کے ہاں معافی کی اب کیا سبیل ہے؟ نیز یہ کہ خوں بہا معاف کرنے کا کون مجاز ہے؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جواب: اسلامی قانون میں قتل کی چار قسمیں ہیں: عمد، خطا، شبہ عمد، اور وہ جو ان تینوں میں سے کسی کی تعریف میں نہ آتا ہو۔ یہ فعل جس کا ارتکاب اس پنساری سے ہوا ہے۔ پہلی تین قسموں میں شمار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ یہ عمد اور شبۂ عمد تو بہر حال نہیں ہے، اور یہ قتل خطا بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ قتلِ خطا کی تعریف یہ ہے کہ آدمی کسی پر قاتلانہ ہتھیار کو کسی دوسری چیز پر چلائے مگر غلطی سے وہ لگ جائے کسی انسان کو جسے وہ مارنا نہ چاہتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ فعل چوتھی قسم ہی میں آتا ہے۔ جس میں سرے سے کسی کو ضرر پہنچانا مقصود ہی نہیں ہوتا۔ نہ کوئی ضرر رساں چیز جانتے بوجھتے استعمال ہی کی جاتی ہے، بلکہ بھولے سے یا غفلت سے موت واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن فقہائے اسلام نے اس چوتھی قسم کا حکم بھی وہی قرار دیا ہے جو قرآن مجید میں قتل خطا کا حکم بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی اگر مقتول اسلامی حکومت کا شہری ہو تو قاتل کو کفارہ بھی دینا ہوگا اور خوں بہا بھی۔ کفارہ تو خود قرآن میں بتادیا گیا ہے کہ وہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا یا پے درپے دو مہینے کے روزے رکھنا۔ رہا خوں بہا تو اس کی کوئی مقدار قرآن میں نہیں بتائی گئی مگر احادیث سے یہ بات بتواتر ثابت ہے کہ قتلِ خطا کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ خوں بہا مقرر فرمادیا تھا جن کی قیمت اس زمانے میں دس ہزار درہم کے برابر تھی۔ [۱۰ ہزار درہم = ۲۲ سیر اور ساڑھے ۱۲ چھٹانک چاندی]۔

(رسائل و مسائل: دوم، ص ۱۷۷ اشاعت دسمبر ۱۹۸۷ء)

کفر کے شبہے میں قتل

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا ضَرَبْتُمْ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَتَبَيَّنُواْ وَلَا تَقُولُواْ لِمَنْ أَلْقَىٰٓ إِلَيْكُمُ ٱلسَّلَٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُونَ عَرَضَ ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا فَعِندَ ٱللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٌ كَذَٰلِكَ كُنتُم مِّن قَبْلُ فَمَنَّ ٱللَّهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوٓاْ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ (النساء ۴: ۹۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمھاری طرف سلام سے تقدیم کرے اسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اگر تم دنیوی فائدہ چاہتے ہو تو اللہ کے پاس تمھارے لیے بہت سے اموالِ غنیمت ہیں۔ آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

ابتدائے اسلام میں ''السلام علیکم'' کا لفظ مسلمانوں کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمھارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمھارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ شعار (Password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوجِ مخالف کے آدمیوں سے ممیز ہوں، اسی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا، خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں اس شعار کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں فرق امتیاز نہ تھا، جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آ جاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے ''السلام علیکم'' یا ''لا الہ الا اللہ'' پکارتا تھا مگر مسلمانوں کو اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھتے اور اس کی چیزیں غنیمت کے طور پر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی۔ مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس کے متعلق تمھیں سرسری طور پر فیصلہ کر دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہوسکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے، تو قتل کر دینے میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمھارے ہاتھ سے مارا جائے اور بہر حال تمھارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے اسلام کو ظلم وستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے، اور تمھارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکر یہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں ان کے ساتھ تم نرمی ورعایت سے کام نہ لو۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۸۴-۳۸۵، النساء، حاشیہ ۱۲۶-۱۲۷)

قصاص اور دیت کے احکام

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ ۲: ۱۷۸-۱۷۹)۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے قتل کے مقدموں میں قصاص کا حکم لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے گا، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے، اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو، تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے، اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ عقل وخرد رکھنے والو تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کروں گے۔

[سورۃ البقرۃ آیت ۱۹۴ میں ارشاد ہے:] اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ۔ ماہِ حرام کا بدلہ ماہِ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا۔

[سورۃ المائدۃ آیت ۴۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:] وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَ الْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ۔ تورات میں ہم نے یہودیوں پر حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔ پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، المائدۃ، آیت ۴۵)

معنی ومفہوم

قصاص، یعنی خون کا بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کیا جائے، جو اس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو، اسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے، بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے وہی اس کے ساتھ کیا جائے۔

قصاص کا جاہلی تصوّر

جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی قیمت کا خون اُس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سیکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہو، تو وہ اصلی قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے یا اُس کے کئی آدمی ان کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول اُن کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر وعزت رکھنے والا شخص ہوتا، تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت ہی میں نہ تھی۔

دورِ جدید کے مہذب لوگوں کا تصور

موجودہ زمانے میں جن قوموں کو انتہائی مہذب سمجھا جاتا ہے، اُن کے باقاعدہ سرکاری اعلانات تک میں بسا اوقات یہ بات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بغیر کسی شرم کے دنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔ اکثر یہ خبریں ہمارے کان سنتے ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے آدمی گولی سے اُڑائے گئے۔ ایک ''مہذب قوم'' نے اسی بیسویں صدی میں اپنے ایک فرد (سرلی اسٹیک) کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔ دوسری طرف ان نام نہاد مہذب قوموں کی باضابطہ عدالتوں کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ اگر قاتل حاکم قوم کا فرد ہو اور مقتول کا تعلق محکوم قوم سے ہو تو ان کے جج قصاص کا فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہی خرابیاں ہیں جن کے سدباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ بدلے میں قاتل اور صرف قاتل ہی کی جان لی جائے۔ قطع نظر اس سے کہ قاتل کون ہے؟ اور مقتول کون۔

اسلامی قانون تعزیرات میں قتل کا معاملہ

''بھائی'' کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سفارش بھی کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اور دوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی، مگر ہے تو وہ تمھارا انسانی بھائی۔ لہٰذا اگر اپنے ایک خطا کار بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصے کو پی جاؤ، تو یہ تمھاری انسانیت کے زیادہ شایان شان ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل کا معاملہ قابل راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف کر دیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ جیسا کہ بعد کی آیت میں ارشاد ہوا، معافی کی صورت میں قاتل کو خوں بہا ادا کرنا ہوگا۔

معروف کیا ہے

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ، معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے۔ معروف کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار ہے، جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ کار ہے رواج عام (Common Law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عرف'' اور ''معروف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے، جن کے بارے میں شریعت نے کوئی خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

خوں بہا وصول کرنے کے بعد زیادتی

فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے، اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔ عقل و خرد رکھنے والو! تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ یہ ایک دوسری جاہلیت کی تردید ہے، جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ جس طرح اہلِ جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا، اسی طرح ایک دوسرا گروہ عفو کے پہلو میں تفریط کی طرف گیا ہے اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دنیا کے متعدد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہل عقل کو مخاطب کر کے تنبیہ کرتا ہے کہ قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے۔ جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو محترم ٹھہراتی ہے، وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

(تفہیم القرآن: ج ا، ص ۱۳۷ تا ۱۴۰، البقرۃ، حواشی ۱۷۶ تا ۱۸۱)

قصاص اور انصاف کے تقاضے

وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (المائدۃ ۵: ۴۵)۔

توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ۔[1] پھر جو قصاص کا صدقہ کر دے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہے۔[2] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

قصاص کس شکل میں لیا جائے گا؟

وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ؕ (الحج ۲۲: ۶۰)

اور جو کوئی بدلہ لے، ویسا ہی جیسا اس کے ساتھ کیا گیا، اور پھر اس پر زیادتی بھی کی گئی ہو، تو اللہ اس کی مدد ضرور کرے گا۔

امام شافعیؒ نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ قصاص اسی شکل میں لیا جائے گا جس شکل میں ظلم کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی شخص نے اگر آدمی کو ڈبو کر مارا ہے تو اسے بھی ڈبو کر مارا جائے گا، اور کسی نے جلا کر مارا ہے تو اسے بھی جلا کر مارا جائے گا۔ لیکن حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ قاتل نے قتل خواہ کسی طریقے سے کیا ہو، اس سے قصاص ایک ہی معروف طریقے پر لیا جائے گا۔

(تفہیم القرآن: ج ۳، ص ۲۴۶، الحج حاشیہ ۱۰۴)

---

1. تقابل کے لیے ملاحظہ ہو توراۃ کی کتاب خروج، باب ۲۱، آیت ۲۳-۲۵۔
2. جو شخص صدقہ کی نیت سے قصاص معاف کر دے اس کے حق میں یہ نیکی اس کے بہت سے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گی۔ اسی معنی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ من جرح فی جسدہ جراحۃ فتصدق بھا کفر عنہ ذنوبہ بمثل ماتصدق بہ یعنی جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا تو جس درجہ کی یہ معافی ہوگی اس کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قصاص اور دیت کے بارے میں چند استفسارات اور ان کے جوابات

سوال: قصاص اور دیت کے بارے میں چند استفسارات تحریر خدمت ہیں۔ ان کے جوابات ارسال فرمائیں۔

الف: مقتول کے ورثا میں سے کوئی ایک وارث دیت لے کر یا بغیر دیت لیے اگر اپنا حق قاتل کو معاف کر دے تو کیا سزائے موت معاف ہو سکتی ہے؟ اس میں اقلیت و اکثریت کا کوئی لحاظ رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ مثلاً تین بیٹوں میں سے ایک نے قصاص معاف کر دیا، باقی دو قصاص لینے پر مصر ہیں تو قاضی کو کیا شکل اختیار کرنی چاہیے؟

ب: اگر مقتول کے ورثا دیت لینے پر آمادہ ہیں لیکن قاتل اپنی غربت کے باعث مطلوبہ دیت کی ادائیگی سے قطعاً معذور ہے، تو کیا قاضی اس کے ورثا کو دیت ادا کرنے پر مجبور کر سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے تو کیا اس سے ورثا کو بے گناہ سزا نہیں مل رہی ہے؟

ج: اگر قاتل کے ورثا ہی نہیں ہیں یا اگر ہیں تو وہ اتنے مفلس ہیں کہ دیت ادا کرنا چاہیں بھی تو نہیں ادا کر سکتے، تو کیا اس صورت میں قاتل کو قصاص یا دیت کے متبادل سزا [از قسم حبس و مشقت وغیرہ] تجویز ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیا صورت اختیار کی جائے گی؟

د: موجودہ قانون میں ہائی کورٹ میں اپیل کے بعد اگر قاتل کو پھانسی کی سزا تجویز ہو جائے تو پھر صدر حکومت یا گورنر جنرل کے سامنے رحم کی اپیل ہوتی ہے جس میں سزا کے تغیر کا امکان رہتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ صورت کس حد تک جائز ہے؟

جواب: مقتول کے ورثا میں سے کوئی ایک بھی اگر قاتل کو اپنا حق معاف کر دے یا دیت لینا قبول کر لے تو قصاص لازماً ساقط ہو جائے گا۔ اور باقی وارثوں کو دیت پر راضی ہونا پڑے گا اس معاملے میں اکثریت و اقلیت کا سوال اٹھانا صحیح نہیں ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس وارث نے عفو یا قبولِ دیت کے ذریعے سے قاتل کو زندہ رہنے کی اجازت دی ہے۔ اس کی اجازت آخر قصاص کی صورت میں کیسے نافذ ہو سکتی ہے؟ مثال کے طور پر اگر تین وارثوں میں سے ایک نے قاتل کو معاف کر دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مقتول کی جان کے ایک تہائی حصے کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اب کیا یہ ممکن ہے کہ باقی دو وارثوں کے مطالبے پر صرف دو تہائی جان لی جا سکے اور ایک تہائی جان کو زندہ رہنے دیا جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں ہے تو لامحالہ باقی دونوں وارثوں کو قبول دیت پر مجبور کرنا پڑے گا۔ یہی رائے ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح کے ایک مقدمے میں ظاہر کی تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر فیصلہ فرمایا۔ چنانچہ مبسوط میں ہے، قال ابن مسعود أرى هذا قد احيا بعض نفسه فليس لِلآخَرَانِ يتلفهُ فامضى عمر القضا على رأيه۔ [ج ۲۶، ۱۵۸] یعنی ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے نزدیک ایک وارث نے جب قاتل کی جان کے ایک حصے کو حقِ حیات بخش دیا تو دوسرے کو اسے تلف کرنے کا حق نہ رہا۔ اسی رائے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فیصلہ فرما دیا۔

---

۱ تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۹۲، اشاعت سوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ب: قاضی یقیناً یہ حق رکھتا ہے کہ قاتل کے اولیا کو دیت ادا کرنے پر مجبور کرے۔ حمل بن مالک والی روایت میں صاف مذکور ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیائے قاتل کو خطاب فرمایا: ''قُوْمُوْا فَدُوْا اٹھو اور دیت ادا کرو۔[1] ''اس حدیث سے یہ بات تو ثابت ہو جاتی ہے کہ دیت ادا کرنے کی ذمہ داری میں قاتل کے ساتھ اس کے اولیا بھی شریک ہیں۔ البتہ اس امر میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ دیت ادا کرنے کے معاملے میں قاتل کے اولیا [یا عاقلہ] کن لوگوں کو قرار دیا جائے گا؟ شافعیہ کے نزدیک عاقلہ سے مراد ورثا یا عصبہ ہیں، اور حنفیہ کے نزدیک وہ تمام لوگ عاقلہ ہیں جو زندگی کے معاملات میں ایک شخص کے پشت پناہ اور سہارا بنتے ہوں، خواہ وہ رشتہ دار ہوں یا ہم پیشہ برادری والے، یا وہ لوگ جو عہد و پیمان کی بنا پر ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں۔ شافعیہ نے جو رائے دی ہے وہ صرف اس معاشرے کے لیے موزوں ہے جس میں قبائلی سسٹم رائج ہو لیکن حنفیہ کی رائے ان معاشروں میں بھی چل سکتی ہے جن میں قبیلے کے بجائے دوسرے نسبی یا معاشی یا تمدنی روابط کی بنا پر لوگ ایک دوسرے کے پشت پناہ بنتے ہوں۔ حنفیہ کی رائے کے مطابق ایک سیاسی پارٹی بھی اپنے فرد کی عاقلہ بن سکتی ہے، کیونکہ اس کے ارکان زندگی کے اہم معاملات میں ایک دوسرے کے حامی و مددگار ہوتے ہیں، اور بڑی حد تک ایک دوسرے کی ذمہ داریوں میں شریک سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب معاشرے کی بنیادیں قبائلی نظام کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہو گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک فوجی کی دیت کا ذمہ دار اس کے پورے لشکر کو ٹھہرایا۔ چنانچہ فتح القدیر میں ہے: فانه لما دوّن الداوين جعل العقل على اهل الديوان و كان ذالك بمحضر من الصحابة رضي الله عنهم من غير نكير منهم (ج ۸، ص ۴۲)۔ ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب عسکری نظام قائم کیا تو دیت کو پورے اہل لشکر پر عائد کیا۔ آپ کا یہ فعل صحابہ کی ایک مجلس میں انجام دیا گیا اور انھوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔''

رہا آپ کا یہ سوال کہ اولیا یا عاقلہ پر دیت عائد کرنا، گناہ گار کی سزا بے گناہوں کو دینے کا ہم معنی تو نہیں ہے؟ تو اس کا جواب آپ خود پا لیتے اگر اس امر پر غور فرماتے کہ ایک شخص اجتماعی زندگی کے اندر رہتے ہوئے قتل جیسے اجتماع کش فعل کا ارتکاب بالعموم اپنے حمائتیوں کے بل بوتے پر کرتا ہے۔ اگر وہ لوگ جن کی حمایت اور پشتیبانی پر وہ بھروسہ رکھتا ہے یہ جان لیں کہ اس کی ایسی حرکات کی ذمہ داری میں بھی وہ شریک ہوں گے تو اسے قابو میں رکھنے کی خود کوشش کریں گے اور اسے چھوٹ نہ دیں گے کہ وہ دوسروں کی جانیں لیتا پھرے۔ کیا عجب ہے کہ دیت کے ذمہ دار اولیا کے لیے ''عاقلہ'' کا لفظ اسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہو۔ عقل کے معنی جانتے ہی ہیں کہ روکنے اور باندھنے کے ہیں۔ شاید ابتداً اسی لفظ کو اختیار کرنے میں یہی مناسبت پیش نظر رہی ہو کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کا کام یہ ہے کہ آدمی کو قابو میں رکھیں اور ایسا بے قابو نہ ہونے دیں کہ وہ قتل و غارت کا ارتکاب کرنے لگے۔

ج: اگر قاتل ایک لاوارث آدمی ہو یا اس کا قریب تر حلقۂ اولیا دیت ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس صورت میں صحیح یہ ہے کہ

---

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۹۰، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کی دیت کا بوجھ وسیع تر حلقۂ اولیا پر ڈالا جائے، حتی کہ بالآخر اس کا بوجھ ریاست کے خزانے پر پڑنا چاہیے کیونکہ ایک شہری کا وسیع تر علاقہ اس کی ریاست ہی ہے۔ اس قول کا مآخذ وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیسِ مملکت ہونے کی حیثیت سے فرمایا ہے: ''مَنْ تَرَکَ کَلًّا فَاِلَیَّ وَ مَنْ تَرَکَ مَالًا فَلِوَرَثَتِہٖ، وَاَنَا وَارِثُ مَنْ لَّاوَارِثَ لَہٗ اَعْقِلُ لَہٗ وَاَرِثُہٗ. [ابوداؤد، کتاب الفرائض] یعنی اگر کوئی شخص بے سہارا اہل وعیال چھوڑے تو ان کی کفالت میرے ذمے ہے اور اگر کوئی مال و دولت چھوڑے تو وہ اس کے ورثا کے لیے ہے، اور میں لاوارث کا وارث ہوں۔ اس کی طرف سے دیت بھی دوں گا اور اس کا ورثہ بھی لوں گا۔

اس حدیث کی رو سے ریاست ہر اس شہری کی وارث ہے جو لاوارث مر گیا ہو اور ہر اس شہری کی عاقلہ ہے جس کی دیت ادا کرنے والا کوئی نہ ہو۔ خود عقل کی رو سے بھی ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ ریاست ملک میں امن کی ذمہ دار ہے، اگر وہ قتل کو روکنے میں ناکام رہی ہے تو مقتول کے وارثوں کے نقصان کی تلافی یا تو اسے قاتل کے وارثوں اور حامیوں سے کرانی چاہیے یا پھر خود کرنی چاہیے۔

دیت ادا نہ کر سکنے کی صورت میں قاتل کو کوئی متبادل سزا دینے کا ثبوت کتاب وسنت میں مجھے کہیں نہیں ملا، نہ اس بارے میں سلف سے کوئی معتبر قول منقول ہوا ہے۔

د: یہ بات اسلامی تصورِ عدل کے خلاف ہے کہ عدالتی فیصلے کے بعد کسی کو سزا معاف کرنے یا بدلنے کا اختیار حاصل ہو۔ عدالت اگر قانون کے مطابق فیصلہ کرنے میں غلطی کرے تو امیر یا صدرِ حکومت کی مدد کے لیے پریوی کونسل کے طرز کی ایک آخری عدالتِ مرافعہ قائم کی جا سکتی ہے، جس کے مشورے سے وہ ان بے انصافیوں کا تدارک کر سکے جو نیچے کی عدالتوں کے فیصلوں میں پائی جاتی ہوں مگر ''مجرد رحم'' کی بنا پر عدالتوں کے فیصلوں میں ردوبدل کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہے۔ یہ ان بادشاہوں کی نقالی ہے جو اپنے اندر کچھ شانِ خدائی رکھنے کے مدعی تھے یا دوسروں پر اس کا مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ (رسائل ومسائل: حصہ دوم، ص ۲۲۰ تا ۲۲۵، اشاعت تیرھویں، بحوالہ ترجمان القرآن، رمضان، شوال ۱۳۷۱ھ، جون، جولائی ۱۹۵۲)

مقتول کے ولی کو مطالبے کا حق

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ مَنْصُوْرًا۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳)

اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبہ کا حق عطا کیا ہے، پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ گزرے، اس کی مدد کی جائے گی۔

اصل الفاظ ہیں: ''اس کے ولی کو ہم نے سلطان عطا کیا ہے''۔ سلطان سے مراد یہاں ''حجت'' ہے جس کی بنا پر وہ قصاص کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس سے اسلامی قانون کا یہ اصول نکلتا ہے کہ قتل کے مقدمے میں اصل مدعی حکومت نہیں بلکہ اولیائے مقتول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہیں، اور وہ قاتل کو معاف کرنے اور قصاص کے بجائے خوں بہا لینے پر راضی ہو سکتے ہیں۔

o......قتل میں حد سے گزرنے کی صورتیں

قتل میں حد سے گزرنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں اور وہ سب ممنوع ہیں۔ مثلاً جوشِ انتقام میں مجرم کے علاوہ دوسروں کو قتل کرنا، یا مجرم کو عذاب دے دے کر مارنا، یا مار دینے کے بعد اس کی لاش پر غصہ نکالنا، یا خوں بہا لینے کے بعد پھر اسے قتل کرنا وغیرہ۔

o......انتقام لینے کا مجاز کون ہے؟

جب اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو طے کر دیا گیا کہ اس کی مدد کرنا اس کے قبیلے یا اس کے حلیفوں کا کام نہیں بلکہ اسلامی حکومت اور اس کے نظامِ عدالت کا کام ہے۔ کوئی شخص یا گروہ بطورِ خود قتل کا انتقام لینے کا مجاز نہیں ہے بلکہ یہ منصب اسلامی حکومت کا ہے کہ حصولِ انصاف کے لیے اس سے مدد مانگی جائے۔ (تفہیم القرآن: ج ۲ص ۶۱۴، بنی اسرائیل، حواشی ۳۵، ۳۶، ۳۷)

دیت کا قرآنی حکم

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ۔
(البقرۃ۲:۱۷۸)

ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ نرمی کرنے کے لیے تیار ہو، تو معروف طریقے کے مطابق خوں بہا کا تصفیہ ہونا چاہیے اور قاتل کو لازم ہے کہ راستی کے ساتھ خوں بہا ادا کرے۔ یہ تمھارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔

''بھائی'' کا لفظ فرما کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سفارش بھی کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے اور دوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی مگر ہے تو وہ تمھارا انسانی بھائی۔ لہٰذا اگر اپنے ایک خطا کار بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصے کو پی جاؤ، تو یہ تمھاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف کر دیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے۔ البتہ معافی کی صورت میں قاتل کو خوں بہا ادا کرنا ہوگا۔

ادائیگی کا صحیح طریقِ کار

فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ۔ معروف کا لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریقِ کار ہے، جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں، جس کے متعلق ہر وہ شخص، جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو، یہ بول اٹھے کہ بے شک حق اور انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریقِ کار ہے۔ رواجِ عام (Common Law) کو بھی اسلامی اصطلاح میں ''عرف'' اور ''معروف'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے، جن کے بارے میں شریعت نے کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خاص قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔

خوں بہا کی وصولی

فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے، اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خوں بہا وصول کر لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے، یا قاتل خوں بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا، اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔

(تفہیم القرآن: ج ا،ص ۱۳۸-۱۳۹، البقرۃ حواشی ۱۸۷، ۱۷۹، ۱۸۰)

غلام آزاد نہ کر سکنے کی صورت میں متبادل......

فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا۔ (النساء ۴: ۹۲)

پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے۔

روزے مسلسل رکھے جائیں، بیچ میں ناغہ نہ ہو۔ اگر کوئی شخص عذر شرعی کے بغیر ایک روزہ بھی بیچ میں چھوڑ دے تو از سر نو روزوں کا سلسلہ شروع کرنا پڑے گا۔

❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

حدِ زنا

زنا کے متعلق ابتدائی حکم

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰى یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ○ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ○ (النساء ۴: ۱۵-۱۶)

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔ اور تم میں سے جو اس فعل کا ارتکاب کریں ان دونوں کو تکلیف دو، پھر اگر وہ توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو انھیں چھوڑ دو کہ اللہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورتوں کے متعلق ہے اور ان کی سزا یہ ارشاد ہوئی ہے کہ انھیں تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ دونوں کو اذیت دی جائے، یعنی مارا پیٹا جائے، سخت سست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ انھیں سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ اہلِ عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے، اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانونِ تعزیرات بنا کر دفعتاً ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ تعزیری قوانین کا خوگر بنانے کے لیے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں، پھر بتدریج زنا، قذف اور سرقہ کی حدیں مقرر کیں، اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں نافذ تھا۔

بعض مفسرین کی غلط فہمی

مفسرِ سُدِّی کو ان دونوں آیتوں کے ظاہری فرق سے یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ پہلی آیت منکوحہ عورتوں کے لیے ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری آیت غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے۔ لیکن یہ ایک کمزور تفسیر ہے جس کی تائید میں کوئی وزنی دلیل نہیں اور اس سے زیادہ کمزور بات وہ ہے جو ابو مسلم اصفہانی نے لکھی ہے کہ پہلی آیت عورت اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں ہے اور دوسری آیت مرد اور عورت کے ناجائز تعلق کے بارے میں۔ تعجب ہے ابو مسلم جیسے ذی علم شخص کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہ گئی کہ قرآن انسانی زندگی کے لیے قانون اور اخلاق کی شاہراہ بناتا ہے اور انھی مسائل سے بحث کرتا ہے جو شاہراہ پر پیش آتے ہیں۔ رہیں گلیاں اور پگڈنڈیاں، تو ان کی طرف توجہ کرنا اور ان پر پیش آنے والے ضمنی مسائل سے بحث کرنا کلامِ شاہانہ کے لیے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ ایسی چیزوں کو اس نے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوت کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد اور مرد کے ناجائز تعلق پر کیا سزا دی جائے تو صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بھی یہ نہ سمجھا کہ سورۂ نساء کی اس آیت میں اس کا حکم موجود ہے۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۳۱ تا ۳۳۳۔ النساء، حاشیہ ۲۶)

ایک سوال اور اس کا جواب

سوال: ایسے ماحول میں جہاں ہر طرف برانگیختگی کے فوج درفوج سامان ہوں پاکبازی کی زندگی گزارنا ممکن نہیں ہے۔ ان حالات میں اپنے آپ سے لڑنا اپنی شخصیت کے لیے ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ اس ذہنی انتشار سے بچنے کے لیے نکاح نہ ہونے کی صورت میں نیچرل طریق پر تسکین خاطر کرنا کس حد تک گناہ ہے اور اس کے لیے متبادل معقول اور قابل عمل راستہ کیا ہے؟ (ملخصاً)

جواب: آپ کا یہ سوال ان اہم مسائل میں سے ہے جن کی بنا پر ہم موجودہ ناپاک ماحول کے خلاف اجتماعی جدوجہد کی ضرورت پر برسوں سے زور دے رہے ہیں۔ بلاشبہ آج کل کے ماحول نے افراد کے لیے پاکباز رہنے کو سخت مشکل بنا دیا ہے لیکن اس کا حل یہ نہیں ہے کہ اس ماحول کی خرابی کو حیلہ بنا کر اپنے لیے اخلاقی بے قیدی کے جواز کی راہ نکالنے لگیں۔ بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ اس ماحول کی ناپاکی کا جتنا زیادہ احساس آپ کے اندر پیدا ہو اسی قدر زیادہ شدت کے ساتھ آپ اسے بدلنے کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ رہیں وہ مشکلات جو اس جدوجہد کے دوران میں ایک نوجوان کو ناپاک ماحول کے اندر پیش آتی ہیں، تو اس کا علاج یہ ہے کہ جن ہیجان خیز چیزوں سے آپ بچ سکتے ہیں ان سے بچیے، مثلاً سینما، فحش تصویریں، مخلوط سوسائٹی، بے پردہ عورتوں کو دانستہ گھورنا، یا ان کی صحبت میں بیٹھنا۔ اس کے بعد جو اضطراری محرکات باقی رہ جاتے ہیں وہ اتنے زیادہ اشتعال انگیز نہیں رہتے کہ آپ ان کی وجہ سے بندشِ تقویٰ کو توڑنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ کے ڈاکٹر دوست اور جن ماہرین نفسیات کا آپ ذکر کر رہے ہیں، دراصل بات سے ناواقف ہیں کہ زنا انسانی تمدن و اخلاق کے لیے کس قدر شدید مفسد و مخرب چیز ہے۔ اگر وہ اس چیز کی برائیوں سے واقف ہوں تو کسی انسان کو یہ مشورہ نہ دیں کہ وہ محض اپنے نفس کی تسکین کے لیے سوسائٹی کے خلاف اتنے سخت جرم کا ارتکاب کر گزرے۔ کیا یہ لوگ کسی شخص کو یہ مشورہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دینے کی جرأت کریں گے کہ جب کسی کے خلاف اس کا جذبہ انتقام ناقابل برداشت ہو جائے تو وہ اسے قتل کر دے؟ اور جب کسی چیز کے حاصل کرنے کی خواہش اسے بہت ستائے تو وہ چوری کر ڈالے؟ اگر ایسے مشورے دینا ناجائز سمجھتے ہیں تو جذبہ شہوت کی تسکین کے لیے وہ زنا کا مشورہ دینے کی جرأت کیسے کرتے ہیں۔ حالانکہ زنا کسی طرح بھی قتل اور چوری سے کم جرم نہیں ہے۔ آپ اس جرم کی شدت کو سمجھنے کے لیے ایک مرتبہ میری کتاب پردہ کے وہ حصے پڑھیے جن میں میں نے زنا کے اجتماعی نقصانات پر بحث کی ہے۔ (رسائل ومسائل: دوم، ص ۳۶۴-۳۶۵، اور ص ۳۶۸ تا ۳۷۰، اشاعت تیرھویں، مارچ ۱۹۸۲ء بحوالہ ترجمان القرآن: ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ۔ جنوری رفروری ۱۹۵۱ء)

زنا: مفہوم، اس کے قانونی، اخلاقی اور تاریخی پہلو اور اس کی سزا

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۔ (النور ۲۴:۲)

زانیہ عورت اور زانی مرد، دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔

اس مسئلے کے بہت سے قانونی، اخلاقی اور تاریخی پہلو تشریح طلب ہیں جن کو اگر تفصیل کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو موجودہ زمانے میں ایک آدمی کے لیے اس کی تشریع الٰہی کا سمجھنا مشکل ہے۔ اس لیے ذیل میں ہم اس کے مختلف پہلوؤں پر سلسلہ وار روشنی ڈالیں گے۔

اخلاقاً قابل اعتراض

۱۔ زنا کا عام مفہوم، جس سے ہر شخص واقف ہے، یہ ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت، بغیر اس کے کہ ان کے درمیان رشتۂ زن وشوہر ہو، باہم مباشرت کا ارتکاب کریں۔ اس فعل کا اخلاقاً برا ہونا، یا مذہباً گناہ ہونا، یا معاشرتی حیثیت سے معیوب اور قابل اعتراض ہونا، ایک ایسی چیز ہے جس پر قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام، انسانی معاشرے متفق رہے ہیں، اور اس میں بجز ان متفرق لوگوں کے جنھوں نے اپنی عقل کو اپنی نفس پرستی کے تابع کر دیا ہے، یا جنھوں نے خبطی پن کی اُپج کو فلسفہ طرازی سمجھ رکھا ہے، کسی نے آج تک اختلاف نہیں کیا ہے۔ اس عالم گیر اتفاق رائے کی وجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت خود زنا کی حرمت کا تقاضا کرتی ہے۔ نوعِ انسانی کا بقا اور انسانی تمدن کا قیام، دونوں اس بات پر منحصر ہیں کہ عورت اور مرد محض لطف اور لذت کے لیے ملنے اور پھر الگ ہو جانے سے آزاد نہ ہوں، بلکہ ہر جوڑے کا باہمی تعلق ایک ایسے مستقل اور پائیدار عہد وفا پر استوار ہو جو معاشرے میں معلوم ومعروف بھی ہو اور جسے معاشرے کی ضمانت بھی حاصل ہو۔ اس کے بغیر انسانی نسل ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتی۔ کیونکہ انسان کا بچہ اپنی زندگی اور اپنے نشوونما کے لیے کئی برسوں کی دردمندانہ نگہداشت اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے، اور تنہا عورت اس بار کو اٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ مرد اس کا ساتھ نہ دے جو اس بچے کے وجود میں آنے کا سبب بنا ہو۔ اسی طرح اس معاہدے کے بغیر انسانی تمدن بھی برقرار نہیں رہ سکتا، کیونکہ تمدن کی تو پیدائش ہی ایک مرد اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک عورت کے مل کر رہنے، ایک گھر اور ایک خاندان وجود میں لانے اور پھر خاندانوں کے درمیان رشتے اور رابطے پیدا ہونے سے ہوئی ہے۔ اگر عورت اور مرد گھر اور خاندان کی تخلیق سے قطع نظر کر کے محض لطف و لذت کے لیے آزادانہ ملنے لگیں تو سارے انسان بکھر کر رہ جائیں، اجتماعی زندگی کی جڑ کٹ جائے اور وہ بنیاد ہی باقی نہ رہے جس پر تہذیب و تمدن کی یہ عمارت اٹھی ہے۔ ان وجوہ سے عورت اور مرد کا ایسا آزادانہ تعلق جو کسی معلوم و معروف اور مسلم عہدِ وفا پر مبنی نہ ہو، انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انھی وجوہ سے انسان اس کو ہر زمانے میں ایک سخت عیب ایک بڑی بداخلاقی، اور مذہبی اصطلاح میں ایک شدید گناہ سمجھتا رہا ہے اور انھی وجوہ سے ہر زمانے میں انسانی معاشروں نے نکاح کی ترویج کے ساتھ ساتھ زنا کے سدباب کی بھی کسی نہ کسی طور پر ضرور کوشش کی ہے۔ البتہ اس کوشش کی شکلوں میں مختلف قوانین اور اخلاقی و تمدنی اور مذہبی نظاموں میں فرق رہا ہے، جس کی بنیاد دراصل اس فرق پر ہے کہ نوعِ اور تمدن کے زنا کے نقصان دہ ہونے کا شعور کہیں کم ہے اور کہیں زیادہ، کہیں واضح ہے اور کہیں دوسرے مسائل سے الجھ کر رہ گیا ہے۔

(۲) قانوناً مستلزم سزا جرم

زنا کی حرمت پر متفق ہونے کے بعد اختلاف جس امر میں ہوا ہے وہ اس کے جرم، یعنی قانوناً مستلزم سزا ہونے کا مسئلہ ہے، اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے اسلام اور دوسرے مذاہب اور قوانین کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔ انسانی فطرت سے قریب جو معاشرے رہے ہیں، انھوں نے ہمیشہ زنا، یعنی عورت اور مرد کے ناجائز تعلق کو بجائے خود ایک جرم سمجھا ہے اور اس کے لیے سخت سزائیں رکھی ہیں۔ لیکن جوں جوں انسانی معاشروں کو تمدن خراب کرتا گیا ہے، رویہ نرم ہوتا چلا گیا ہے۔ اس معاملے میں اولین تساہل، جس کا ارتکاب بالعموم کیا گیا، یہ تھا کہ ''محض زنا (fornication) اور زنا بزنِ غیر (Adultery) میں فرق کر کے، اول الذکر کو ایک معمولی سی غلطی اور صرف مؤخر الذکر کو جرم مستلزم سزا قرار دیا گیا ہے۔

''محض زنا'' کی تعریف

محض زنا کی تعریف جو مختلف قوانین میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی مرد، خواہ وہ کنوارا ہو یا شادی شدہ، کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو کسی دوسرے کی بیوی نہ ہو۔ اس تعریف میں اصل اعتبار مرد کی حالت کا نہیں، بلکہ عورت کی حالت کا کیا گیا ہے۔ عورت اگر بے شوہر ہے تو اس سے مباشرت محض زنا ہے، قطع نظر اس سے کہ مرد بیوی رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ قدیم مصر، بابل، آشور (اسیریا) اور ہندستان کے قوانین میں اس کی سزا بہت ہلکی تھی۔ اس قاعدے کو یونان اور روم نے اختیار کیا، اور اسی سے آخر کار یہودی بھی متاثر ہو گئے۔ بائبل میں یہ صرف ایک ایسا قصور ہے جس سے مرد پر محض مالی تاوان واجب آتا ہے۔ کتاب ''خروج'' میں اس کے متعلق جو حکم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

> اگر کوئی مرد کسی کنواری کو، جس کی نسبت (یعنی منگنی) نہ ہوئی ہو، پھسلا کر اس سے مباشرت کر لے تو وہ ضرور ہی اسے مہر دے کر اس سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بیاہ کرلے،لیکن اگراس کا باپ ہرگز راضی نہ ہو کہ اس لڑکی کو اسے دے،تو وہ کنواریوں کے مہر کے موافق (یعنی جتنا مہر کسی کنواری لڑکی کو دیا جاتا ہو) اسے نقدی دے۔(باب ۲۲،آیت ۱۶-۱۷)

کتاب ''استثناء'' میں یہی حکم ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوا ہے،اور پھر تصریح کی گئی ہے کہ مرد سے لڑکی کے باپ کو پچاس مثقال چاندی (تقریباً ۵۵ روپے) تاوان دلوایا جائے (باب ۲۲۔آیت ۲۸-۲۹) البتہ اگر کوئی شخص کاہن (یعنی پروہت، Priest) کی بیٹی سے زنا کرے تو اس کے لیے یہودی قانون میں پھانسی کی سزا ہے اور لڑکی کے لیے زندہ جلانے کی (Everyman's Talmud P.319-20)۔

یہ تخیل ہندوؤں کے تخیل سے کس قدر مشابہ ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے منو کی دھرم شاستر سے مقابلہ کر کے دیکھیے۔ وہاں لکھا کہ:

جو شخص اپنی ذات کی کنواری لڑکی سے اس کی رضامندی کے ساتھ زنا کرے وہ کسی سزا کا مستحق نہیں ہے۔لڑکی کا باپ راضی ہو تو وہ اس کو معاوضہ دے کر شادی کرلے۔البتہ اگر لڑکی اونچی ذات کی ہو اور مرد نیچی ذات کا تو لڑکی کو گھر سے نکال دینا چاہیے اور مرد کو قطعِ اعضا کی سزا دینی چاہیے۔(ادھیائے ۸، اشلوک ۳۶۵، ۳۶۶) اور یہ سزا زندہ جلا دیے جانے کی سزا میں تبدیل کی جاسکتی ہے جب کہ لڑکی برہمن ہو۔(اشلوک ۳۷۷)

دراصل ان سب قوانین میں زنا بزنِ غیر ہی اصلی اور بڑا جرم تھا یعنی یہ کہ کوئی شخص (خواہ وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ) کسی ایسی عورت سے مباشرت کرے جو دوسرے شخص کی بیوی ہو۔اس فعل کے جرم ہونے کی بنیاد یہ نہ تھی کہ ایک مرد اور عورت نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، بلکہ یہ تھی کہ ان دونوں نے مل کر ایک شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ اسے کسی ایسے بچے کو پالنا پڑے جو اس کا نہیں ہے۔گویا زنا نہیں بلکہ اختلاطِ نسب کا خطرہ اور ایک کے بچے کا دوسرے کے خرچ پر پلنا اور اس کا وارث ہونا اصل بنائے جرم تھا جس کی وجہ سے عورت اور مرد دونوں مجرم قرار پاتے تھے۔مصریوں کے ہاں اس کی سزا یہ تھی کہ مرد کو لاٹھیوں سے خوب پیٹا جائے اور عورت کی ناک کاٹ دی جائے۔قریب قریب ایسی ہی سزائیں بابل، اشور اور قدیم ایران میں بھی رائج تھیں۔ہندوؤں کے ہاں عورت کی سزا یہ تھی کہ اس کو کتوں سے پھڑوا دیا جائے اور مرد کی یہ کہ اسے لوہے کے گرم پلنگ پر لٹا کر چاروں طرف آگ جلادی جائے۔یونان اور روم میں ابتداً ایک مرد کو یہ حق تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ کسی کو زنا کرتے دیکھ لے تو اسے قتل کردے، یا چاہے تو اس سے مالی تاوان وصول کرلے۔پھر پہلی صدی قبل مسیح میں قیصر آگسٹس نے یہ قانون مقرر کیا کہ مرد کی آدھی جائداد ضبط کر کے اسے جلاوطن کر دیا جائے اور عورت کا آدھا مہر ساقط اور اس کی ۱/۳ جائداد ضبط کر کے اسے بھی مملکت کے کسی دور دراز حصے میں بھیج دیا جائے۔قسطنطین نے اس قانون کو بدل کر عورت اور مرد دونوں کے لیے سزائے موت مقرر کی۔لیو (Leo) اور مارسیئن (Marcian) کے دور میں اس سزا کو حبس دوام میں تبدیل کر دیا گیا۔پھر قیصر جسٹینین نے اس میں مزید تخفیف کر کے یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ عورت کو کوڑوں سے پیٹ کر کسی راہب خانے میں ڈال دیا جائے

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

اور اس کے شوہر کو یہ حق دیا جائے کہ چاہے تو دو سال کے اندر اسے نکلوا لے، ورنہ ساری عمر وہیں پڑا رہنے دے۔

یہودی قانون میں زنا بزنِ غیر کے احکام

یہودی قانون میں زنا بزنِ غیر کے متعلق جو احکام پائے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:

''اگر کوئی کسی ایسی عورت سے صحبت کرے جو لونڈی اور کسی شخص کی منگیتر ہو اور نہ تو اس کا فدیہ دیا گیا ہو اور نہ وہ آزاد کی گئی ہو، تو ان دونوں کو سزا ملے، لیکن وہ جان سے نہ مارے جائیں اس لیے کہ عورت آزاد نہ تھی۔'' (احبار: ۱۹-۲۰)

''جو شخص دوسرے کی بیوی سے، یعنی اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے وہ زانی اور زانیہ دونوں ضرور جان سے مار دیے جائیں گے۔'' (احبار: ۲۰-۱۰)

''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتے پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔'' (استثناء: ۲۲-۲۳)

''اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہوگئی ہو (یعنی اس کی منگنی ہوگئی ہو) اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو اس شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا کہ وہ مر جائیں۔ لڑکی کو اس لیے کہ وہ شہر میں ہوتے ہوئے نہ چلائی اور مرد کو اس لیے کہ اس نے اپنے ہمسائے کی بیوی کو بے حرمت کیا۔ پر اگر اس آدمی نے وہی لڑکی جس کی نسبت ہو چکی ہو، کسی میدان یا کھیت میں مل جائے اور وہ آدمی جبراً اس سے صحبت کرے تو فقط وہ آدمی ہی جس نے صحبت کی مار ڈالا جائے پر اس لڑکی سے کچھ نہ کرنا۔'' (استثناء: ۲۳ تا ۲۶)

لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد سے بہت پہلے یہودی علما، فقہا، امرا اور عوام سب اس قانون کو عملاً منسوخ کر چکے تھے۔ یہ اگرچہ بائیبل میں لکھا ہوا تھا اور خدائی حکم اسی کو سمجھا جاتا تھا، مگر اسے عملاً نافذ کرنے کا کوئی روادار نہ تھا، حتیٰ کہ یہودیوں کی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر تک نہ پائی جاتی تھی کہ یہ حکم کبھی نافذ کیا گیا ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دعوتِ حق لے کر اٹھے اور علمائے یہود نے دیکھا کہ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے تو وہ ایک چال کے طور پر ایک زانیہ عورت کو آپ کے پاس پکڑ لائے اور کہا اس کا فیصلہ فرمایئے (یوحنا باب ۸- آیت ۱۔۱۱) اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کنویں یا کھائی، دونوں میں سے کسی ایک میں کودنے پر مجبور کر دیں۔ اگر آپ رجم کا حکم دیں تو ایک طرف قانون سے آپ کو ٹکرایا جائے اور دوسری طرف قوم سے کہا جائے کہ مانو ان پیغمبر صاحب کو، دیکھ لینا، اب توراۃ کی پوری شریعت تمھاری پیٹھوں اور جانوں پر برسے گی۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک ہی فقرے میں ان کی چال کو انھی پر الٹ دیا۔ آپ نے فرمایا تم میں سے جو خود پاک دامن ہو وہ آگے بڑھ کر اسے پتھر مارے۔ یہ سنتے ہی فقیہوں کی ساری بھیڑ چھٹ گئی ایک ایک منہ چھپا کر رخصت ہو گیا اور ''حاملانِ شرعِ متین'' کی اخلاقی حالت بالکل برہنہ ہو کر رہ گئی۔ پھر جب عورت تنہا کھڑی رہ گئی تو آپ نے اسے نصیحت فرمائی اور توبہ کرا کے رخصت کر دیا۔ کیونکہ نہ آپ قاضی تھے کہ اس کے مقدمے کا فیصلہ کرتے، نہ اس پر کوئی شہادت قائم ہوئی تھی، اور نہ کوئی اسلامی حکومت قانونِ الٰہی نافذ کرنے کے لیے موجود تھی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت عیسیٰؑ کے ارشاد کے ساتھ عیسائیوں کا غلط استنباط

حضرت عیسیٰؑ کے اس واقعہ سے اور آپ کے چند اور متفرق اقوال سے جو مختلف مواقع پر آپ نے ارشاد فرمائے، عیسائیوں نے غلط استنباط کر کے زنا کے جرم کا ایک اور تصور قائم کر لیا۔ ان کے ہاں زنا اگر غیر شادی شدہ مرد، غیر شادی شدہ عورت سے کرے تو یہ گناہ تو ہے، مگر جرم مستلزم سزا نہیں ہے اور اگر اس فعل کا کوئی ایک فریق، خواہ وہ عورت ہو یا مرد، شادی شدہ ہو یا دونوں شادی شدہ ہوں، تو یہ جرم ہے، مگر اس کو جرم بنانے والی چیز دراصل ''عہد شکنی'' ہے نہ کہ محض زنا۔ ان کے نزدیک جس نے بھی شادی شدہ ہو کر زنا کا ارتکاب کیا وہ اس لیے مجرم ہے کہ اس نے اس عہدِ وفا کو توڑ دیا جو قربان گاہ کے سامنے اس نے پادری کے توسط سے اپنی بیوی یا اپنے شوہر کے ساتھ باندھا تھا۔ مگر اس جرم کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ زانی مرد کی بیوی، اپنے شوہر کے خلاف بے وفائی کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے اور زانیہ عورت کا شوہر ایک طرف اپنی بیوی پر دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے اور دوسری طرف اس شخص سے بھی تاوان لینے کا حق دار ہو جس نے اس کی بیوی کو خراب کیا۔ بس یہ سزا ہے جو مسیحی قانون شادی شدہ زانیوں اور زانیات کو دیتا ہے، اور غضب یہ ہے کہ سزا بھی دو دھاری تلوار ہے۔ اگر ایک عورت اپنے شوہر کے خلاف ''بے وفائی'' کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری حاصل کر لے تو وہ بے وفا شوہر سے تو نجات حاصل کر لے گی، لیکن مسیحی قانون کی رو سے پھر وہ عمر بھر کوئی دوسرا نکاح نہ کر سکے گی اور ایسا ہی حشر اس مرد کا بھی ہو گا جو بیوی پر ''بے وفائی'' کا دعویٰ کر کے تفریق کی ڈگری لے، کیونکہ مسیحی قانون اس کو بھی نکاحِ ثانی کا حق نہیں دیتا۔ گویا زوجین میں سے جس کو بھی تمام عمر راہب بن کر رہنا ہو وہ اپنے شریک زندگی کی بے وفائی کا شکوہ مسیحی عدالت میں لے جائے۔

موجودہ زمانے کے مغربی قوانین اور مسلمان

موجودہ زمانے کے مغربی قوانین، جن کی پیروی اب خود مسلمانوں کے بھی بیشتر ممالک کر رہے ہیں، انھی مختلف تصورات پر مبنی ہیں۔ ان کے نزدیک زنا، عیب یا بد اخلاقی یا گناہ جو کچھ بھی ہو، جرم بہر حال نہیں ہے۔ اسے اگر کوئی چیز جرم بنا سکتی ہے تو وہ جبر ہے، جبکہ فریقِ ثانی کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے مباشرت کی جائے۔ رہا کسی شادی شدہ مرد کا ارتکاب زنا، تو وہ اگر وجہ شکایت ہے تو اس کی بیوی کے لیے ہے، وہ چاہے تو اس کا ثبوت دے کر طلاق حاصل کر لے اور زنا کی مرتکب اگر شادی شدہ عورت ہے تو اس کے شوہر کو نہ صرف اس کے خلاف بلکہ زانی مرد کے خلاف بھی وجہ شکایت پیدا ہوتی ہے اور دونوں پر دعویٰ کر کے وہ بیوی سے طلاق اور زانی مرد سے تاوان وصول کر سکتا ہے۔

زنا اسلامی قانون کی نظر میں

۳۔ اسلامی قانون ان سب تصورات کے برعکس زنا کو بجائے خود ایک جرم مستلزم سزا قرار دیتا ہے اور شادی شدہ ہو کر زنا کرنا اس کے جرم کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے، نہ اس بنا پر کہ مجرم نے کسی سے ''عہد شکنی'' کی، یا کسی دوسرے کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بستر پر دست درازی کی، بلکہ اس بنا پر کہ اس کے لیے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ایک جائز ذریعہ موجود تھا اور پھر اس نے ناجائز ذریعہ اختیار کیا۔ اسلامی قانون زنا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ وہ فعل ہے جس کی اگر آزادی ہو جائے تو ایک نوع انسانی کی اور دوسری طرف تمدنِ انسانی کی جڑ کٹ جائے۔ نوع کی بقا اور تمدن کے قیام، دونوں کے لیے ناگزیر ہے کہ عورت اور مرد کا تعلق صرف قانون کے مطابق قابل اعتماد رابطے تک محدود ہو اور اسے محدود رکھنا ممکن نہیں ہے اگر اس کے ساتھ ساتھ آزادانہ تعلق کی بھی گنجایش موجود رہے۔ کیونکہ گھر اور خاندان کی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالے بغیر جہاں لوگوں کو خواہشاتِ نفس کی تسکین کے مواقع حاصل رہیں، وہاں ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ انھی خواہشات کی تسکین کے لیے وہ پھر اتنی بھاری ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے پر آمادہ ہوں گے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ریل میں بیٹھنے کے لیے ٹکٹ کی شرط بے معنی ہے اگر بلا ٹکٹ سفر کرنے کی آزادی بھی لوگوں کو حاصل رہے۔ ٹکٹ کی شرط اگر ضروری ہے تو اسے موثر بنانے کے لیے بلا ٹکٹ سفر کو جرم ہونا چاہیے۔ پھر اگر کوئی شخص پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے بے ٹکٹ سفر کرے تو کم درجے کا مجرم ہے، اور مالدار ہوتے ہوئے بھی یہ حرکت کرے تو جرم اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے۔

کیا اسلام انسانی معاشروں کو زنا سے بچانے کے لیے قانونی تعزیر پر انحصار کرتا ہے؟

اسلام انسانی معاشروں کو زنا کے خطرے سے بچانے کے لیے صرف قانونی تعزیر کے ہتھیار پر انحصار نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیے وسیع پیمانے پر اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرتا ہے، اور یہ قانونی تعزیر اس نے محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر تجویز کی ہے۔ اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے رہیں اور شب و روز ان پر کوڑے برسانے کے لیے ٹکٹکیاں لگی رہیں، بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا ارتکاب نہ کریں اور کسی کو اس پر سزا دینے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ وہ سب سے پہلے آدمی کے نفس کی اصلاح کرتا ہے، اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف بٹھاتا ہے، اسے آخرت کی بازپرس کا احساس دلاتا ہے جس سے مر کر بھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوٹ سکتا، اس میں قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے، اور پھر اسے بار بار متنبہ کرتا ہے کہ زنا اور بے عصمتی ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سخت بازپرس کرے گا۔ یہ مضمون سارے قرآن میں جگہ جگہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد وہ آدمی کے لیے نکاح کی تمام ممکن آسانیاں پیدا کرتا ہے۔ ایک بیوی سے تسکین نہ ہو تو چار چار تک اسے جائز تعلق کا موقع دیتا ہے۔ دل نہ ملیں تو مرد کے لیے طلاق اور عورت کے لیے خلع کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے اور ناموافقت کی صورت میں خاندانی پنچایت سے لے کر سرکاری عدالت تک سے رجوع کا راستہ کھول دیتا ہے تاکہ یا تو مصالحت ہو جائے، یا پھر زوجین ایک دوسرے سے آزاد ہو کر جہاں دل ملے نکاح کر لیں۔ یہ سب کچھ آپ سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سورۂ طلاق میں دیکھ سکتے ہیں اور اسی سورۂ [نور] میں آپ ابھی دیکھیں گے کہ مردوں اور عورتوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور صاف حکم دے دیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کے

www.KitaboSunnat.com

نکاح کر دیے جائیں، حتی کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی مجرد نہ چھوڑا جائے۔ پھر وہ معاشرے سے ان اسباب کا خاتمہ کرتا ہے جو زنا کی رغبت دلانے والے، اس کی تحریک کرنے والے، اور اس کے لیے مواقع پیدا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ زنا کی سزا بیان کرنے سے ایک سال پہلے سورۂ احزاب میں عورتوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ گھر سے نکلیں تو چادریں اوڑھ کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلیں، اور مسلمان عورتوں کے لیے جس نبی کا گھر نمونے کا گھر تھا اس کی عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ گھروں میں وقار و سکینت کے ساتھ بیٹھو، اپنے حسن اور بناؤ سنگھار کی نمائش نہ کرو، اور باہر کے مردتم سے کوئی چیز لیں تو پردے کے پیچھے سے لیں۔ یہ نمونہ دیکھتے دیکھتے ان تمام صاحب ایمان عورتوں میں پھیل گیا جن کے نزدیک زمانۂ جاہلیت کی بے حیا عورتیں نہیں بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اور بیٹیاں تقلید کے لائق تھیں۔ اس طرح فوجداری قانون کی سزا مقرر کرنے سے پہلے عورتوں اور مردوں کی خلط ملط معاشرت بند کی گئی۔ بنی سنوری عورتوں کا باہر نکلنا بند کیا گیا، اور ان اسباب و ذرائع کا دروازہ بند کر دیا گیا جو زنا کے مواقع اور اس کی آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ ان سب کے بعد جب زنا کی فوجداری سزا مقرر کی گئی تو آپ دیکھتے کہ اس کے ساتھ ساتھ اسی سورۂ نور میں اشاعت فحش کو بھی روکا جا رہا ہے، قحبہ گری (Prostitution) کی قانونی بندش بھی کی جا رہی ہے، عورتوں اور مردوں پر بدکاری کے بے ثبوت الزام لگانے اور ان کے چرچے کرنے کے لیے بھی سخت سزا تجویز کی جا رہی ہے، غضِ بصر کا حکم دے کر نگاہوں پر پہرے بھی بٹھائے جا رہے ہیں تا کہ وہ دیدہ بازی سے حسن پرستی تک اور حسن پرستی سے عشق بازی تک نوبت نہ پہنچے اور عورتوں کو یہ حکم بھی دیا جا رہا ہے کہ اپنے گھروں میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کے درمیان تمیز کریں اور غیر محرموں کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔ اس سے آپ اس پوری اصلاحی سکیم کو سمجھ سکتے ہیں جس کے ایک جز کے طور پر زنا کی قانونی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ سزا اس لیے ہے کہ تمام داخلی و خارجی تدابیر اصلاح کے باوجود جو شریر النفس لوگ کھلے ہوئے جائز مواقع کو چھوڑ کر ناجائز طریقے سے ہی، اپنی خواہش نفس پوری کرنے پر اصرار کریں ان کی کھال ادھیڑ دی جائے اور ایک بدکار کو سزا دے کر معاشرے کے ان بہت سے لوگوں کا نفسیاتی آپریشن کر دیا جائے جو اس طرح کے میلانات رکھتے ہوں۔ یہ سزا محض ایک مجرم کی عقوبت ہی نہیں ہے بلکہ اس امر کا بالفعل اعلان بھی ہے کہ مسلم معاشرہ بدکاروں کی تفریح گاہ نہیں ہے جس میں ذواقین اور ذواقات اخلاقی قیود سے آزاد ہو کر مزے لوٹتے پھریں۔ اس نقطۂ نظر سے کوئی شخص اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو سمجھے تو وہ بآسانی محسوس کرے گا کہ اس پوری اسکیم کا ایک جز بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ردّ و بدل کا خیال یا تو وہ نادان کر سکتا ہے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت رکھے بغیر مصلح بن بیٹھا ہو، یا پھر وہ مفسد ایسا کر سکتا ہے جس کی اصل نیت اس مقصد کو بدل دینے کی ہو جس کے لیے یہ اسکیم حکیم مطلق نے تجویز کی ہے۔

زنا کو کس سال قانونی جرم قرار دیا گیا

۵۔ زنا کو قابل سزا فعل تو ۳ھ میں ہی قرار دے دیا گیا تھا، لیکن اس وقت یہ ایک "قانونی" جرم نہ تھا جس پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ریاست کی پولیس اور عدالت کوئی کارروائی کرے، بلکہ اس کی حیثیت ایک ''معاشرتی'' یا ''خاندانی'' جرم کی سی تھی جس پر اہل خانہ ہی کو بطورِ خود سزا دینے کا اختیار تھا۔ حکم یہ تھا کہ اگر چار گواہ اس امر کی شہادت دے دیں کہ انھوں نے ایک مرد اور ایک عورت کو زنا کرتے دیکھا ہے تو دونوں کو مارا پیٹا جائے اور عورت کو گھر میں قید کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ اشارہ بھی کر دیا گیا تھا کہ یہ قاعدہ ''تا حکم ثانی'' ہے، اصل قانون بعد میں آنے والا ہے (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۳۳۱) اس کے ڈھائی تین سال بعد یہ حکم نازل ہوا جو آپ اس آیت میں پا رہے ہیں، اور اس نے حکم سابق کو منسوخ کر کے زنا کو ایک قانونی جرم قابل دست اندازیِ سرکار (Cognizable offence) قرار دے دیا۔

اس آیت میں کون سی سزا بیان کی گئی ہے؟

۶۔ اس آیت میں زنا کی جو سزا مقرر کی گئی ہے وہ دراصل ''محض زنا'' کی سزا ہے، زنا بعدِ احصان (یعنی شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کا ارتکاب) کی سزا نہیں ہے جو اسلامی قانون کی نگاہ میں سخت جرم ہے۔ یہ بات خود قرآن ہی کے اشارے سے معلوم ہوتی ہے کہ وہ یہاں اس زنا کی سزا بیان کر رہا ہے جس کے فریقین غیر شادی شدہ ہوں۔ سورۂ نساء میں پہلے ارشاد ہوا کہ:

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ۝ (النساء ۴:۱۵)

تمھاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔

اس کے بعد تھوڑی دور آگے چل کر پھر فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَیْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَی الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ۔ (النساء ۴:۲۵)

اور تم میں سے جو لوگ اتنی مقدرت نہ رکھتے ہوں کہ مومنوں میں سے محصنٰت کے ساتھ نکاح کریں تو وہ تمھاری مومن لونڈیوں سے نکاح کرلیں...... پھر اگر وہ (لونڈیاں) محصنہ ہو جانے کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو محصنٰت کو (ایسے جرم پر) دی جائے۔

ان میں سے پہلی آیت میں توقع دلائی گئی ہے کہ زانیہ عورتیں جن کو سردست قید کرنے کا حکم دیا جارہا ہے، ان کے لیے اللہ تعالیٰ بعد میں کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور کا یہ دوسرا حکم وہی چیز ہے جس کا وعدہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا تھا۔ دوسری آیت میں شادی شدہ لونڈی کے ارتکابِ زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ یہاں ایک ہی سلسلہ بیان میں دو جگہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

محصنات کا لفظ استعمال ہوا ہے اور لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ دونوں جگہ اس کے ایک ہی معنی ہیں۔ اب آغاز کے فقرے کو دیکھیے تو وہاں کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ ''محصنات سے نکاح کرنے کی قدرت نہ رکھتے ہوں''۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد شادی شدہ عورت نہیں ہو سکتی بلکہ ایک آزاد خاندان کی بن بیاہی عورت ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد اختتام کے فقرے میں فرمایا جاتا ہے کہ لونڈی منکوحہ ہونے کے بعد اگر زنا کرے تو اس کو اس سزا سے آدھی سزا دی جائے جو محصنات کو اس جرم پر ملنی چاہیے۔ سیاق عبارت صاف بتاتا ہے کہ اس فقرے میں بھی محصنات کے معنی وہی ہیں جو پہلے فقرے میں تھے، یعنی شادی شدہ عورت نہیں بلکہ آزاد خاندان کی حفاظت میں رہنے والی بن بیاہی عورت۔ اس طرح سورۂ نساء کی یہ دونوں آیتیں مل کر اس امر کی طرف اشارہ کر دیتی ہیں کہ سورۂ نور کا یہ حکم، جس کا وہاں وعدہ کیا گیا تھا، غیر شادی شدہ لوگوں کے ارتکاب زنا کی سزا بیان کرتا ہے۔ مزید توضیح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، النساء، حاشیہ ۴۶)[1]

زنا بعد احصان کی سزا اور اس کا ثبوت

۷۔ یہ امر کہ زنا بعد احصان کی سزا کیا ہے، قرآن مجید نے نہیں بتایا بلکہ اس کا علم ہمیں حدیث سے حاصل ہوتا

---

[1] سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور ان دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے؟ لہٰذا یہ آیت اس بات کی دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں''۔ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰت (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک ''شادی شدہ عورتیں'' جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے ''خاندانی عورتیں'' جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں ''محصنات'' کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنی میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے محصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لیے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی شدہ ہونے کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی مِلک میں وہ تھی، اور نہ اسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں، تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہن رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ بکثرت معتبر روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف قولاً اس کی سزا رجم (سنگساری) بیان فرمائی ہے، بلکہ عملاً آپؐ نے متعدد مقدمات میں یہی سزا نافذ بھی کی ہے۔ پھر آپ کے بعد چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دور میں یہی سزا نافذ کی اور اسی قانون کا بار بار اعلان کیا۔ صحابہ کرام اور تابعین میں یہ مسئلہ بالکل متفق علیہ تھا۔ کسی ایک شخص کا بھی کوئی قول ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ قرن اول میں کسی کو اس کے ایک ثابت شدہ حکمِ شرعی ہونے میں کوئی شک تھا۔ ان کے بعد تمام زمانوں اور ملکوں کے فقہائے اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک سنتِ ثابتہ ہے، کیونکہ اس کی صحت کے اتنے متواتر اور قوی ثبوت موجود ہیں جن کے ہوتے کوئی صاحب علم اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ امت کی پوری تاریخ میں بجز خوارج اور بعض معتزلہ کے کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا ہے، اور ان کے انکار کی بنیاد بھی یہ نہیں تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے ثبوت میں وہ کسی کمزوری کی نشان دہی کرسکے ہوں، بلکہ وہ اسے "قرآن کے خلاف" قرار دیتے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے اپنے فہم قرآن کا قصور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن الزانی والزانیۃ کے مطلق الفاظ استعمال کر کے اس کی سزا سو کوڑے بیان کرتا ہے، لہٰذا قرآن کی رو سے ہر قسم کے زانی اور زانیہ کی سزا یہی ہے اور اس سے زانی مُحصن کو الگ کر کے اس کی کوئی اور سزا تجویز کرنا قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی ہے۔ مگر انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ قرآن کے الفاظ جو قانونی وزن رکھتے ہیں وہی قانونی وزن ان کی اس تشریح کا بھی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہو، بشرطیکہ وہ آپ سے ثابت شدہ ہو۔ قرآن نے ایسے ہی مطلق الفاظ میں السارق والسارقۃ کا حکم بھی قطع ید بیان کیا ہے۔ اس حکم کو اگر ان تشریحات سے مقید نہ کیا جائے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں تو اس کے الفاظ کی عمومیت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ایک سوئی یا ایک بیر کی چوری پر بھی آدمی کو سارق قرار دیں اور پھر پکڑ کر اس کا ہاتھ شانے کے پاس سے کاٹ دیں۔ دوسری طرف لاکھوں روپے کی چوری کرنے والا بھی اگر گرفتار ہوتے ہی کہہ دے کہ میں نے اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہے اور اب میں چوری سے توبہ کرتا ہوں تو آپ کو اسے چھوڑ دینا چاہیے کیونکہ قرآن کہتا ہے: "فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ"۔ (المائدۃ ۵:۳۹) اسی طرح قرآن صرف رضاعی ماں اور رضاعی بہن کی حرمت بیان کرتا ہے، رضاعی بیٹی کی حرمت اس استدلال کی رو سے قرآن کے خلاف ہونی چاہیے۔ قرآن صرف دو بہنوں کے جمع کرنے سے منع کرتا ہے۔ خالہ اور بھانجی اور پھوپھی اور بھتیجی کے جمع کرنے کو جو شخص حرام کہے اس پر قرآن کے خلاف حکم لگانے کا الزام عائد ہونا چاہیے۔ قرآن صرف اس حالت میں سوتیلی بیٹی کو حرام کرتا ہے جب کہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو۔ مطلقاً اس کی حرمت خلافِ قرآن قرار پانی چاہیے۔ قرآن صرف اس وقت رہن کی اجازت دیتا ہے جب کہ آدمی سفر میں ہو اور قرض کی دستاویز لکھنے والا کاتب میسر نہ آئے۔ حضر میں، اور کاتب کے قابل حصول ہونے کی صورت میں رہن کا جواز قرآن کے خلاف ہونا چاہیے۔ قرآن عام لفظوں میں حکم دیتا ہے: وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ "گواہ بناؤ جب کہ آپس میں خرید و فروخت کرو۔" اب وہ تمام خرید و فروخت ناجائز ہونی چاہیے جو رات دن ہماری دکانوں پر گواہی کے بغیر ہو رہی ہے۔ صرف چند مثالیں ہیں جن پر ایک نگاہ ڈال لینے سے ہی ان لوگوں کے استدلال کی غلطی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معلوم ہوجاتی ہے جو رجم کے حکم کو خلاف قرآن کہتے ہیں۔ نظام شریعت میں نبی کا یہ منصب ناقابلِ انکار ہے کہ وہ خدا کا حکم پہنچانے کے بعد ہمیں بتائے کہ اس حکم کا منشا کیا ہے، اس پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے، کن معاملات پر اس کا اطلاق ہوگا، اور کن معاملات کے لیے دوسرا حکم ہے۔ اس منصب کا انکار صرف اصولِ دین ہی کے خلاف نہیں ہے بلکہ اس سے اتنی عملی قباحتیں لازم آتی ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہوسکتا۔

زنا کی قانونی تعریف فقہا کی نظر میں

۸۔ زنا کی قانونی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ اس کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ''ایک مرد کا کسی ایسی عورت سے قُبل میں مباشرت کرنا جو نہ تو اس کے نکاح یا ملکِ یمین میں ہو اور نہ اس امر کے شبہ کی کوئی معقول وجہ ہو کہ اس نے منکوحہ یا مملوکہ سمجھتے ہوئے اس سے مباشرت کی ہے۔'' اس تعریف کی رو سے ''وطی فی الدبر'' عمل قومِ لوط، بہائم سے مجامعت وغیرہ، ماہیت زنا سے خارج ہوجاتے ہیں اور صرف عورت کے قُبل میں مباشرت ہی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جب کہ شرعی حق یا اس کے شبہ کے بغیر یہ فعل کیا گیا ہو۔ بخلاف اس کے شافعیہ اس کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں: ''شرم گاہ کو ایسی شرم گاہ میں داخل کرنا جو شرعاً حرام ہو مگر طبعاً جس کی طرف رغبت کی جاسکتی ہو۔'' اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے: ''شرعی حق یا اس کے شبہ کے بغیر قُبل یا دُبر میں مرد یا عورت سے وطی کرنا۔'' ان دونوں تعریفوں کی رو سے عمل قوم لوط بھی زنا میں شمار ہوجاتا ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں تعریفیں لفظ زنا کی معروف معنوں سے ہٹی ہوئی ہیں۔ قرآن مجید ہمیشہ الفاظ کو ان کے معروف اور عام فہم معنی میں استعمال کرتا ہے، الا یہ کہ وہ کسی لفظ کو اپنی اصطلاحِ خاص بنا رہا ہو، اور اصطلاح خاص بنانے کی صورت میں وہ خود اپنے مفہوم خاص کو ظاہر کردیتا ہے۔ یہاں ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے کہ لفظ زنا کو کسی مخصوص معنی میں استعمال کیا گیا ہو، لہٰذا اسے معروف معنی ہی میں لیا جائے گا، اور وہ عورت سے فطری مگر ناجائز تعلق تک ہی محدود ہے۔ شہوت رانی کی دوسری صورتوں تک وسیع نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں یہ بات معلوم ہے کہ عملِ قوم لوط کی سزا کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ اگر اس فعل کا شمار بھی اسلامی اصطلاح کی رو سے زنا میں ہوتا تو ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

قانوناً فعلِ زنا کے مجرم کو کب مستلزم سزا قرار دیا جائے گا

۹۔ قانوناً ایک فعلِ زنا کو مستلزم قرار دینے کے لیے صرف اِدخال حشفہ کافی ہے۔ پورا اِدخال یا تکمیلِ فعل اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر اِدخال حشفہ نہ ہو تو محض ایک بستر پر یکجا پایا جانا، یا ملاعبت کرتے ہوئے دیکھا جانا، یا برہنہ پایا جانا کسی کو زانی قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے اور اسلامی شریعت اس حد تک بھی نہیں جاتی کہ کوئی جوڑا ایسی حالت میں پایا جائے تو اس کا ڈاکٹری معائنہ کرا کے زنا کا ثبوت بہم پہنچایا جائے اور پھر اس پر حد زنا جاری کی جائے۔ جو لوگ اس طرح کی بے حیائی میں مبتلا پائے جائیں ان پر صرف تعزیر ہے جس کا فیصلہ حالات کے لحاظ سے حاکمِ عدالت خود کرے گا یا جس کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے اسلامی حکومت کی مجلسِ شوریٰ کوئی سزا تجویز کرنے کی مجاز ہوگی۔

تعزیر اور اس کے حدود

یہ تعزیر اگر کوڑوں کی شکل میں ہو تو دس کوڑوں سے زیادہ نہیں لگائے جاسکتے، کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ "لا یجلد فوق عشر جلدات الا فی حد من حدود الله۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے سوا کسی اور جرم میں دس کوڑوں سے زیادہ نہ مارے جائیں۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد)۔[1] اور اگر کوئی شخص پکڑا نہ گیا ہو بلکہ خود نادم ہو کر ایسے کسی قصور کا اعتراف کرے تو اس کے لیے صرف توبہ کی تلقین ہے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ "شہر کے باہر میں ایک عورت سے سب کچھ کر گزرا بجز جماع کے۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو چاہیں مجھے سزا دیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب خدا نے پردہ ڈال دیا تھا تو تو بھی پردہ پڑا رہنے دیتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اور وہ شخص چلا گیا۔ پھر آپ نے اسے واپس بلایا اور یہ آیت پڑھی: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ (ہود ۱۱: ۱۱۴)۔ نماز قائم کر دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر، نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔[2] ایک شخص نے پوچھا: کیا یہ اسی کے لیے خاص ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں سب کے لیے ہے۔" (مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)۔ یہی نہیں بلکہ شریعت اس کو بھی جائز نہیں رکھتی کہ کوئی شخص اگر جرم کی تصریح کے بغیر اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کرے تو کھوج لگا کر اس سے پوچھا جائے کہ تو نے کون سا ایسا جرم کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا: "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حد کا مستحق ہو گیا ہوں، مجھ پر حد جاری فرمائیے"۔ مگر آپؐ نے اس سے نہیں پوچھا کہ تو کس حد کا مستحق ہوا ہے۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر وہ شخص پھر اٹھا اور کہنے لگا کہ میں مجرم ہوں مجھے سزا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا: "کیا تو نے ابھی ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی ہے؟" اس نے عرض کیا: "جی ہاں"۔ فرمایا: "بس تو اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا۔" (بخاری، مسلم، احمد)

مجرم قرار دینے کے لیے شرائط

۱۰۔ کسی شخص (مرد یا عورت) کو مجرم قرار دینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ اس سے فعل زنا صادر ہوا ہے، بلکہ اس کے لیے مجرم میں کچھ شرطیں پائی جانی چاہییں۔ یہ شرطیں زنائے محض کے معاملے میں اور ہیں، اور زنا بعد احصان کے معاملے میں اور۔

زنائے محض کے معاملے میں شرط یہ ہے کہ مجرم عاقل ہو اور بالغ ہو۔ اگر کسی مجنون یا کسی بچے سے یہ فعل سرزد ہو تو وہ حد زنا

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۶۱، اشاعت سوم۔
[2] ایضاً۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا مستحق نہیں ہے۔

اور زنا بعد احصان کے لیے عقل اور بلوغ کے علاوہ چند مزید شرطیں بھی ہیں جن کو ذیل میں بیان کرتے ہیں۔

پہلی شرط: پہلی شرط یہ ہے کہ مجرم آزاد ہو۔ اس شرط پر سب کا اتفاق ہے، کیونکہ قرآن خود اشارہ کرتا ہے کہ غلام کو رجم کی سزا نہیں دی جائے گی۔ ابھی یہ بات گزر چکی ہے کہ لونڈی اگر نکاح کے بعد زنا کی مرتکب ہو تو اسے غیر شادی شدہ آزاد عورت کی بہ نسبت آدھی سزا دینی چاہیے۔ فقہا نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کا یہی قانون غلام پر بھی نافذ ہوگا۔

دوسری شرط: دوسری شرط یہ ہے کہ مجرم باقاعدہ شادی شدہ ہو۔ یہ شرط بھی متفق علیہ ہے، اور اس شرط کی رو سے کوئی ایسا شخص جو مِلک یمین کی بنا پر تمتع کر چکا ہو، یا جس کا نکاح کسی فاسد طریقے سے ہوا ہو، شادی شدہ قرار نہیں دیا جائے گا، یعنی اس سے اگر زنا کا صدور ہو تو رجم نہیں بلکہ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

تیسری شرط: تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا محض نکاح ہی نہ ہوا ہو بلکہ نکاح کے بعد خلوتِ صحیحہ بھی ہو چکی ہو۔ صرف عقدِ نکاح کسی مرد کو مُحصن، یا عورت کو مُحصنہ نہیں بنا دیتا کہ زنا کے ارتکاب کی صورت میں اس کو رجم کر دیا جائے۔ اس شرط پر بھی اکثر فقہا متفق ہیں۔ مگر امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ اس میں اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ ایک مرد یا ایک عورت کو محصن صرف اس صورت میں قرار دیا جائے گا جب کہ نکاح اور خلوت صحیحہ کے وقت زوجین آزاد، بالغ اور عاقل ہوں۔ اس مزید شرط سے جو فرق واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ایک مرد کا نکاح ایسی عورت سے ہوا ہو جو لونڈی ہو، یا نابالغ ہو، یا مجنون ہو، تو خواہ وہ اس حالت میں اپنی بیوی سے لذت اندوز ہو بھی چکا ہو، پھر وہ مرتکب زنا ہونے کی صورت میں رجم کا مستحق نہ ہوگا۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے کہ اگر اس کو اپنے نابالغ یا مجنون یا غلام شوہر سے لذت اندوز ہونے کا موقع مل چکا ہو، پھر بھی وہ مرتکبِ زنا ہونے کی صورت میں رجم کی مستحق نہ ہوگی۔ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک بہت ہی معقول اضافہ ہے جو ان دونوں بالغ النظر بزرگوں نے کیا ہے۔

چوتھی شرط: چوتھی شرط یہ ہے کہ مجرم مسلمان ہو۔ اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام ابویوسف اور امام احمد اس کو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک ذمی بھی اگر زنا بعد احصان کا مرتکب ہوگا تو رجم کیا جائے گا۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور امام مالک اس امر پر متفق ہیں کہ زنا بعد احصان کی سزا رجم صرف مسلمان کے لیے ہے۔ اس کے دلائل میں سے سب سے زیادہ معقول اور وزنی دلیل یہ ہے کہ ایک آدمی کو سنگسار جیسی خوف ناک سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مکمل ''احصان'' کی حالت میں ہو اور پھر بھی زنا کے ارتکاب سے باز نہ آئے۔ احصان کا مطلب ہے ''اخلاقی قلعہ بندی'' اور اس کی تکمیل تین حصاروں سے ہوتی ہے۔ اولین حصار یہ ہے کہ آدمی خدا پر ایمان رکھتا ہو، آخرت کی جواب دہی کا قائل ہو اور شریعت خداوندی کو تسلیم کرتا ہو۔ دوسرا حصار یہ ہے کہ وہ معاشرے کا آزاد فرد ہو، کسی دوسرے کی غلامی میں نہ ہو جس کی پابندیاں اسے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے جائز تدابیر اختیار کرنے میں مانع ہوتی ہیں، اور لاچاری و مجبوری اس سے گناہ کرا سکتی ہے اور کوئی خاندان اپنے اخلاق اور اپنی عزت کی حفاظت میں مدد دینے والا نہیں ہوتا۔ تیسرا حصار ہے کہ اس کا نکاح ہو چکا ہو اور اسے تسکینِ نفس کا جائز ذریعہ حاصل ہو۔ یہ تینوں حصار جب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پائے جاتے ہوں تب "قلعہ بندی" مکمل ہو جاتی ہے اور تب ہی وہ شخص بجا طور پر سنگساری کا مستحق قرار پا سکتا ہے جس نے ناجائز شہوت رانی کی خاطر تین تین حصار توڑ ڈالے۔ لیکن جہاں پہلا اور سب سے بڑا حصار، یعنی خدا اور آخرت اور قانون خداوندی پر ایمان ہی موجود نہ ہو وہاں یقیناً قلعہ بندی مکمل نہیں ہے اور اس بنا پر فجور کا جرم بھی اس شدت کو پہنچا ہوا نہیں ہے جو اسے انتہائی سزا کا مستحق بنا دے۔ اس دلیل کی تائید ابن عمرؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے اسحاق بن رَاھَوَیہ نے اپنی مسند میں اور دارِقطنی نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے کہ مَنْ اَشْرَکَ بِاللّٰہِ فَلَیْسَ بِمُحْصِنٍ "جس نے خدا کے ساتھ شرک کیا وہ محصن نہیں ہے"۔ اگرچہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا ابن عمر نے اس روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل کیا ہے یا یہ ان کا اپنا فتویٰ ہے۔ لیکن اس کمزوری کے باوجود اس کا مضمون اپنے معنی کے لحاظ سے نہایت قوی ہے۔ اس کے جواب میں اگر یہودیوں کے اس مقدمے سے استدلال کیا جائے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم نافذ فرمایا تھا، تو ہم کہیں گے کہ یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس مقدمے کے متعلق تمام معتبر روایات کو جمع کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اسلام کا ملکی قانون (Law of the Land) نہیں بلکہ ان کا اپنا مذہبی قانون (Personal Law) نافذ فرمایا تھا۔ بخاری و مسلم کی متفقہ روایت ہے کہ جب یہ مقدمہ آپ کے پاس لایا گیا تو آپ نے یہودیوں سے پوچھا: "کہ مَاتَجِدُوْنَ فِی التَّوْرَاۃِ فِی شَاْنِ الرَّجْمِ یا مَاتَجِدُوْنَ فِی کِتَابِکُمْ، یعنی تمھاری کتاب تورات میں اس کا کیا حکم ہے؟" پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کے ہاں رجم کا حکم ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "فَاِنِّیْ اَحْکُمُ بِمَا فِی التَّوْرَاۃِ میں وہی فیصلہ کرتا ہوں جو تورات میں ہے۔" اور ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے اس مقدمے کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَوَّلُ مَنْ اَحْیَا اَمْرَکَ اِذْاَمَاتُوْا، خداوندا میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو زندہ کیا جب کہ انھوں نے اسے مردہ کر دیا تھا۔[1]

کیا جبری زنا کا مرتکب مجرم ہے؟

۱۱۔ فعلِ زنا کے مرتکب کو مجرم قرار دینے کے لیے بھی ضروری ہے کہ اس نے اپنی آزادی سے یہ فعل کیا ہو۔ جبر و اکراہ سے اگر کسی شخص کو اس فعل کے ارتکاب پر مجبور کیا گیا ہو تو وہ نہ مجرم ہے نہ سزا کا مستحق۔ اس معاملے پر شریعت کا صرف یہ عام قاعدہ ہی منطبق نہیں ہوتا کہ "آدمی جبراً کرائے ہوئے کاموں کی ذمہ داری سے بری ہے"۔ بلکہ آگے چل کر اسی سورت میں خود قرآن ان عورتوں کی معافی کا اعلان کرتا ہے جن کو زنا پر مجبور کیا گیا ہو۔ نیز متعدد احادیث میں تصریح ہے کہ زنا بالجبر کی صورت میں صرف زانی جابر کو سزا دی گئی اور جس پر جبر کیا گیا تھا اسے چھوڑ دیا گیا۔ ترمذی و ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک عورت اندھیرے میں نماز کے لیے نکلی۔ راستے میں ایک شخص نے اسے گرا لیا اور زبردستی اس کی عصمت دری کر دی۔ اس کے شور مچانے پر لوگ آئے اور زانی پکڑا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو رجم کرا دیا اور عورت کو چھوڑ دیا۔ بخاری کی روایت ہے، کہ حضرت عمرؓ

---

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۷-۴۸، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے زمانہ خلافت میں ایک شخص نے ایک لڑکی سے زنا بالجبر کا ارتکاب کیا۔ آپ نے اسے کوڑے لگوائے اور لڑکی کو چھوڑ دیا۔

ان دلائل کی بنا پر عورت کے معاملے میں تو قانون متفق علیہ ہے۔ لیکن اختلاف اس امر میں ہوا ہے کہ مرد کے معاملے میں جبر و اکراہ معتبر ہے یا نہیں۔ امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام زُفرؒ کہتے ہیں کہ اسے معاف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ انتشارِ عضو کے بغیر اس فعل کا ارتکاب نہیں کرسکتا، اور انتشارِ عضو اس امر کی دلیل ہے کہ اس کی اپنی شہوت اس کی محرک ہوئی تھی۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ اگر حکومت یا اس کے کسی حاکم نے آدمی کو زنا پر مجبور کیا تو سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ جب خود حکومت ہی جرم پر مجبور کرنے والی ہو تو اسے سزا دینے کا حق نہیں رہنا۔ لیکن اگر حکومت کے سوا کسی اور نے مجبور کیا ہو تو زانی کو سزا دی جائے گی، کیونکہ ارتکاب زنا بہرحال وہ اپنی شہوت کے بغیر نہ کرسکتا تھا اور شہوت جبراً پیدا نہیں کی جاسکتی۔ ان تینوں اقوال میں سے پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انتشارِ عضو چاہے شہوت کی دلیل ہو مگر رضا و رغبت کی لازمی دلیل نہیں ہے۔ فرض کیجیے ایک ظالم کسی شریف آدمی کو زبردستی پکڑ کر قید کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ ایک جوان، خوب صورت عورت کو برہنہ کر کے ایک ہی کمرے میں بند رکھتا ہے اور اسے اس وقت تک رہا نہیں کرتا جب تک کہ وہ زنا کا مرتکب نہ ہو جائے۔ اس حالت میں اگر یہ دونوں زنا کے مرتکب ہو جائیں اور ظالم اس کے چار گواہ بنا کر انھیں عدالت میں پیش کر دے تو کیا یہ انصاف ہوگا کہ ان کے حالات کو نظر انداز کر کے انھیں سنگسار کر دیا جائے یا ان پر کوڑے برسائے جائیں؟ اس طرح کے حالات عقلاً یا عادتاً ممکن ہیں جن میں شہوت لاحق ہوسکتی ہے، بغیر اس کے کہ اس میں آدمی کی اپنی رضا و رغبت کا دخل ہو۔ اگر کسی شخص کو قید کر کے شراب کے سوا پینے کو کچھ نہ دیا جائے اور اس حالت میں وہ شراب پی لے تو کیا محض اس دلیل سے اس کو سزا دی جاسکتی ہے کہ حالات تو واقعی اس کے لیے مجبوری کے تھے مگر حلق سے شراب کا گھونٹ وہ اپنے ارادے کے بغیر نہ اتار سکتا تھا؟ جرم کے متحقق ہونے کے لیے محض ارادے کا پایا جانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آزاد ارادہ ضروری ہے۔ جو شخص زبردستی ایسے حالات میں مبتلا کیا گیا ہو کہ وہ جرم کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو جائے وہ بعض صورتوں میں تو قطعی مجرم نہیں ہوتا، اور بعض صورتوں میں اس کا جرم بہت ہلکا ہو جاتا ہے۔

زانی اور زانیہ کو سزا دینے کا مجاز کون ہے؟

۱۲۔ اسلامی قانون حکومت کے سوا کسی کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ زانی اور زانیہ کے خلاف کارروائی کرے، اور عدالت کے سوا کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس پر سزا دے۔ اس امر پر تمام امت کے فقہا کا اتفاق ہے کہ آیت زیر بحث میں حکم فَاجْلِدُوْا (ان کو کوڑے مارو) کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ اسلامی حکومت کے حکام اور قاضی ہیں۔ البتہ غلام کے معاملے میں اختلاف ہے کہ اس پر اس کا آقا حد جاری کرنے کا مجاز ہے یا نہیں۔ مذہب حنفی کے تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ وہ اس کا مجاز ہے۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ مجاز ہے اور مالکیہ کہتے ہیں کہ آقا کو سرقہ میں ہاتھ کاٹنے کا تو حق نہیں ہے مگر زنا، قذف اور شراب نوشی پر وہ حد جاری کرسکتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی قانون کی نظر میں سزائے زنا کا دائرہ

۱۳۔ اسلامی قانون زنا کی سزا کو قانونِ مملکت کا ایک حصہ قرار دیتا ہے اس لیے مملکت کی تمام رعایا پر یہ حکم جاری ہوگا خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ اس سے امام مالکؒ کے سوا غالباً ائمہ میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ رجم کی سزا غیر مسلموں پر جاری کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کا اختلاف اس بنیاد پر نہیں ہے کہ یہ قانون مملکت نہیں ہے، بلکہ اس بنیاد پر ہے کہ ان کے نزدیک رجم کی شرائط میں سے ایک شرط زانی کا پورا محصن ہونا ہے اور احصان کی تکمیل اسلام کے بغیر نہیں ہوتی، اس وجہ سے وہ غیر مسلم زانی کو رجم کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ بخلاف اس کے امام مالکؒ کے نزدیک اس حکم کے مخاطب مسلمان ہیں نہ کہ کافر، اس لیے وہ حدِ زنا کو مسلمانوں کے شخصی قانون (پرسنل لا) کا ایک جز قرار دیتے ہیں۔ رہا مستامن (جو کسی دوسرے ملک سے دارالاسلام میں اجازت لے کر آیا ہو) تو امام شافعیؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک وہ بھی اگر دارالاسلام میں زنا کرے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ ہم اس پر حد جاری نہیں کر سکتے۔

کیا حکام کے لیے ایسے مجرم کو معافی کی گنجایش ہے؟

۱۴۔ اسلامی قانون یہ لازم نہیں کرتا کہ کوئی شخص اپنے جرم کا خود اقرار کرے، یا جو لوگ کسی شخص کے جرمِ زنا پر مطلع ہوں وہ ضرور ہی اس خبر کو حکام تک پہنچائیں۔ البتہ جب حکام اس پر مطلع ہو جائیں تو پھر اس جرم کے لیے معافی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اتی شیئا من هذه القاذوراتِ فلیستتر بستر الله فان ابدی لنا صفحته اقمنا علیه کتاب الله۔ (احکام القرآن للجصاص) تم میں سے جو شخص ان گندے کاموں میں سے کسی کا مرتکب ہو جائے تو اللہ کے ڈالے ہوئے پردے میں چھپا رہے۔ لیکن اگر وہ ہمارے سامنے اپنا پردہ کھولے گا تو ہم اس پر کتاب اللہ کا قانون نافذ کر کے چھوڑیں گے''۔ ابوداؤد میں ہے ماعز بن مالک اسلمی سے جب زنا کا جرم سرزد ہو گیا تو ہزّال بن نُعَیم نے ان سے کہا کہ جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرو۔ چنانچہ انھوں نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا جرم بیان کر دیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف تو انھیں رجم کی سزا دی اور دوسری طرف ہزّال سے فرمایا: ''لَوْ سَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ كَانَ خَيْرًا لَكَ۔ کاش تم اس کا پردہ ڈھانک دیتے تو تمھارے لیے زیادہ اچھا تھا'' ابوداؤد اور نسائی میں ایک اور حدیث ہے کہ آپ نے فرمایا: ''تَعَافُوا الْحُدُوْدَ فِيْ مَا بَيْنَكُمْ فَمَا بَلَغَنِيْ مِنْ حَدٍّ فَقَدْ وَجَبَ۔ حدود کو آپس ہی میں معاف کر دیا کرو۔ مگر جس حد (یعنی مستلزم حد) کا معاملہ مجھ تک پہنچ جائے گا پھر وہ واجب ہو جائے گا''۔[1]

کیا یہ جرم قابل راضی نامہ ہے؟

اسلامی قانون میں یہ جرم قابل راضی نامہ نہیں ہے۔ قریب قریب تمام کتب حدیث میں یہ واقعہ موجود ہے کہ ایک لڑکا

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۳۸۵-۳۸۶، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہو گیا۔ لڑکے کے باپ نے سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر اس شخص کو راضی کیا۔ مگر جب یہ مقدمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا: ''اَمَّا غَنَمُکَ وَجَارِیَتُکَ فَرَدٌّ عَلَیْکَ۔ تیری بکریاں اور تیری لونڈی تجھی کو واپس۔'' اور پھر آپ نے زانی اور زانیہ پر حد جاری فرمائی۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اس جرم میں راضی نامہ کی کوئی گنجایش نہیں، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون میں عصمتوں کا معاوضہ مالی تاوانوں کی شکل میں نہیں دلوایا جاسکتا۔ آبرو کی قیمت کا یہ دیوثانہ تصور مغربی قوانین ہی کو مبارک رہے۔[1]

بلا ثبوت حکومت کارروائی کرنے کی مجاز نہیں

۱۶۔ اسلامی حکومت کسی شخص کے خلاف زنا کے جرم میں کوئی کارروائی نہ کرے گی جب تک کہ اس کے جرم کا ثبوت نہ مل جائے۔ ثبوت جرم کے بغیر کسی کی بدکاری خواہ کتنے ہی ذرائع سے حکام کے علم میں ہو، وہ بہر حال اس پر حد جاری نہیں کرسکتے۔ مدینے میں ایک عورت تھی جس کے متعلق روایات ہیں کہ وہ کھلی کھلی فاحشہ تھی۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے: کانت تظھر فی الاسلام السوء۔ دوسری روایت میں ہے: کانت قد اعلنت فی الاسلام۔ ابن ماجہ کی روایت ہے: فقد ظھر منھا الریبة فی منطقھا وھیئتھا و من یدخل علیھا۔ لیکن چونکہ اس کے خلاف بدکاری کا ثبوت نہ تھا اس لیے اسے کوئی سزا نہ دی گئی، حالانکہ اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ تک نکل گئے تھے کہ لو کنت راجما احدا بغیر بینة لرجمتھا۔ اگر میں ثبوت کے بغیر رجم کرنے والا ہوتا تو اس عورت کو ضرور رجم کرا دیتا۔[2]

جرم زنا کا پہلا ممکن ثبوت اور اس کے متعلقہ قانونی اجزا

۱۷۔ جرم زنا کا پہلا ممکن ثبوت یہ ہے کہ شہادت اس پر قائم ہو۔ اس کے متعلق قانون کے اہم اجزا یہ ہیں:

الف: قرآن تصریح کرتا ہے کہ زنا کے کم سے کم چار عینی شاہد ہونے چاہییں۔ اس کی صراحت سورۂ النساء آیت ۱۵ میں بھی گزر چکی ہے اور آگے اسی سورہ النور میں بھی دو جگہ آ رہی ہے۔ شہادت کے بغیر قاضی محض اپنے علم کی بنا پر فیصلہ نہیں کرسکتا خواہ وہ اپنی آنکھوں سے ارتکاب جرم ہوتے دیکھ چکا ہو۔

ب: گواہ ایسے لوگ ہونے چاہییں جو اسلامی قانونِ شہادت کی رو سے قابل اعتماد ہوں، مثلاً یہ کہ وہ پہلے کسی مقدمے میں جھوٹے گواہ ثابت نہ ہو چکے ہوں، خائن نہ ہوں، پہلے کے سزا یافتہ نہ ہوں، ملزم سے ان کی دشمنی ثابت نہ ہو وغیرہ۔ بہرحال ناقابل اعتماد شہادت کی بنا پر تو کسی کو رجم کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاسکتے ہیں۔

ج: گواہوں کو اس بات کی شہادت دینی چاہیے کہ انھوں نے ملزم اور ملزمہ کو عین حالت مباشرت میں دیکھا ہے، یعنی کَالْمِیْلِ

---

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۳۴-۴۳۵، اشاعت سوم۔

[2] ایضاً ص ۴۴۴۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فِي الْمِكْحَلَةِ وَالرِّشَاءِ فِي الْبِئْرِ (اس طرح جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنوئیں میں رسی)۔

د: گواہوں کو اس امر میں متفق ہونا چاہیے کہ انھوں نے کب، کہاں، کس کو، کس سے زنا کرتے دیکھا ہے۔ ان بنیادی امور میں اختلاف ان کی شہادت کو ساقط کر دیتا ہے۔[1]

اسلامی قانونِ شہادت کا منشا کیا ہے؟

شہادت کی یہ شرائط خود ظاہر کر رہی ہیں کہ اسلامی قانون کا منشا یہ نہیں ہے کہ ٹکٹکیاں لگی ہوں اور روز لوگوں کی پیٹھوں پر کوڑے برستے رہیں۔ بلکہ وہ ایسی حالت ہی میں یہ سخت سزا دیتا ہے جب کہ تمام اصلاحی اور انسدادی تدابیر کے باوجود اسلامی معاشرے میں کوئی جوڑا ایسا بے حیا ہو کہ چار چار آدمی اس کو جرم کرتے دیکھ لیں۔

کیا محض حمل کا پایا جانا ثبوتِ زنا کے لیے شہادت بالقرینہ ہے؟

۱۸۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا محض حمل کا پایا جانا، جب کہ عورت کا کوئی شوہر، یا لونڈی کا کوئی آقا معلوم ومعروف نہ ہو، ثبوت زنا کے لیے شہادت بالقرینہ ہے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہے کہ یہ کافی شہادت ہے اور اسی کو مالکیہ نے اختیار کیا ہے۔ مگر جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ محض حمل اتنا مضبوط قرینہ نہیں ہے کہ اس کی بنیاد پر کسی کو رجم کر دیا جائے یا کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسا دیے جائیں۔ اتنی بڑی سزا کے لیے ناگزیر ہے کہ یا تو شہادت موجود ہو، یا پھر اقرار۔ اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ شبہ سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ معاف کرنے کے لیے محرک ہونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِدْفَعُوا الْحُدُوْدَ مَاوَجَدْتُّمْ لَهَا مَدْفَعًا سزاؤں کو دفع کرو جہاں تک بھی ان کو دفع کرنے کی گنجایش پاؤ۔ (ابن ماجہ) ایک دوسری حدیث میں ہے: ''اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَااسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ كَانَ لَهٗ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهٗ، فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِنْ اَنْ يُّخْطِئَ فِي الْعُقُوْبَةِ۔ مسلمانوں سے سزاؤں کو دور رکھو جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اگر کسی ملزم کے لیے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ حاکم کا معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر جائے۔[2] (ترمذی) اس قاعدے کے لحاظ سے حمل کی موجودگی، چاہے شبہ کے لیے کتنی ہی قوی بنیاد ہو، زنا کا یقینی ثبوت بہر حال نہیں ہے، اس لیے کہ لاکھ میں ایک درجے کی حد تک اس امر کا بھی امکان ہے کہ مباشرت کے بغیر کسی عورت کے رحم میں کس مرد کے نطفے کا کوئی جز پہنچ جائے اور وہ حاملہ ہو جائے۔ اتنے خفیف شبہ کا امکان اس کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ ملزمہ کو زنا کی ہولناک سزا سے معاف رکھا جائے۔

---

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۶۷، اشاعت سوم۔

[2] ایضاً ص ۳۸۲۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا گواہوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں ان کو جھوٹے گواہ کی سزا دی جائے گی؟

۱۹۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ اگر زنا کے گواہوں میں اختلاف ہو جائے، یا اور کسی وجہ سے ان کی شہادتوں سے جرم ثابت نہ ہو تو کیا الٹے گواہ جھوٹے الزام کی سزا پائیں گے؟ فقہا کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس صورت میں وہ قاذف قرار پائیں گے اور انھیں ۸۰ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ان کو سزا نہیں دی جائے گی کیونکہ وہ گواہ کی حیثیت سے آئے ہیں نہ کہ مدعی کی حیثیت سے اور اگر اس طرح گواہوں کو سزا دی جائے تو پھر زنا کی شہادت بہم پہنچنے کا دروازہ ہی بند ہو جائے گا۔ آخر کس کی شامت نے دھکا دیا ہے کہ سزا کا خطرہ مول لے کر شہادت دینے آئے جب کہ اس امر کا یقین کسی کو بھی نہیں ہو سکتا کہ چاروں گواہوں میں سے کوئی ٹوٹ نہ جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری رائے معقول ہے، کیونکہ شبہ کا فائدہ جس طرح ملزم کو ملنا چاہیے، اسی طرح گواہوں کو بھی ملنا چاہیے۔ اگر ان کی شہادت کی کمزوری اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ملزم کو زنا کی خوفناک سزا دے ڈالی جائے، تو اسے اس بات کے لیے کافی نہ ہونا چاہیے کہ گواہوں پر قذف کی خوف ناک سزا برسا دی جائے، الا یہ کہ ان کا صریح جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے۔ پہلے قول کی تائید میں دو بڑی دلیلیں دی جاتی ہیں۔ اول یہ کہ قرآن جھوٹی تہمت کو مستوجب سزا قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ دلیل اس لیے غلط ہے کہ قرآن خود قاذف (تہمت لگانے والے) اور شاہد کے درمیان فرق کر رہا ہے، اور شاہد محض اس بنا پر قاذف قرار نہیں دیا جا سکتا کہ عدالت نے اس کی شہادت کو ثبوتِ جرم کے لیے کافی نہیں پایا۔ دوسری دلیل یہ دی جاتی ہے کہ مغیرہ بن شعبہؓ کے مقدمے میں حضرت عمرؓ نے ابوبکرہ اور ان کے دو ساتھی شاہدوں کو قذف کی سزا دی تھی۔ لیکن اس مقدمے کی پوری تفصیلات دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ نظیر ہر اس مقدمے پر چسپاں نہیں ہوتی جس میں ثبوت کے لیے شہادتیں ناکافی پائی جائیں۔

واقعاتِ مقدمہ

مقدمے کے واقعات یہ ہیں کہ بصرہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہؓ سے ابوبکرہ کے تعلقات پہلے سے خراب تھے۔ دونوں کے مکان ایک ہی سڑک پر آمنے سامنے واقع تھے۔ ایک روز یکا یک ہوا کے زور سے دونوں کے کمروں کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ ابوبکرہ اپنی کھڑکی بند کرنے کے لیے اٹھے تو ان کی نگاہ سامنے کے کمرے پر پڑی اور انھوں نے حضرت مغیرہ کو مباشرت میں مشغول دیکھا۔ ابوبکرہ کے پاس ان کے تین دوست (نافع ابن کلدہ، زیاد، اور شبل بن مَعْبَد) بیٹھے تھے۔ انھوں نے کہا کہ آؤ، دیکھو اور گواہ رہو کہ مغیرہ کیا کر رہے ہیں۔ دوستوں نے پوچھا یہ عورت کون ہے۔ ابوبکرہ نے کہا امِ جمیل۔ دوسرے روز اس کی شکایت حضرت عمرؓ کے پاس بھیجی گئی۔ انھوں نے فوراً حضرت مغیرہ کو معطل کر کے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو بصرے کا گورنر مقرر کیا اور ملزم کو گواہوں سمیت مدینے طلب کر لیا۔ پیشی پر ابوبکرہ اور دو گواہوں نے کہا کہ ہم نے مغیرہ کو ام جمیل کے ساتھ بالفعل مباشرت کرتے دیکھا۔ مگر زیاد نے کہا کہ عورت صاف نظر نہیں آتی تھی اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ ام جمیل تھی۔ مغیرہ بن شعبہ نے جرح میں یہ ثابت کر دیا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہ جس رخ سے یہ لوگ انھیں دیکھ رہے تھے اس سے دیکھنے والا عورت کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کیا کہ ان کی بیوی اور ام جمیل باہم بہت مشابہ ہیں۔ قرائن خود بتا رہے تھے کہ حضرت عمرؓ کی حکومت میں ایک صوبے کا گورنر خود اپنے سرکاری مکان میں، جہاں اس کی بیوی اس کے ساتھ رہتی تھی، ایک غیر عورت کو بلا کر زنا نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ابو بکرہ اور ان کے ساتھیوں کا یہ سمجھنا کہ مغیرہ اپنے گھر میں اپنی بیوی کے بجائے ام جمیل سے مباشرت کر رہے ہیں، ایک نہایت بے جا بدگمانی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے صرف ملزم کو بری کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ابو بکرہ، نافع اور شِبل پر حدِ قذف بھی جاری فرمائی۔ یہ فیصلہ اس مقدمے کے مخصوص حالات کی بنا پر تھا نہ کہ اس قاعدہ کلیہ کی بنا پر کہ جب کبھی شہادتوں سے جرم زنا ثابت نہ ہو تو گواہ ضرور پیٹ ڈالے جائیں۔ (مقدمے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، احکام القرآن لابن العربی، جلد ۲، ص ۸۸، ۸۹)

مجرم کا اپنا اقرار جرم

۲۰۔ شہادت کے سوا دوسری چیز جس سے جرم زنا ثابت ہو سکتا ہے وہ مجرم کا اپنا اقرار ہے۔ یہ اقرار صاف اور صریح الفاظ میں فعلِ زنا کے ارتکاب کا ہونا چاہیے، یعنی اسے یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے ایک ایسی عورت سے جو اس کے لیے حرام تھی کالمیل فی المکحلة یہ فعل کیا ہے اور عدالت کو پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہیے کہ مجرم کسی خارجی دباؤ کے بغیر بطور خود یہ اقرار کر رہا ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ ایک اقرار کافی نہیں ہے بلکہ مجرم کو چار مرتبہ الگ الگ اقرار کرنا چاہیے (یہ امام ابو حنیفہؒ، امام احمدؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، اسحاقؒ بن رَاھُوَیہ اور حسنؒ بن صالح کا مسلک ہے) اور بعض کہتے ہیں کہ ایک ہی اقرار کافی ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ، عثمانؒ البتی، اور حسن بصریؒ وغیرہ اس کے قائل ہیں۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ کسی دوسرے تائیدی ثبوت کے بغیر صرف مجرم کے اپنے ہی اقرار پر فیصلہ کیا گیا ہو اگر عین سزا کے دوران بھی مجرم اپنے اقرار سے پھر جائے تو سزا کو روک دینا چاہیے، خواہ یہ بات صریحاً ہی کیوں نہ ظاہر ہو رہی ہو کہ وہ مار کی تکلیف سے بچنے کے لیے اقرار سے رجوع کر رہا ہے۔

مقدمات زنا میں سب سے بڑا مقدمہ (ماعز بن مالک اسلمی کا واقعہ)

اس پورے قانون کا مآخذ وہ نظائر ہیں جو زنا کے مقدمے کے متعلق احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ سب سے بڑا مقدمہ ماعز بن مالک اسلمی کا ہے جسے متعدد صحابہ سے بکثرت راویوں نے نقل کیا ہے اور قریب قریب تمام کتب احادیث میں اس کی روایات موجود ہیں۔ یہ شخص قبیلہ اسلم کا یتیم لڑکا تھا جس نے حضرت ہزّال بن نُعَیم کے ہاں پرورش پائی تھی۔ یہاں وہ آزاد کردہ لونڈی سے زنا کر بیٹھا تھا۔ حضرت ہزال نے کہا کہ جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گناہ کی خبر دے، شاید کہ آپؐ تیرے لیے دعائے مغفرت فرما دیں۔ اس نے جا کر مسجد نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا یا رسول اللہ مجھے پاک کر دیجیے، میں نے زنا کی ہے۔ آپؐ نے منہ پھیر لیا اور فرمایا وَیْحَکَ اِرْجِعْ فَاسْتَغْفِرِ اللّٰہَ وَتُبْ اِلَیْهِ۔ ارے چلا جا اور اللہ سے توبہ و استغفار کر۔ مگر اس نے پھر سامنے آ کر وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ پھیر لیا۔ اس نے تیسری مرتبہ وہی بات کہی اور آپؐ نے پھر منہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھیر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو متنبہ کیا کہ دیکھ اب چوتھی بار اگر تو نے اقرار کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجھے رجم کرا دیں گے۔ مگر وہ نہ مانا اور پھر اس نے اپنی بات دہرائی۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے فرمایا: لَعَلَّکَ قَبَّلْتَ اَوْ غَمَزْتَ اَوْنَظَرْتَ شاید تو نے بوس و کنار کیا ہوگا یا چھیڑ چھاڑ کی ہوگی یا نظر بد ڈالی ہوگی (اور تو سمجھ بیٹھا ہوگا کہ زنا کا ارتکاب کیا ہے) اس نے کہا نہیں۔ آپؐ نے پوچھا کیا تُو اس سے ہم بستر ہوا ہے؟ اس نے کہا ہاں، پھر پوچھا کیا تو نے اس سے مباشرت کی؟ اس نے کہا ہاں، پھر پوچھا کیا تو نے اس سے مجامعت کی؟ اس نے کہا ہاں۔ پھر آپ نے وہ لفظ استعمال کیا جو عربی زبان میں صریحاً فعل مباشرت کے لیے بولا جاتا ہے اور فحش سمجھا جاتا ہے۔ ایسا لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہلے کبھی نہ سنا گیا اور نہ اس کے بعد کسی نے سنا۔ اگر ایک شخص کی جان کا معاملہ نہ ہوتا تو زبان مبارک سے کبھی ایسا لفظ نہ نکل سکتا تھا۔ مگر اس نے اس کے جواب میں بھی ہاں کہہ دیا۔ آپ نے پوچھا حَتّٰی غَابَ ذٰلِکَ مِنْکَ فِی ذٰلِکَ مِنْھَا (کیا اس حد تک کہ تیری وہ چیز اس کی اس چیز میں غائب ہوگئی؟) اس نے کہا ہاں۔ پھر پوچھا کَمَا یَغِیْبُ الْمِیلُ فِی الْمِکْحَلَۃِ وَالرِّشَآءِ فِی الْبِئْرِ (کیا اس طرح غائب ہوگئی جیسے سرمہ دانی میں سلائی اور کنوئیں میں رسی؟) اس نے کہا ہاں۔ پوچھا کیا تو جانتا ہے کہ زنا کسے کہتے ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں، میں نے اس کے ساتھ حرام طریقے سے وہ کام کیا ہے جو شوہر حلال طریقے سے اپنی بیوی کے ساتھ کرتا ہے۔ آپ نے پوچھا کیا تیری شادی ہو چکی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں، آپ نے پوچھا تو نے شراب تو نہیں پی لی ہے؟ اس نے کہا نہیں۔ ایک شخص نے اٹھ کر اس کا منہ سونگھا اور تصدیق کی۔ پھر آپؐ نے اس کے محلہ والوں سے دریافت کیا کہ یہ دیوانہ تو نہیں ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہم نے اس کی عقل میں کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ آپؐ نے ہزّال سے فرمایا: لَوْ سَتَرْتَہٗ بِثَوْبِکَ کَانَ خَیْرًا لَّکَ کاش تم نے اس کا پردہ ڈھانک دیا ہوتا تو تمھارے لیے اچھا تھا۔ پھر آپؐ نے ماعز کو رجم کرنے کا فیصلہ صادر فرما دیا اور اسے شہر کے باہر لے جا کر سنگسار کر دیا۔ جب پتھر پڑنے شروع ہوئے تو ماعز بھاگا اور اس نے کہا لوگو! مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے چلو، میرے قبیلے کے لوگوں نے مجھے مروا دیا۔ مجھے دھوکا دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قتل نہیں کرائیں گے، مگر مارنے والوں نے اسے مار ڈالا۔ بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اسے چھوڑ کیوں نہیں دیا، میرے پاس لے آئے ہوتے شاید وہ توبہ کرتا اور اللہ اس کی توبہ قبول کر لیتا۔

دوسرا بڑا واقعہ زنا (غامدیہ کا واقعہ)

دوسرا واقعہ غامدیہ کا ہے جو قبیلہ غامد (قبیلہ جُہَینَہ کی ایک شاخ) کی ایک عورت تھی۔ اس نے بھی آ کر چار مرتبہ اقرار کیا کہ وہ زنا کی مرتکب ہوئی ہے اور اسے ناجائز حمل ہے۔ آپ نے اسے بھی پہلے اقرار پر فرمایا: وَیْحَکِ اِرْجِعِیْ فَاسْتَغْفِرِیْ اِلَی اللّٰہِ وَتُوبِیْ اِلَیْہِ، اری چلی جا، اللہ سے معافی مانگ اور توبہ کر۔ مگر اس نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ مجھے ماعز کی طرح ٹالنا چاہتے ہیں۔ میں زنا سے حاملہ ہوں۔ یہاں چونکہ اقرار کے ساتھ حمل بھی موجود تھا، اس لیے آپ نے اس قدر مفصل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جرح نہ فرمائی جو ماعز کے ساتھ کی تھی۔ آپؐ نے فرمایا: ''اچھا نہیں مانتی تو جا وضع حمل کے بعد آئیو۔'' وضع حمل کے بعد وہ بچے کو لے کر آئی اور کہا اب مجھے پاک کر دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا ''جا اور اس کو دودھ پلا۔ دودھ چھوٹنے کے بعد آئیو۔'' پھر وہ دودھ چھٹانے کے بعد آئی اور ساتھ روٹی کا ایک ٹکڑا بھی لیتی آئی۔ بچے کو روٹی کا ٹکڑا بھی کھلا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اس کا دودھ چھوٹ گیا ہے اور دیکھیے یہ روٹی کھانے لگا ہے۔ تب آپؐ نے بچے کو پرورش کے لیے ایک شخص کے حوالے کیا اور اس کے رجم کا حکم دیا۔

ان دونوں واقعات میں بصراحت چار اقراروں کا ذکر ہے اور ابوداؤد میں حضرت بریدہ کی روایت ہے کہ صحابہ کرام کا عام خیال یہی تھا کہ اگر ماعز اور غامدیہ چار مرتبہ اقرار نہ کرتے تو انھیں رجم نہ کیا جاتا۔ البتہ تیسرا واقعہ (جس کا ذکر ہم اوپر نمبر ۱۵ میں کر چکے ہیں) اس میں صرف یہ الفاظ ملتے ہیں کہ جا کر اس کی بیوی سے پوچھ، اور اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔ اس میں چار اعترافوں کا ذکر نہیں ہے، اور اسی سے فقہا کے ایک گروہ نے استدلال کیا ہے کہ ایک ہی اعتراف کافی ہے۔

کیا اقراری مجرم سے پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کی؟

۲۱۔ اوپر ہم نے جن تین مقدمات کی نظیریں پیش کی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اقراری مجرم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ اس نے کس سے زنا کا ارتکاب کیا ہے، کیوں کہ اس طرح ایک کے بجائے دو کو سزا دینی پڑے گی، اور شریعت لوگوں کو سزائیں دینے کے لیے بے چین نہیں ہے۔ البتہ اگر مجرم خود بتائے کہ اس فعل کا فریق ثانی فلاں ہے تو اس سے پوچھا جائے گا۔ اگر وہ بھی اعتراف کرے تو اسے سزا دی جائے گی۔ لیکن اگر وہ انکار کر دے تو صرف اقراری مجرم ہی حد کا مستحق ہوگا۔ اس امر میں فقہا کا اختلاف ہے کہ اس دوسری صورت میں (یعنی جب کہ فریقِ ثانی اس کے ساتھ مرتکب زنا ہونے کو تسلیم نہ کرے) اس پر آیا حد زنا جاری کی جائے گی یا حد قذف۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک وہ حد زنا کا مستوجب ہے، کیونکہ اسی جرم کا اس نے اقرار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام اوزاعیؒ کی رائے میں اس پر حد قذف جاری کی جائے گی، کیونکہ فریق ثانی کے انکار نے اس جرمِ زنا کو مشکوک کر دیا ہے، البتہ اس کا جرم قذف بہر حال ثابت ہے اور امام محمدؒ کا فتویٰ یہ ہے (امام شافعیؒ کا بھی ایک قول اس کی تائید میں ہے) کہ اسے زنا کی سزا بھی دی جائے گی اور قذف کی بھی، کیونکہ اپنے جرم کا وہ خود معترف ہے اور فریق ثانی پر اپنا الزام وہ ثابت نہیں کر سکا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں اس قسم کا ایک مقدمہ آیا تھا۔ اس کی ایک روایت جو مسند احمد اور ابوداؤد میں سہل بن سعد سے منقول ہے اس میں یہ الفاظ ہیں: ''ایک شخص نے آ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اقرار کیا کہ وہ فلاں عورت سے زنا کا مرتکب ہوا ہے۔ آپ نے عورت کو بلا کر پوچھا، اس نے انکار کیا۔ آپ نے اس پر حد جاری کی اور عورت کو چھوڑ دیا۔ اس روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ کون سی حد جاری کی۔ دوسری روایت ابوداؤد اور نسائی نے ابن عباس سے نقل کی ہے اور اس میں یہ ہے کہ پہلے اس کے اقرار پر آپ نے حد زنا جاری کی۔ پھر عورت سے پوچھا اور اس کے انکار پر اس شخص کو حد

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قذف کے کوڑے لگوائے۔ لیکن یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی ضعیف ہے، کیونکہ اس کے ایک راوی قاسم بن فیاض کو متعدد محدثین نے ساقط الاعتبار ٹھہرایا ہے، اور قیاس کے بھی خلاف ہے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ آپؐ نے اسے کوڑے لگوانے کے بعد عورت سے پوچھا ہوگا۔ صریح عقل اور انصاف کا تقاضا، جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نظر انداز نہیں فرما سکتے، یہ تھا کہ جب اس نے عورت کا نام لے دیا تھا تو عورت سے پوچھے بغیر اس کے مقدمے کا فیصلہ نہ کیا جاتا۔ اسی کی تائید سہل بن سعد والی روایت بھی کر رہی ہے۔ لہٰذا دوسری روایت لائق اعتماد ہے۔

ثبوتِ جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو کون سی سزا دی جائے گی؟

۲۲۔ ثبوت جرم کے بعد زانی اور زانیہ کو کیا سزا دی جائے گی، اس مسئلے پر فقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ مختلف فقہا کے مسلک اس باب میں حسب ذیل ہیں:

شادی شدہ مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا: امام احمد، داؤد ظاہری اور اسحاق بن راہویہ کے نزدیک سو کوڑے لگانا اور اس کے بعد سنگسار کرنا ہے باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ان کی سزا صرف سنگساری ہے۔ رجم، اور سزائے تازیانہ کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

غیر شادی شدہ کی سزا: امام شافعیؒ، امام احمد، اسحاق، داؤد ظاہری، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن صالح کے نزدیک سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی، مرد و عورت ہر دو کے لیے۔ امام مالکؒ اور امام اوزاعی کے نزدیک مرد کے لیے ۱۰۰ کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور عورت کے لیے صرف سو کوڑے۔ (جلاوطنی سے مراد ان سب کے نزدیک یہ ہے کہ مجرم کو اس کی بستی سے نکال کر کم از کم اتنے فاصلے پر بھیج دیا جائے جس پر نماز میں قصر واجب ہوتا ہے۔ مگر زید بن علی اور امام جعفر صادق کے نزدیک قید کر دینے سے بھی جلاوطنی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ اور ان کے شاگرد امام ابو یوسف، امام زفرؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ اس صورت میں حد زنا مرد اور عورت دونوں کے لیے صرف سو کوڑے ہے۔ اس پر کسی اور سزا، مثلاً قید یا جلاوطنی کا اضافہ نہیں بلکہ تعزیر ہے۔ قاضی اگر یہ دیکھے کہ مجرم بدچلن ہے، یا مجرم اور مجرمہ کے تعلقات بہت گہرے ہیں تو حسب ضرورت وہ انھیں خارج البلد کر سکتا ہے اور قید بھی کر سکتا ہے۔ حد اور تعزیر میں فرق یہ ہے کہ حد ایک مقرر سزا ہے جو ثبوت جرم کی شرائط پوری ہونے کے بعد لازماً دی جائے گی اور تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جو قانون میں بلحاظ مقدار و نوعیت بالکل مقرر نہ کر دی گئی ہو، بلکہ جس میں عدالت حالاتِ مقدمہ کے لحاظ سے کمی بیشی کر سکتی ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان مسالک کی مؤید احادیث

ان مختلف مسالک میں ہر ایک نے مختلف احادیث کا سہارا لیا ہے جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت، جسے مسلم، ابوداؤدؒ، ابن ماجہؒ، ترمذیؒ اور امام احمدؒ نے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خذوا عنی خذوا عنی، قد جعل اللہ لهن سبيلا البكر بالبكر جلد مأة وتغريب عام والثيب بالثيب جلد مأة والرجم (او رمى بالحجارة اور رجم بالحجارة)۔ مجھ سے لو، مجھ سے لو، اللہ نے زانیہ عورتوں کے لیے طریقہ مقرر کر دیا۔ غیر شادی شدہ مرد کی غیر شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی اور شادی شدہ مرد کی شادی شدہ عورت سے بدکاری کے لیے سو کوڑے اور سنگساری۔[1] (یہ حدیث اگرچہ سنداً صحیح ہے، مگر روایات صحیحہ کا ایک جم غفیر ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ اس پر نہ عہد نبوی میں کبھی عمل ہوا، نہ عہد خلفائے راشدین میں، اور نہ فقہا میں سے کسی نے ٹھیک اس کے مضمون کے مطابق فتویٰ دیا۔ فقہ اسلامی میں جو بات متفق علیہ ہے وہ یہ ہے کہ زانی اور زانیہ کے محصن اور غیر محصن ہونے کا الگ الگ اعتبار کیا جائے گا۔ غیر شادی شدہ مرد خواہ شادی شدہ عورت سے زنا کرے یا غیر شادی شدہ سے ہر دو حالتوں میں اس کو ایک ہی سزا دی جائے گی۔ یہی معاملہ عورت کا بھی ہے۔ وہ شادی شدہ ہو تو ہر حالت میں ایک ہی سزا پائے گی خواہ اس سے زنا کرنے والا مرد شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اور باکرہ ہونے کی صورت میں بھی اس کے لیے ایک ہی سزا ہے بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ساتھ زنا کرنے والا محصن ہے یا غیر محصن۔

حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت زید بن خالد جُہنیؓ کی روایت، جسے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور امام احمد نے نقل کیا ہے۔ اس میں یہ ہے کہ دو اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لائے۔ ایک نے کہا میرا بیٹا اس شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا تھا۔ وہ اس کی بیوی سے ملوث ہو گیا۔ میں نے اس کو سو بکریاں اور ایک لونڈی دے کر راضی کیا۔ مگر اہلِ علم نے بتایا ہے کہ یہ کتاب اللہ کے خلاف ہے۔ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرما دیں، دوسرے نے بھی کہا کہ آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرما دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں کتاب اللہ ہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ بکریاں اور لونڈی تجھی کو واپس۔ تیرے بیٹے کے لیے سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی۔ پھر آپ نے قبیلۂ اسلم کے ایک شخص سے فرمایا اُنیس، تو جا کر اس کی بیوی سے پوچھ۔ اگر وہ اعتراف کرے تو اسے رجم کر دے۔ چنانچہ اس نے اعتراف کیا اور رجم کر دی گئی۔ (اس میں رجم سے پہلے کوڑے لگانے کا کوئی ذکر نہیں ہے اور غیر شادی شدہ مرد کو شادی شدہ عورت سے بدکاری کرنے پر تازیانے اور جلاوطنی کی سزا دی گئی)۔[2]

---

1. تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۳۳، اشاعت سوم۔
2. ایضاً: ص ۴۳۵۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ماعز اور غامدیہ کے مقدمات کی جتنی روداد یں احادیث کی مختلف کتابوں میں مروی ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ملتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کرانے سے پہلے ان کو سو کوڑے بھی لگوائے ہوں۔

کوئی روایت کسی حدیث میں نہیں ملتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مقدمے میں رجم کے ساتھ سزائے تازیانہ کا بھی فیصلہ فرمایا ہو۔ زنا بعد احصان کے تمام مقدمات میں آپؐ نے صرف رجم کی سزا دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا مشہور خطبہ جس میں انھوں نے پورے زور کے ساتھ زنا بعد احصان کی سزا رجم بیان کی ہے، بخاری و مسلم اور ترمذی و نسائی نے مختلف سندوں سے نقل کیا ہے اور امام احمدؒ نے بھی اس کی متعدد روایتیں لی ہیں، مگر اس کی کسی روایت میں بھی رجم مع سزائے تازیانہ کا ذکر نہیں ہے۔

سزائے تازیانہ

خلفائے راشدین میں سے صرف حضرت علیؓ نے سزائے تازیانہ اور سنگساری کو ایک سزا میں جمع کیا ہے۔ امام احمد اور امام بخاری عامر شعبی سے یہ واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک عورت شُراحہ نامی نے ناجائز حمل کا اعتراف کیا، حضرت علیؓ نے جمعرات کے روز اسے کوڑے لگوائے اور جمعہ کے روز اس کو رجم کرایا اور فرمایا ہم نے اسے کتاب اللہ کے مطابق کوڑے لگائے ہیں اور سنت رسول اللہ کے مطابق سنگسار کرتے ہیں۔ اس ایک واقعہ کے سوا عہدِ خلافت راشدہ کا کوئی دوسرا واقعہ رجم مع تازیانہ کے حق میں نہیں ملتا۔

جابر بن عبداللہؓ کی ایک روایت، جسے ابوداؤد اور نسائی نے نقل کیا ہے، یہ بتاتی ہے کہ ایک شخص زنا کا مرتکب ہوا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صرف سزائے تازیانہ دی، پھر معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ تھا، تب آپ نے اسے رجم کرایا۔ اس کے علاوہ متعدد روایات ہم پہلے نقل کر آئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ زانیوں کو آپ نے سزائے تازیانہ دی، مثلاً وہ شخص جس نے نماز کے لیے جاتی ہوئی عورت سے زنا بالجبر کی تھی، اور وہ شخص جس نے زنا کا اعتراف کیا اور عورت نے انکار کیا۔

حضرت عمرؓ نے ربیعہ بن اُمیّہ بن خلف کو شراب نوشی کے جرم میں جلاوطن کیا اور وہ بھاگ کر رومیوں سے جا ملا۔ اس پر حضرت عمر نے فرمایا کہ آئندہ میں کسی کو جلاوطنی کی سزا نہیں دوں گا۔ اسی طرح حضرت علیؓ نے غیر شادی شدہ مرد کو زنا کے جرم میں جلاوطن کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس میں فتنے کا اندیشہ ہے۔ (احکام القرآن، جصاص، جلد ۳، ص ۳۱۵)

ان تمام روایات پر مجموعی نظر ڈالنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کا مسلک ہی صحیح ہے، یعنی زنا بعد احصان کی حد صرف رجم ہے اور محض زنا کی حد صرف ۱۰۰ کوڑے۔ تازیانے اور رجم کو جمع کرنے پر تو عہد نبوی سے لے کر عہد عثمانی تک کبھی عمل ہی نہیں ہوا۔ رہا تازیانے اور جلاوطنی کو جمع کرنا، تو اس پر کبھی عمل ہوا ہے اور کبھی نہیں ہوا۔ اس سے مسلک

۱؎ تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۳۳، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حنفی کی صحت صاف ثابت ہو جاتی ہے۔

ضرب تازیانہ کی کیفیت

ضربِ تازیانہ کی کیفیت کے متعلق پہلا اشارہ خود قرآن کے لفظ فَاجْلِدُوْا میں ملتا ہے جَلْد کا لفظ جِلد (یعنی کھال) سے ماخوذ ہے۔اس سے تمام اہلِ لغت اور علمائے تفسیر نے یہی معنی لیے ہیں کہ مار ایسی ہونی چاہیے جس کا اثر جِلد تک رہے، گوشت تک نہ پہنچے۔ایسی ضرب تازیانہ جس سے گوشت کے ٹکڑے اڑ جائیں، یا کھال پھٹ کر اندر تک زخم پڑ جائے،قرآن کے خلاف ہے۔

کوڑا کیسا ہونا چاہیے؟

مار کے لیے خواہ کوڑا استعمال کیا جائے یا بید، دونوں صورتوں میں وہ اوسط درجے کا ہونا چاہیے۔نہ بہت موٹا اور سخت اور نہ بہت پتلا اور نرم۔مؤطا میں امام مالک کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ضربِ تازیانہ کے لیے کوڑا طلب کیا اور وہ کثرت استعمال سے بہت کمزور ہو چکا تھا۔آپ نے فرمایا فوق ھذا (اس سے زیادہ سخت لاؤ) پھر ایک نیا کوڑا لایا گیا جو ابھی استعمال سے نرم نہیں پڑا تھا۔آپؐ نے فرمایا دونوں کے درمیان۔پھر ایسا کوڑا لایا گیا جو سواری میں استعمال ہو چکا تھا۔اس سے آپ نے ضرب لگوائی۔اسی مضمون سے ملتی جلتی روایت ابوعثمان النہدی نے حضرت عمرؓ کے متعلق بھی بیان کی ہے کہ وہ اوسط درجے کا کوڑا استعمال کرتے تھے۔(احکام القرآن، جصاص، ج ۳،ص ۳۲۲)۔گرہ لگا ہوا کوڑا یا دو شاخہ سہ شاخہ کوڑا بھی استعمال کرنا ممنوع ہے۔

مار کی کیفیت

مار بھی اوسط درجے کی ہونی چاہیے۔حضرت عمرؓ مارنے والے کو ہدایت کرتے تھے کہ لاترفع (یا لاتخرج) ابطک ''اس طرح مار کہ تیری بغل نہ کھلے''۔یعنی پوری طاقت سے ہاتھ کو تان کر نہ مار۔(احکام القرآن،ابن عربی، ج ۲،ص ۸۴، احکام القرآن،جصاص، ج ۳،ص ۳۲۲) تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ ضرب مبرح نہیں ہونی چاہیے،یعنی زخم ڈال دینے والی۔ایک ہی جگہ نہیں مارنا چاہیے بلکہ تمام جسم پر مار کو پھیلا دینا چاہیے۔صرف منہ اور شرم گاہ کو (اور حنفیہ کے نزدیک سر کو بھی) بچا لینا چاہیے،باقی ہر عضو پر کچھ نہ کچھ مار پڑنی چاہیے۔حضرت علیؓ نے ایک شخص کو کوڑے لگواتے وقت فرمایا: ہر عضو کو اس کا حق دے اور صرف منہ اور شرم گاہ کو بچالے، دوسری روایت میں ہے ''صرف سر اور شرم گاہ کو بچالے''۔(احکام القرآن، جصاص ،ج ۳،ص ۳۲۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا ضرب احدکم فلیتق الوجہ۔ ''جب تم میں سے کوئی مارے تو منہ پر نہ مارے''۔(ابوداؤد)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرد وعورت کو سزا دینے کی الگ الگ نوعیت

مرد کو کھڑا کر کے مارنا چاہیے اور عورت کو بٹھا کر۔ امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں کوفے کے قاضی ابن ابی لیلیٰ نے ایک عورت کو کھڑا کر کے پٹوایا۔ اس پر امام ابوحنیفہؒ نے سخت گرفت کی اور علانیہ ان کے فیصلے کو غلط ٹھہرایا۔ (اس سے قانون توہین عدالت کے معاملے میں بھی امام صاحب کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے) ضربِ تازیانہ کے وقت عورت اپنے پورے کپڑے پہنے رہے گی، بلکہ اس کے کپڑے اچھی طرح باندھ دیے جائیں گے تا کہ اس کا جسم کھل نہ جائے۔ صرف موٹے کپڑے اتروا دیے جائیں گے۔ مرد کے معاملے میں اختلاف ہے۔ بعض فقہا کہتے ہیں کہ وہ صرف پاجامہ پہنے رہے گا اور بعض کہتے ہیں کہ قمیص بھی نہ اتروایا جائے گا۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے ایک زانی کو سزائے تازیانہ کا حکم دیا۔ اس نے کہا ''اس گناہ گار جسم کو اچھی طرح مار کھانی چاہیے اور یہ کہہ کر وہ قمیص اتارنے لگا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے فرمایا: ''اسے قمیص نہ اتارنے دو''۔ (احکام القرآن، جصاص، ج ۳، ص ۳۲۲) حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک شخص کو کوڑے لگوائے گئے اور وہ چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

سزا کے لیے گرمی سردی کے اوقات کا لحاظ

سخت سردی اور سخت گرمی کے وقت سزا ممنوع ہے۔ جاڑے میں گرم وقت اور گرمی میں ٹھنڈے وقت مارنے کا حکم ہے۔

باندھ کر مارنے کی بھی اجازت نہیں ہے، الا یہ کہ مجرم بھاگنے کی کوشش کرے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

''لایحل فی ھذا الامة تجرید و المد۔ اس امت میں ننگا کر کے اور ٹکٹکی باندھ کر مارنا حلال نہیں ہے''۔

فقہانے اس کو جائز رکھا ہے کہ روزانہ کم از کم بیس بیس کوڑے مارے جائیں۔ لیکن اولیٰ یہی ہے کہ بیک وقت پوری سزا دی جائے۔

جلاد کیسے ہونے چاہییں

مار کا کام اُجڈ جلادوں سے نہیں لینا چاہیے بلکہ صاحبِ علم وبصیرت آدمیوں کو یہ خدمت انجام دینی چاہیے جو جانتے ہوں کہ شریعت کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کس طرح مارنا مناسب ہے۔ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، مقداد بن عمروؓ، محمد بن مسلمہؓ، عاصم بن ثابتؓ اور ضحاکؓ بن سفیان جیسے صلحا و معززین سے جلاد کی خدمت لی جاتی تھی۔ (ج ۱، ص ۴۴-۴۵)

مریض مجرم اور بہت بوڑھے زانی کی سزا

اگر مجرم مریض ہو، اور اس کے صحت یاب ہونے کی امید نہ ہو، یا بہت بوڑھا ہو تو سو شاخوں والی ایک ٹہنی یا سو تیلیوں والی ایک جھاڑو لے کر صرف ایک دفعہ مار دینا چاہیے تا کہ قانون کا تقاضا پورا کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک بوڑھا مریض زنا کے جرم میں پکڑا گیا تھا اور آپ نے اس کے لیے یہی سزا تجویز کی تھی (احمد، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حاملہ عورت کو سزا کب دی جائے؟

حاملہ عورت کو سزائے تازیانہ دینی ہو تو وضع حمل کے بعد نفاس کا زمانہ گزر جانے تک انتظار کرنا ہوگا اور رجم کرنا ہو تو جب تک اس کے بچے کا دودھ نہ چھوٹ جائے، سزا نہیں دی جا سکتی۔

سزا کا آغاز کون کرے گا؟

اگر زنا شہادتوں سے ثابت ہو تو گواہ ضرب کی ابتدا کریں گے اور اگر اقرار کی بنا پر سزا دی جا رہی ہو تو قاضی خود ابتدا کرے گا، تا کہ گواہ اپنی گواہی کو اور جج اپنے فیصلوں کو کھیل نہ سمجھ بیٹھیں۔ شراحہ کے مقدمے میں حضرت علیؓ نے رجم کا فیصلہ کیا تو فرمایا: ''اگر اس کے جرم کا کوئی گواہ ہوتا تو اسی کو مار کی ابتدا کرنی چاہیے تھی، مگر اس کو اقرار کی بنا پر سزا دی جا رہی ہے اس لیے میں خود ابتدا کروں گا۔'' حنفیہ کے نزدیک ایسا کرنا واجب ہے، شافعیہ اس کو واجب نہیں مانتے، مگر سب کے نزدیک اولیٰ یہی ہے۔

دورِ جدید کی ضرب تازیانہ

ضرب تازیانہ کے قانون کی ان تفصیلات کو دیکھیے اور پھر ان لوگوں کی جرأت کی داد دیجیے جو اسے تو وحشیانہ سزا کہتے ہیں، مگر وہ سزائے تازیانہ ان کے نزدیک بڑی مہذب سزا ہے جو آج جیلوں میں دی جا رہی ہے۔ موجودہ قانون کی رو سے صرف عدالت ہی نہیں جیل کا ایک معمولی سپرنٹنڈنٹ بھی ایک قیدی کو حکم عدولی یا گستاخی کے قصور میں ۳۰ ضرب بید تک کی سزا دینے کا مجاز ہے۔ یہ بید لگانے کے لیے ایک آدمی خاص طور پر تیار کیا جاتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی مشق کرتا رہتا ہے۔ اس غرض کے لیے بید بھی خاص طور پر بھگو بھگو کر تیار کیے جاتے ہیں تا کہ جسم کو چھری کی طرح کاٹ دیں۔ مجرم کو ننگا کر کے ٹکٹکی سے باندھ دیا جاتا ہے تا کہ وہ تڑپ بھی نہ سکے۔ صرف ایک پتلا سا کپڑا اس کے ستر کو چھپانے کے لیے رہنے دیا جاتا ہے اور وہ ٹنکچر آیوڈین سے بھگو دیا جاتا ہے۔ جلاد دور سے بھاگتا ہوا آتا ہے اور پوری طاقت سے مارتا ہے۔ ضرب ایک ہی مخصوص حصۂ جسم (یعنی سُرین) پر مسلسل لگائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ گوشت قیمہ ہو کر اڑتا چلا جاتا ہے اور بسا اوقات ہڈی نظر آنے لگتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ طاقت ور سے طاقت ور آدمی بھی پورے تیس بید کھانے سے پہلے ہی بے ہوش ہو جاتا ہے اور اس کے زخم بھرنے میں ایک مدت لگ جاتی ہے۔ اس ''مہذب'' سزا کو جو لوگ آج جیلوں میں خود نافذ کر رہے ہیں ان کا یہ منہ ہے کہ اسلام کی مقرر کی ہوئی سزائے تازیانہ کو ''وحشیانہ'' سزا کے نام سے یاد فرمائیں! پھر ان کی پولیس ثابت شدہ مجرموں کو نہیں بلکہ محض مشتبہ لوگوں کو تفتیش کی خاطر (خصوصاً سیاسی جرائم کے شبہات میں) جیسے جیسے عذاب دیتی ہے وہ آج کسی سے چھپے ہوئے نہیں۔

رجم کی سزا میں مرجانے والے کی تجہیز و تکفین

۲۴۔ رجم کی سزا میں جب مجرم مرجائے تو پھر اس سے پوری طرح مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ اس کی تجہیز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وتکفین کی جائے گی۔ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس کو عزت کے ساتھ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ اس کے حق میں دعائے مغفرت کی جائے گی اور کسی کے لیے جائز نہ ہوگا کہ اس کا ذکر برائی کے ساتھ کرے۔ بخاری میں جابر بن عبداللہ انصاری کی روایت ہے کہ جب رجم سے ماعز بن مالک کی موت واقع ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو "خیر سے یاد فرمایا اور اس کی نماز جنازہ خود پڑھائی"۔ مسلم میں بریدہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: استغفروا لماعز بن مالک۔ لقد تاب توبة لو قسمت بین امة لوسعتهم "ماعز کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پوری امت پر تقسیم کردی جائے تو سب کے لیے کافی ہو"۔ اسی روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ غامدیہ جب رجم سے مرگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور جب حضرت خالد بن ولید نے اس کا ذکر برائی سے کیا تو آپ نے فرمایا مهلا یا خالد، فوالذی نفسی بیده لقد تابت توبة لو تابها صاحب مکس لغفرله۔ "خالد اپنی زبان کو روکو، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ظالمانہ محصول وصول کرنے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا"۔[1] ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ ماعز کے واقعہ کے بعد ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم راستے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے دو شخصوں کو ماعز کا ذکر برائی سے کرتے سنا۔ چند قدم آگے جا کر ایک گدھے کی لاش پڑی نظر آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر گئے اور ان دونوں آدمیوں سے کہا: "آپ حضرات اس میں سے کچھ نوشِ جان فرمائیں" انھوں نے عرض کیا: "یا نبی اللہ اسے کون کھا سکتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "اپنے بھائی کی آبرو سے جو کچھ آپ ابھی تناول فرمارہے تھے وہ اسے کھانے کی بہ نسبت بدتر چیز تھی"۔ مسلم بن عمران بن حُصین کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے غامدیہ کی نماز جنازہ کے موقع پر عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اس زانیہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی؟ آپ نے فرمایا لقد تاب توبة لو قسمت بین اهل المدینة لوسعتهم۔ اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہلِ مدینہ پر تقسیم کردی جائے تو سب کے لیے کافی ہو"۔ بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص کو شراب نوشی کے جرم میں سزا دی جارہی تھی۔ کسی کی زبان سے نکلا "خدا تجھے رسوا کرے، اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس طرح نہ کہو، اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو"۔ ابوداؤد میں اس پر اتنا اور اضافہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلکہ یوں کہو اللّٰهم اغفرله، اللّٰهم ارحمه، خدایا اسے معاف کردے، خدایا اس پر رحم کر۔ یہ ہے اسلام میں سزا کی اصل روح۔ اسلام کسی بڑے سے بڑے مجرم کو بھی دشمنی کے جذبے سے سزا نہیں دیتا بلکہ خیر خواہی کے جذبے سے دیتا ہے اور جب سزا دے چکتا ہے تو پھر اسے رحمت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ کم ظرفی موجودہ تہذیب نے پیدا کی ہے کہ حکومت کی فوج یا پولیس جسے ماردے، اور کوئی عدالتی تحقیقات جس کے مارنے کو جائز ٹھہرادے۔ اس کے متعلق یہ تک گوارا نہیں کیا جاتا کہ کوئی اس کا جنازہ اٹھائے یا کسی کی زبان سے اس کا ذکر خیر سنا جائے۔ اس پر اخلاقی جرأت (یہ موجودہ تہذیب میں ڈھٹائی کا مہذب نام ہے) کا یہ عالم ہے کہ دنیا کو رواداری کے وعظ سنائے جاتے ہیں۔

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۴۶۹، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جانوروں سے فعلِ بد کے مرتکب کی سزا

رہا جانور سے فعلِ بد، تو بعض فقہا اس کو بھی زنا کے حکم میں شمار کرتے ہیں اور اس کے مرتکب کو حدِ زنا کا مستحق ٹھہراتے ہیں، مگر امام ابوحنیفہؒ، امام یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ یہ زنا نہیں ہے اس لیے اس کا مرتکب تعزیر کا مستحق ہے نہ کہ حدِ زنا کا۔ تعزیر کے متعلق ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اس کا فیصلہ قاضی کی رائے پر چھوڑا گیا ہے، یا مملکت کی مجلسِ شوریٰ ضرورت سمجھے تو اس کے لیے کوئی مناسب شکل خود تجویز کر سکتی ہے۔ (تفہیم القرآن: ج ۲ ص ۳۱۹ تا ۳۴۳۔ النور حاشیہ ۲)

فوجداری قانون یعنی دین کے بارے میں ترس کھانے کی ممانعت

وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ (النور ۲۴:۲)

اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اولین چیز جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ یہاں فوجداری قانون کو ''دین اللہ'' فرمایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ صرف نماز اور روزہ اور حج و زکوٰۃ ہی دین نہیں ہے، مملکت کا قانون بھی دین ہے۔ دین کو قائم کرنے کا مطلب صرف نماز ہی قائم کرنا نہیں ہے بلکہ اللہ کا قانون اور نظامِ شریعت قائم کرنا بھی ہے۔ جہاں یہ چیز قائم نہ ہو وہاں نماز اگر قائم ہو بھی تو گویا ادھورا دین قائم ہوا۔ جہاں اس کو رد کر کے دوسرا کوئی قانون اختیار کیا جائے وہاں کچھ اور نہیں خود دین اللہ رد کر دیا گیا۔

دوسری چیز جو اس میں قابلِ توجہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کی یہ تنبیہ ہے کہ زانی اور زانیہ پر میری تجویز کردہ سزا نافذ کرنے میں مجرم کے لیے رحم اور شفقت کا جذبہ تمھارا ہاتھ نہ پکڑے۔ اس بات کو اور زیادہ کھول کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے: يُؤْتٰى بِوَالٍ نَقَصَ مِنَ الْحَدِّ سَوْطًا فَيُقَالُ لَهُ لِمَ فَعَلْتَ ذَاكَ؟ فَيَقُوْلُ رَحْمَةً لِعِبَادِكَ۔ فَيُقَالُ لَهُ اَنْتَ اَرْحَمُ بِهِمْ مِنِّيْ؟ فَيُؤْمَرُ بِهِ اِلَى النَّارِ۔ وَيُؤْتٰى بِمَنْ زَادَ سَوْطًا فَيُقَالُ لَهُ لِمَ فَعَلْتَ ذَاكَ؟ فَيَقُوْلُ لِيَنْتَهُوْا عَنْ مَعَاصِيْكَ۔ فَيَقُوْلُ اَنْتَ اَحْكَمُ بِهِمْ مِنِّيْ فَيُؤْمَرُ بِهِ اِلَى النَّارِ۔ ''قیامت کے روز ایک حاکم لایا جائے گا جس نے حد میں سے ایک کوڑا کم کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا یہ حرکت تو نے کیوں کی تھی؟ وہ عرض کرے گا کہ آپ کے بندوں پر رحم کھا کر۔ ارشاد ہوگا اچھا، تو ان کے حق میں مجھ سے زیادہ رحیم تھا، پھر حکم ہوگا لے جاؤ اسے دوزخ میں۔ ایک اور حاکم لایا جائے گا جس نے حد پر ایک کوڑے کا اضافہ کر دیا تھا۔ پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ کس لیے کیا تھا؟ وہ عرض کرے گا تا کہ لوگ آپ کی نافرمانیوں سے باز رہیں۔ ارشاد ہوگا اچھا، تو ان کے معاملے میں مجھ سے زیادہ حکیم تھا! پھر حکم ہوگا کہ لے جاؤ اسے دوزخ میں''۔[۱] (تفسیر کبیر: ج ۶ ص ۲۲۵)

یہ تو اس صورت میں ہے جب کہ کمی بیشی کا عمل رحم یا مصلحت کی بنا پر ہو۔ لیکن اگر کہیں احکام میں رد و بدل مجرموں کے

---

[۱] تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۳۸۷، اشاعت سوم۔

[۲] ایضاً۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرتبے کی بنا پر ہونے لگے تو پھر یہ ایک بدترین جرم ہے۔ صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں فرمایا: لوگو، تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ ہلاک ہوگئیں اس لیے کہ جب ان میں سے کوئی عزت والا چوری کرتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کرتا تو حد جاری کرتے تھے۔'' ایک اور روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک حد جاری کرنا اہلِ زمین کے لیے چالیس دن کی بارش سے زیادہ مفید ہے''۔ (نسائی و ابن ماجہ)۔[1]

بعض مفسرین نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مجرم کو جرم ثابت ہونے کے بعد چھوڑ نہ دیا جائے اور نہ سزا میں کمی کی جائے، بلکہ پورے سو کوڑے مارے جائیں اور بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہلکی مار نہ ماری جائے جس کی کوئی تکلیف ہی مجرم محسوس نہ کرے۔ آیت کے الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں، بلکہ حق یہ ہے کہ دونوں ہی مراد معلوم ہوتے ہیں اور مزید برآں یہ مراد بھی ہے کہ زانی کو وہی سزا دی جائے جو اللہ نے تجویز فرمائی ہے، اسے کسی اور سزا سے نہ بدل دیا جائے۔ کوڑوں کے بجائے کوئی اور سزا دینا اگر رحم اور شفقت کی بنا پر ہو تو معصیت ہے، اور اگر اس خیال کی بنا پر ہو کہ کوڑوں کی سزا ایک وحشیانہ سزا ہے تو یہ قطعی کفر ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی ایمان کے ساتھ ایک سینے میں جمع نہیں ہوسکتا۔ خدا کو خدا بھی ماننا اور اس کو معاذ اللہ وحشی بھی کہنا صرف انھی لوگوں کے لیے ممکن ہے جو ذلیل ترین قسم کے منافق ہیں۔ (تفہیم القرآن: ج ۳، ص ۳۴۴، النور، حاشیہ ۳)

سزا علی الاعلان دی جائے (اسلام کا نظریۂ سزا)

وَلۡيَشۡهَدۡ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ۔ (النور ۲۴: ۲)

اور ان کو سزا دیتے وقت اہلِ ایمان کا ایک گروہ موجود رہے۔

سزا علی الاعلان عام لوگوں کے سامنے دی جائے، تاکہ ایک طرف مجرم کو نصیحت ہو اور دوسری طرف عوام الناس کو نصیحت۔ اس سے اسلام کے نظریۂ سزا پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ سورۂ مائدہ میں چوری کی سزا بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا: جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ۔ ان کے کیے کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے جرم کو روکنے والی سزا۔ (المائدۃ ۵: ۳۸) اور اب یہاں ہدایت کی جارہی ہے کہ زانی کو علانیہ لوگوں کے سامنے عذاب دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون میں سزا کے تین مقصد ہیں۔ اول یہ کہ مجرم سے اس زیادتی کا بدلہ لیا جائے اور اس کو اس برائی کا مزا چکھایا جائے جو اس نے کسی دوسرے شخص یا معاشرے کے ساتھ کی تھی۔ دوم یہ کہ اسے اعادۂ جرم سے باز رکھا جائے۔ سوم یہ کہ اس کی سزا کو ایک عبرت بنا دیا جائے تاکہ معاشرے میں جو دوسرے لوگ بُرے میلانات رکھنے والے ہوں ان کے دماغ کا آپریشن ہوجائے اور وہ اس طرح کے کسی جرم کی جرأت نہ کرسکیں۔ اس کے علاوہ علانیہ سزا دینے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں حکام سزا دینے میں بے جا رعایت یا بے جا سختی کرنے کی کم ہی جرأت کرسکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن: ج ۳، ص ۳۴۴، النور، حاشیہ ۴)

۱۔ تفہیم الاحادیث، ج ۵، ص ۳۸۷، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بدچلنی (زنا) کی صورت میں لونڈی کی سزا

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَیْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (النساء۴:۲۵)

پھر جب وہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو جائیں اور اس کے بعد کسی بدچلنی کی مرتکب ہوں تو ان پر اس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو خاندانی عورتوں (محصنات) کے لیے مقرر ہے۔ یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بندِ تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن تم صبر کرو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوتی ہے جس سے خوارج اور ان دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ’’اگر آزاد شادی شدہ عورت کے لیے شریعتِ اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے۔ لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں۔ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ محصنات (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورتیں، جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو۔ دوسرے خاندانی عورتیں، جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو، اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں ’’محصنات‘‘ کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لیے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنی میں، جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لیے محصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لیے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔

اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے، کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو صرف شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری، کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی مِلک میں وہ تھی، اور نہ اسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لہٰذا اسے جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورت کی سزا سے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورۂ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے۔ رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے سزائے رجم کی تصریح نہیں کرتا، لیکن نہایت لطیف طریقے سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الذہن لوگوں سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے، نبی کے ذہن رسا سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا۔ (تفہیم القرآن: جلد اول، ص ۳۴۲-۳۴۳، النساء، حاشیہ ۶۴)

کیا دنیا میں دی گئی شرعی سزا آخرت میں برأت کا موجب ہوگی؟

سوال: کیا اگر کسی گناہ [مثلاً زنا] کی شرعی سزا ایک شخص کو اسلامی حکومت کی جانب سے مل جائے تو وہ آخرت میں اس گناہ کی سزا سے بری ہو جائے گا یا کہ نہیں؟

جواب: شرعی سزا ہو جانے کے بعد آخرت میں آدمی کی معافی اس صورت میں ہو سکتی ہے جب آدمی نے اس کے ساتھ خدا سے توبہ بھی کی ہو اور اپنے نفس کی اصلاح کر لی ہو۔ لیکن اگر بالفرض ایک شخص نے چوری کی ہو اور اس کا ہاتھ کاٹ ڈالا گیا، مگر اس نے اپنے گناہ پر اپنے خدا کے سامنے کوئی اعتراف ندامت نہ کیا ہو، کوئی توبہ نہ کی، چوری چھوڑنے کا کوئی فیصلہ نہ کیا ہو، بلکہ الٹا اپنے دل میں اس شریعت کو ہی کوستا رہا جس نے اس کا ہاتھ کٹوایا ہے، تو خدا کے ہاں اس کے معاف کر دیے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(رسائل ومسائل: حصہ سوم، ص ۲۹۵-۲۹۶، اشاعت ششم، جولائی ۱۹۷۶ء، بحوالہ ترجمان القرآن فروری ۱۹۶۱ء)

❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

حدِ قذف

پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے والوں کی سزا اور اس کا منشا

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۚ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (النور ۲۴: ۴-۵)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، ان کو اَسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں، سوائے ان لوگوں کے جو اس حرکت کے بعد تائب ہو جائیں اور اصلاح کر لیں کہ اللہ ضرور (ان کے حق میں) غفور و رحیم ہے۔

حکم کا منشا

اس حکم کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں لوگوں کی آشنائیوں اور ناجائز تعلقات کے چرچے قطعی طور پر بند کر دیے جائیں، کیونکہ اس سے بے شمار برائیاں پھیلتی ہیں، اور ان میں سب سے بڑی برائی یہ ہے کہ اس طرح غیر محسوس طریقے پر ایک عام زناکارانہ ماحول بنتا چلا جاتا ہے۔ ایک شخص مزے لے لے کر کسی کے صحیح یا غلط گندے واقعات دوسروں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ دوسرے اس میں نمک مرچ لگا کر اور لوگوں تک انھیں پہنچاتے ہیں، اور ساتھ ساتھ کچھ مزید لوگوں کے متعلق بھی اپنی اپنی معلومات یا بدگمانیاں بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف شہوانی جذبات کی ایک عام رو چل پڑتی ہے، بلکہ بُرے میلانات رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو بھی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ معاشرے میں کہاں کہاں ان کے لیے قسمت آزمائی کے مواقع موجود ہیں۔ شریعت اس چیز کا سدباب پہلے ہی قدم پر کر دینا چاہتی ہے۔ ایک طرف وہ حکم دیتی ہے کہ اگر کوئی زنا کرے اور شہادتوں سے اس کا جرم ثابت ہو جائے تو اس کو وہ انتہائی سزا دو جو کسی اور جرم پر نہیں دی جاتی اور دوسری طرف وہ فیصلہ کرتی ہے کہ جو شخص کسی پر زنا کا الزام لگائے وہ یا تو شہادتوں سے اپنا الزام ثابت کرے، ورنہ اس پر اسّی کوڑے برسا دو تا کہ آیندہ کبھی وہ اپنی زبان سے ایسی بات بلا ثبوت نکالنے کی جرأت نہ کرے۔ بالفرض اگر الزام لگانے والے نے کسی کو اپنی آنکھوں سے بھی بدکاری کرتے دیکھ لیا تب بھی اسے خاموش رہنا چاہیے اور دوسروں تک اسے نہ پہنچانا چاہیے، تا کہ گندگی جہاں ہے وہیں پڑی رہے، آگے نہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پھیل سکے۔ البتہ اگر اس کے پاس گواہ موجود ہیں تو معاشرے میں بیہودہ چرچے کرنے کے بجائے معاملہ حکام کے پاس لے جائے اور عدالت میں ملزم کا جرم ثابت کر کے اسے سزا دلوادے۔

اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیلات نگاہ میں رہیں۔ اس لیے ہم ذیل میں ان کو نمبروار بیان کر رہے ہیں:

(۱) قذف مستقل اصطلاح ہے

آیت میں الفاظ "وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ" استعمال ہوئے ہیں جن کے معنی ہیں "وہ لوگ جو الزام لگائیں"۔ لیکن سیاق وسباق یہ بتاتا ہے کہ یہاں الزام سے مراد ہر قسم کا الزام نہیں، بلکہ مخصوص طور پر زنا کاری کا الزام ہے۔ پہلے زنا کا حکم بیان ہوا ہے اور آگے لعان کا حکم آ رہا ہے، ان دونوں کے درمیان اس حکم کا آنا صاف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں "الزام" سے مراد کس نوعیت کا الزام ہے پھر الفاظ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (الزام لگائیں پاک دامن عورتوں پر) سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ مراد وہ الزام ہے جو پاک دامنی کے خلاف ہو۔ اس پر مزید یہ کہ الزام لگانے والوں سے اپنے الزام کے ثبوت میں چار گواہ لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے جو پورے قانونِ اسلامی میں صرف زنا کا نصاب شہادت ہے۔ ان قرائن کی بنا پر تمام امت کے علما کا اجماع ہے کہ اس آیت میں صرف الزام زنا کا حکم بیان ہوا ہے، جس کے لیے علمانے "قذف" کی مستقل اصطلاح مقرر کر دی ہے تاکہ دوسری تہمت تراشیاں (مثلاً کسی کو چور، شرابی، یا سود خوار، یا کافر کہہ دینا) اس حکم کی زد میں نہ آئیں" قذف کے سوا دوسری تہمتوں کی سزا قاضی خود تجویز کر سکتا ہے، یا مملکت کی مجلسِ شوریٰ حسبِ ضرورت ان کے لیے توہین اور ازالۂ حیثیت عرفی کا کوئی عام قانون بنا سکتی ہے۔

(۲) کیا یہ الزام صرف عورتوں پر لگانے تک محدود ہے؟

آیت میں اگرچہ الفاظ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ (پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں) استعمال ہوئے ہیں، لیکن فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ حکم صرف عورتوں ہی پر الزام لگانے تک محدود نہیں ہے بلکہ پاک دامن مردوں پر بھی الزام لگانے کا یہی حکم ہے۔ اسی طرح اگرچہ الزام لگانے والوں کے لیے الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ صرف مردوں ہی کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اگر جرم قذف کی مرتکب ہوں تو وہ اسی حکم کی سزاوار ہوں گی۔ کیونکہ جرم کی شناعت میں قاذف یا مقذوف کے مرد یا عورت ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لہٰذا قانون کی شکل یہ ہوگی کہ جو مرد یا عورت بھی کسی پاک دامن مرد یا عورت پر زنا کا الزام لگائے اس کا یہ حکم ہے۔ (واضح رہے کہ یہاں محصن اور محصنہ سے مراد شادی شدہ مرد اور عورت نہیں بلکہ پاک دامن مرد اور عورت ہیں)

(۳) حکم کا نفاذ کب ہوگا

یہ حکم صرف اسی صورت میں نافذ ہوگا جب کہ الزام لگانے والے نے محصنین یا محصنات پر الزام لگایا ہو۔ کسی غیر محصن پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الزام لگانے کی صورت میں اس کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ غیر محصن اگر بدکاری میں معروف ہو تب تو اس پر الزام لگانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن اگر وہ ایسا نہ ہو تو اس کے خلاف بلا ثبوت الزام لگانے والے کے لیے قاضی خود سزا تجویز کر سکتا ہے، یا ایسی صورتوں کے لیے مجلسِ شوریٰ حسب ضرورت قانون بنا سکتی ہے۔

(۴) فعل قذف کے ثبوت کے لیے شرائط

کسی فعل کے مستلزمِ سزا ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں ہے کہ کسی نے کسی پر بدکاری کا بلا ثبوت الزام لگایا ہے، بلکہ اس کے لیے کچھ شرطیں قاذف (الزام لگانے والے) میں، اور کچھ مقذوف (الزام کے ہدف بنائے جانے والے) اور کچھ خود فعل قذف میں پائی جانی ضروری ہیں۔

شرائط برائے قاذف

قاذف میں جو شرطیں پائی جانی چاہییں وہ یہ ہیں:

اوّل یہ کہ وہ بالغ ہو، بچہ اگر قذف کا مرتکب ہو تو اسے تعزیر دی جا سکتی ہے مگر اس پر حد جاری نہیں کی جا سکتی۔ دوم یہ کہ وہ عاقل ہو۔ مجنون پر حد قذف جاری نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حرام نشے کے سوا کسی دوسری نوعیت کے نشے کی حالت میں، مثلاً کلوروفارم کے زیر اثر الزام لگانے والے کو بھی مجرم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ سوم یہ کہ اس نے اپنے آزاد ارادے سے (فقہا کی اصطلاح میں طائعاً) یہ حرکت کی ہو۔ کسی کے جبر سے قذف کا ارتکاب کرنے والا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ چہارم یہ کہ وہ مقذوف کا اپنا باپ یا دادا نہ ہو، کیونکہ ان پر حد قذف جاری نہیں کی جا سکتی۔ ان کے علاوہ حنفیہ کے نزدیک ایک پانچویں شرط یہ بھی ہے کہ وہ ناطق ہو، گونگا اگر اشاروں میں الزام لگائے تو وہ حد قذف کا مستوجب نہ ہوگا۔ لیکن امام شافعی کو اس سے اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر گونگے کا اشارہ بالکل صاف اور صریح ہو جسے دیکھ کر ہر شخص سمجھ لے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تو وہ قاذف ہے، کیونکہ اس کا اشارہ ایک ہی شخص کو بدنام و رسوا کر دینے میں تصریح بالقول سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اس کے برعکس حنفیہ کے نزدیک محض اشارے کی صراحت اتنی قوی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ایک آدمی کو کوڑوں کی سزا دے ڈالی جائے۔ وہ اس پر صرف تعزیر دیتے ہیں۔

وہ شرطیں جو مقذوف میں پائی جانی چاہییں

پہلی شرط یہ کہ وہ عاقل ہو، یعنی اس پر بحالت عقل زنا کا الزام لگایا گیا ہو۔ مجنون پر (خواہ وہ بعد میں عاقل ہو گیا ہو یا نہ ہوا ہو) الزام لگانے والا حد قذف کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ مجنون اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا اور اس پر اگر زنا کی شہادت قائم بھی ہو جائے تو نہ وہ حد زنا کا مستحق ہوتا ہے نہ اس کی عزت پر حرف آتا ہے۔ لہٰذا اس پر الزام لگانے والا بھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حدِ قذف کا مستحق نہ ہونا چاہیے۔ لیکن امام مالک اور امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ مجنون قاذف حد کا مستحق ہے کیونکہ بہرحال وہ ایک بے ثبوت الزام لگا رہا ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بالغ ہو۔ یعنی اس پر بحالت بلوغ زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا ہو۔ بچے پر الزام لگانا، یا جوان پر اس امر کا الزام لگانا کہ وہ بچپن میں اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، حدِ قذف کا موجب نہیں ہے۔ کیونکہ مجنون کی طرح بچہ بھی اپنی عصمت کے تحفظ کا اہتمام نہیں کر سکتا، نہ وہ حدِ زنا کا مستوجب ہوتا ہے اور نہ اس کی عزت مجروح ہوتی ہے۔ لیکن امام مالکؒ کہتے ہیں کہ سن بلوغ کے قریب عمر کے لڑکے پر اگر زنا کے ارتکاب کا الزام لگایا جائے تب تو قاذف حد کا مستحق نہیں ہے، لیکن اگر ایسی عمر کی لڑکی پر زنا کرانے کا الزام لگایا جائے جس کے ساتھ مباشرت ممکن ہو، تو اس کا قاذف حد کا مستحق ہے، کیونکہ اس سے نہ صرف لڑکی بلکہ اس کے خاندان تک کی عزت مجروح ہو جاتی ہے اور لڑکی کا مستقبل خراب ہو جاتا ہے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو، یعنی اس پر بحالت اسلام زنا کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ کافر پر الزام، یا مسلم پر یہ الزام کہ وہ بحالت کفر اس فعل کا مرتکب ہوا تھا، موجب حد نہیں ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ آزاد ہو۔ لونڈی یا غلام پر الزام، یا آزاد پر یہ الزام کہ وہ بحالت غلامی میں اس کا مرتکب ہوا تھا، موجب حد نہیں ہے، کیونکہ غلام کی بے بسی اور کمزوری یہ امکان پیدا کر دیتی ہے کہ وہ اپنی عصمت کا اہتمام نہ کر سکے۔ خود قرآن میں بھی غلامی کی حالت کو احصان کی حالت قرار نہیں دیا گیا ہے، چنانچہ سورۂ نساء میں محصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل استعمال ہوا ہے۔ لیکن داؤد ظاہری اس دلیل کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ لونڈی اور غلام کا قاذف بھی حد کا مستحق ہے۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ عفیف ہو، یعنی اس کا دامن زنا اور شبہ زنا سے پاک ہو۔ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر پہلے کبھی جرمِ زنا ثابت نہ ہو چکا ہو۔ شبہ زنا سے پاک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاح فاسد، یا خفیہ نکاح، یا مشتبہ ملکیت، یا شبہ نکاح میں مباشرت نہ کر چکا ہو، نہ اس کے حالات زندگی ایسے ہوں جن میں اس پر بدچلنی اور آبرو باختگی کا الزام چسپاں ہو سکتا ہو اور نہ زنا سے کم تر درجہ کی بداخلاقیوں کا الزام اس پر پہلے کبھی ثابت ہو چکا ہو، کیونکہ ان سب صورتوں میں اس کی عفت مجروح ہو جاتی ہے، اور ایسی مجروح عفت پر الزام لگانے والا ۸۰ کوڑوں کی سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ حتیٰ کہ اگر حدِ قذف جاری ہونے سے پہلے مقذوف کے خلاف کسی جرمِ زنا کی شہادت قائم ہو جائے، تب بھی قاذف چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ وہ شخص پاک دامن نہ رہا جس پر اس نے الزام لگایا تھا۔

مگر ان پانچوں صورتوں میں حد نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مجنون، یا بچے، یا کافر، یا غلام، یا غیر عفیف آدمی پر بلا ثبوت الزام لگا دینے والا مستحق تعزیر بھی نہیں ہے۔

فعلِ قذف میں پائی جانے والی شرائط

اب وہ شرطیں لیجیے جو خود فعلِ قذف میں پائی جانی چاہییں۔ ایک الزام کو دو چیزوں میں سے کوئی ایک چیز قذف بنا سکتی ہے۔ یا تو قاذف نے مقذوف پر ایسی وطی کا الزام لگایا ہو جو، اگر شہادتوں سے ثابت ہو جائے تو مقذوف پر حد واجب ہو جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یا پھر اس نے مقذوف کو ولد الزنا قرار دیا ہو۔ لیکن دونوں صورتوں میں الزام صاف اور صریح ہونا چاہیے۔ کنایات کا اعتبار نہیں ہے جن سے زنا یا طعن فی النسب مراد ہونے کا انحصار قاذف کی نیت پر ہے۔ مثلاً کسی کو فاسق، فاجر، بدکار، بدچلن وغیرہ کے الفاظ سے یاد کرنا، یا کسی عورت کو رنڈی، کسبن، یا چھنالی کہنا، یا کسی سید کو پٹھان کہہ دینا کنایہ ہے جس سے صریح قذف لازم نہیں آتا۔ اسی طرح جو الفاظ محض گالی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، مثلاً حرامی، یا حرام زادہ وغیرہ ان کو بھی صریح قذف نہیں قرار دیا جا سکتا۔ البتہ تعریض کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ بھی قذف ہے یا نہیں۔ مثلاً کہنے والا کسی کو مخاطب کر کے یوں کہے کہ "ہاں، مگر میں تو زانی نہیں ہوں" یا "میری ماں نے تو زنا کر کے مجھے نہیں جنا" امام مالک کہتے ہیں کہ اس طرح کی تعریض جس سے صاف سمجھ میں آ جائے کہ قائل کی مراد مخاطب کو زانی یا ولد الزنا قرار دینا ہے، قذف ہے جس پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام شافعیؒ، سفیان ثوریؒ، ابن شُبرمہ، اور حسن بن صالحؒ اس بات کے قائل ہیں کہ تعریض میں بہر حال شک کی گنجائش ہے اور شک کے ساتھ حد جاری نہیں کی جا سکتی۔ امام احمدؒ اور ابن اسحاق راھویہ کہتے ہیں کہ تعریض اگر لڑائی جھگڑے میں ہو تو قذف ہے اور ہنسی مذاق میں ہو تو قذف نہیں ہے۔ خلفاء میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے تعریض پر حد جاری کی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو آدمیوں کے درمیان گالم گلوچ ہوگئی۔ ایک نے دوسرے سے کہا: "نہ میرا باپ زانی تھا اور نہ میری ماں زانیہ تھی"۔ معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس آیا۔ آپ نے حاضرین سے پوچھا آپ لوگ اس سے کیا سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگوں نے کہا اس نے اپنے باپ اور ماں کی تعریف کی ہے، اس کے ماں باپ پر تو حملہ نہیں کیا۔ کچھ دوسرے لوگوں نے کہا اس کے لیے اپنے ماں باپ کی تعریف کرنے کے لیے کیا یہی الفاظ رہ گئے تھے؟ ان خاص الفاظ کو اس موقع پر استعمال کرنے سے صاف مراد یہی ہے کہ اس کے ماں باپ زانی تھے۔ حضرت عمرؓ نے دوسرے گروہ سے اتفاق کیا اور حد جاری کر دی۔ (جصاص: ج ۳ ص ۳۳۰) اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ کسی پر عمل قوم لوط کے ارتکاب کا الزام لگانا قذف ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کو قذف نہیں مانتے۔ امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام مالکؒ، اور امام شافعیؒ اسے قذف قرار دیتے ہیں اور حد کا حکم لگاتے ہیں۔

(۵) کیا جرم قذف قابلِ دست اندازیٔ سرکار ہے؟

جرمِ قذف قابلِ دست اندازیِ سرکار (Cognizable Offence) ہے یا نہیں، اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ یہ حقُّ اللہ ہے اس لیے قاذف پر بہر حال حد جاری کی جائے گی خواہ مقذوف مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کے نزدیک یہ اس معنی میں تو ضرور ہے کہ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد جاری کرنا واجب ہے، لیکن اس پر مقدمہ چلانا مقذوف کے مطالبے پر موقوف ہے، اور اس لحاظ سے یہ حقِ آدمی ہے۔ یہی رائے امام شافعیؒ اور امام اوزاعیؒ کی بھی ہے۔ امام مالک کے نزدیک اس میں تفصیل ہے۔ اگر حاکم کے سامنے قذف کا ارتکاب کیا جائے تو یہ جرم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قابل دست اندازی سرکار ہے، ورنہ اس پر کارروائی کرنا مقذوف کے مطالبے پر منحصر ہے۔

(۶) کیا جرمِ قذف قابلِ راضی نامہ ہے

جرم قذف قابلِ راضی نامہ (Compoundable Offence) نہیں ہے۔ مقذوف عدالت میں دعویٰ لے کر نہ آئے تو یہ دوسری بات ہے، لیکن عدالت میں معاملہ آ جانے کے بعد قاذف کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ اپنا الزام ثابت کرے، اور ثابت نہ ہونے کی صورت میں اس پر حد جاری کی جائے گی۔ نہ عدالت اس کو معاف کر سکتی ہے اور نہ خود مقذوف۔ نہ کسی مالی تاوان پر معاملہ ختم ہو سکتا ہے۔ نہ توبہ کر کے یا معافی مانگ کر سزا سے بچ سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ **تعافوا لحدود فیما بینکم فما بلغنی من حد فقد وجب** ''حدود کو آپس ہی میں معاف کر دو، مگر جس حد کا معاملہ میرے پاس پہنچ گیا پھر وہ واجب ہو گئی''۔

(۷) حد قذف کے مطالبے کا حق دار کون ہے؟

حنفیہ کے نزدیک حد قذف کا مطالبہ یا خود مقذوف کر سکتا ہے، یا پھر جس کے نسب پر اس سے حرف آتا ہو اور مطالبہ کرنے کے لیے خود مقذوف موجود نہ ہو، مثلاً باپ، ماں، اولاد اور اولاد کی اولاد۔ مگر امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حق قابل توریث ہے۔ مقذوف مر جائے تو اس کا ہر شرعی وارث حد کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعی بیوی اور شوہر کو اس سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ موت کے ساتھ رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے اور بیوی یا شوہر میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا، حالانکہ یہ دونوں ہی دلیلیں کمزور ہیں۔ مطالبۂ حد کو قابل توریث ماننے کے بعد یہ کہنا کہ یہ حق بیوی اور شوہر کو اس لیے نہیں پہنچتا کہ موت کے ساتھ رشتۂ زوجیت ختم ہو جاتا ہے خود قرآن کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن نے ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کو اس کا وارث قرار دیا ہے۔ رہی یہ بات کہ زوجین میں سے کسی ایک پر الزام آنے سے دوسرے کے نسب پر کوئی حرف نہیں آتا، تو یہ شوہر کے معاملے میں چاہے صحیح ہو مگر بیوی کے معاملے میں تو قطعاً غلط ہے۔ جس کی بیوی پر الزام رکھا جائے اس کی تو پوری اولاد کا نسب مشتبہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ حد قذف صرف نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنے کی وجہ سے واجب قرار دی گئی ہے۔ نسب کے ساتھ عزت پر حرف آنا بھی اس کی ایک اہم وجہ ہے، اور ایک شریف مرد یا عورت کے لیے یہ کچھ کم بے عزتی نہیں ہے کہ اس کی بیوی یا اس کے شوہر کو بدکار قرار دیا جائے۔ لہٰذا اگر حد قذف کا مطالبہ قابل توریث ہو تو زوجین کو اس سے مستثنیٰ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔

(۸) حد قذف سے بچنے کا راستہ

یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد ایک شخص نے قذف کا ارتکاب کیا ہے، جو چیز اسے حد سے بچا سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ چار گواہ ایسے لائے جو عدالت میں یہ شہادت دیں کہ انھوں نے مقذوف کو فلاں مرد یا فلاں عورت کے ساتھ بالفعل زنا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرتے دیکھا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ چاروں گواہ بیک وقت عدالت میں آنے چاہییں اور انھیں بیک وقت شہادت دینی چاہیے، کیونکہ اگر وہ یکے بعد دیگرے آئیں تو ان میں سے ہر ایک قاذف ہوتا چلا جائے گا اور اس کے لیے پھر چار گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ لیکن یہ ایک کمزور بات ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو امام شافعی اور عثمان البتی نے کہی ہے کہ گواہوں کے بیک وقت آنے اور یکے بعد دیگرے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بلکہ زیادہ بہتر یہ ہے کہ دوسرے مقدمات کی طرح گواہ ایک کے بعد ایک آئے اور شہادت دے۔ حنفیہ کے نزدیک ان گواہوں کا عادل ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر قاذف چار فاسق گواہ بھی لے آئے تو حد قذف سے بچ جائے گا اور ساتھ ہی مقذوف بھی حد زنا سے محفوظ رہے گا کیوں کہ گواہ عادل نہیں ہیں۔ البتہ کافر، یا اندھے، یا غلام، یا قذف کے جرم میں پہلے کے سزا یافتہ گواہ پیش کر کے قاذف سزا سے بچ نہیں سکتا۔ مگر امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ قاذف اگر فاسق گواہ پیش کرے تو وہ اور اس کے گواہ سب حد کے مستحق ہوں گے اور یہی رائے امام مالکؒ کی بھی ہے۔ اس معاملے میں حنفیہ کا مسلک ہی اقرب الصواب معلوم ہوتا ہے۔ گواہ اگر عادل ہوں تو قاذف جرم قذف سے بری ہو جائے گا اور مقذوف پر جرم زنا ثابت ہو جائے گا۔ لیکن اگر گواہ عادل نہ ہوں تو قاذف کا قذف اور مقذوف کا فعل زنا اور گواہوں کا صدق وکذب، ساری ہی چیزیں مشکوک قرار پائیں گی اور شک کی بنا پر کسی کو بھی حد کا مستوجب قرار نہ دیا جا سکے گا۔

(۹) ایسی شہادت پیش نہ کیے جانے کی صورت میں سزا کی نوعیت

جو شخص ایسی شہادت پیش نہ کر سکے جو اسے قذف سے بری کر سکتی ہو، اس کے لیے قرآن نے تین حکم ثابت کیے ہیں: ایک یہ کہ اسے ۸۰ کوڑے لگائے جائیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہے۔ اس کے بعد قرآن کہتا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (آل عمران ۳:۸۹)۔ ”سوائے ان لوگوں کے جو اس کے بعد توبہ کریں اور اصلاح کریں، کہ اللہ غفور اور رحیم ہے“۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فقرے میں توبہ اور اصلاح سے جس معافی کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تعلق ان تینوں احکام میں سے کس کے ساتھ ہے۔ فقہا کا اس پر اتفاق ہے کہ پہلے حکم سے اس کا تعلق نہیں ہے، یعنی توبہ سے حد ساقط نہ ہوگی اور مجرم کو سزائے تازیانہ بہر حال دی جائے گی۔ فقہا اس پر بھی متفق ہیں کہ اس معافی کا تعلق آخری حکم سے ہے، یعنی توبہ اور اصلاح کے بعد مجرم فاسق نہ رہے گا اور اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔ (اس میں اختلاف صرف اس پہلو سے ہے کہ آیا مجرم نفس قذف سے فاسق ہوتا ہے یا عدالتی فیصلہ صادر ہونے کے بعد فاسق قرار پاتا ہے۔ امام شافعیؒ اور لیثؒ بن سعد کے نزدیک وہ نفس قذف سے فاسق ہو جاتا ہے اس لیے وہ اسی وقت سے اس کو مردود الشہادت قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ وہ عدالتی فیصلہ نافذ ہو جانے کے بعد فاسق ہوتا ہے، اس لیے وہ نفاذ حکم سے پہلے تک اس کو مقبول الشہادت سمجھتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ مجرم کا عنداللہ فاسق ہونا نفسِ قذف کا نتیجہ ہے اور عندالناس فاسق ہونا اس پر موقوف ہے کہ عدالت میں اس کا جرم ثابت ہو اور وہ سزا پائے)۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اب رہ جاتا ہے بیچ کا حکم، یعنی یہ کہ ''قاذف کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے''۔ فقہا کے درمیان اس پر بڑا اختلاف واقع ہو گیا ہے کہ آیا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کے فقرے کا تعلق اس حکم سے بھی ہے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اس فقرے کا تعلق صرف آخری حکم سے ہے، یعنی جو شخص توبہ اور اصلاح کرے گا وہ عنداللہ اور عندالناس فاسق نہ رہے گا، لیکن پہلے دونوں حکم اس کے باوجود برقرار رہیں گے، یعنی مجرم پر حد بھی جاری کی جائے گی اور وہ ہمیشہ کے لیے مردود الشہادت بھی رہے گا۔ اس گروہ میں قاضی شریح، سعید بن مسیّب، سعید بن جبیر، حسن بصری، ابراہیم نخعی، ابن سیرین، مکحول، عبدالرحمٰن بن زید، ابوحنیفہ، ابویوسف، زُفر، محمد، سفیان ثوری، اور حسن بن صالح جیسے اکابر شامل ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا کا تعلق پہلے حکم سے تو نہیں ہے مگر آخری دونوں حکموں سے ہے، یعنی توبہ کے بعد قذف کے سزا یافتہ مجرم کی شہادت بھی قبول کی جائے گی اور وہ فاسق بھی شمار نہ ہو گا۔ اس گروہ میں عطاء، طاؤس، مجاہد، شعبی، قاسم بن محمد، سالم، زہری، عکرمہ، عمر بن عبدالعزیز، ابن ابی نجیح، سلیمان بن یسار، مسروق، ضحاک، مالک بن انس، عثمان البتی، لیث بن سعد، شافعی، احمد بن حنبل، اور ابن جریر طبری جیسے بزرگ شامل ہیں۔ یہ لوگ اپنی تائید میں دوسرے دلائل کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے کو بھی پیش کرتے ہیں جو انھوں نے مغیرہ بن شعبہ کے مقدمے میں کیا تھا، کیونکہ اس کی بعض روایات میں یہ ذکر ہے کہ حد جاری کرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ابوبکرہ اور ان کے دونوں ساتھیوں سے کہا کہ اگر تم توبہ کر لو (یا اپنے جھوٹ کا اقرار کر لو) تو میں آیندہ تمھاری شہادت قبول کروں گا ورنہ نہیں۔ دونوں ساتھیوں نے اقرار کر لیا، مگر ابوبکرہ اپنے قول پر قائم رہے۔ بظاہر یہ ایک بڑی قوی تائید معلوم ہوتی ہے، لیکن مغیرہ بن شعبہ کے مقدمے کی جو روداد ہم پہلے درج کر چکے ہیں اس پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس نظیر سے اس مسئلے میں استدلال کرنا درست نہیں ہے۔ وہاں نفسِ فعل متفق علیہ تھا اور خود مغیرہ بن شعبہ کو بھی اس سے انکار نہ تھا۔ بحث اس میں تھی کہ عورت کون تھی۔ مغیرہ بن شعبہ کہتے تھے کہ وہ ان کی بیوی تھیں جنھیں یہ لوگ ام جمیل سمجھ بیٹھے تھے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہو گئی تھی کہ حضرت مغیرہ کی بیوی اور ام جمیل باہم اس حد تک مشابہ تھیں کہ واقعہ جتنی روشنی میں جتنے فاصلے سے دیکھا گیا اس میں یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ عورت ام جمیل ہے۔ مگر قرائن سارے کے سارے مغیرہ بن شعبہ کے حق میں تھے اور خود استغاثے کا بھی ایک گواہ اقرار کر چکا تھا کہ عورت صاف نظر نہ آتی تھی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے مغیرہ بن شعبہ کے حق میں فیصلہ دیا اور ابوبکرہ کو سزا دینے کے بعد وہ بات کہی جو مذکورہ بالا روایتوں میں منقول ہوئی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا منشا دراصل یہ تھا کہ تم لوگ مان لو کہ تم نے بے جا بدگمانی کی تھی اور آیندہ کے لیے ایسی بدگمانیوں کی بنا پر لوگوں کے خلاف الزامات عائد کرنے سے توبہ کرو، ورنہ آیندہ تمھاری شہادت کبھی قبول نہ کی جائے گی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ جو شخص صریح جھوٹا ثابت ہو جائے وہ بھی حضرت عمرؓ کے نزدیک توبہ کر کے مقبول الشہادت ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں پہلے گروہ ہی کی رائے زیادہ وزنی ہے۔ آدمی کی توبہ کا حال خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔ ہمارے سامنے جو شخص توبہ کرے گا ہم اسے اس حد تک تو رعایت دے سکتے ہیں کہ اسے فاسق کے نام سے یاد نہ کریں، لیکن اس حد تک رعایت نہیں دے سکتے کہ جس کی زبان کا اعتبار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک دفعہ جا تا رہا ہے اس پر پھر محض اس لیے اعتبار کرنے لگیں کہ وہ ہمارے سامنے توبہ کر رہا ہے۔ علاوہ بریں خود قرآن کی عبارت کا اندازِ بیان بھی یہی بتا رہا ہے کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا تعلق صرف فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ سے ہے۔ اس لیے کہ عبارت کی پہلی دو باتیں حکم کے الفاظ میں فرمائی گئی ہیں: ''ان کو اسی (۸۰) کوڑے مارو'' اور ''ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو'' اور تیسری بات خبر کے الفاظ میں ارشاد ہوئی ہے: ''وہ خود ہی فاسق ہیں'' اس تیسری بات کے بعد متصلاً یہ فرمانا کہ ''سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کرلیں'' خود ظاہر کر دیتا ہے کہ یہ استثنا آخری فقرہ خبریہ سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ پہلے دو حکمی فقروں سے۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ استثنا آخری فقرہ خبریہ تک محدود نہیں ہے، تو پھر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ ''شہادت قبول نہ کرو'' کے فقرے تک پہنچ کر رک کیسے گیا، ''اسی کوڑے مارو، کے فقرے تک بھی کیوں نہ پہنچ گیا۔

(۱۰) ایک سوال اور اس کا جواب

سوال کیا جا سکتا ہے کہ اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا استثنا آخر پہلے حکم سے بھی متعلق کیوں نہ مان لیا جائے؟ قذف آخر ایک قسم کی توہین ہی تو ہے۔ ایک آدمی اس کے بعد اپنا قصور مان لے، مقذوف سے معافی مانگ لے اور آیندہ کے لیے اس حرکت سے توبہ کر لے تو آخر کیوں نہ اسے چھوڑ دیا جائے جب کہ اللہ تعالیٰ خود حکم بیان کرنے کے بعد فرما رہا ہے اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا ...... فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝ یہ تو عجیب بات ہوگی کہ خدا معاف کر دے اور بندے معاف نہ کریں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ توبہ دراصل ت و ب ہ کے تلفظ کا نام نہیں ہے بلکہ دل کے احساسِ ندامت اور عزمِ اصلاح اور رجوع الی الخیر کا نام ہے اور اس چیز کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے توبہ سے دنیوی سزائیں معاف نہیں ہوتیں بلکہ اخروی سزا معاف ہوتی ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اگر وہ توبہ کر لیں تو تم انھیں چھوڑ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ جو لوگ توبہ کر لیں گے میں ان کے حق میں غفور و رحیم ہوں۔ اگر توبہ سے دنیوی سزائیں بھی معاف ہونے لگیں تو آخر وہ کون سا مجرم ہے جو سزا سے بچنے کے لیے توبہ نہ کر لے گا؟

(۱۱) ایک اور سوال اور اس کا جواب

یہ بھی سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کا اپنے الزام کے ثبوت میں شہادت نہ لا سکنا لازماً یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ وہ جھوٹا ہو، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا الزام واقعی صحیح ہو اور وہ ثبوت مہیا کرنے میں ناکام رہا ہے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ اسے صرف ثبوت نہ دے سکنے کی بنا پر فاسق ٹھیرایا جائے، اور وہ بھی عند الناس ہی نہیں عند اللہ بھی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ایک شخص نے اگر اپنی آنکھوں سے بھی کسی کو بدکاری کرتے دیکھ لیا ہو پھر بھی وہ اس کا چرچا کرنے اور شہادت کے بغیر اس پر الزام عائد کرنے میں گناہ گار ہے۔ شریعت الٰہی یہ نہیں چاہتی کہ ایک شخص اگر ایک گوشے میں نجاست لیے بیٹھا ہو تو دوسرا شخص اسے اٹھا کر معاشرے میں پھیلانا شروع کر دے۔ اس نجاست کی موجودگی کا اگر اس کو علم ہے تو اس کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو وہ اس کو، جہاں وہ پڑی ہے وہیں پڑا رہنے دے، یا پھر اس کی موجودگی کا ثبوت دے تاکہ حکومت اسلامی کے حکام اسے صاف کر دیں۔ ان دو راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ اس کے لیے نہیں ہے۔ اگر وہ پبلک میں چرچا کرے گا تو محدود گندگی کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کا مجرم ہوگا اور اگر وہ قابل اطمینان شہادت کے بغیر حکام تک معاملہ لے جائے گا تو حکام اس گندگی کو صاف نہ کر سکیں گے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ اس مقدمے کی ناکامی گندگی کی اشاعت کا سبب بنے گی اور بدکاروں میں جرأت بھی پیدا کر دے گی۔ اس لیے ثبوت اور شہادت کے بغیر قذف کا ارتکاب کرنے والا بہر حال فاسق ہے خواہ وہ اپنی جگہ سچا ہی کیوں نہ ہو۔

حد قذف کی مار کی کیفیت

(۱۲) حدِ قذف کے بارے میں فقہائے حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ قاذف کو زانی کی بہ نسبت ہلکی مار ماری جائے۔ یعنی تازیانے تو اتنے ہی ہوں، مگر ضرب اتنی سخت نہ ہونی چاہیے جتنی زانی کو لگائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس الزام کے قصور میں اسے سزا دی جا رہی ہے اس میں اس کا جھوٹا ہونا بہر حال یقینی نہیں ہے۔

تکرارِ قذف میں جمہور فقہا کا مسلک

(۱۳) تکرارِ قذف کے بارے میں حنفیہ اور جمہور فقہا کا مسلک یہ ہے کہ قاذف نے سزا پانے سے پہلے یا سزا کے دوران میں خواہ کتنی ہی مرتبہ ایک شخص پر الزام لگایا ہو، اس پر ایک ہی حد جاری کی جائے گی اور اگر اجرائے حد کے بعد وہ اپنے سابق الزام ہی کی تکرار کرتا رہتا ہے تو جو حد اسے لگائی جا چکی ہے وہی کافی ہوگی۔ البتہ اگر اجرائے حد کے بعد وہ اس شخص پر ایک نیا الزام زنا عائد کر دے تو پھر نئے سرے سے مقدمہ قائم کیا جائے گا مغیرہ بن شعبہ کے مقدمے میں سزا پانے کے بعد ابوبکرہ کھلے بندوں کہتے رہے کہ "میں شہادت دیتا ہوں کہ مغیرہ نے زنا کا ارتکاب کیا تھا" حضرت عمر نے ارادہ کیا کہ ان پر پھر مقدمہ قائم کریں۔ مگر چونکہ وہ سابق الزام ہی کو دہرا رہے تھے اس لیے حضرت علیؓ نے رائے دی کہ اس پر دوسرا مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا، اور حضرت عمرؓ نے ان کی رائے قبول کر لی۔ اس کے بعد فقہا میں اس بات پر قریب قریب اتفاق ہو گیا کہ سزا یافتہ قاذف کو صرف نئے الزام پر پکڑا جا سکتا ہے، سابق الزام کے اعادے پر نہیں۔

قذفِ جماعت کے معاملے میں فقہا کا اختلاف

(۱۴) قذفِ جماعت کے معاملے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص بہت سے لوگوں پر بھی الزام لگائے، خواہ ایک لفظ میں یا الگ الگ الفاظ میں، تو اس پر ایک ہی حد لگائی جائے گی الا یہ کہ حد لگنے کے بعد وہ پھر کسی نئے قذف کا ارتکاب کرے۔ اس لیے کہ آیت کے الفاظ یہ ہیں: "جو لوگ پاک دامن عورتوں پر الزام لگائیں" اس سے معلوم ہوا کہ ایک فرد ہی نہیں ایک جماعت پر الزام لگانے والا بھی ایک ہی حد کا مستحق ہوتا ہے۔ نیز اس لیے کہ زنا کا کوئی الزام ایسا نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوسکتا جو کم از کم دو شخصوں پر نہ لگتا ہو۔ مگر اس کے باوجود شارع نے ایک ہی حد کا حکم دیا، عورت پر الزام کے لیے الگ اور مرد پر الزام کے لیے الگ حد کا حکم نہیں دیا۔ بخلاف اس کے امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ ایک جماعت پر الزام لگانے والا خواہ ایک لفظ میں الزام لگائے یا الگ الگ الفاظ میں، اس پر ہر شخص کے لیے الگ الگ پوری حد لگائی جائے گی۔ یہی رائے عثمان البتی کی بھی ہے اور ابن ابی لیلیٰ کا قول، جس میں شعبی اور اوزاعی بھی ان کے ہم نوا ہیں، یہ ہے کہ ایک لفظ میں پوری جماعت کو زانی کہنے والا ایک حد کا مستحق ہے اور الگ الگ الفاظ میں ہر ایک کو کہنے والا ہر ایک کے لیے الگ الگ حد کا مستحق۔

(تفہیم القرآن: ج ۳۔ ص ۳۴۷ تا ۳۵۶۔ النور حاشیہ ۶)

قاذف کے لیے اخروی سزا

إِنَّ الَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ لُعِنُوا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (النور ۲۴: ۲۳-۲۴)

جو لوگ پاک دامن، بے خبر، مومن عورتوں پر تہمتیں لگاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ اس دن کو نہ بھول جائیں جب کہ ان کی اپنی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔

تہمت لگانا تباہ کن کبیرہ گناہ ہے

حدیث میں آتا ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا ان سات کبیرہ گناہوں میں سے ہے جو "موبقات" (تباہ کن) ہیں۔ اور طبرانی میں حضرت حذیفہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قذف المحصنة یھدم عمل مأة سنة۔ یعنی ایک پاک دامن عورت پر تہمت لگانا سو برس کے اعمال کو غارت کر دینے کے لیے کافی ہے"۔

(تفہیم القرآن: ج ۳۔ ص ۳۷۳، النور حاشیہ ۲۱)

www.kitabosunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

حد سرقہ

قرآن مجید میں اس کا ذکر

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (المائدة ۵:۳۸-۳۹)

اور چور خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو[1]، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا۔ اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا و بینا ہے۔ پھر جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے اور اپنی اصلاح کر لے تو اللہ کی نظر عنایت پھر اس پر مائل ہو جائے گی۔ اللہ بہت درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ "لَا قَطْعَ عَلٰی خَائِنٍ"۔ اس سے معلوم ہوا کہ سرقہ کا اطلاق خیانت وغیرہ پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس فعل پر ہوتا ہے کہ آدمی کسی کے مال کو اس کی حفاظت سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لے۔

سرقہ کا نصاب

پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت بھی فرمائی ہے کہ ایک ڈھال کی قیمت سے کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ ایک ڈھال کی قیمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بروایت عبداللہ بن عباسؓ دس درہم، بروایت ابن عمرؓ تین درہم، بروایت انسؓ بن مالک پانچ درہم اور بروایت حضرت عائشہؓ ایک چوتھائی دینار ہوتی تھی۔

نصاب سرقہ میں فقہا کا اختلاف

اسی اختلاف کی بنا پر فقہا کے درمیان کم سے کم نصاب سرقہ میں اختلاف ہوا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک سرقہ کا نصاب دس درہم ہے اور امام مالکؒ، شافعیؒ اور احمد کے نزدیک چوتھائی دینار۔ (اس زمانے کے درہم میں تین ماشہ 1.20 رتی چاندی ہوتی تھی اور چوتھائی دینار ۳ درہم کے برابر تھا۔)

---

[1] دونوں ہاتھ نہیں بلکہ ایک ہاتھ اور امت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ پہلی چوری پر سیدھا ہاتھ کاٹا جائے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ چیزیں جن میں قطع ید کی سزا نہیں

پھر بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے کہ لَا قَطْعَ فِيْ ثَمَرَةٍ وَلَا كَثْرٍ (پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا) لَا قَطْعَ فِي طَعَامٍ (کھانے کی چوری میں قطع ید نہیں ہے) اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے کہ لم یک قطع السارق علی عَهْدِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فِي الشَّيْءِ التَّافِةِ (حقیر چیزوں کی چوری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا)۔ حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کا فیصلہ ہے اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے اس پر اختلاف نہیں کیا ہے کہ لاقطع فی الطیر (پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے) نیز سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما نے بیت المال سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا اور اس معاملے میں صحابہ کرام میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔ ان مآخذ کی بنیاد پر مختلف ائمۂ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطعِ ید کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ترکاریاں، پھل، گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو، کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطعِ ید کی سزا نہیں ہے۔ نیز جنگل میں چرتے ہوئے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں بھی وہ قطعِ ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان چوریوں پر سرے سے کوئی سزا ہی نہ دی جائے گی۔ طلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔

قطع ید کے بعد توبہ

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کرلے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کرکے اللہ کا صالح بندہ بن جائے وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا، اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھودے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی، اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اسی لیے قرآن مجید چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظام تمدن کے لیے ہے۔ اس سزا سے نفس پاک نہیں ہوسکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رجوع الی اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں مذکور ہے کہ ایک چور کا ہاتھ جب آپ کے حکم سے کاٹا جاچکا تو آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا کہ قُلْ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ "کہ میں خدا سے معافی چاہتا ہوں اور اس سے توبہ کرتا ہوں" اس نے آپ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے۔ پھر آپ نے اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اَللّٰھُمَّ تُبْ عَلَیْہِ ’’خدایا اسے معاف فرما دے۔

(تفہیم القرآن: ج ا، ص ۴۶۷ تا ۴۶۹۔ المائدۃ حواشی ۶۰، ۶۱)

اسلام میں قطعِ ید کی سزا پر اعتراض کا جواب

سوال اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ آج کل روزانہ سیکڑوں چوریاں ہوتی ہیں تو کیا روزانہ سیکڑوں ہاتھ کاٹے جائیں گے؟ بظاہر حالات یہ سزا سخت اور ناقابل عمل معلوم ہوتی ہے۔

جواب: قطعِ ید اور اسلام کے دوسرے قوانین فوجداری کے بارے میں اگر میں اسلام کا نقطۂ نظر پوری وضاحت سے بیان کروں تو اس میں بڑا وقت لگے گا۔ میں اس موضوع پر اپنی کتاب اسلامی قوانین اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر میں تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ اس وقت میں صرف اتنی بات کہوں گا کہ جب چور کے ہاتھ کاٹنے کا طریقہ جاری ہوگا تو ان شاء اللہ چوری نہایت تھوڑے عرصے میں ختم ہو جائے گی اور سیکڑوں ہاتھوں کے کٹنے کی نوبت نہیں آئے گی۔ ایک چور یہ امید رکھتا ہے کہ میں دس ہزار روپیہ چرالوں گا، اگر پکڑا جاؤں گا تو کچھ مدت تک سرکاری روٹیاں کھا کر واپس آ جاؤں گا اور اس وقت بھی میرے پاس اچھا خاصا سرمایہ جمع ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص دوبارہ اولین موقع پاتے ہی پھر چوری کرے گا۔ اس طرح کے عادی مجرمین کی ہمارے ہاں کثرت ہے اور انھی کو جرائم سے باز رکھنا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ لیکن اگر چور کو یہ معلوم ہو کہ ایک مرتبہ پکڑے جانے کے بعد ایک ہاتھ اور دوسری مرتبہ پکڑے جانے کے بعد دوسرا ہاتھ کٹ جائے گا تو وہ چوری کرنے پر بآسانی آمادہ نہ ہوگا۔ پھر جس چور کا ہاتھ ایک مرتبہ کٹ جائے گا وہ جہاں جائے گا اس کا کٹا ہوا ہاتھ پکار پکار کر داستانِ حال بیان کرے گا اور موجودہ صورت حال باقی نہیں رہے گی جس میں پیشہ ور چور اور ڈاکو مہذب انسانوں کے بھیس میں چار سو اپنے شکار تلاش کرتے پھرتے ہیں اور کوئی انھیں پہچان بھی نہیں سکتا۔ میری قطعی رائے یہ ہے کہ چوری کے انسداد کے لیے اس قانون کے نفاذ کی شدید ضرورت ہے۔ تہذیب جدید کے بہت سے نقائص میں سے ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس کی ساری ہمدردیاں مجرم کے ساتھ ہیں، اس سوسائٹی کے ساتھ نہیں ہیں جس کے خلاف مجرم سرگرم کار ہے۔ مجرد یہ سننے پر کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اس تہذیب کے فرزندوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہولناک جرائم کو معاشرے میں پروان چڑھتے دیکھ کر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ آخر میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اسلام صرف چور کا ہاتھ ہی نہیں کاٹتا بلکہ وہ زکوٰۃ و صدقات کا نظام بھی قائم کرتا ہے، ہر شخص کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرتا ہے، وہ شہریوں کی اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کرتا ہے، وہ لوگوں کو حلال اور جائز طریق پر کمانا اور خرچ کرنا بھی سکھاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ایک شخص کی حلال کی کمائی کو کوئی دوسرا حرام طریقے سے چراتا ہے تو اسے ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتی ہے۔

(رسائل و مسائل: حصہ چہارم، ص ۱۸۱-۱۸۳، اشاعت اول۔ بحوالہ ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ، ستمبر ۱۹۵۴ء)

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

حرمتِ شراب اور اس کی حد

مکّی سورت میں حرمتِ شراب کی طرف اشارہ

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا۔ (النحل ۱۶:۶۷)

کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں سے بھی ہم ایک چیز تمھیں پلاتے ہیں جسے تم نشہ آور بھی بنا لیتے ہو اور پاک رزق بھی۔

اس میں ایک ضمنی اشارہ اس مضمون کی طرف بھی ہے کہ پھلوں کے اس عرق میں وہ مادہ بھی موجود ہے جو انسان کے لیے حیات بخش غذا بن سکتا ہے اور وہ مادہ بھی موجود ہے جو سڑ کر الکوہل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی قوتِ انتخاب پر منحصر ہے کہ وہ اس سرچشمے سے پاک رزق حاصل کرتا ہے یا عقل و خرد زائل کرنے والی شراب۔ ایک ضمنی اشارہ شراب کی حرمت کی طرف بھی ہے کہ وہ پاک رزق نہیں ہے۔

شراب اور جوئے کی حرمت

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔ (البقرۃ ۲:۲۱۹)

پوچھتے ہیں: شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو: ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

حرمتِ شراب کا پہلا حکم

یہ شراب اور جوئے کے متعلق پہلا حکم ہے، جس میں صرف اظہار ناپسندیدگی کر کے چھوڑ دیا گیا ہے، تاکہ ذہن ان کی حرمت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ بعد میں شراب پی کر نماز پڑھنے کی ممانعت آئی۔ پھر شراب اور جوئے اور اس نوعیت کی تمام چیزوں کو حرام کر دیا گیا۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۱۶۷-۱۶۸، البقرۃ حاشیہ ۲۳۵)

دوسرا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (النساء ۴:۴۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

یہ شراب کے متعلق دوسرا حکم ہے۔ غالباً ۴ھ کی ابتدا میں یہ دوسرا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے اپنے شراب پینے کے اوقات بدل دیے اور ایسے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی جن میں یہ اندیشہ ہوتا کہ نشے ہی کی حالت میں نماز کا وقت نہ آ جائے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ آیت میں سکر یعنی نشہ کا لفظ ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف شراب کے لیے خاص نہ تھا بلکہ ہر نشہ آور چیز کے لیے عام تھا اور اب بھی اس کا حکم باقی ہے۔ اگرچہ نشہ آور اشیا کا استعمال بجائے خود حرام ہے لیکن نشے کی حالت میں نماز پڑھنا دوہرا اور عظیم تر گناہ ہے۔

(تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۵۴، النساء حاشیہ ۶۵)

بعض لوگوں کے استدلال کی غلطی کا جواب

حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (النساء ۴:۴۳)۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ جب کسی شخص پر نیند کا غلبہ ہو رہا ہو اور وہ نماز پڑھنے میں بار بار اونگھ جاتا ہو تو اسے نماز چھوڑ کر سو جانا چاہیے۔ بعض لوگ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ جو شخص نماز کی عربی عبارات کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن علاوہ اس کے کہ یہ ایک بے جا تشدد ہے، خود قرآن کے الفاظ بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن میں حَتّٰى تَفْقَهُوْا یا حَتّٰى تَفْهَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ نہیں فرمایا ہے بلکہ حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ فرمایا ہے یعنی نماز میں آدمی کو اتنا ہوش رہنا چاہیے کہ وہ یہ جانے کہ وہ کیا چیز زبان سے ادا کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کھڑا تو ہو نماز پڑھنے اور شروع کر دے کوئی غزل۔ (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۳۵۴، النساء حاشیہ ۶۶)

چار چیزوں کی قطعی حرمت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ (المائدۃ ۵:۹۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔

اس آیت میں چار چیزیں قطعی طور پر حرام کی گئی ہیں۔ ایک شراب، دوسرے قمار بازی، تیسرے وہ مقامات جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کرنے یا خدا کے سوا کسی اور کے نام پر قربانی اور نذر و نیاز چڑھانے کے لیے مخصوص کیے گئے ہوں۔ چوتھے پانسے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بعض لوگوں کے سوالات اور ان کے جوابات

اس آخری حکم کے آنے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں لوگوں کو متنبہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے، بعید نہیں کہ اس کی قطعی حرمت کا حکم آجائے، لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو وہ اسے فروخت کردیں۔ اس کے کچھ مدت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ نے اعلان کرادیا کہ اب جن کے پاس شراب ہے وہ نہ اسے پی سکتے ہیں، نہ بیچ سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کردیں۔ چنانچہ اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں شراب بہادی گئی۔ بعض لوگوں نے پوچھا ہم یہودیوں کو تحفتاً کیوں نہ دے دیں؟ آپ نے فرمایا جس نے یہ چیز حرام کی ہے اس نے اسے تحفہ دینے سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ ''نہیں، اسے بہادو''۔ ایک صاحب نے باصرار دریافت کیا کہ دوا کے طور پر استعمال کی تو اجازت ہے؟ فرمایا ''نہیں، وہ دوا نہیں ہے بلکہ بیماری ہے''۔ ایک اور صاحب نے عرض کیا یارسول اللہ! ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں جو نہایت سرد ہے، اور ہمیں محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے؟ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ نے پوچھا جو چیز تم پیتے ہو وہ نشہ کرتی ہے؟ انھوں نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا تو اس سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کیا مگر ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں مانیں گے۔ فرمایا ''اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو''۔

حرمتِ شراب احادیث کی روشنی میں

ابن عمر کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَعَنَ اللّٰهُ الْخَمْرَ وَشَارِبَهَا وَسَاقِيَهَا وَبَائِعَهَا وَمُبْتَاعَهَا وَعَاصِرَهَا وَمُعْتَصِرَهَا وَحَامِلَهَا وَالْمَحْمُوْلَةَ اِلَيْهِ. اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر اور اس کے پینے والے پر، اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے والے پر اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔

ایک اور حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دسترخوان پر کھانا کھانے سے منع فرمایا جس پر شراب پی جارہی ہو۔ ابتداً آپؐ نے ان برتنوں تک کے استعمال کو منع فرمادیا تھا جن میں شراب بنائی اور پی جاتی تھی۔ بعد میں جب شراب کی حرمت کا حکم پوری طرح نافذ ہوگیا تب آپؐ نے برتنوں پر سے یہ قید اٹھادی۔[1]

خمر کا لفظ عرب میں انگوری شراب کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور مجازاً گیہوں، جَو، کشمش، کھجور اور شہد کی شرابوں کے لیے بھی یہ لفظ بولتے تھے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرمت کے اس حکم کو تمام ان چیزوں پر عام قرار دیا جو نشہ پیدا کرنے والی ہیں۔ چنانچہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح ارشادات ہمیں ملتے ہیں کہ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ۔ ہر نشہ آور چیز خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ كُلُّ شَرَابٍ اَسْكَرَ فَهُوَ حَرَامٌ۔ ہر وہ مشروب جو نشہ پیدا کرے حرام ہے۔ وَاَنَا

---

[1] تفہیم الاحادیث: ج ۵ ص ۴۰۷-۴۱۳، اشاعت سوم۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اَنْھٰی عَنْ کُلِّ مُسْکِرٍ۔ اور میں ہر نشہ آور چیز سے منع کرتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جمعہ کے خطبے میں شراب کی یہ تعریف بیان کی تھی کہ اَلْخَمْرُ مَاخَامَرَ الْعَقْلَ۔ خمر سے مراد ہر وہ چیز ہے جو عقل کو ڈھانک لے۔

نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بھی بیان فرمایا کہ مَااَسْکَرَ کَثِیْرُہٗ فَقَلِیْلُہٗ حَرَامٌ۔ جس چیز کی کثیر مقدار نشہ پیدا کرے اس کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔ اور مَااَسْکَرَ الْفِرْقُ مِنْهُ فَمِلْءُ الْکَفِّ مِنْهُ حَرَامٌ۔ جس چیز کا ایک پورا قرابہ نشہ پیدا کرتا ہے اس کا ایک چلو پینا بھی حرام ہے۔[1]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شراب پینے والے کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہ تھی۔ جو شخص اس جرم میں گرفتار ہو کر آ تا تھا اسے جوتے، لات، مکے، بل دی ہوئی چادروں کے سونٹے اور کھجور کے سنٹے مارے جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ چالیس ضربیں آپؐ کے زمانے میں اس جرم پر لگائی گئی ہیں۔

خلافت راشدہ میں سزا

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ۴۰ کوڑے مارے جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی ابتداً ۴۰ کوڑوں ہی کی سزا رہی۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس جرم سے باز نہیں آتے تو انھوں نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ۸۰ کوڑے سزا مقرر کی۔ اسی سزا کو امام مالک اور امام ابوحنیفہ اور ایک روایت کے بموجب امام شافعی بھی، شراب کے حد قرار دیتے ہیں۔ مگر امام احمد بن حنبل اور ایک دوسری روایت کے مطابق امام شافعی ۴۰ کوڑوں کے قائل ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی اسی کو پسند فرمایا ہے۔

حکومت اسلامی کی ذمہ داری

شریعت کی رُو سے یہ بات حکومتِ اسلامی کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ شراب کی بندش کے اس حکم کو بزورِ قوت نافذ کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بنی ثقیف کے ایک شخص رُوَیْشِد نامی کی دکان اس بنا پر جلوادی گئی کہ وہ خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک پورا گاؤں حضرت عمرؓ کے حکم سے اس قصور پر جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقے سے شراب کی کشید اور فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔[2] (تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۵۰۱-۵۰۲، المائدہ حاشیہ ۱۰۹)

---

1. تفہیم الاحادیث: ج ۵، ص ۴۱۳-۴۱۵، اشاعت سوم۔
2. س: مولانا آج کل بعض لوگ ذہنی سکون کے لیے بعض مُسکّن ادویات استعمال کرتے ہیں جس سے ان کا دماغ Dull ہو جاتا ہے۔ ایسی مسکن ادویات اگر زیادہ مقدار میں استعمال کی جائیں تو انسان اپنے آپ کو Drowsy سا محسوس کرتا ہے، کیا ایسی چیزیں بھی نشے کی ذیل میں آتی ہیں۔
جواب: Dull ہونا اور چیز ہے اور نشہ اور شے ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ نشے کی تعریف یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت یا کیفیت طاری ہو جائے کہ اسے اپنے ارادے پر اختیار نہ رہے اور اس کی قوت فیصلہ اور قوت تمیز ختم ہو جائے۔ لیکن وہ کیفیت جسے آپ Dull کہتے ہیں وہ اور چیز ہے۔ ان دونوں کے فرق کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ مثلاً کوکین کے نشہ میں مدہوش کوئی شخص اگر برسر عام مادرزاد برہنہ بھی ہو جائے تو اسے احساس نہیں ==

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

شراب کی انفرادی اور عالم گیر تباہ کاریاں

شراب کی تباہ کاریوں کا ذکر ہوا تو مولانا نے انفرادی زندگی میں اس کا فساد بیان کرتے ہوئے اس کے عالم گیر ظلم کا تذکرہ بھی کیا۔ فرمایا:

الکحل نے دنیا میں جتنا فساد مچا رکھا ہے اس پر کبھی سنجیدگی سے غور کیا جائے تو انسان اس کی تباہ کاریاں دیکھ کر ششدر رہ جائے۔ حالت یہ ہے کہ بڑے بڑے ملکوں کے سربراہوں نے الکحل کے زیر اثر عالمی جنگوں کے احکامات جاری کر دیے اور لاتعداد انسانوں کو آگ میں جھونک دیا۔ اسی کے زیر اثر انتہائی غلط فیصلے کیے جاتے رہے۔ درحقیقت انسان شراب کی تباہ کاریاں دیکھے تو وہ اس کے بارے میں بآسانی شریعت کے احکامات اور ان کی حکمت عملی کو سمجھ سکتا ہے۔

(۵۔اے ذیلدار پارک، مرتبہ مظفر بیگ، مطبوعہ البدر پبلی کیشنز، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۳)

الکوہل آمیز ادویہ کا استعمال

سوال: اس زمانے میں انگریزی دوائیں جو عام طور پر رائج ہیں ان میں سے ہر رقیق دوا میں الکوہل [جوہر شراب] شامل ہوتا ہے۔ میں ان سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ تحریم خمر کے متعلق جو حکم قرآن میں ہے اس میں اگر خمر کا مطلب ''نشہ آور چیز'' لیا جائے تو دوا میں الکوہل اتنا کم ہوتا ہے کہ نشہ نہیں کرتا اور نہ کوئی اس مقصد سے پیتا ہے، نہ اس ترکیب سے اس کو اپنے لیے حلال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں باریک بینی کی جائے تو ڈبل روٹی میں بھی آٹے کا خمیر اٹھنے پر کچھ الکوہل بن جاتا ہے، اور شربت جو بوتلوں میں آتے ہیں ان میں بھی کچھ الکوہل ضرور بن جاتا ہے، بلکہ الکوہل تو باسی انگوروں میں بھی بنتا ہے۔ اگر ان صورتوں میں کوئی وجہ حرمت نمودار نہیں ہوتی تو صرف دوا ہی کے اندر الکوہل کی شمولیت کیوں اتنی زیادہ قابل توجہ ہو؟

نیز اگر باعتبار لغت خمر کا مطلب انگوری شراب لیا جائے تو الکوہل انگوری شراب نہیں ہے۔ اس لیے انگریزی دوائیں ناجائز نہ ہونی چاہییں۔ لیکن علما نے اس زمانے میں جب ایسی ادویات سامنے نہیں تھیں ایسے سخت فتوے دے دیے کہ آج انھیں مختلف مواقع پر چسپاں کرنے سے بڑی مشکل پیش آ رہی ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ آج کل یونانی ادویہ مرکبہ کا خالص حالت میں دستیاب ہونا بہت ہی دشوار ہے۔ خمیرہ مروارید میں بڑے سے بڑا متقی دواساز بھی مروارید کی جگہ صدف ملا دیتا ہے۔ نیز جانیں بچانے کے لیے جب لوگ زیادہ ترقی یافتہ انگریزی طب اور جراحی کے ماہرین کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہیں تو آخروہ یونانی ادویہ تجویز کر کے تو دینے سے رہے، ان سارے پہلوؤں کو ملحوظ رکھ کر آپ اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔

جواب: خمر اگرچہ انگوری شراب کو کہتے ہیں، لیکن اس سے مراد ہر نشہ آور چیز ہے۔ چنانچہ خمر کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ

== ہوگا کہ میں یہ کیا کر رہا ہوں، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قوت تمیز ختم ہوگئی ہے۔ اس کے برعکس Dull ذہن میں آدمی کو ایسی حالت میں اپنے ننگے ہونے کا احساس ہوگا۔ پہلی حالت نشے کی ہے لیکن دوسری نہیں۔ (۵۔اے ذیلدار پارک، حصہ دوم، ص ۱۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

"الخمر ماخامر العقل"، یعنی ہر وہ چیز خمر ہے جو عقل کو ڈھانک لے اور شریعت میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ "ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام"، یعنی جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ پیدا کرے اس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔ یہ کم مقدار کی حرمت نشہ کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ کم مقدار استعمال کر لینے سے نفس کے اندر وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے، یا کم از کم کمزور پڑ جاتی ہے، جو حرام چیز کے لیے نفس میں موجود ہوتی ہے۔

پھر یہ بات علمی طریق پر معلوم ہے کہ تمام شرابوں میں وہ اصل چیز جو نشہ پیدا کرنے والی ہے، الکوہل ہی ہے۔ اس لیے کسی صورت میں اس کا استعمال جائز تو نہیں ہو سکتا۔ البتہ ایسے حالات میں جب کہ فن طب کی ترقی مسلمانوں کے ہاں ایک مدت سے بند ہو چکی ہے اور جدید زمانے میں اس فن کی تمام ترقیات ایسے لوگوں کے ہاتھوں ہوئی ہیں جو حرام وحلال کی تمیز سے خالی ہے، اور انھوں نے نئے زمانے کی بیش تر موثر دواؤں میں الکوہل کو ایک اچھا محلّل پا کر دوا سازی میں بکثرت استعمال کیا ہے، افراد کے لیے اضطرار کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ شریعت کسی انسان سے یہ مطالبہ نہیں کرتی کہ وہ اپنی صحت اور اپنی زندگی کی حفاظت کے صرف ان ذرائع پر انحصار کرے جو کسی خاص زمانے تک دریافت ہوئے ہوں اور اس زمانے کے بعد دریافت ہونے والے ذرائع خواہ کتنے ہی کارگر اور مفید ہوں، ان سے اجتناب کر کے اپنے آپ کو خطرے میں ڈالے۔ اس لیے افراد تو اضطرار کی بنا پر ان ذرائع میں حرمت کا سبب موجود ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، لیکن تمام مسلمان بحیثیتِ مجموعی اس وقت تک اس گناہ کے ذمہ دار بنتے رہیں گے جب تک وہ فن طب اور دوا سازی کی جدید ترقیات کو مسلمان بنا لینے کی اجتماعی کوشش نہ کریں۔

جدید فنِ طب اور دوا سازی کو مسلمان بنانے سے میری مراد یہ ہے کہ اس فن کی تمام موجودہ اور آئندہ ترقیات کو اسلام کے اصول کا پابند بنایا جائے اور دوا سازی کے تمام موجودہ اور آئندہ ترقی پذیر ذرائع کو اسلامی حدود کے سانچے میں ڈھال لیا جائے۔ یہ کام جب تک اجتماعی سعی سے نہ ہوگا افراد تو اضطرار کی وجہ سے معاف ہوتے رہیں گے، لیکن جماعت کے نامۂ اعمال میں مسلسل گناہ لکھا جاتا رہے گا۔ اجتماعی گناہوں کی یہی خاصیت ہے کہ ان کی وجہ سے افراد کے لیے انفرادی طور پر اضطرار کی حالت پیدا ہو جاتی ہے، مگر اجتماعی طور پر پوری جماعت گنہگار قرار پاتی ہے۔

(رسائل ومسائل: حصہ اول، ص ۲۲۴ تا ۲۲۷، اشاعت اول، ستمبر ۱۹۵۱ء بحوالہ ترجمان القرآن، رجب ۱۳۶۵ھ، جون ۱۹۴۶ء)

الکوہل کے مختلف مدارج واشکال کا حکم

سوال: آپ نے ترجمان القرآن میں ایک جگہ الکوہل کے خواص رکھنے والے اشیا کی حلت وحرمت پر بحث کی ہے۔ اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سلسلے میں بعض امور وضاحت طلب ہیں۔ طبعی اور قدرتی اشیا میں الکوہل اس وقت پائی جاتی ہے جبکہ وہ تعفین و تخمیر کے منازل خاص طریق پر طے کر چکی ہو۔ بالفاظ دیگر جس شے سے الکوہل حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے، اسے اس قابل بنایا جاتا ہے کہ اس میں الکوہل پیدا ہو جائے۔ جب تک اس میں یہ صلاحیت پیدا نہ ہو جائے، اس وقت تک اس میں الکوہل کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ بات دوسری ہے کہ بعض اشیا میں الکوہل صلاحیت زیادہ ہے، بعض میں کم اور بعض میں بالکل نہیں۔ جن اشیا سے شراب تیار کی جاتی ہے ان میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ اگر ایسی صلاحیت رکھنے والی قدرتی اشیا میں تخمیر و تعفین کی وجہ سے الکوہل یا سکر پیدا ہو جائے تو کیا وہ سب حرام ہو جائیں گی؟

جواب: جن چیزوں کو قصداً الکوہل پیدا کرنے کی خاطر سڑایا جائے، ان کا استعمال تو الکوہلی کیفیات کے پیدا ہو جانے کے بعد ناجائز ہے۔ البتہ جو چیزیں تعفین کے بعض مراحل سے خود بخود گزری ہوں ان کا استعمال زیادہ سے زیادہ مکروہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً انگور اور گنڈیریاں جب سرخی مائل ہو جائیں تو ان میں الکوہل کا پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس حالت میں ان کو کھانا حرام ہے۔ ہاں اگر کوئی قدرتی چیز بگڑ کر اس حد کو پہنچ جائے کہ اسے کھا کر سکر لاحق ہو جاتا ہے تو پھر اس کا استعمال یقیناً ناجائز ہوگا۔

(رسائل ومسائل: حصہ دوم، ص ۲۶۰ تا ۲۶۱، اشاعت تیرھویں، مارچ ۱۹۸۲ء بحوالہ ترجمان القرآن، شعبان، رمضان، ۱۳۷۲ھ، مئی جون ۱۹۵۳ء)

الکوہل کا استعمال ادویات میں

سوال: ایک ڈاکٹر صاحب نے دریافت کیا ”سنا ہے کہ دوائیوں میں جو الکوہل استعمال ہوتا ہے اس کی ۱۵ فیصد تک کی اجازت ہے“۔

جواب: جی نہیں پندرہ پرسنٹ کی گنجایش کیا، شراب کا تو ایک قطرہ بھی حرام ہے۔

سوال: مولانا چھوٹے بچوں کو بعض حالات میں برانڈی پلانی پڑتی ہے۔ اس کے بارے میں شریعت کی رہنمائی کیا ہے؟

جواب: کوشش تو یہی کرنی چاہیے کہ کوئی متبادل علاج میسر آسکے، لیکن اگر کوئی دوسری صورت ممکن نہ ہو تو صرف جان بچانے کی حد تک اس کے استعمال کی اجازت ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، حصہ دوم، ص ۱۵۳)

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

الکوہل کے متعلق ایک سائل کے استفسار کا جواب

سوال: آپ نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ ’’آج کل الکوہل کو ایک اچھا محلّل ہونے کی حیثیت سے دوا سازی میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن جب فن دوا سازی کو مسلمان بنایا جائے گا تو الکوہل کے استعمال کو ترک کر دیا جائے گا‘‘ لیکن کیمیاوی اصطلاح میں الکوہل کے لفظ کا اطلاق نشہ آور اجزا پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ علم الکیمیا میں اشیا کے ایک خاص گروپ کا نام ہے، جس میں مسکرات کے علاوہ اور بہت سی چیزیں شامل ہیں، تو کیا پھر ان سب اشیا کا استعمال ناجائز ہوگا؟ علاوہ ازیں الکوہل کا جسم پر خارجی استعمال بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ صرف محلّل ہی نہیں، بلکہ جراثیم کش بھی ہے، کیا یہ استعمال بھی ممنوع ہے؟

تفہیم القرآن میں آپ نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمان اطبا دوا سازی میں الکوہل کے بجائے شہد استعمال کرتے تھے۔ نیز آپ نے وہاں یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ شہد کی مکھی کو خاص جڑی بوٹیوں سے رس حاصل کرنے کی تربیت دے کر اس سے دوا سازی میں مدد لی جاسکتی ہے۔ ترقی فن کے موجودہ دور میں آپ کا شہد کو الکوہل کا بدل تجویز کرنا اور شہد کی مکھی کی تربیت کا مشورہ دینا میری سمجھ میں نہیں آسکا۔

جواب: الکوہل کے بارے میں مختصر گزارش یہ ہے کہ اس سے مراد وہ الکوہل نہیں ہے جو مختلف قدرتی اشیا میں بطور ایک جز کے موجود ہے یا کسی خاص مرحلے پر ان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے بلکہ وہ الکوہل ہے جو اشیا میں سے برآمد کر لی جاتی ہے اور ایک نشہ آور مادے کی حیثیت سے قابل استعمال ہوتی ہے۔ یہ چیز چونکہ اصل مادّۂ نشہ آور [ام الخبائث کی والدہ] ہے، اس لیے اس کا اندرونی استعمال جائز نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ جس تناسب سے وہ کسی دوا میں ملائی جائے وہ بالفعل نشہ آور ہو یا نہ ہو۔ البتہ اس کے بیرونی استعمال کو جائز رکھا جاسکتا ہے۔

کیا آپ اپنے فن کے نقطۂ نظر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھانے اور پینے کی دواؤں میں کوئی دوسری چیز الکوہل کا بدل نہیں ہوسکتی؟ اور یہ کہ اس کا استعمال بہرحال ناگزیر ہے؟ میرے دوستوں میں سے متعدد ایسے ڈاکٹر ہیں جنھوں نے الکوہل کے بارے میں میرے نقطۂ نظر کی تائید کی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس کے دوسرے بدل موجود ہیں بلکہ ان میں سے بعض نے تو اندرونی استعمال کی دواؤں میں اس سے کام لینا چھوڑ دیا ہے۔

شہد کے بارے میں مَیں نے تفہیم القرآن میں جو کچھ لکھا تھا اس سے مقصود شہد اور الکوہل کا مقابلہ کرنا نہ تھا۔ میرا مدعا یہ تھا کہ مسلمانوں کے ہاں فن طب کے رواج سے پہلے، جب یہ فن غیر مسلموں کے ہاتھ میں تھا، دواؤں کو محفوظ کرنے کے لیے حرام و حلال کی تمیز کے بغیر ہر طرح کی چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔ مگر جب یہ فن مسلمانوں کے پاس آیا تو انھوں نے حلال چیزوں کی طرف توجہ کی اور دواؤں کو ان کی مفید صورت میں برقرار رکھنے کے لیے ان کے پاس ایک اہم ذریعہ شہد تھا جو خود بھی ایک مدت تک خراب نہیں ہوتا اور اپنے اندر دوسری چیزوں کو بھی محفوظ رکھتا ہے۔ بعد میں جب یہ فن پھر ایسے لوگوں کے قبضے میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چلا گیا جو حرام و حلال کی تمیز سے واقف نہیں ہیں، تو پھر حرام چیزیں آزادی کے ساتھ استعمال ہونے لگیں جن میں سے ایک نمایاں چیز الکوہل ہے۔

دوسری بات جس سے آپ اتفاق نہیں کر سکے ہیں، دواسازی کے فن کی تمام ترقیات کے باوجود اس لائق ہے کہ اہل فن اس کی طرف توجہ کریں۔ میرا یہ خیال نہیں ہے کہ سب تدابیر کو چھوڑ کر صرف ایک شہد کی مکھی پر انحصار کر لیا جائے بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ شہد کی مکھی بھی فنِ دواسازی کی ایک اچھی خادم بن سکتی ہے۔

(رسائل و مسائل: حصہ دوم، ص ۲۴۹ تا ۲۵۴، اشاعت تیرھویں، مارچ ۱۹۸۲ء بحوالہ ترجمان القرآن، محرم، صفر ۱۳۷۲ھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

❁❁❁❁❁❁❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

حد محاربہ

قرآن مجید میں اس کا ذکر

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَ اَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (المائدۃ ۵:۳۳-۳۴)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالیں جائیں، یا وہ جلاوطن کردیے جائیں۔ یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے اس سے بڑی سزا ہے۔ مگر جو لوگ توبہ کرلیں قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسول سے لڑنے کا مطلب اس نظامِ صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی کے لیے اس نے اپنا رسولؐ بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اس چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمال مطلوب کو پہنچ سکے، جس کے تحت زمین کے وسائل اس طرح استعمال کیے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں نہ کہ اس کی بربادی میں۔ ایسا نظام جب کسی سرزمین پر قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا، قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ کوئی فاسد نظام قائم کردینے کے لیے ہو، دراصل وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قاضی یا امام وقت کے لیے نوعیتِ جرم کے مطابق سزا دینے کا اختیار

یہ مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

صالح نظام کو درہم برہم کرنے سے باز آ جائیں تو

اگر وہ سعی فساد سے باز آ گئے ہوں اور صالح نظام کو درہم برہم کرنے یا الٹنے کی کوشش چھوڑ چکے ہوں اور ان کا بعد کا طرز عمل ثابت کر رہا ہو کہ وہ امن پسند، مطیع قانون اور نیک چلن انسان بن چکے ہیں اور اس کے بعد ان کے سابق جرائم کا پتا چلے، تو ان سزاؤں میں سے کوئی سزا ان کو نہ دی جائے گی جو اوپر بیان ہوئی ہیں۔ البتہ آدمیوں کے حقوق پر اگر کوئی دست درازی انھوں نے کی تھی تو اس کی ذمہ داری ان پر سے ساقط نہ ہوگی۔ مثلاً اگر کسی انسان کو انھوں نے قتل کیا تھا یا کسی کا مال لیا تھا یا کوئی اور جرم انسانی جان و مال کے خلاف کیا تھا تو اس جرم کے بارے میں فوجداری مقدمہ ان پر قائم کیا جائے گا، لیکن بغاوت اور غداری اور خدا اور رسولؐ کے خلاف محاربے کا کوئی مقدمہ نہ چلایا جائے گا۔

(تفہیم القرآن: ج ۱، ص ۴۶۵-۴۶۶، المائدہ، حواشی، ۵۵-۵۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہشتم

حدِ ارتداد [مرتد کی سزا]

دورِ نبوت سے دورِ جدید تک مسلسل ایک ہی حکم

یہ بات اسلامی قانون کے کسی واقف کار آدمی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں اس شخص کی سزا قتل ہے جو مسلمان ہو کر پھر کفر کی طرف پلٹ جائے۔ اس باب میں پہلا شک جو مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا وہ انیسویں صدی کے دورِ آخر کی تاریک خیالی کا نتیجہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے کامل بارہ سو برس تک یہ تمام امت کا متفق علیہ مسئلہ رہا ہے اور ہمارا پورا دینی لٹریچر شاہد ہے کہ قتلِ مرتد کے معاملے میں مسلمانوں کے درمیان کبھی دو رائے نہیں پائی گئیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین، صحابہ کبار، تابعین، ائمہ مجتہدین اور ان کے بعد ہر صدی کے علما کی تصریحات کتابوں میں موجود ہیں۔ ان سب کو جمع کر کے دیکھ لیجیے آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ دورِ نبوت سے لے کر آج تک اس مسئلے میں ایک ہی حکم مسلسل و متواتر چلا آ رہا ہے اور کہیں اس شبے کے لیے کوئی گنجایش نہیں پائی جاتی کہ شاید مرتد کی سزا قتل نہ ہو۔

ایسے ثابت شدہ مسائل کے متعلق جن لوگوں نے موجودہ زمانے کی روشن خیالی سے متاثر ہو کر اختلافی بحث کا دروازہ کھولا ان کی جسارت فی الواقع سخت حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر ایسے امور بھی مشکوک ہو جائیں جن کے لیے اس قدر تسلسل اور تواتر کے ساتھ شہادتیں پائی جاتی ہیں تو معاملہ ایک دو مسائل تک محدود کہاں رہتا ہے۔ اس کے بعد تو زمانہ گزشتہ کی کوئی چیز بھی جو ہم تک روایتاً پہنچی ہے شک سے محفوظ نہیں رہتی، خواہ وہ قرآن ہو یا نماز یا روزہ۔ بلکہ سرے سے یہی بات مشکوک ہو جاتی ہے کہ آیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی دنیا میں مبعوث ہوئے بھی تھے یا نہیں۔ اس قسم کے شکوک پیدا کرنے کے بجائے درحقیقت ان لوگوں کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ واقعہ ہے اور مستند شہادتوں سے ثابت ہے اسے واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے اور پھر غور اس امر پر کرتے کہ آیا ہم اس دین کا اتباع کریں یا نہ کریں جو مرتد کو موت کی سزا دیتا ہے۔ اپنے مذہب کی کسی ثابت و مسلم چیز کو اپنے عقلی معیاروں کے خلاف پا کر جو شخص یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ چیز سرے سے مذہب میں ہے ہی نہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ "کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو" کی حالت میں مبتلا ہے۔ یعنی اس کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

طریق فکر و نظر جس مذہب کے حقیقی راستے سے منحرف ہو چکا ہے، اس میں رہنے پر وہ صرف اس لیے اصرار کر رہا ہے کہ وہ مذہب اس نے باپ دادا سے پایا ہے۔

حکمِ قتلِ مرتد کا ثبوت قرآن سے

ذرائع معلومات کی کمی کی وجہ سے جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ شاید اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہ ہو اور بعد کے مولویوں نے یہ چیز اپنی طرف سے اس دین میں بڑھا دی ہو، ان کو اطمینان دلانے کے لیے میں یہاں مختصراً اس کا ثبوت پیش کرتا ہوں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ وَ اِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَ طَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَاۤ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ○ (التوبۃ ۹: ۱۱-۱۲)

پھر اگر وہ کفر سے توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی ہیں۔ ہم اپنے احکام ان لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کر رہے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ لیکن اگر وہ (یعنی قبول اسلام کا عہد) کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ دیں اور تمھارے دین پر زبان طعن دراز کریں تو پھر کفر کے لیڈروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ وہ اس طرح باز آ جائیں۔

یہ آیت سورۂ توبہ میں جس سلسلے میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ۹ھ میں حج کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے اعلانِ برأت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس اعلان کا مفاد یہ تھا کہ جو لوگ اب تک خدا اور اس کے رسولؐ سے لڑتے رہے ہیں اور ہر طرح کی زیادتیوں اور بدعہدیوں سے خدا کے دین کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے رہے ہیں ان کو اب زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس مدت میں وہ اپنے معاملے پر غور کر لیں۔ اسلام قبول کرنا ہو تو قبول کر لیں معاف کر دیے جائیں گے۔ ملک چھوڑ کر نکلنا چاہیں تو جائیں، مدتِ مقررہ کے اندر ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ اس کے بعد جو لوگ ایسے رہ جائیں گے جنھوں نے نہ اسلام قبول کیا ہو اور نہ ملک چھوڑا ہو ان کی خبر تلوار سے لی جائے گی۔ اس سلسلے میں فرمایا گیا کہ ''اگر وہ توبہ کر کے ادائے نماز و زکوٰۃ کے پابند ہو جائیں تو تمھارے دینی بھائی ہیں، لیکن اگر اس کے بعد وہ پھر اپنا عہد توڑ دیں تو کفر کے لیڈروں سے جنگ کی جائے''۔ یہاں عہد شکنی سے مراد کسی طرح بھی سیاسی معاہدات کی خلاف ورزی نہیں لی جا سکتی۔ بلکہ سیاقِ عبارت صریح طور پر اس کے معنی اقرار اسلام سے پھر جانا متعین کر دیتا ہے، اور اس کے بعد فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتے کہ تحریک ارتداد کے لیڈروں سے جنگ کی جائے۔

حکمِ قتلِ مرتد کا ثبوت، حدیث سے

یہ تو ہے قرآن کا حکم۔ اب حدیث کی طرف آیئے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من بدل دينه فاقتلوه۔ جو شخص یعنی مسلمان اپنا دین بدل دے اسے قتل کردو۔

یہ حدیث حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور متعدد دوسرے صحابہ سے مروی ہے اور تمام معتبر کتبِ حدیث میں موجود ہے۔

(۲) حضرت عبداللہؓ بن مسعود روایت کرتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لايحل دم امرء مسلم يشهد ان لااله الا الله وانى رسول الله الا باحدىٰ ثلث: النفس بالنفس، والثيب الزانى، والمفارق لدينه التارک للجماعة ۔ (بخاری: کتاب الديات، ومسلم: کتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات، وابوداؤد: کتاب الحدود، باب الحکم فی من ارتد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص مسلمان ہو اور شہادت دیتا ہو اس بات کی کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور اس بات کی کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اس کا خون تین جرائم کے سوا کسی صورت میں حلال نہیں: ایک یہ کہ اس نے کسی کی جان لی ہو اور قصاص کا مستحق ہو گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ شادی شدہ ہو اور زنا کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنے دین کو چھوڑ دے اور جماعت سے الگ ہو جائے۔

(۳) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لايحل دم امرء مسلم الا رجل زنى بعد احصانه اوكفر بعد اسلامه اوالنفس بالنفس (نسائی، باب ذکر مايحل به دم المسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کسی مسلمان کا خون حلال نہیں الا یہ کہ اس نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کی ہو، یا مسلمان ہونے کے بعد کفر اختیار کیا ہو، یا کسی کی جان لی ہو۔

(۴) حضرت عثمانؓ کی روایت ہے:

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لايحل دم امرء مسلم الا باحدىٰ ثلاث، رجل كفر بعد اسلامه او زنى بعد احصانه اوقتل نفسا بغيرنفس۔ (نسائی، باب ايضاً)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے بجز تین صورتوں کے۔ ایک یہ کہ کوئی شخص اسلام لانے کے بعد کافر ہو گیا ہو، دوسرے یہ کہ شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کی ہو، تیسرے یہ کہ وہ قتل کا مرتکب ہو بغیر اس کے کہ اسے جان کے بدلے جان لینے کا حق حاصل ہوا ہو۔

حضرت عثمانؓ ہی سے دوسری روایت ہے:

سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول لا يحل دم امرء مسلم الّا باحدىٰ ثلث رجل زنىٰ بعد احصانه فعليه الرجم او قتل عمداً فعليه القَوَدُ وارتد بعد اسلامه فعليه القتل۔ (نسائی، باب الحکم فی المرتد)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین جرائم کی پاداش میں، ایک یہ کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کسی نے شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کی ہو، اس کی سزا سنگساری ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی نے عمداً قتل کا ارتکاب کیا ہو، اس پر قصاص ہے۔ تیسرے یہ کہ کوئی اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گیا ہو، اس کی سزا قتل ہے۔

تاریخ کی تمام معتبر کتابوں سے ثابت ہے کہ یہ حدیث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر ہزاروں آدمیوں کے سامنے اس وقت بیان کی تھی جب کہ باغی آپ کے مکان کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور آپ کے قتل کے درپے تھے۔ باغیوں کے مقابلے میں آپ کے استدلال کی بنا یہ تھی کہ اس حدیث کی رو سے تین جرائم کے سوا کسی چوتھے جرم میں ایک مسلمان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور میں نے ان میں سے کوئی جرم نہیں کیا ہے، لہٰذا مجھے قتل کر کے تم لوگ خود مجرم قرار پاؤ گے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح یہ حدیث حضرت عثمانؓ کے حق میں باغیوں پر صریح حجت بن رہی تھی۔ اگر یہ امر ذرہ برابر بھی مشتبہ ہوتا کہ آیا یہ حدیث صحیح ہے یا نہیں، تو سیکڑوں آوازیں بلند ہو جاتیں کہ آپ کا بیان غلط ہے یا مشکوک ہے، لیکن باغیوں کے پورے مجمع میں سے کوئی بھی اس حدیث کی صحت پر اعتراض نہ کر سکا۔

(۵) حضرت ابوموسیٰؓ اشعری سے روایت ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم بعثہ الی الیمن ثم ارسل معاذ بن جبل بعد ذالک فلما قدم قال ایھاالناس انی رسول اللہ الیکم فالقیٰ لہ ابوموسیٰ وسادۃ لیجلس علیھا فاتی رجل کان یھودیا فاسلم ثم کفر فقال معاذ لا اجلس حتی یقتل قضاء اللہ ورسولہ ثلاث مرات فلما قتل قعد۔ (نسائی، باب حکم المرتد، بخاری، باب حکم المرتد والمرتدہ واستتابھم، ابوداؤد، کتاب الحدود باب الحکم فی من ارتد)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو (یعنی حضرت ابوموسیٰ کو) یمن کا حاکم مقرر کر کے بھیجا پھر اس کے بعد معاذ بن جبل کو ان کے معاون کی حیثیت سے روانہ کیا جب معاذ وہاں پہنچے تو انھوں نے اعلان کیا کہ لوگو! میں تمھاری طرف اللہ کے رسول کا فرستادہ ہوں۔ ابوموسیٰ نے ان کے لیے تکیہ رکھا تا کہ اس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں۔ اتنے میں ایک شخص پیش ہوا جو پہلے یہودی تھا پھر مسلمان ہوا پھر یہودی ہو گیا۔ معاذ نے کہا میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک یہ شخص قتل نہ کر دیا جائے، اللہ اور اس کے رسول کا یہی فیصلہ ہے، معاذ نے یہ بات تین دفعہ کہی۔ آخر کار جب وہ قتل کر دیا گیا تو معاذ بیٹھ گئے۔

خیال رہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پیش آیا۔ اس وقت حضرت ابوموسیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گورنر کی حیثیت میں اور حضرت معاذ وائس گورنر کی حیثیت میں تھے۔ اگر ان کا یہ فعل واقعی اللہ اور اس کے رسول کے فیصلے پر مبنی نہ ہوتا تو یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس پر باز پرس فرماتے۔

(۶) حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت ہے:

کان عبداللہ بن ابی سرح یکتب لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فازلہ الشیطان فالحق بالکفار فامر بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یقتل یوم الفتح فاستجار لہ عثمان بن عفان فاجارہ رسول اللہ۔ (ابوداؤد، کتاب الحدود، باب الحکم فی من ارتد)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عبداللہ بن ابی سرح کسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کاتب (سیکرٹری) تھا۔ پھر شیطان نے اس کو پھسلایا اور کفار سے جاملا۔ جب مکہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ مگر بعد میں حضرت عثمانؓ نے اس کے لیے پناہ مانگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پناہ دے دی۔

اس آخری واقعہ کی تشریح حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت میں ہم کو یہ ملتی ہے:

لما كان يوم فتح مكة اختبا عبدالله ابن سعد بن ابی سرح عند عثمان بن عفان فجاء به حتى اوقفه على النبی صلى الله عليه وسلم فقال يا رسول الله بايع عبدالله فرفع رأسه فنظر اليه ثلثا كل ذالك يابى فبايعه بعد ثلث ثم اقبل على اصحابه فقال اما فيكم رجل رشيد يقوم الىٰ هذا حين رانی كففتُ يدی عن بيعته فيقتله فقالوا ماندری يارسول الله ما فی نفسک الا او مأت الينا بعينک قال انه لا ينبغی لنبی ان تكون له خائنة الاعين۔

(ابو داؤد، ایضاً)

جب مکہ فتح ہوا تو عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے عثمان بن عفان کے دامن میں پناہ لی۔ عثمان اس کو لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ عبداللہ کی بیعت قبول فرما لیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھا اور چپ رہے۔ تین دفعہ یہی ہوا اور آپ اس کی طرف بس دیکھ دیکھ کر رہ جاتے تھے۔ آخر تین دفعہ کے بعد آپ نے اس کو بیعت میں لے لیا۔ پھر آپ اپنے صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تمھارے اندر کوئی ایسا بھلا آدمی موجود نہ تھا کہ جب اس نے دیکھا کہ میں نے بیعت سے ہاتھ روک رکھا ہے تو آگے بڑھتا اور اس شخص کو قتل کر دیتا؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ آپ نے آنکھ سے اشارہ کیوں نہ فرما دیا؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک نبی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ آنکھوں کی چوری کرے۔

(۷) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے:

ان امرأة ارتدت يوم احد فامر النبی صلى الله عليه وسلم ان تستأب فان تابت والا قتلت۔ (بیہقی)

جنگِ احد کے موقع پر (جبکہ مسلمانوں کو شکست ہوئی) ایک عورت مرتد ہوگئی۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے توبہ کرائی جائے اور اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دی جائے۔

(۸) حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے:

ان امرأة ام رومان ارتدت فامر النبی صلى الله عليه وسلم بان يعرض عليها الاسلام فان تابت والاقتلت۔

(دارقطنی، بیہقی)

ایک عورت ام رومان (یا ام مروان) نامی مرتد ہوگئی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے، پھر وہ توبہ کر لے تو بہتر ورنہ قتل کر دی جائے۔

بیہقی کی دوسری روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ فابت ان تسلم فقتلت اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس بنا پر قتل کر دی گئی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خلافت راشدہ کے نظائر

اس کے بعد دورِ خلافت راشدہ کے نظائر ملاحظہ ہوں:

(۱) حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں ایک عورت جس کا نام ام قرفہ تھا اسلام لانے کے بعد کافر ہوگئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا، مگر اس نے توبہ نہ کی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسے قتل کرادیا۔ (دارِقطنی، بیہقی)

(۲) عمرو بن عاصؓ حاکمِ مصر نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ ایک شخص اسلام لایا تھا، پھر کافر ہوگیا۔ پھر اسلام لایا پھر کافر ہوگیا۔ یہ فعل وہ کئی مرتبہ کرچکا ہے۔ اب اس کا اسلام قبول کیا جائے یا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جب تک اللہ اس سے اسلام قبول کرتا ہے تم بھی کیے جاؤ۔ اس کے سامنے اسلام پیش کرو، مان لے تو چھوڑ دو ورنہ گردن ماردو۔ (کنز العمال)

(۳) سعد بن ابی وقاصؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ نے تُستُر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ کے پاس ایک قاصد بھیجا۔ قاصد نے حضرت عمرؓ کے سامنے حالات کی رپورٹ پیش کی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے پوچھا کوئی اور غیر معمولی بات؟ اس نے عرض کیا: ہاں اے امیر المومنین! ہم نے ایک عرب کو پکڑا جو اسلام لانے کے بعد کافر ہوگیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا پھر تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے کہا ہم نے اسے قتل کردیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا ''تم نے ایسا کیوں نہ کیا کہ اسے ایک کمرے میں بند کرکے دروازے کا تیغہ لگا دیتے پھر تین دن تک روزانہ ایک روٹی پھینکتے رہتے۔ شاید کہ وہ اس دوران توبہ کرلیتا۔ خدایا یہ کام میرے حکم سے نہیں ہوا۔ نہ میرے سامنے ہوا نہ میں اسے سن کر راضی ہوا''۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر حضرت سعدؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ سے کوئی باز پرس نہیں کی اور نہ کوئی سزا تجویز کی۔ (طحاوی، کتاب السیر، بحث استتابته المرتد۔ نیز بیہقی، و کتاب الام للشافعی)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سعدؓ اور ابوموسیٰؓ اشعری کا فعل تھا تو قانون کی حدود کے اندر، لیکن حضرت عمر کی رائے میں قتل سے پہلے توبہ کا موقع دینا زیادہ بہتر تھا۔

(۴) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اطلاع ملی کہ بنی حنیفہ کی ایک مسجد میں کچھ لوگ شہادت دے رہے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے۔ یہ سن کر حضرت عبداللہ نے پولیس بھیجی اور ان کو گرفتار کرکے بلالیا۔ جب وہ لوگ ان کی سامنے پیش ہوئے تو سب نے توبہ کرلی اور اقرار کیا کہ ہم آیندہ ایسا نہ کریں گے۔ حضرت عبداللہ نے اوروں کو تو چھوڑ دیا مگر ان میں سے ایک شخص عبداللہ بن ابی النواحہ کو موت کی سزا دی۔ لوگوں نے کہا یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ نے ایک ہی مقدمے میں دو مختلف فیصلے کیے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ یہ ابن النواحہ وہ شخص ہے جو مسیلمہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سفیر بن کر آیا تھا۔ میں اس وقت حاضر تھا۔ ایک دوسرا شخص حجر بن وثالی بھی اس کے ساتھ سفارت میں شریک تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے ان دونوں سے پوچھا کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ ان دونوں نے جواب دیا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے؟ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر سفارتی وفد کو قتل کرنا جائز ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔ یہ واقعہ بیان کر کے حضرت عبداللہ نے کہا میں نے اسی وجہ سے ابن النواحہ کو سزائے موت دی ہے۔[1] (طحاوی)

واضح رہے کہ یہ واقعہ حضرت عمرؓ کے زمانے کا ہے جب کہ حضرت عبداللہؓ بن مسعود ان کے ماتحت کوفہ کے چیف جج تھے۔

(۵) کوفہ میں چند آدمی پکڑے گئے جو مسیلمہ کی دعوت پھیلا رہے تھے۔ حضرت عثمان کو اس باب میں لکھا گیا۔ آپ نے جواب میں لکھا ان کے سامنے دینِ حق اور شہادت لَااله الّا الله محمدرسول الله پیش کی جائے، جو اسے قبول کرے اور مسیلمہ سے براءت کا اظہار کر دے اسے چھوڑ دیا جائے اور جو دینِ مسیلمہ پر قائم رہے اسے قتل کر دیا جائے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۶) حضرت علیؓ کے سامنے ایک شخص پیش کیا گیا جو پہلے عیسائی تھا، پھر مسلمان ہوا پھر عیسائی ہو گیا۔ آپ نے اس سے پوچھا تیری اس روش کا کیا سبب ہے؟ اس نے جواب دیا میں نے عیسائیوں کے دین کو تمھارے دین سے بہتر پایا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تیرا کیا عقیدہ ہے؟ اس نے کہا وہ میرے رب ہیں، یا یہ کہا کہ وہ علی کے رب ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ نے حکم دیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۷) حضرت علیؓ کو اطلاع دی گئی کہ ایک گروہ عیسائی سے مسلمان ہوا پھر عیسائی ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو گرفتار کرا کے اپنے سامنے بلوایا اور حقیقتِ حال دریافت کی۔ انھوں نے کہا ہم عیسائی تھے پھر ہمیں اختیار دیا گیا کہ عیسائی رہیں یا مسلمان ہو جائیں، ہم نے اسلام کو اختیار کر لیا، مگر اب ہماری رائے یہ ہے کہ ہمارے دین سے افضل کوئی دین نہیں ہے۔ لہٰذا اب ہم عیسائی ہو گئے۔ اس پر حضرت علیؓ کے حکم سے یہ لوگ قتل کر دیے گئے اور ان کے بال بچے غلام بنا لیے گئے۔ (طحاوی، حوالہ مذکور)

(۸) حضرت علیؓ کو یہ اطلاع دی گئی کہ کچھ لوگ آپ کو اپنا رب قرار دیتے ہیں۔ آپ نے انھیں بلا کر پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا آپ ہمارے رب ہیں اور ہمارے خالق و رازق ہیں۔ حضرت علیؓ نے فرمایا، تمھاری حالت پر افسوس ہے، میں تو تم جیسا ایک بندہ ہوں، تمھاری طرح کھاتا پیتا ہوں، اگر اللہ کی اطاعت کروں گا تو وہ مجھے اجر دے گا، اس کی نافرمانی کروں تو مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے سزا دے گا۔ لہٰذا تم خدا سے ڈرو اور اپنے اس عقیدے کو چھوڑ دو۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ دوسرے دن قنبر

---

[1] اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ بنی حنیفہ کا قبیلہ ابن النواحہ اور حجر بن وثال سمیت پہلے مسلمان ہو چکا تھا۔ پھر مسیلمہ نے نبوت کا دعویٰ کیا تو یہ لوگ اس کی نبوت کے قائل ہو گئے۔ اس بنا پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن النواحہ اور حجر بن وثال سے فرمایا کہ ”اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں تمھیں قتل کر دیتا“۔ تو اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ اس ارتداد کی وجہ سے تو واجب القتل ہو چکا ہے لیکن چونکہ اس وقت تو سفیر بن کر آیا ہے اس لیے تجھ پر شریعت کا یہ حکم نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے آ کر عرض کیا کہ وہ لوگ پھر وہی بات کہہ رہے ہیں۔ آپ نے انھیں بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے سب باتیں دہرا دیں۔ تیسرے روز حضرت علیؓ نے انھیں بلا کر دھمکی دی کہ اگر اب تم نے وہ بات کہی تو میں تم کو بدترین طریقے سے قتل کروں گا۔ مگر وہ اپنی بات پر اڑے رہے۔ آخر کار حضرت علی نے ایک گڑھا کھدوایا، اس میں آگ جلوائی، پھر ان سے کہا، دیکھو اب بھی اپنے اس قول سے باز آ جاؤ ورنہ میں تمھیں اس گڑھے میں پھینک دوں گا، مگر وہ اپنے اس عقیدے پر قائم رہے۔ تب حضرت علیؓ کے حکم سے وہ سب اس گڑھے میں پھینک دیے گئے۔ (فتح الباری، جلد ۱۲، ص ۲۳۸)

(۹) حضرت علیؓ رحبہ کے مقام پر تھے کہ آپ کو ایک شخص نے آ کر اطلاع دی کہ یہاں ایک گھر کے لوگوں نے اپنے ہاں ایک بت رکھ چھوڑا ہے اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ خود وہاں تشریف لے گئے۔ تلاشی لینے پر بت نکل آیا۔ حضرت علیؓ نے اس گھر میں آگ لگا دی اور وہ گھر والوں سمیت جل گیا۔ (فتح الباری، جلد ۱۲، ص ۲۳۹)

(۱۰) حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک شخص پکڑا ہوا آیا جو مسلمان تھا پھر وہ کافر ہو گیا۔ آپ نے اسے ایک مہینہ تک توبہ کی مہلت دی، پھر اس سے پوچھا مگر اس نے توبہ سے انکار کر دیا۔ آخر کار آپ نے اسے قتل کرا دیا۔ (کنز العمال، جلد ۱، ص ۳۱۳)

یہ دس نظیریں پورے دورِ خلافت راشدہ کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ چاروں خلفا کے زمانے میں جب بھی ارتداد کا واقعہ پیش آیا ہے اس کی سزا قتل ہی دی گئی ہے، اور ان میں سے کسی واقعہ میں بھی نفسِ ارتداد کے سوا کسی دوسرے جرم کی شمولیت ثابت نہیں ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ قتل کی سزا دراصل اُس جرم پر دی گئی تھی نہ کہ ارتداد پر۔

مرتدوں کے خلاف خلیفۂ اوّل کا جہاد

مگر ان سب نظیروں سے بڑھ کر وزنی نظیر اہلِ ردّہ کے خلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جہاد ہے۔ اس میں صحابہ کرام کی پوری جماعت شریک تھی۔ اس سے اگر ابتدا میں کسی نے اختلاف کیا بھی تھا تو بعد میں وہ اختلاف اتفاق سے بدل گیا تھا۔ لہٰذا یہ معاملہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ جن لوگوں نے براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کی تعلیم و تربیت پائی تھی ان سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ جو گروہ اسلام سے پھر جائے اس کے خلاف اسلامی حکومت کو جنگ کرنی چاہیے۔

بعض لوگ اس جہاد کی توجیہہ یہ کرتے ہیں کہ مرتدین کی حیثیت دراصل باغیوں کی تھی کیونکہ انھوں نے حکومت کا ٹیکس (یعنی زکوٰۃ) دینا بند کر دیا تھا اور وہ حکومت کے عاملوں کو الگ کر کے خود اپنی حکومتیں قائم کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ توجیہہ چار وجوہ سے قطعی غلط ہے۔

۱۔ جہاد جن لوگوں کے خلاف کیا گیا تھا وہ سارے کے سارے مانعین زکوٰۃ ہی نہیں تھے بلکہ ان میں مختلف قسم کے مرتدین شامل تھے۔ کچھ لوگ ان مدعیان نبوت پر ایمان لے آئے تھے جنھوں نے عرب کے مختلف گوشوں میں اپنی نبوت کا اعلان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا تھا۔ کچھ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا یقین نہ رہا اور وہ کہتے تھے کہ لَوْ كَانَ مُحَمَّدٌ نَبِيًّا مَامَاتَ (اگر محمد نبی ہوتے تو مرتے نہیں) کچھ لوگ تمام ضروریاتِ دین کے قائل تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنی زکوٰۃ بطور خود جمع اور خرچ کریں گے، ابوبکر کے عاملوں کو نہیں دیں گے۔ کچھ اور لوگ کہتے تھے:

اَطَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِذَا كَانَ نَبِيًّا
فَوَا عَجَبًا مَا بَالَ مُلْكِ اَبِيْ بَكْرٍ

ہم نے خدا کے رسولؐ کی پیروی کر لی جب کہ وہ ہمارے درمیان تھے، مگر مقام حیرت ہے کہ یہ ابوبکر کی حکومت ہم پر کیوں مسلط ہوئی۔

گویا انھیں اعتراض اس بات پر تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت کا نظام قائم ہوا اور سب مسلمانوں کو اس طرح اس مرکز سے وابستہ رہنے پر مجبور کیا جائے جس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے وابستہ تھے۔

۲۔ ان سب مختلف قسم کے لوگوں کے لیے صحابہ نے باغی کے بجائے ''مرتد'' کا لفظ اور اس ہنگامے کے لیے بغاوت کے بجائے ''ارتداد'' کا لفظ استعمال کیا، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں وہ اصل جرم جس کے یہ لوگ مرتکب ہوئے تھے، ارتداد تھا نہ کہ بغاوت۔ جنوبِ عرب میں جن لوگوں نے لقیط بن مالک الازدی کی نبوت تسلیم کر لی تھی ان کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے عکرمہ بن ابی جہل کو جہاد کے لیے روانہ کرتے وقت یہ ہدایت کی تھی کہ ومن لقيه من المرتدة بين عمان الى حضر موت واليمن فنكل به۔ (عمان سے حضرموت اور یمن تک جہاں مرتدوں کو پاؤ کچل ڈالو)

۳۔ جن لوگوں نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا ان کے معاملے میں جب یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کرنا جائز بھی ہے یا نہیں تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا تھا: "والله لاقاتلن من فرق بين الصلوٰة والزكوٰة (خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا) اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خلیفۂ اول کی نگاہ میں ان کا اصل جرم ٹیکس نہ دینا نہیں تھا بلکہ دینِ اسلام کے دو ارکان میں سے ایک کو ماننا اور دوسرے کو نہ ماننا تھا اور آخر کار جس بنا پر صحابہ کرامؓ نے ان مانعین زکوٰۃ سے جنگ کرنے کے معاملے میں خلیفہ اول سے اتفاق کیا وہ یہی تھا کہ خلیفہ برحق کے دلائل سے انھیں اس امر کا پورا اطمینان ہو گیا کہ نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرنے کی وجہ سے یہ لوگ دائرہ دین سے باہر نکل چکے ہیں۔

۴۔ ان سب سے بڑھ کر فیصلہ کن چیز سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا وہ فرمانِ عام (Proclamation) ہے جو آپ نے عرب کے مختلف گوشوں میں مرتدین کے خلاف جہاد کے لیے ۱۱ فوجیں روانہ کرتے وقت ہر فوج کے کمانڈر کو لکھ کر دیا تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اپنی کتاب البداية والنهاية (جلد ۶، ص ۳۱۶) میں یہ پورا فرمان نقل کیا ہے۔ اس کے حسب ذیل فقرے خاص طور پر قابل غور ہیں:

تم میں سے جن لوگوں نے شیطان کی پیروی قبول کی ہے اور جو اللہ سے بے خوف ہو کر اسلام سے کفر کی طرف پھر گئے ہیں ان کی اس حرکت کا حال مجھے معلوم ہوا، اب میں نے فلاں شخص کو مہاجرین و انصار اور نیک نہاد تابعین کی ایک فوج کے ساتھ تمھاری طرف بھیجا ہے اور اسے ہدایت کر دی ہے کہ ایمان کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے، اور اللہ عزوجل کی طرف دعوت دیے بغیر کسی کو قتل نہ کرے۔ پس جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کوئی اس دعوت الی اللہ کو قبول کرے گا اور اقرار کرنے کے بعد اپنا عمل درست رکھے گا اس کے اقرار کو وہ قبول کرلے گا اور اسے راہ راست پر چلنے میں مدد دے گا۔ اور جو انکار کرے گا اس سے وہ لڑے گا یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ اس کو حکم دے دیا گیا ہے کہ انکار کرنے والوں میں سے جس پر وہ قابو پائے اسے جیتا نہ چھوڑے۔ ان کی بستیوں کو وہ جلا دے، ان کو نیست و نابود کردے، ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لے اور اسلام کے سوا کسی سے کچھ قبول نہ کرے۔ پس جو اس کی بات مانے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو نہ مانے گا وہ اللہ کو عاجز نہ کر سکے گا۔ میں نے اپنے فرستادہ امیر کو یہ بھی ہدایت کردی ہے کہ میری اس تجویز کو تمھارے ہر مجمع میں سنا دے اور یہ کہ اسلام قبول کرنے کی علامت اذان ہے۔ جہاں سے اذان کی آواز آئے اس بستی سے تعرض نہ کرو اور جہاں سے یہ آواز نہ آئے وہاں کے لوگوں سے پوچھو کہ وہ کیوں اذان نہیں دیتے۔ اگر وہ انکار کریں تو ان پر ٹوٹ پڑو اور اگر اقرار کریں تو ان کے ساتھ وہی سلوک کرو جس کے وہ مستحق ہیں۔

ائمۂ مجتہدین کا اتفاق

اب بحث طویل ہو جائے گی اگر ہم پہلی صدی ہجری سے لے کر اس چودھویں صدی تک کے فقہا کی تحریریں مسلسل نقل کریں۔ لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مسئلہ کے جزئیات میں مذاہب اربعہ کے درمیان خواہ کتنا ہی اختلاف ہو، بہرحال بجائے خود یہ مسئلہ کہ ''مرتد کی سزا قتل ہے'' فقہ کے چاروں مذاہب میں متفق علیہ ہے۔

امام مالکؒ کا مذہب ان کی کتاب مؤطا میں یوں لکھا ہے

زید بن اسلم سے مالک نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو اپنا دین بدلے اس کی گردن مار دو۔ اس حدیث کے متعلق مالک نے کہا جہاں تک ہم سمجھ سکتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے طریقے کا پیرو ہو جائے مگر اپنے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کرتا رہے جیسا کہ زندیقوں[1] اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کا ڈھنگ ہے تو اس کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اسے قتل کر دیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا اور جو شخص اسلام سے نکل کر علانیہ کسی دوسرے طریقے کی پیروی اختیار کرے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے، توبہ کرلے تو خیر ورنہ قتل کیا جائے۔ (باب القضا فی من ارتد عن الاسلام)

حنابلہ کا مذہب ان کی مستند ترین کتاب المغنی میں اس طرح بیان ہوا ہے

امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ جو عاقل و بالغ مرد یا عورت اسلام کے بعد کفر اختیار کرے اسے تین دن تک توبہ کی مہلت دی جائے، اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ یہی رائے حسن بصری، زہری، ابراہیم نخعی، مکحول، حماد، مالک، لیث، اوزاعی، شافعی اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔ (جلد ۱۰، ص ۷۴)

مذہب حنفی کی تصریح امام طحاوی نے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں اس طرح کی ہے

اسلام سے مرتد ہونے والے شخص کے بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے یا نہیں۔

---

[1] یعنی ملحدوں اور دہریوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر امام اس سے توبہ کا مطالبہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ پھر اگر وہ شخص توبہ کر لے تو چھوڑ دیا جائے۔ امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، اور محمد رحمۃ اللہ علیہم ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے یہ رائے اختیار کی ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ توبہ کا مطالبہ کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔ ان کے نزدیک مرتد کی حیثیت حربی کافر کی سی ہے۔ جن حربی کافروں تک ہماری دعوت پہنچ چکی ہے ان کو جنگ شروع کرنے سے بیش تر اسلام کی طرف دعوت دینا غیر ضروری ہے، البتہ جنھیں دعوت نہ پہنچی ہو ان پر حملہ آور ہونے سے پہلے حجت تمام کرنی چاہیے۔ اسی طرح جو شخص اسلام سے ناواقفیت کی بنا پر مرتد ہوا ہو اس کو تو پہلے سمجھا کر اسلام کی طرف واپس لانے کی کوشش کر لینی چاہیے مگر جو شخص سوچ سمجھ کر اسلام سے نکلا ہو اسے توبہ کی دعوت دیے بغیر قتل کر دیا جائے۔ امام ابو یوسف کا بھی ایک قول اسی رائے کی تائید میں ہے۔ چنانچہ وہ کتاب الاملاء میں فرماتے ہیں کہ میں مرتد کو قتل کروں گا اور توبہ کا مطالبہ نہ کروں گا، ہاں اگر وہ خود ہی جلدی کر کے توبہ کر لے تو میں اسے چھوڑ دوں گا اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کروں گا۔ (کتاب السیر بحث استتابة المرتد)

مذہب حنفی کی مزید تصریح ہدایہ میں اس طرح ہے

جب کوئی شخص اسلام سے پھر جائے (العیاذ باللہ) تو اس کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ اگر اسے کوئی شبہ ہو تو اسے صاف کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ وہ کسی شبہ میں مبتلا ہوا اور ہم اس کا شبہ دور کر دیں تو اس کا شر ایک بدتر (یعنی قتل) کے بجائے ایک بہتر صورت (یعنی دوبارہ قبولِ اسلام) سے دفع ہو جائے۔ مگر مشائخ فقہا کے قول کے مطابق اس کے سامنے اسلام پیش کرنا واجب نہیں ہے کیونکہ اسلام کی دعوت تو اس کو پہنچ چکی۔ (باب احکام المرتدین)

افسوس ہے کہ فقہ شافعی کی کوئی معتبر کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے، مگر ہدایہ میں ان کا جو مذہب نقل کیا گیا ہے وہ یہ ہے:

شافعی سے منقول ہے کہ امام کو لازم ہے کہ مرتد کو تین دن کی مہلت دے اور اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس سے پہلے اسے قتل کر دے۔ کیونکہ ایک مسلمان کا ارتداد بظاہر کسی شبہ ہی کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک مدت ضرور ہونی چاہیے، جس میں اس کے لیے غور و تامل کا موقع ہو اور ہم اس غرض کے لیے تین دن کافی سمجھتے ہیں۔ (باب احکام المرتدین)

غالباً ان شہادتوں کے بعد کسی شخص کے لیے اس امر میں شبہ کرنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے اور یہ سزا نفسِ ارتداد کی ہے نہ کہ کسی اور جرم کی جو ارتداد کے ساتھ شامل ہو گیا ہو۔

بعض لوگ حدیث اور فقہ کی باتیں سن کر یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ قرآن میں یہ سزا کہاں لکھی ہے؟ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے اگرچہ ہم نے اس بحث کی ابتدا میں قرآن کا حکم بھی بیان کر دیا ہے، لیکن اگر بالفرض یہ حکم قرآن میں نہ بھی ہوتا تو حدیث کی کثیر التعداد روایات، خلفائے راشدین کے فیصلوں کی نظیریں، اور فقہا کی متفقہ رائیں اس حکم کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی تھیں۔ ثبوت حکم کے لیے ان چیزوں کو ناکافی سمجھ کر جو لوگ اس کا حوالہ قرآن سے مانگتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ تمھاری رائے میں کیا اسلام کا پورا قانون تعزیرات وہی ہے جو قرآن میں بیان ہوا ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو گویا تم کہتے ہو کہ قرآن میں جن افعال کو جرم قرار دے کر سزا تجویز کر دی گئی ہے ان کے ماسوا کوئی فعل اسلامی حکومت میں مستلزم سزا نہ ہوگا۔ پھر ایک مرتبہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غور کرلو، کیا اس قاعدے پر تم دنیا میں کوئی حکومت ایک دن بھی کامیابی کے ساتھ چلا سکتے ہو؟ اور اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور تم خود بھی تسلیم کرتے ہو کہ قرآن کے بیان کردہ جرائم اور سزاؤں کے علاوہ اسلامی نظام حکومت میں دوسرے جرائم بھی ہو سکتے ہیں اور ان کے لیے تفصیلی قانونِ تعزیرات کی ضرورت ہے، تو ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ جو قانون نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی حکومت میں رائج تھا اور جس کو مسلسل تیرہ سو برس تک تمام امت کے جج، مجسٹریٹ اور علمائے قانون بالاتفاق تسلیم کرتے رہے ہیں۔ آیا وہ اسلامی قانون کہلانے کا زیادہ مستحق ہے یا وہ قانون جسے آج چند ایسے لوگ تجویز کریں جو غیر اسلامی علوم اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن سے مغلوب و متاثر ہیں اور جن کو اسلامی علوم کی ادھوری تعلیم بھی میسر نہیں آئی ہے؟

(مرتد کی سزا، ص ۹ تا ۳۱)

مرتد سے جنگ

وَاِنۡ نَّكَثُوۡۤا اَيۡمَانَهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ عَهۡدِهِمۡ وَطَعَنُوۡا فِىۡ دِيۡـنِكُمۡ فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّةَ الۡـكُفۡرِ‌ۙ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ لَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ يَنۡتَهُوۡنَ ○ (التوبۃ ۹:۱۲)

اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمھارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علَم برداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا کوئی اعتبار نہیں۔ شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں۔

اس جگہ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ قسم اور عہد و پیمان سے مراد کفر چھوڑ کر اسلام قبول کر لینے کا عہد ہے۔ اس لیے کہ اُن لوگوں سے اب کوئی اور معاہدہ کرنے کا تو کوئی سوال باقی ہی نہ رہا تھا۔ پچھلے سارے معاہدے وہ توڑ چکے تھے۔ ان کی عہد شکنیوں کی بنا پر ہی اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے برأت کا اعلان انھیں صاف صاف سنایا جا چکا تھا۔ یہ بھی فرما دیا گیا تھا کہ آخر ایسے لوگوں کے ساتھ کوئی معاہدہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور یہ فرمان بھی صادر ہو چکا تھا کہ اب انھیں صرف اسی صورت میں چھوڑا جا سکتا ہے کہ یہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کی پابندی قبول کر لیں۔ اس لیے یہ آیت مرتدین سے جنگ کے معاملے میں بالکل صریح ہے۔ دراصل اس میں اس فتنۂ ارتداد کی طرف اشارہ ہے جو ڈیڑھ سال بعد خلافت صدیقی کی ابتدا میں برپا ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس موقع پر جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ ٹھیک اس ہدایت کے مطابق تھا جو اس آیت میں پہلے ہی دی جا چکی تھی۔

(تفہیم القرآن: ج ۲، ص ۱۷۹-۱۸۰، التوبۃ، حاشیہ ۱۵)

مرتد سے توبہ کا تقاضا

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَـغۡفِرَ لَهُمۡ وَلَا لِيَـهۡدِيَهُمۡ سَبِيۡلًا ؕ (النساء ۴:۱۳۷)

رہے وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہِ راست دکھائے گا۔

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے۔ ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغ میں ایک لہر اٹھی، مسلمان ہو گئے اور جب دوسری لہر اٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان ہو گئے اور جب معبودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت اور یہ جو فرمایا کہ ''پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفانہ کرے بلکہ اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے، اور اپنی قوت اس سعی و جہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلے میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں مزید ترقی، اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

(تفہیم القرآن: ج ا، ص ۴۰۷-۴۰۸، النساء، حاشیہ ۱۶۸)

آیت لا اکراہ فی الدین اور مرتد کی سزا پر ایک اشکال کا جواب

سوال: اگر ایک اسلامی ریاست میں ایک مرتد واجب القتل ہے تو پھر کیا یہ دین میں جبر کا استعمال نہیں ہے؟

جواب: مرتد کے بارے میں اسلام کا قانون بظاہر اس آیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت وہ اس کے خلاف نہیں ہے۔ آیت کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اسلام میں داخل نہ ہوئے ہوں۔ انھی کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ انھیں داخل ہونے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ اس کے برعکس مرتد کے بارے میں اسلامی قانون کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو اسلام میں داخل ہو کر پھر اس سے نکلنا چاہیں۔ ان لوگوں پر جبر کے استعمال کی اصل غرض یہ نہیں ہے کہ ان کو دین میں رکھا جائے بلکہ یہ ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو، جو ریاست کی بنیاد ہے، انتشار (Disintegration) سے بچایا جائے۔ اسلامی قانون جس طرح ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اسلامی ریاست کے اندر رہتے ہوئے علانیہ اسلام کو چھوڑ دے، اسی طرح وہ ایک غیر مسلم ذمی کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ ریاست کے حدود میں رہتے ہوئے اس کی وفاداری سے علانیہ انکار کر دے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی ریاست بھی اپنے اجزائے ترکیبی کے انتشار کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ اس معاملہ میں سب ہی ''داخل نہ ہونے والے اور داخل ہو کر نکل جانے والے'' کے درمیان فرق کرتے ہیں اور دونوں کے ساتھ ایک سا معاملہ کوئی بھی نہیں کرتا۔ کیا امریکی شہریت یا برطانوی قومیت اختیار نہ کرنے والے اور اختیار کر کے چھوڑ دینے والے کی پوزیشن ایک ہے؟ کیا امریکی وفاق میں شامل نہ ہونے والی ریاست اور شامل ہو کر نکل جانے والی ریاست کے ساتھ آپ ایک ہی معاملہ اختیار کریں گے؟

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۷ تا ۲۸۔ اشاعت چھٹی جولائی ۱۹۷۶ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن صفر ۱۳۷۵ھ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

اسلامی معیشت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

معاشیات اسلام

کیا معاش انسان کا اصل مسئلہ ہے؟

جولوگ معاشیات میں مستغرق ہیں وہ انسان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ معاش تیری زندگی کا اصل مسئلہ ہے اور باقی سارے مسائل اسی جڑ کی شاخیں ہیں۔ حالانکہ حقیقت جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک کل کے مختلف پہلو ہیں۔ اس کل کے اندر ان سب کا ایک خاص مقام ہے اور اس مقام کے لحاظ ہی سے ان کی اہمیت بھی ہے...... انسان کو زندہ رہنے کے لیے غذا کی، پوشش کی اور مکان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے معاشیات اس کی زندگی کے ایک اہم شعبے پر حاوی ہے، مگر وہ محض ایک کھانے، پہننے اور گھر بنا کر رہنے والا حیوان ہی نہیں ہے کہ تنہا معاشیات ہی پر اس کے فلسفۂ حیات کی بنا رکھ دی جائے۔ اپنے تمام وجود اور اپنی زندگی کے سارے شعبوں سمیت وہ کائنات کے اس عظیم الشان نظام کا ایک جز ہے اور اس کی زندگی کا ضابطہ لازمی طور پر اس امر کا تعین چاہتا ہے کہ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا جز ہونے کی حیثیت سے اس کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ نیز اس کے لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنے مقصد زندگی کا تعین کرے اور اس کے لحاظ سے فیصلہ کرے کہ اسے کس لیے کام کرنا ہے۔ یہ آخری دونوں سوال انسانی زندگی کے بنیادی سوال ہیں۔ انھی پر ایک فلسفۂ حیات بنتا ہے، پھر اس فلسفۂ حیات کے تحت تمام وہ علوم جو دنیا اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں اپنے اپنے دائرے کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور کم وبیش ان سب سے مل کر ایک لائحۂ عمل بنتا ہے جس پر انسانی زندگی کا پورا کارخانہ چلتا ہے۔ اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر آپ اپنی زندگی کے کسی مسئلے کو سمجھنا چاہیں تو اس کے لیے یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ آپ خوردبین لگا کر صرف اسی ایک مسئلے پر نظر کو محدود کر کے دیکھیں یا اس خاص شعبہ حیات کے لیے جس سے وہ مسئلہ تعلق رکھتا ہے ایک قسم کا تعصب لیے ہوئے پورے مجموعۂ حیات پر نظر ڈالیں بلکہ صحیح فہم وادراک کے لیے آپ کو پورے مجموعے کے اندر رکھ کر اسے دیکھنا ہوگا اور غیر متعصبانہ نگاہ سے اسے دیکھنا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ زندگی کے توازن میں کوئی بگاڑ پائیں اور اس کو درست کرنا چاہیں تو یہ اور بھی زیادہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خطرناک ہے کہ آپ کسی ایسے مسئلۂ زندگی کو کل مسئلۂ زندگی قرار دے کر سارے کارخانے کو اسی ایک پرزے کے گرد گھما دیں۔ اس حرکت سے تو آپ اور زیادہ عدم توازن پیدا کر دیں گے۔ صحیح طریقۂ اصلاح یہ ہے کہ غیر متعصبانہ نگاہ سے پورے نظام زندگی کو اس کے بنیادی فلسفے سے لے کر شاخوں کی تفصیلات تک دیکھیے اور تحقیق کیجیے کہ خرابی کس جگہ اور کس نوعیت کی ہے......

اب اگر ہم اصطلاحی اور فنی پیچیدگیوں سے بچ کر ایک سیدھے سادے طریقے سے دیکھیں تو انسان کا معاشی مسئلہ ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تمدن کی رفتارِ ترقی کو قائم رکھتے ہوئے کس طرح تمام انسانوں کو ان کی ضروریات زندگی بہم پہنچنے کا انتظام ہو اور کس طرح سوسائٹی میں ہر شخص کو اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشو ونما دینے اور اپنے کمال لائق تک پہنچنے کے مواقع حاصل رہیں۔

(انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا حل: ص ۵-۹، بار پنجم ۱۹۴۸ء)

معاشی انتظام کی خرابی کا سبب

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور خرابی کی نوعیت کیا ہے؟ نظام معیشت کی خرابی کا نقطۂ آغاز خودغرضی کا اعتدال سے بڑھ جانا ہے، پھر دوسرے رذائل اخلاق اور ایک فاسد نظام سیاست کی مدد سے یہ چیز بڑھتی اور پھیلتی ہے یہاں تک کہ پورے معاشی انتظام کو خراب کر کے زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اپنا زہریلا اثر پھیلا دیتی ہے...... شخصی ملکیت اور بعض انسانوں کا بعض کی بہ نسبت بہتر معاشی حالت میں ہونا، یہ دونوں عین فطرت کے مقتضیات تھے اور بجائے خود ان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر انسان کی تمام اخلاقی صفات کو توازن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور خارج میں بھی ایک ایسا نظام ریاست موجود ہوتا جو زور وقوت کے ساتھ عدل قائم رکھتا تو ان سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن جس چیز نے انھیں خرابیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ جو لوگ، فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ خودغرضی، تنگ نظری، بداندیشی، بخل، حرص، بددیانتی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ شیطان نے انھیں یہ سمجھایا کہ تمھاری اصلی ضرورت سے زائد جو وسائل معیشت تمھیں ملتے ہیں اور جن پر تمھیں حقوق مالکانہ حاصل ہیں، ان کے صحیح ومعقول مصرف صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو اپنی آسائش، آرائش، لطف، تفریح اور خوش باشی میں صرف کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کو مزید وسائلِ معیشت پر قبضہ کرنے کے لیے استعمال کرو، اور بن پڑے تو انھیں کے ذریعے سے انسانوں کے خدا اور ان داتا بن جاؤ۔

(انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا حل: ص ۱۳-۱۴، بار پنجم ۱۹۴۸ء)

قرآن مجید کی معاشی پالیسی کا بنیادی قاعدہ

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۔ (الحشر ۵۹:۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تا کہ وہ تمھارے مال داروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

یہ قرآن مجید کی اہم ترین اصولی آیات میں سے ہے جس میں اسلامی معاشرے اور حکومت کی معاشی پالیسی کا یہ بنیادی قاعدہ بیان کیا گیا ہے کہ دولت کی گردش پورے معاشرے میں عام ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ مال صرف مالداروں ہی میں گھومتا رہے، یا امیر روز بروز امیر تر اور غریب روز بروز غریب تر ہوتے چلے جائیں۔ قرآن مجید میں اس پالیسی کو صرف بیان ہی کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسی مقصد کے لیے سود حرام کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کی گئی ہے، اموالِ غنیمت میں سے خمس نکالنے کا حکم دیا گیا ہے، صدقاتِ نافلہ کی جگہ جگہ تلقین کی گئی ہے۔ مختلف قسم کے کفاروں کی ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جن سے دولت کے بہاؤ کا رخ معاشرے کے غریب طبقات کی طرف پھیر دیا جائے، میراث کا ایسا قانون بنایا گیا ہے کہ ہر مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دولت زیادہ سے زیادہ وسیع دائرے میں پھیل جائے، اخلاقی حیثیت سے بخل کو سخت قابل مذمت اور فیاضی کو بہترین صفت قرار دیا گیا ہے، خوشحال طبقوں کو یہ سمجھایا گیا ہے کہ ان کے پاس مال میں سائل اور محروم کا حق ہے جسے خیرات نہیں بلکہ ان کا حق سمجھ کر ہی انھیں ادا کرنا چاہیے اور اسلامی حکومت کی آمدنی کے ایک بہت بڑے ذریعے، یعنی فَے کے متعلق یہ قانون مقرر کر دیا گیا ہے کہ اس کا ایک حصہ لازماً معاشرے کے غریب طبقات کو سہارا دینے کے لیے صرف کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ اسلامی حکومت کے ذرائع آمدنی کی اہم ترین مدات دو ہیں۔ ایک زکوٰۃ، دوسری فَے۔ زکوٰۃ مسلمانوں کے پورے زائد از نصاب سرمائے، مویشی، اموالِ تجارت اور زرعی پیداوار سے وصول کی جاتی ہے اور وہ زیادہ تر غریبوں ہی کے لیے مخصوص ہے اور فَے میں جزیہ و خراج سمیت وہ تمام آمدنیاں شامل ہیں جو غیر مسلموں سے حاصل ہوں، اور ان کا بھی بڑا حصہ غریبوں ہی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ کھلا ہوا اشارہ اس طرف ہے کہ ایک اسلامی حکومت کو اپنی آمد و خرچ کا نظام اور بحیثیت مجموعی ملک کے تمام مالی اور معاشی معاملات کا انتظام اس طرح کرنا چاہیے کہ دولت کے ذرائع پر مال دار اور با اثر لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ ہو، اور دولت کا بہاؤ نہ غریبوں سے امیروں کی طرف ہونے پائے نہ وہ امیروں ہی میں چکر لگاتی رہے۔

(تفہیم القرآن: ج۵، ص ۳۹۳، الحشر، حاشیہ ۱۴)

معاشی مساوات اور اسلام

مصنوعی معاشی مساوات اسلام کا مطالبہ نہیں ہے، نہ اسلام اس طرز کی سوسائٹی بنانا چاہتا ہے جس میں مصنوعی طور پر یوں مساوات پیدا کی جائے کہ جسے اللہ اپنے فضل سے سو روپے مہینہ کی حلال آمدنی دے، وہ لازماً اس معیار پر زندگی بسر کرے جو دس یا پندرہ روپے رکھنے والے کا ہو۔ نہ صحابہ کرامؓ میں یہ قاعدہ جاری کیا گیا تھا کہ عثمانؓ، اور عمارؓ و بلالؓ کا معیار معاشرت ایک ہونا چاہیے۔ اگر لوگوں کے دل اس طرح کی مساوات نہ ہونے پر ٹوٹتے ہیں اور ان میں رشک و حسد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ ان کی غیر اسلامی ذہنیت کا نتیجہ ہے اور اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ علمائے کرام اسلامی اصول کے خلاف مساوات پیدا کرنے پر زور دیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ [لوگوں] میں وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ[1] کی ذہنیت پیدا کر دیں۔

(خطوط مودودی: اول، ص ۷۰، نمبر شمار ۱۲، اشاعت اول، اپریل ۱۹۸۳ء)

بندوں کے درمیان تقسیم رزق میں کمی بیشی کی حکمت

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے درمیان رزق کی بخشش میں کم و بیش کا جو فرق رکھا ہے انسان اس کی مصلحتوں کو نہیں سمجھ سکتا، لہٰذا تقسیم رزق کے فطری نظام میں انسان کو اپنی مصنوعی تدبیروں سے دخل انداز نہ ہونا چاہیے۔ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا، یا اس کو فطرت کی حدود سے بڑھا کر بے انصافی کی حد تک پہنچا دینا، دونوں ہی یکساں غلط ہیں۔ ایک صحیح معاشی نظام وہی ہے جو خدا کے مقرر کیے ہوئے طریقِ تقسیم رزق سے قریب تر ہو۔ (اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ) کے فقرے میں قانونِ فطرت کے جس قاعدے کی طرف رہنمائی کی گئی ہے اس کی وجہ سے مدینے کے اصلاحی پروگرام میں یہ تخیل سرے سے کوئی راہ نہ پا سکا کہ رزق اور وسائلِ رزق میں تفاوت اور تفاضل بجائے خود کوئی برائی ہے جسے مٹانا اور ایک بے طبقات سوسائٹی پیدا کرنا کسی درجے میں بھی مطلوب ہو۔ اس کے برعکس مدینہ طیبہ میں انسانی تمدن کو صالح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جو راہ عمل اختیار کی گئی ہے وہ یہ تھی کہ فطرت اللہ نے انسانوں کے درمیان جو فرق رکھے ہیں ان کو اصل فطری حالت پر برقرار رکھا جائے اور سوسائٹی کے اخلاق و اطوار اور قوانینِ عمل کی اس طرح اصلاح کر دی جائے کہ معاش کا فرق و تفاوت کسی ظلم و بے انصافی کا موجب بننے کے بجائے ان بے شمار اخلاقی، روحانی اور تمدنی فوائد و برکات کا ذریعہ بن جائے جس کی خاطر ہی دراصل خالق کائنات نے اپنے بندوں کے درمیان یہ فرق و تفاوت رکھا ہے۔

(تفہیم القرآن: ج ۲، ص ۶۱۲-۶۱۳، بنی اسرائیل، حاشیہ ۳۰)

❀❀❀❀❀❀❀

[1] ترجمہ: اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے کسی کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ (النساء ۴: ۳۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

اسلامی نظم معیشت کے بنیادی ارکان

اسلام نے اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان جو متوسط معاشی نظریہ اختیار کیا ہے اس پر ایک نظام کی عمارت اٹھانے کے لیے وہ سب سے پہلے فرد اور معاشرے میں چند ایسی اخلاقی اور عملی بنیادیں قائم کرتا ہے جو اس عمارت کو مضبوطی کے ساتھ سنبھال سکیں۔ اس غرض کے لیے وہ ہر ہر فرد کی ذہنیت کو درست کر کے اس میں ٹھیک وہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس متوازن نظام کے چلانے والے افراد میں درکار ہے۔ وہ انفرادی آزادی پر چند حدود عائد کرتا ہے تاکہ وہ اجتماعی مفاد کے لیے مضر ہونے کے بجائے مثبت طور پر مفید و معاون ہو جائے۔ وہ معاشرے میں کچھ ایسے قواعد مقرر کرتا ہے جو معاشی زندگی کو خراب کرنے والے اسباب کا سدباب کر دیتے ہیں۔ یہ اسلامی نظمِ معیشت کے بنیادی ارکان ہیں جنھیں سمجھ لینا جدید معاشی پیچیدگیوں کے اسلامی حل کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

ا۔ اکتسابِ مال کے ذرائع میں جائز اور ناجائز کی تفریق

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اسلام اپنے پیرؤوں کو دولت کمانے کا عام لائسنس نہیں دیتا بلکہ کمائی کے طریقوں میں اجتماعی مفاد کے لحاظ سے جائز اور ناجائز کا امتیاز قائم کرتا ہے یہ امتیاز اس قاعدہ کلیہ پر مبنی ہے کہ دولت حاصل کرنے کے تمام وہ طریقے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص یا اشخاص کے نقصان پر ہو، اور ہر وہ طریقہ جائز ہے جس میں فوائد کا مبادلہ اشخاص متعلقہ کے درمیان منصفانہ طور پر ہو۔ قرآن مجید میں اس قاعدۂ کلیہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا۔ (النساء ۴: ۲۹-۳۰)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو بجز اس کے کہ لین دین آپس کی رضامندی سے ہو اور تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو اللہ تمھارے حال پر مہربان ہے۔ اور جو کوئی اپنی حد سے تجاوز کر کے ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم آگ میں جھونک دیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس آیت میں لین دین کے لیے جواز کی دو شرطیں بتائی گئی ہیں۔ایک یہ کہ لین دین باہمی رضامندی سے ہو۔دوسرے یہ کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان نہ ہو۔اس معنی میں وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ کا فقرہ نہایت بلیغ ہے۔اس کے دو مفہوم ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد لیے گئے ہیں۔ایک یہ کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک نہ کرو۔دوسرے یہ کہ تم خود اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنے فائدے کے لیے دوسرے کا نقصان کرتا ہے وہ گویا اس کا خون پیتا ہے،اور مآل کار میں خود اپنی تباہی کا راستہ کھولتا ہے۔چوری،رشوت،قمار،دغا وفریب،سود اور تمام ان تجارتی طریقوں میں جن کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے،عدم جواز کے یہ دونوں اسباب پائے جاتے ہیں اور اگر بعض میں باہمی رضامندی کے وہم کی گنجایش بھی ہے تو وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ کی دوسری اہم شرط مفقود ہے۔

۲۔مال جمع کرنے کی ممانعت

دوسرا اہم حکم یہ ہے کہ جائز طریقوں سے جو دولت کمائی جائے اس کو جمع نہ کیا جائے،کیونکہ اس سے دولت کی گردش رک جاتی ہے اور تقسیم دولت میں توازن برقرار نہیں رہتا۔دولت سمیٹ سمیٹ کر جمع کرنے والا نہ صرف خود بدترین اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ درحقیقت وہ پوری جماعت کے خلاف ایک شدید جرم کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کا نتیجہ آخرکار خود اس کے اپنے لیے بھی برا ہے۔اسی لیے قرآن مجید بخل اور قارونیت کا سخت مخالف ہے۔وہ کہتا ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ ۔ (آلِ عمران ۳:۱۸۰)

جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے فضل میں بخل کرتے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ فعل ان کے لیے اچھا ہے،بلکہ درحقیقت یہ ان کے لیے برا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ (التوبۃ ۹:۳۴)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ان کو عذاب الیم کی خبر دے دو۔

یہ چیز سرمایہ داری کی بنیاد پر ضرب لگاتی ہے۔بچت کو جمع کرنا اور جمع شدہ دولت کو مزید دولت پیدا کرنے میں لگانا ہی دراصل سرمایہ داری کی جڑ ہے۔مگر اسلام سرے سے اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی اپنی ضرورت سے زائد دولت کو جمع کر کے رکھے۔

۳۔خرچ کرنے کا حکم

جمع کرنے کے بجائے اسلام خرچ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔مگر خرچ کرنے سے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے عیش و آرام اور گلچھرے اڑانے میں دولت لٹائیں۔بلکہ وہ خرچ کرنے کا حکم فی سبیل اللہ کی قید کے ساتھ دیتا ہے،یعنی آپ کے پاس اپنی ضرورت سے جو کچھ بچ جائے اس کو جماعت کی بھلائی کے کاموں میں خرچ کر دیں کہ یہی سبیل اللہ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ ۲:۲۱۹)

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہو کہ جو ضرورت سے بچ رہے۔

وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْجَارِ الْجُنُبِ وَ الصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (النساء ۴:۳۶)

اور نیک سلوک کرو اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور نادار مسکینوں اور قرابت دار پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والے دوستوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ۔

وَفِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ۝ (الذاریات ۵۱:۱۹)

اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔

یہاں پہنچ کر اسلام کا نقطۂ نظر سرمایہ داری کے نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ خرچ کرنے سے مفلس ہو جاؤں گا اور جمع کرنے سے مال دار بنوں گا۔ اسلام کہتا ہے کہ خرچ کرنے سے برکت ہوگی۔ تیری دولت گھٹے گی نہیں بلکہ بڑھے گی۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ (البقرۃ ۲:۲۶۸)

شیطان تم کو ناداری کا خوف دلاتا ہے اور (بخل جیسی) شرم ناک بات کا حکم دیتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ تم سے بخشش اور مزید عطا کا وعدہ کرتا ہے۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ جو کچھ خرچ کر دیا وہ کھو دیا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں وہ کھویا نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمھاری طرف پلٹ کر آئے گا۔

وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (البقرۃ ۲:۲۷۲)

اور تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔

وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ ۙ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَ يَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ (الفاطر ۳۵:۲۹-۳۰)

اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ان کے بدلے ان کو پورے پورے اجر دے گا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی عنایت کرے گا۔

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ دولت کو جمع کر کے اس کو سود پر چلانے سے دولت بڑھتی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں، سود سے تو دولت گھٹ جاتی ہے۔ دولت بڑھانے کا ذریعہ نیک کاموں میں اسے خرچ کرنا ہے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ (البقرۃ ۲:۲۷۶)

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

وَ مَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاۡ فِيْۤ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ مَاۤ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الْمُضْعِفُوْنَ۞۔ (الروم ۳۰:۳۹)

اور یہ جو تم سود دیتے ہو تا کہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ ہرگز نہیں بڑھتا، بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکوٰۃ میں دیتے ہو۔

یہ ایک نیا نظریہ ہے جو سرمایہ داری کے نظریے کی بالکل ضد ہے۔ خرچ کرنے سے دولت کا بڑھنا اور خرچ کیے ہوئے مال کا ضائع نہ ہونا بلکہ اس کا پورا پورا بدل کچھ زائد فائدے کے ساتھ واپس آنا، سود سے دولت میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹا گھاٹا آنا، زکوٰۃ و صدقات سے دولت میں کمی واقع ہونے کے بجائے اضافہ ہونا، یہ ایسے نظریات ہیں جو بظاہر عجیب معلوم ہوتے ہیں۔ سننے والا سمجھتا ہے کہ شاید ان سب باتوں کا تعلق ثواب آخرت سے بھی ہے، اور اسلام کی نگاہ میں اصلی اہمیت اسی کی ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں بھی معاشی حیثیت سے یہ نظریات ایک نہایت مضبوط بنیاد پر قائم ہیں۔ دولت کو جمع کرنے اور اس کو سود پر چلانے کا آخری نتیجہ یہ ہے کہ دولت سمٹ سمٹ کر چند افراد کے پاس اکٹھی ہو جائے۔ جمہور کی قوت خرید (Purchasing Power) روز بروز گھٹتی چلی جائے۔ صنعت اور تجارت اور زراعت میں کساد بازاری رونما ہو، قوم کی معاشی زندگی تباہی کے سرے پر جا پہنچے، اور آخر کار خود سرمایہ دار افراد کے لیے بھی اپنی جمع شدہ دولت کو افزائش دولت کے کاموں میں لگانے کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔[1] بخلاف اس کے خرچ کرنے اور زکوٰۃ و صدقات دینے کا مآل یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد تک دولت پھیل جائے، ہر ہر شخص کو کافی قوت خرید حاصل ہو، صنعتیں پرورش پائیں، کھیتیاں سرسبز ہوں، تجارت کو خوب فروغ ہو، اور چاہے کوئی لکھ پتی اور کروڑ پتی نہ ہو، مگر سب خوشحال و فارغ البال ہوں۔ اس مال اندیشانہ معاشی نظریے کی صداقت اگر دیکھنی ہو تو سرمایہ داری نظام کے تحت دنیا کے موجودہ معاشی حالات کو دیکھیے کہ جہاں سود ہی کی وجہ سے تقسیم ثروت کا توازن بگڑ گیا ہے، اور صنعت و تجارت کی کساد بازاری نے عوام کی معاشی زندگی کو تباہی کے سرے پر پہنچا دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ابتدائے عہد اسلامی کی حالت کو دیکھیے کہ جب اس معاشی نظریہ کو پوری شان کے ساتھ عملی جامہ پہنایا گیا تو چند سال کے اندر عوام کی خوشحالی اس مرتبے کو پہنچ گئی کہ لوگ زکوٰۃ کے مستحقین کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور مشکل ہی سے کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خود صاحب نصاب نہ ہو۔ ان دونوں حالتوں کا موازنہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کس طرح سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔

پھر اسلام جو ذہنیت پیدا کرتا ہے وہ بھی سرمایہ دارانہ ذہنیت سے بالکل مختلف ہے۔ سرمایہ دار کے ذہن میں کسی طرح یہ تصور سما ہی نہیں سکتا کہ ایک شخص اپنا روپیہ دوسرے کو سود کے بغیر کیسے دے سکتا ہے۔ وہ قرض پر نہ صرف سود لیتا ہے بلکہ اپنے راس المال اور سود کی بازیافت کے لیے قرض دار کے کپڑے اور گھر کے برتن تک قرق کرا لیتا ہے۔ مگر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حاجت

---

[1] اس بات کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان الربا وان کثیر فان عاقبتہٗ تصیر الی قِلٍّ (ابن ماجہ، بیہقی، احمد) یعنی سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو مگر انجام کار وہ کمی کی طرف پلٹتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مند کو صرف قرض ہی نہ دو بلکہ اگر وہ تنگ دست ہو تو اس پر تقاضے میں سختی بھی نہ کرو، حتیٰ کہ اگر اس میں دینے کی استطاعت نہ ہو تو معاف کر دو۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ ۲:۲۸۰)

اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دے دو، اور اگر معاف کر دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔

سرمایہ داری میں امدادِ باہمی کے معنی یہ ہیں کہ آپ انجمن امداد باہمی کو پہلے روپیہ دے کر اس کے رکن بنیے، پھر اگر کوئی ضرورت آپ کو پیش آئے گی تو انجمن آپ کو عام بازاری شرح سود سے کچھ کم پر قرض دے دے گی۔ اگر آپ کے پاس روپیہ نہیں ہے تو ''امداد باہمی'' سے آپ کچھ بھی امداد حاصل نہیں کر سکتے۔ برعکس اس کے اسلام کے ذہن میں امداد باہمی کا تصور یہ ہے کہ جو لوگ ذی استطاعت ہوں وہ ضرورت کے وقت اپنے کم استطاعت بھائیوں کو نہ صرف قرض دیں بلکہ قرض ادا کرنے میں بھی حسبةً للہ ان کی مدد کریں، چنانچہ زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف و الغارمین بھی ہے یعنی قرض داروں کے قرض ادا کرنا۔

سرمایہ دار اگر نیک کاموں میں خرچ کرتا ہے تو محض نمایش کے لیے، کیونکہ اس کم نظر کے نزدیک اس خرچ کا کم سے کم یہ معاوضہ تو اس کو حاصل ہونا ہی چاہیے کہ اس کا نام ہو جائے۔ اس کو مقبولیت عام حاصل ہو، اس کی دھاک اور ساکھ بیٹھ جائے۔ مگر اسلام کہتا ہے کہ خرچ کرنے میں نمایش ہرگز نہ ہونی چاہیے۔ خفیہ یا علانیہ جو کچھ بھی خرچ کرو، اس میں یہ مقصد پیش نظر ہی نہ رکھو کہ فوراً اس کا بدل تم کو کسی نہ کسی شکل میں مل جائے بلکہ مآل کار پر نگاہ رکھو۔ اس دنیا سے لے کر آخرت تک جتنی دور تمھاری نظر جائے گی تم کو یہ خرچ پھلتا پھولتا اور منافع پر منافع پیدا کرتا ہی دکھائی دے گا۔ ''جو شخص اپنے مال کو نمایش کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی تھی۔ اس نے اس مٹی پر بیج بویا، مگر پانی کا ایک ریلہ آیا اور مٹی کو بہا لے گیا اور جو شخص اپنی نیت کو درست رکھ کر اللہ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس نے ایک عمدہ زمین میں باغ لگایا، اگر بارش ہوگئی تو دوگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ ہوئی تو محض ہلکی سی پھوار اس کے لیے کافی ہے۔'' (البقرۃ ۲:۲۶۴-۲۶۵)

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ ۔ (البقرۃ ۲:۲۷۱)

اگر صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے۔ لیکن اگر چھپا کر دو اور غریب لوگوں تک پہنچاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔

سرمایہ دار اگر نیک کام میں کچھ صرف بھی کرتا ہے تو بادلِ نخواستہ۔ بدتر سے بدتر مال دیتا ہے اور پھر جس کو دیتا ہے اس کی آدھی جان اپنی زبان کے نشتروں سے نکال لیتا ہے۔ اسلام اس کے بالکل برعکس یہ سکھاتا ہے کہ اچھا مال خرچ کرو، اور احسان نہ جتاؤ، بلکہ اس کی خواہش بھی نہ رکھو کہ کوئی تمھارے سامنے احسان مندی کا اظہار کرے۔

اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ ۔ (البقرۃ ۲:۲۶۷)

تم نے جو کچھ کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے عمدہ اموال کو راہِ خدا میں صرف کرو، نہ یہ کہ بدتر مال

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چھانٹ کر اس میں سے دینے لگو۔

لَا تُبْطِلُوا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ (البقرة ۲:۲۶۴)

اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر ملیا میٹ نہ کرو۔

وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ (الدھر ۷۶:۸-۹)

اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔ ہم تم سے کسی جزا اور شکریے کے خواہش مند نہیں ہیں۔

چھوڑیے اس سوال کو کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے ان دونوں ذہنیتوں میں کتنا عظیم تفاوت ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ خالص معاشی نقطۂ نظر ہی سے دیکھ لیجیے کہ فائدے اور نقصان کے ان دونوں نظریوں میں سے کون سا نظریہ زیادہ محکم اور دوررس نتائج کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے۔ پھر جب کہ منفعت و مضرت کے باب میں اسلام کا نظریہ وہ ہے جو آپ دیکھ چکے ہیں تو کیوں کر ممکن ہے کہ اسلام کسی شکل میں بھی سودی کاروبار کو جائز رکھے؟

۴۔ زکوٰۃ [صدقات]

اسلام کا مقصد جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ ہے کہ دولت کسی جگہ جمع نہ ہونے پائے۔ وہ چاہتا ہے کہ جماعت کے جن افراد کو اپنی بہتر قابلیت یا خوش قسمتی کی بنا پر ان کی ضرورت سے زیادہ دولت میسر آ گئی ہو وہ اس کو سمیٹ کر نہ رکھیں بلکہ خرچ کریں، اور ایسے مصارف میں خرچ کریں جن سے دولت کی گردش میں سوسائٹی کے کم نصیب افراد کو بھی کافی حصہ مل جائے۔ اس غرض کے لیے اسلام ایک طرف اپنی بلند اخلاقی تعلیم اور ترغیب و ترہیب کے نہایت موثر طریقوں سے فیاضی اور حقیقی امداد باہمی کی اسپرٹ پیدا کرتا ہے، تاکہ لوگ خود اپنے میلانِ طبع ہی سے دولت جمع کرنے کو برا سمجھیں اور اسے خرچ کر دینے کی طرف راغب ہوں۔ دوسری طرف وہ ایسا قانون بناتا ہے کہ جو لوگ فیاضی کی اس تعلیم کے باوجود اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے روپیہ جوڑنے اور مال سمیٹنے کے خوگر ہوں، یا جن کے پاس کسی نہ کسی طور پر مال جمع ہو جائے، ان کے مال میں سے بھی کم از کم ایک حصہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لیے ضرور نکلوا لیا جائے۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اس کو ارکانِ اسلام میں شامل کر لیا گیا ہے۔ نماز کے بعد سب سے زیادہ اسی کی تاکید کی گئی ہے اور صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو شخص دولت جمع کرتا ہے، اس کی دولت اس کے لیے حلال ہی نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ زکوٰۃ نہ ادا کرے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔ (التوبة ۹:۱۰۳)

ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرو اور اس کے ذریعے سے ان کو پاک اور طاہر کر دو۔

لفظ زکوٰۃ خود اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مال دار آدمی کے پاس جو دولت جمع ہوتی ہے وہ اسلام کی نگاہ میں ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نجاست ہے، ایک ناپاکی ہے اور وہ پاک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا مالک اس میں سے ہر سال کم از کم ڈھائی فی صد راہِ خدا میں خرچ نہ کر دے۔ راہِ خدا کیا ہے؟ خدا کی ذات تو بے نیاز ہے، اس کو نہ تمھارا مال پہنچتا ہے نہ وہ اس کا حاجت مند ہے۔ اس کی راہ بس یہی ہے کہ تم خود اپنی قوم کے تنگ حال لوگوں کو خوش حال بنانے کی کوشش کرو اور ایسے مفید کاموں کو ترقی دو جن کا فائدہ ساری قوم کو حاصل ہوتا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ الْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَ فِي الرِّقَابِ وَ الْغٰرِمِيْنَ وَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۔ (التوبۃ ۹:۶۰)

صدقات تو دراصل فقرا اور مساکین کے لیے ہیں اور ان کارکنوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل پر مقرر ہوں اور ان لوگوں کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو اور لوگوں کی گردنیں بندِ اسیری سے چھڑانے کے لیے اور قرض داروں کے لیے اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کے لیے اور مسافروں کے لیے۔

یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے۔ یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے۔ یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے۔ یہ ان کے لیے بے کاروں کا سرمایۂ اعانت ہے۔ یہ ان کے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعۂ معاش ہے اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکرِ فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادا اصول یہ ہے کہ آج تم مال دار ہو تو دوسروں کی مدد کرو۔ کل تم نادار ہو گئے تو دوسرے تمھاری مدد کریں گے۔ تمھیں یہ فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ مفلس ہو گئے تو کیا بنے گا؟ مر گئے تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ کوئی آفت ناگہانی آپڑی، بیمار ہو گئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آ گیا، دیوالہ نکل گیا، تو ان مصیبتوں سے مخلصی کی کیا سبیل ہوگی؟ سفر میں پیسہ پاس نہ رہا تو کیوں کر گزر بسر ہوگی؟ ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لیے بے فکر کر دیتی ہے۔ تمھارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی فی صد دے کر اللہ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرالو۔ اس وقت تم کو اس دولت کی ضرورت نہیں ہے، یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔ کل جب تم ضرورت مند ہو گے یا تمھاری اولاد ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف تمھارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے بھی زیادہ تم کو واپس مل جائے گا۔

یہاں پھر سرمایہ داری اور اسلام کے اصول و مناہج میں کلی تضاد نظر آتا ہے، سرمایہ داری کا اقتضا یہ ہے کہ روپیہ جمع کیا جائے اور اس کو بڑھانے کے لیے سود لیا جائے تاکہ ان نالیوں کے ذریعے سے آس پاس کے لوگوں کا روپیہ بھی سمٹ کر اس جھیل میں جمع ہو جائے۔ اسلام اس کے بالکل خلاف یہ حکم دیتا ہے کہ روپیہ اول تو جمع ہی نہ ہو، اور اگر جمع ہو بھی تو اس تالاب میں سے زکوٰۃ کی نہریں نکال دی جائیں تاکہ جو کھیت سوکھے ہیں ان کو بھی پانی پہنچے اور گرد و پیش کی ساری زمین شاداب ہو جائے۔ سرمایہ داری کے نظام میں دولت کا مبادلہ مقید ہے اور اسلام میں آزاد۔ سرمایہ داری کے تالاب سے پانی لینے کے لیے ناگزیر ہے کہ خاص آپ کا پانی پہلے سے وہاں موجود ہو، ورنہ آپ ایک قطرۂ آب بھی وہاں سے نہیں لے سکتے۔ اس کے مقابلے میں اسلام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے خزانۂ آب کا قاعدہ یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ پانی ہو وہ اس میں لا کر ڈال دے اور جس کو پانی کی ضرورت ہو وہ اس میں سے لے لے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں طریقے اپنی اصل اور طبیعت کے لحاظ سے ایک دوسرے کی پوری پوری ضد ہیں اور ایک ہی نظم معیشت میں دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

۵۔ قانونِ وراثت

اپنی ضرورت پر خرچ کرنے اور راہِ خدا میں دینے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی جو دولت کسی ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو، اس کو پھیلانے کے لیے پھر ایک تدبیر اسلام نے اختیار کی ہے اور وہ اس کا قانونِ وراثت ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو شخص مال چھوڑ کر مر جائے، خواہ وہ زیادہ ہو یا کم، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نزدیک و دور کے تمام رشتے داروں میں درجہ بدرجہ پھیلا دیا جائے اور اگر کسی کا کوئی وارث بھی نہ ہو یا نہ ملے تو بجائے اس کے کہ اسے متبنّیٰ بنانے کا حق دیا جائے، اس کے مال کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دینا چاہیے تا کہ اس سے پوری قوم فائدہ اٹھائے۔ تقسیم وراثت کا یہ قانون جیسا اسلام میں پایا جاتا ہے، کسی اور معاشی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے معاشی نظاموں کا میلان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے سمیٹ کر جمع کی ہے وہ اس کے بعد بھی ایک یا چند اشخاص کے پاس سمٹی رہے۔[1] مگر اسلام دولت کے سمٹنے کو پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تا کہ دولت کی گردش میں آسانی ہو۔

۶۔ غنائمِ جنگ اور اموالِ مفتوحہ کی تقسیم

اس معاملے میں بھی اسلام نے وہی مقصد پیش نظر رکھا ہے۔ جنگ میں جو مالِ غنیمت فوجوں کے ہاتھ آئے اس کے متعلق یہ قانون بنایا گیا ہے کہ اس کے پانچ حصے کیے جائیں، چار حصے فوج میں تقسیم کر دیے جائیں اور ایک حصہ اس غرض کے لیے رکھ لیا جائے کہ عام قومی مصالح میں صرف ہو۔

> وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۔ (الانفال ۸:۴۱)
>
> جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت میں ہاتھ آئے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رسولؐ کے رشتہ داروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کے حصے سے مراد ان اجتماعی اغراض و مصالح کا حصہ ہے جن کی نگرانی اللہ اور اس کے رسول کے تحتِ حکم اسلامی حکومت کے سپرد کی گئی ہے۔

---

[1] اولادِ اکبر کی جانشینی کا قانون (Law of Primogeniture) اور مشترک خاندان کا طریقہ (Joint Family System) اسی مقصد پر مبنی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد خمس میں تین طبقوں کا حصہ خصوصیت کے ساتھ رکھا گیا ہے:

قوم کے یتیم بچے تا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو اور ان کو زندگی کی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل بنایا جائے۔

مساکین جن میں بیوہ عورتیں، اپاہج، معذور، بیمار اور نادار سب شامل ہیں۔

ابن سبیل یعنی مسافر۔ اسلام نے اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں مسافر نوازی کا میلان خاص طور پر پیدا کیا ہے اور اس کے ساتھ زکوٰۃ و صدقات اور غنائم جنگ میں بھی مسافروں کا حق رکھا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس نے اسلامی ممالک میں تجارت، سیاحت، تعلیم اور مطالعہ و مشاہدۂ آثار و احوال کے لیے لوگوں کی نقل و حرکت میں بڑی آسانیاں پیدا کر دیں۔

جنگ کے نتیجے میں جو اراضی اور اموال اسلامی حکومت کے ہاتھ آئیں ان کے لیے یہ قانون بنایا گیا ہے کہ ان کو بالکلیہ حکومت کے قبضے میں رکھا جائے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ ...... لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ ...... وَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ ...... وَ الَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (الحشر ۵۹: ۷-۱۰)

جو کچھ مال و جائداد اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں کے باشندوں سے فَے میں دلوایا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول اور رسول کے رشتے داروں، اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے ہے تا کہ یہ مال صرف تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان چکر نہ لگاتا رہے...... اور اس میں ان نادار مہاجرین کا بھی حصہ ہے جو اپنے گھر بار اور جائدادوں سے بے دخل کر کے نکال دیے گئے ہیں...... اور ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو مہاجرین کی آمد سے پہلے مدینہ میں ایمان لائے تھے...... اور ان کی آیندہ نسلوں کا بھی حصہ ہے جو بعد میں آنے والی ہیں۔

اس آیت میں نہ صرف ان مصارف کی توضیح کی گئی ہے جن میں اموالِ فَے کو صرف کیا جائے گا، بلکہ صاف طور پر اس مقصد کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کو اسلام نے نہ صرف اموالِ فَے کی تقسیم میں، بلکہ اپنے پورے معاشی نظام میں پیش رکھا ہے یعنی كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ؕ (مال تمھارے مال داروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے) یہ مضمون جس کو قرآن مجید نے ایک چھوٹے سے جامع فقرے میں بیان کر دیا ہے، اسلامی معاشیات کا سنگ بنیاد ہے۔

۷۔ اقتصاد کا حکم

ایک طرف اسلام نے دولت کو تمام افرادِ قوم میں گردش دینے اور مال داروں کے مال میں ناداروں کو حصہ دار بنانے کا انتظام کیا ہے، جیسا کہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ دوسری طرف وہ ہر شخص کو اپنے خرچ میں اقتصاد اور کفایت شعاری ملحوظ رکھنے کا حکم دیتا ہے تا کہ افراد اپنے معاشی وسائل سے کام لینے میں افراط یا تفریط کی روش اختیار کر کے تقسیم ثروت کے توازن کو نہ بگاڑ دیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرآن مجید کی جامع تعلیم اس باب میں یہ ہے کہ:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

نہ اپنے ہاتھ کو اپنی گردن سے باندھے رکھ (کہ کھلے ہی نہیں) اور نہ اس کو بالکل ہی کھول دے کہ بعد میں حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان ۲۵:۶۷)

اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل برتتے ہیں بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل رہتے ہیں۔

اس تعلیم کا منشا یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کچھ خرچ کرے اپنے معاشی وسائل کی حد میں رہ کر خرچ کرے۔ نہ اس قدر حد سے تجاوز کر جائے کہ اس کا خرچ اس کی آمدنی سے بڑھ جائے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فضول خرچیوں کے لیے ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا پھرے۔ دوسروں کی کمائی پر ڈاکے مارے۔ حقیقی ضرورت کے بغیر لوگوں سے قرض لے اور پھر یا تو ان کے قرض مار کھائے یا قرضوں کا بھگتان بھگتنے میں اپنے تمام معاشی وسائل کو صرف کر کے اپنے آپ کو خود اپنے کیے کرتوتوں سے فقرا ومساکین کے زمرے میں شامل کر دے۔ نہ ایسا بخیل بن جائے کہ اس کے معاشی وسائل جس قدر خرچ کرنے کی اس کو اجازت دیتے ہوں، اتنا بھی نہ خرچ کرے۔ پھر اپنی حد کے اندر رہ کر خرچ کرنے کے بھی یہ معنی نہیں ہیں کہ اگر وہ اچھی آمدنی رکھتا ہے تو اپنی ساری کمائی صرف اپنے عیش وآرام اور تزک واحتشام پر صرف کر دے، درآں حالیکہ اس کے عزیز، قریب دوست، ہمسائے مصیبت کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ اس قسم کے خودغرضانہ خرچ کو بھی اسلام فضول خرچی ہی شمار کرتا ہے:

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶-۲۷)

اور اپنے رشتے دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو۔ فضول خرچی نہ کر۔ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

اسلام نے اس باب میں صرف اخلاقی تعلیم ہی دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اس نے بخل اور فضول خرچی کی انتہائی صورتوں کو روکنے کے لیے قوانین بھی بنائے ہیں، اور ایسے تمام طریقوں کا سد باب کرنے کی کوشش کی ہے جو تقسیم ثروت کے توازن کو بگاڑنے والے ہیں۔ وہ جوئے کو حرام قرار دیتا ہے۔ شراب اور زنا سے روکتا ہے۔ لہوولعب کی بہت سی مسرفانہ عادتوں کو جن کا لازمی نتیجہ ضیاع وقت اور ضیاع مال ہے، ممنوع قرار دیتا ہے۔ موسیقی کے فطری ذوق کو اس حد تک پہنچنے سے باز رکھتا ہے، جہاں انسان کا انہماک دوسری اخلاقی وروحانی خرابیاں پیدا کرنے کے ساتھ معاشی زندگی میں بھی بدنظمی پیدا کرنے کا موجب ہو سکتا ہے اور فی الواقع ہو جاتا ہے۔ جمالیات کے طبعی رجحان کو بھی وہ حدود کا پابند بناتا ہے۔ قیمتی ملبوسات، زروجواہرات کے زیورات، سونے چاندی کے ظروف اور تصاویر اور مجسموں کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام مروی ہیں ان سب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں دوسرے مصالح کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی پیش نظر ہے کہ جو دولت تمھارے بہت سے غریب بھائیوں کی ناگزیر ضرورتیں پوری کرسکتی ہے، ان کو زندگی کے مایحتاج فراہم کر کے دے سکتی ہے، اسے محض اپنے جسم اور اپنے گھر کی تزئین اور آرایش پر صرف کر دینا جمالیت نہیں، شقاوت اور بدترین خودغرضی ہے۔ غرض اخلاقی تعلیم اور قانونی احکام دونوں طریقوں سے اسلام نے انسان کو جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت کی ہے وہ ایسی سادہ زندگی ہے کہ اس میں انسان کی ضروریات اور خواہشات کا دائرہ اتنا وسیع ہی نہیں ہوسکتا کہ وہ ایک اوسط درجے کی آمدنی میں گزر بسر نہ کرسکتا ہو، اور اسے اپنے دائرے سے پاؤں نکال کر دوسروں کی کمائیوں میں حصہ لڑانے کی ضرورت پیش آئے یا اگر وہ اوسط سے زیادہ آمدنی رکھتا ہو تو اپنا تمام مال خود اپنی ذات پر خرچ کر دے اور اپنے ان بھائیوں کی مدد نہ کر سکے جو اوسط سے کم آمدنی رکھتے ہوں۔

(اسلام اور جدید معاشی نظریات: ص ۹۷-۱۱۸، فروری ۱۹۶۹، مزید تفصیلی مباحث اسلام اور جدید معاشی نظریات میں دیکھے جاسکتے ہیں)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

قرآن کی معاشی تعلیمات

۱۔ بنیادی حقائق

انسانی معیشت کے بارے میں اولین بنیادی حقیقت، جسے قرآن مجید بار بار زور دے کر بیان کرتا ہے، یہ ہے کہ تمام وہ ذرائع ووسائل جن پر انسان کی معاش کا انحصار ہے، اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اسی نے ان کو اس طرح بنایا اور ایسے قوانین فطرت پر قائم کیا ہے کہ وہ انسان کے لیے نافع ہو رہے ہیں اور اسی نے انسان کو ان سے انتفاع کا موقع دیا اور ان پر تصرف کا اختیار بخشا ہے:

هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝ (الملک ۶۷:۱۵)

وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو رام کر دیا، پس چلو اس (زمین) کی پہنائیوں میں اور کھاؤ اس (خدا) کا رزق اور اسی کی طرف تمھیں دوبارہ زندہ ہو کر واپس جانا ہے۔

وَهُوَالَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْهٰرًا ؕ وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ۔ (الرعد ۱۳:۳)

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ بنائے، دریا جاری کیے اور ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کیں۔

هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ۔ (البقرۃ ۲:۲۹)

وہی ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۝ وَاٰتٰىکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ۔ (ابراہیم ۱۴:۳۲-۳۴)

اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے تمھارے رزق کے لیے پھل نکالے، اور تمھارے لیے کشتی کو مسخر کیا تاکہ وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے، اور تمھارے لیے دریاؤں کو مسخر کیا اور سورج اور چاند کو تمھارے مفاد میں ایک دستور پر قائم کیا کہ پیہم گردش کر رہے ہیں، اور دن رات کو تمھارے مفاد میں ایک قانون کا پابند کیا، اور وہ سب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کچھ تمھیں دیا جو تم نے مانگا۔[1] اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ (الاعراف ۷:۱۰)

ہم نے زمین میں تم کو اقتدار بخشا اور تمھارے لیے اس میں زندگی کے ذرائع فراہم کیے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ (الواقعہ ۵۶:۶۳-۶۴)

کیا تم نے غور کیا، یہ کھیتیاں جو تم بوتے ہو انھیں تم اگاتے ہو یا ان کے اگانے والے ہم ہیں۔

۲۔ جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنا اللہ ہی کا حق ہے

اسی بنیاد پر قرآن یہ اصول قائم کرتا ہے کہ انسان ان ذرائع کے اکتساب اور استعمال کے معاملے میں نہ تو آزاد ہونے کا حق رکھتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے خود حرام و حلال اور جائز و ناجائز کے حدود وضع کر لینے کا مجاز ہے، بلکہ یہ حق خدا کا ہے کہ اس کے لیے حدود مقرر کرے۔ وہ عرب کی ایک قدیم قوم، مدین کی اس بات پر مذمت کرتا ہے کہ وہ لوگ کمائی اور خرچ کے معاملے میں غیر محدود حقِ تصرف کے مدعی تھے:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰۗؤُا ۭ (ھود ۱۱:۸۷)

انھوں نے کہا، اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑ دیں جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے تھے یا ہم اپنے اموال میں اپنی مرضی سے جو کچھ کرنا چاہیں وہ نہ کریں؟

وہ اس بات کو "جھوٹ" قرار دیتا ہے کہ آدمی خود کسی چیز کو حرام اور کسی کو حلال کہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ ۔ (النحل ۱۶:۱۱۶)

اور اپنی زبانوں سے یہ جھوٹے احکام نہ لگاؤ کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔[2]

وہ اس اختیار کو اللہ اور (اس کے نائب کی حیثیت سے) اس کے رسولؐ کے لیے خاص کرتا ہے:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ (الاعراف ۷:۱۵۷)

۱۔ یعنی جس کی تمھیں احتیاج تھی اور جس کو تم نے زبان حال سے مانگا، خواہ زبان قال سے مانگا ہو یا نہ مانگا ہو۔ بیضاوی، انوار التنزیل، ج ۳، ص ۱۶۱، مصطفی البابی، مصر، ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء)۔

۲۔ "اس آیت میں بتاکید اس بات سے منع کیا گیا ہے کہ لوگ محض اپنے خیالات اور خواہشات کی بنا پر حلال و حرام کا فیصلہ کریں"۔ (بیضاوی، ج ۳، ص ۱۹۳۔

"اس آیت کا ماحصل یہ ہے، جیسا کہ عسکری نے بیان کیا ہے کہ جس چیز کے حلال یا حرام ہونے کا حکم تم کو اللہ اور اس کے رسول سے نہ پہنچے اسے حلال یا حرام نہ کہو ورنہ تم اللہ پر جھوٹ باندھنے والے ہو گے، کیونکہ حلت اور حرمت کا مدار اللہ کے حکم کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔" آلوسی، روح المعانی، ج ۱۴، ص ۲۲۶، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۵ھ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ (رسولؐ) ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے، پاک چیزیں ان کے لیے حلال اور ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتا ہے، اور وہ بوجھ اور بندشیں ان پر سے اتارتا ہے جن سے وہ لدے اور جکڑے ہوئے تھے۔

۳۔ حدود اللہ کے اندر شخصی ملکیت کا اثبات

اللہ کی بالاتر ملکیت کے ماتحت اور اس کی عائد کردہ حدود کے اندر قرآن شخصی ملکیت کا اثبات کرتا ہے:

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۔ (النساء۴:۲۹)

ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقوں سے نہ کھاؤ اِلّا یہ کہ تمھارے درمیان تجارت ہو آپس کی رضامندی سے۔

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ (البقرة۲:۲۷۵)

اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۔ (البقرة۲:۲۷۹)

اور اگر تم سود لینے سے توبہ کر لو تو تمھیں اپنے رأس المال واپس لینے کا حق ہے۔

اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۔ (البقرة۲:۲۸۲)

جب آپس میں کسی مقررمدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اس کی دستاویز لکھ لو۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۔ (البقرة۲:۲۸۳)

اور اگر تم سفر میں ہو اور (قرض کی دستاویز لکھنے کے لیے) کاتب نہ پاؤ تو رہن بالقبض رکھو۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۔ (النساء۴:۷)

مردوں کے لیے ان کے مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور رشتے داروں نے چھوڑا ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا ۔ (النور۲۴:۲۷)

اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک اجازت نہ لے لو۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ۔ (یٰسین۳۶:۷۱)

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ان کے لیے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے مویشی پیدا کیے اور یہ ان کے مالک ہیں۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا ۔ (المائدة۵:۳۸)

اور چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۔ (الانعام۶:۱۴۱)

اور فصل کاٹنے کے دن (زمین کی پیداوار میں سے) خدا کا حق ادا کرو۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً ۔ (التوبة۹:۱۰۳)

اے نبیؐ، ان کے اموال میں سے زکوٰۃ وصول کرو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ ...... وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ (النساء ۴: ۲)

اور یتیموں کا مال ان کے حوالے کرو...... اور ان کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ (النساء ۴: ۲۴)

اور ان (حرام عورتوں) کے سوا (باقی عورتوں کے معاملے میں) یہ بات تمھارے لیے حلال کر دی گئی ہے کہ تم انھیں اپنے اموال کے بدلے حاصل کرو۔ نکاح کرنے والے بن کر نہ کہ ناجائز تعلقات رکھنے والے بن کر۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ (النساء ۴: ۴)

اور عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ (النساء ۴: ۲۰)

اور اگر تم نے کسی عورت کو (نکاح کے وقت) ڈھیر سارا مال بھی دیا ہو تو (طلاق دیتے وقت) اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ ۔ (البقرۃ ۲: ۲۶۱)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے تو اس سے سات بالیں نکلیں۔

وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ (الصف ۶۱: ۱۱)

اور یہ کہ تم اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذاریات ۵۱: ۱۹)

اور ان کے مال میں حق ہے سائل (مدد مانگنے والے) اور محروم کے لیے۔

مذکورہ بالا احکام و آیات میں سے کسی کا تصور بھی شخصی ملکیت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن لازماً ایک ایسی معیشت کا نقشہ پیش کرتا ہے جو اپنے تمام گوشوں میں افراد کے حقوق مالکانہ پر مبنی ہے۔ اس میں کہیں اس تصور کا شائبہ تک نہیں ملتا کہ اشیائے صرف (Consumer Goods) اور وسائل پیداوار (Means of Production) میں فرق کر کے صرف مقدم الذکر تک شخصی ملکیت کو محدود رکھا جائے اور مؤخر الذکر کو اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ اسی طرح اس میں محنت سے کمائی ہوئی دولت (Earned Income) اور بلا محنت کمائی ہوئی دولت (Un-earned Income) کے درمیان بھی کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ مثلاً یہ ظاہر بات ہے کہ جو شخص ماں، باپ، اولاد، بیوی، شوہر یا بھائی بہن سے کوئی میراث پاتا ہے وہ اس کی محنت سے کمائی ہوئی دولت نہیں ہے، اور جسے زکوٰۃ دی جاتی ہے اس کے لیے بھی وہ اس کی محنت کی کمائی نہیں ہے۔ مزید براں معیشت کے اس نقشے میں یہ تصور بھی کہیں نہیں پایا جاتا کہ یہ صرف ایک عارضی مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے اور اصل مقصود کوئی ایسی منزل ہے جہاں شخصی ملکیت ختم کر کے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کر دیا جائے۔ اگر اس چیز کو قرآن میں مقصد اصلی کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے تو وہ صاف اپنے اس مقصد کو بیان کرتا اور اس نظام کے متعلق احکامات و ہدایات دیتا۔ محض یہ بات کہ قرآن نے ایک جگہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ (زمین خدا کی ہے، الاعراف ۷: ۱۲۸) کہا ہے، یہ نتیجہ نکالنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس سے زمین کی انفرادی ملکیت کا ابطال اور قومی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ملکیت کا اثبات مقصود ہے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ ہی کا ہے، البقرۃ ۲: ۲۸۴)۔ اس سے نہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز بھی افراد کی ملکیت نہ ہو، اور نہ یہی نتیجہ نکل سکتا ہے کہ یہ چیزیں قوم کی ملکیت ہوں۔ خدا کی ملکیت اگر انسانی ملکیت کی نفی کرتی ہے تو پھر افراد اور اقوام سب ہی کی ملکیت کی نفی کر دیتی ہے۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت نمبر ۱۰ (وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ) سے بھی یہ استدلال درست نہیں ہے کہ "زمین کے وسائلِ غذا کو قرآن سب انسانوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کرنا چاہتا ہے، اور یہ مساوات اجتماعی ملکیت ختم کیے بغیر قائم نہیں ہو سکتی، اس لیے قرآن کا مقصود یہی نظام قائم کرنا ہے"۔ بالفرض اگر اس آیت کا ترجمہ یہ مان بھی لیا جائے کہ "خدا نے زمین میں اس کے وسائلِ خوراک چار دن کے اندر ایک انداز ے سے رکھ دیے سب مانگنے والوں کے لیے برابر برابر[1]" تب بھی "مانگنے والوں" سے مراد محض انسان لے لینا درست نہ ہوگا۔ مانگنے والے تو انسان کے علاوہ تمام انواعِ حیوانات بھی ہیں جن کے وسائلِ خوراک خدا نے اسی زمین میں رکھے ہیں۔ اگر اس آیت کی رُو سے سب مانگنے والوں کا حصہ مساوی ہے تو یہ برابری کا استحقاق محض انسانوں کے لیے مخصوص ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اس طرح قرآن کی ان آیات سے بھی، جن میں معاشرے کے کمزور افراد کی رزق رسانی پر زور دیا گیا ہے، یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس مقصد کے لیے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ قرآن جہاں کہیں بھی اس ضرورت کا ذکر کرتا ہے وہاں لازماً اسے پورا کرنے کی ایک ہی صورت بیان کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ معاشرے کے خوش حال افراد اپنے غریب رشتہ داروں اور یتامیٰ، مساکین اور دوسرے محروم یا تنگ حال لوگوں پر محض خدا کی خوشنودی کے لیے خود بھی اپنے مال فراخ دلی کے ساتھ خرچ کریں اور ریاست بھی ان کے اموال سے ایک مقرر حصہ وصول کر کے اس کام میں صَرف کرے۔ اس غرض کے لیے اس عملی صورت کے سوا کسی دوسری صورت کا کوئی تخیل قرآن میں قطعاً نہیں پایا جاتا۔

اس میں شک نہیں کہ کسی خاص چیز کو نجی انتظام کے بجائے اجتماعی انتظام میں لینے کی اگر ضرورت محسوس ہو تو ایسا کرنے میں قرآن کا کوئی حکم مانع بھی نہیں ہے۔ لیکن شخصی ملکیت کی کلی نفی، اور اجتماعی ملکیت کے نظریے کو بطور ایک فلسفے اور نظام کے اختیار کرنا انسانی معیشت کے بارے میں قرآن کی اسکیم کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا اور قرآن انسانی معاشرے کے لیے جو سیاسی نظام تجویز کرتا ہے اس کی رو سے یہ فیصلہ کرنا بھی کسی پارٹی کا کام نہیں ہے کہ کسی چیز کی نجی ملکیت کے بجائے اجتماعی ملکیت میں لینے کی ضرورت ہے، بلکہ اس کا فیصلہ معاشرے کی آزاد مرضی سے منتخب نمایندوں کی ایک مجلس شوریٰ ہی کر سکتی ہے۔[2]

---

[1] یہ ترجمہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اصل الفاظ ہیں: فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ۔ اس میں لفظ سَوَاۗءً کا تعلق زمخشری، بیضاوی، رازی، آلوسی اور دوسرے مفسرین نے ایام سے مانا ہے اور مفہوم یہ قرار دیا ہے کہ "پورے چار دنوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیا"۔ لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ کے ساتھ سَوَاۗءً کا تعلق جن مفسرین نے مانا ہے وہ اس کا مطلب لیتے ہیں "سب مانگنے والوں کے لیے مہیا کیے ہوئے" یا "سب مانگنے والوں کی مانگ کے مطابق"۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورۂ حٰمٓ السجدۃ، حاشیہ نمبر ۱۲۔

[2] قرآن کے تجویز کردہ سیاسی نظام کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب خلافت و ملوکیت کا پہلا باب۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۴۔ معاشی مساوات کا غیر فطری تخیّل

قرآن اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت کے ایک پہلو کی حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ دوسری تمام چیزوں کی طرح انسانوں کے درمیان رزق اور وسائلِ زندگی میں بھی مساوات نہیں ہے۔ مختلف تمدنی نظاموں کی مصنوعی بے اعتدالیوں سے قطعِ نظر، جہاں تک بجائے خود اس فطری عدمِ مساوات کا تعلق ہے، اسے قرآن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا اور اس کی تقسیم وتقدیر (Dispensation) کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اس کی پوری اسکیم میں کہیں اس تخیل کا نشان نہیں ملتا کہ اس عدمِ مساوات کو مٹا کر کوئی ایسا نظام قائم کرنا مطلوب ہے جس میں سب انسانوں کو ذرائع معاش برابر ملیں:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ ۗ (الانعام ۷:۱۶۵)

اور وہی اللہ ہے جس نے تم کو زمین کے خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے اوپر بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم لوگوں کو اس نے دیا ہے اس میں تمھاری آزمایش کرے۔

انْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ وَلَلْآخِرَةُ أَكْبَرُ دَرَجَاتٍ وَأَكْبَرُ تَفْضِيلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۱)

دیکھو کس طرح ہم نے بعض لوگوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور آخرت تو درجات کے فرق اور تفضیل میں اور بھی زیادہ ہے۔

أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۚ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۗ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ○ (الزخرف ۴۳:۳۲)

کیا تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلند درجے دیے ہیں تاکہ ان میں سے کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں سے کام لیں اور تیرے رب کی رحمت (یعنی نبوت) تو اس مال ودولت سے بھی بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔[1]

إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ كَانَ بِعِبَادِهِ خَبِيرًا بَصِيرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۰)

درحقیقت تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا دیتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے اور ان پر نظر رکھتا ہے۔

لَهُ مَقَالِيدُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ○ (الشوریٰ ۴۲:۱۲)

آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے قبضے میں ہیں، جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے، وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ ۚ (سبا ۳۴:۳۹)

اے نبی کہو میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے نپا تلا کر دیتا ہے۔

قرآن ہدایت کرتا ہے کہ لوگوں کو یہ فطری عدمِ مساوات ٹھنڈے دل سے قبول کرنی چاہیے اور دوسروں کو جو فضیلت خدا

[1] یہ بات اس سیاق وسباق میں فرمائی گئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مخالفین کہتے تھے کہ مکہ اور طائف کے کسی بڑے سردار کو پیغمبر کیوں نہ بنایا گیا، خدا کو پیغمبر ہی بھیجنا تھا تو اس کے لیے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتخاب کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ [الزخرف ۴۳:۳۲]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نے بخشی ہو اس پر رشک وحسد نہ کرنا چاہیے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ○ (النساء ۴:۳۲)

اور تمنا نہ کرو اس فضیلت کی جو اللہ نے تم میں سے کسی کو کسی پر عطا کی ہو۔ مردوں کے لیے حصہ ہے ان کی کمائی میں سے اور عورتوں کے لیے حصہ ہے ان کی کمائی میں سے۔ البتہ اللہ سے اس کا فضل مانگو، یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

دو آیتیں جن سے آج کل کچھ لوگ یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ قرآن لوگوں کے درمیان رزق میں مساوات چاہتا ہے، حسب ذیل ہیں:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۷۱)

اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، تو جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دینے والے نہیں ہیں کہ وہ اور ان کے غلام اس میں برابر ہو جائیں۔ پھر کیا اللہ ہی کے احسان کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں؟

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِىْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (الروم ۳۰:۲۸)

اللہ تمھیں خود تمھاری اپنی ہی ذات سے ایک مثال دیتا ہے۔ کیا تمھارے غلاموں میں سے کچھ غلام اس رزق میں جو ہم نے تمھیں دیا ہے تمھارے ایسے شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر ہوں اور تم ان سے اس طرح ڈرتے رہو جس طرح اپنے ہمسروں سے ڈرتے ہو؟ اسی طریقے سے ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔

لیکن دونوں آیتوں کے الفاظ بتا رہے ہیں، اور جس سیاق و سباق میں یہ آئی ہیں اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں دراصل معاشی عدم مساوات کو مذموم قرار دینے اور اس کو مٹا کر مساوات قائم کرنے کی تلقین نہیں کی گئی ہے، بلکہ اس امر واقعہ کو، جو انسانوں میں پایا جاتا ہے، شرک کے خلاف ایک دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یعنی استدلال یہ ہے کہ جب تم اللہ کے دیے ہوئے رزق میں اپنے غلاموں کو اپنے ساتھ برابر کا شریک بنانے کے لیے تیار نہیں ہو تو اللہ کے متعلق تم نے یہ کیسا تصور قائم کیا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی خدائی میں اس کا شریک ہے۔[۱]

۵۔ رہبانیت کے بجائے اعتدال اور پابندیِ حدود

قرآن اس حقیقت کو بھی بار بار زور دے کر بیان کرتا ہے کہ خدا نے دنیا میں اپنی نعمتیں اسی لیے پیدا کی ہیں کہ اس کے

---

[۱] یہ بات سورۂ النحل کو آیت ۷۱ سے ۷۶ تک اور سورۂ الروم کو آیت ۲۰ سے ۳۵ تک پڑھنے سے پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ دونوں عبارتوں میں موضوعِ بحث دراصل شرک کا ابطال اور توحید کا اثبات ہے۔ ان دونوں مقامات کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحات ۵۵۴ تا ۵۵۸۔ جلد سوم، صفحات ۷۴۲ تا ۷۵۶۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بندے ان سے متمتع ہوں۔ خدا کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے اور نہیں ہوسکتا کہ انسان ان نعمتوں سے اجتناب کر کے رہبانیت اختیار کرلے۔ البتہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ پاک اور ناپاک میں امتیاز کیا جائے، جائز اور ناجائز طریقوں میں فرق کیا جائے، تمتع اور انتفاع صرف حلال وطیب تک محدود رہے، اور اس میں بھی حدّ اعتدال سے تجاوز نہ ہو۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۔ (البقرہ ۲:۲۹)

وہی تو ہے جس نے تمھارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا ہے جو زمین میں ہے۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۔ (الاعراف ۷:۳۲)

اے نبیؐ، ان سے پوچھو، کس نے حرام کردیا اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے اور رزق کی عمدہ چیزوں کو؟

وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ○ (المائدہ ۵:۸۸)

اور کھاؤ ان چیزوں میں سے جو اللہ نے تم کو بخشی ہیں حلال اور پاکیزہ، اور بچے رہو اس خدا کی ناراضی سے جس پر تم ایمان لائے ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (البقرہ ۲:۱۶۸)

لوگو، کھاؤ جو کچھ زمین میں ہے حلال اور پاک، اور شیطان کے طریقوں کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ (الاعراف ۷:۳۱)

کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ گزرو، اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ ۔ (الحدید ۵۷:۲۷)

اور رہبانیت انھوں نے (یعنی عیسیٰ ابن مریم کے پیروؤں نے) خود ایجاد کرلی۔ ہم نے وہ ان پر نہیں لکھی تھی، مگر صرف اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش (ان پر لازم کی تھی) پس انھوں نے اس کا لحاظ نہ کیا جیسا کہ اس کا حق تھا۔

۶۔ کسب مال میں حرام وحلال کا امتیاز

اس غرض کے لیے قرآن یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ دولت صرف حلال طریقوں سے حاصل کی جائے اور حرام طریقوں سے اجتناب کیا جائے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○ (النساء ۴:۲۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ کہ تجارت ہو تمھاری آپس کی رضامندی سے[1]، اور اپنے آپ کو (یا ایک دوسرے کو) ہلاک نہ کرو، اللہ تمھارے اوپر رحیم ہے۔

---

[1] تجارت سے مراد ہے اشیا اور خدمات کا تبادلہ بالعوض (الجصاص، احکام القرآن، ج ۲ ص ۲۱۰، مطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۳۱ھ۔ ابن العربی، احکام القرآن، ج ۱ ص ۱۷۰، مطبعۃ السعادہ، مصر، ۱۳۳۱ھ) آپس کی رضامندی کی شرط خود بخود یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس تبادلے میں کسی نوعیت کا دباؤ نہ ہو، اور نہ کوئی دھوکا یا ایسی چال ہو جو اگر دوسرے فریق کے علم میں آجائے تو وہ اس پر راضی نہ ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۷۔ کسبِ مال کے حرام طریقے

باطل طریقوں سے پوری تفصیل تو احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور قانونِ اسلامی کی کتابوں میں فقہا نے بیان کی ہے۔ لیکن ان میں سے بعض جن کی صراحت قرآن میں کی گئی ہے، یہ ہیں:

(الف) وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ ۲:۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ ان کو حکام کے سامنے پیش کرو تا کہ کھا جاؤ جانتے بوجھتے لوگوں کے مال گناہ کے ساتھ۔[۱]

(ب) فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ۔ (البقرۃ ۲:۲۸۳)

پس اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے پر اعتماد کر کے کوئی امانت اس کے سپرد کرے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے اسے امانت ادا کرنی چاہیے اور اللہ، اپنے رب کے غضب سے ڈرنا چاہیے۔

(ج) وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ۔ (آل عمران ۳:۱۶۱)

اور جو کوئی غلول (پبلک کے مال میں خیانت) کرے وہ اپنے خیانت کیے ہوئے مال سمیت قیامت کے روز حاضر ہوگا اور ہر ایک کو اس کی کمائی کا پورا بدلہ ملے گا۔

(د) وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا۔ (المائدۃ ۵:۳۸)

چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا...... (المائدۃ ۵:۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں،[۲] ان کی جزا تو یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا صلیب دیے جائیں......

(ہ) اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ○ (النساء ۴:۱۰)

جو لوگ یتیموں کے مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور عنقریب وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے۔

(و) وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ○ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ○ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ○ (المطففین ۸۳:۱-۳)

تباہی ہے ان کم تولنے والوں کے لیے جو دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پیمانہ بھر کر لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں۔

۱۔ حکام کے سامنے پیش کرنے سے مراد دوسرے کے مال کی ملکیت کا جھوٹا دعوی لے کر حاکموں کے پاس جانا بھی ہے، اور حکام کو رشوت دے کر دوسرے کی ملکیت پر غاصبانہ قبضہ کرنا بھی۔ (آلوسی، روح المعانی، ج ۲، ص ۶۰)

۲۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ڈاکے اور رہزنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ (الجصاص، ج ۲، ص ۴۹۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(ز) اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ (النور ۲۴:۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں میں فحش کی اشاعت ہو ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک سزا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

(لقمان ۳۱:۶)

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو خریدتا ہے کلامِ دل فریب تا کہ اللہ کی راہ سے بھٹکا دے...... ایسے لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔[۱]

(ح) وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ (النور ۲۴:۳۳)

اپنی لونڈیوں کو قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جب کہ وہ بچنا چاہتی ہوں، محض اس لیے کہ تم دنیوی زندگی کے فائدے حاصل کرنا چاہتے ہو۔[۲]

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۲)

اور زنا کے قریب نہ پھٹکو، یہ بے حیائی اور برا چلن ہے۔

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ (النور ۲۴:۲)

زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔[۳]

(ط) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (المائدۃ ۵:۹۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، شراب اور جوا اور بت اور فال کے تیر (یا پانسے) تو گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو۔[۴]

(ی) وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ (البقرۃ ۲:۲۷۵)

۱۔ اس آیت میں کلام دل فریب سے مراد گانا، بجانا اور ہر وہ لہو ولعب ہے جو راہِ خدا سے بھٹکانے والا ہو (ابن جریر، جامع البیان فی تفسیر القرآن، ج ۲۱، ص ۳۹ تا ۴۱، مطبعۃ الامیریہ مصر، ۱۳۲۸ھ)

۲۔ اس آیت کا اصل مقصد قحبہ گری کے پیشے کا انسداد ہے۔ لونڈیوں کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ قدیم زمانے میں اہل عرب کے ہاں قحبہ گری (Prostitution) کا سارا کاروبار لونڈیوں کے ذریعے سے چلتا تھا۔ لوگ اپنی جوان اور خوب صورت لونڈیوں کو چکلے میں بٹھا دیتے تھے اور ان کی کمائی کھاتے تھے۔ (ابن جریر، ج ۱۸، صفحات ۵۵ تا ۵۸۔ ۱۰۳، ۱۰۴)

ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ۳، ص ۸۹-۲۸۸۔ مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۴۷ء۔ ابن عبدالبرّ، الاستیعاب، ج ۲، ص ۷۶۲، دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۳۷ء۔

۳۔ زنا کو جرم قرار دینے کے ساتھ ہی اسلام میں زنا کے ذریعے سے حاصل ہونے والی آمدنی کو بھی حرام کر دیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بدترین کمائی قرار دیا۔ (بخاری، کتاب ۳۴، باب ۱۱۳۔ کتاب ۳۷، باب ۲۰۔ کتاب ۶۸، باب ۵۰۔ کتاب ۷۶، باب ۴۶۔ کتاب ۷۷، باب ۶۹۔

مسلم، کتاب ۲۲، حدیث نمبر ۳۹، ۴۱۔ ابوداؤد، کتاب ۲۲، باب ۳۹، ۶۳۔ ترمذی، کتاب ۹، باب ۳۷۔ کتاب ۱۲، باب ۴۶۔ کتاب ۲۶ باب ۲۳۔ نسائی، کتاب ۴۲، باب ۵۔ کتاب ۴۴، باب ۹۔

۴۔ تمام وہ چیزیں جو قرآن میں حرام کی گئی ہیں ان کی صنعت و تجارت بھی ممنوع ہے کیونکہ تحریم تمام طریقوں سے انتفاع کے ممنوع ہونے کی مقتضی ہے۔ (الجصاص، ج ۲، ص ۲۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا۔[۱]

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ○ وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ ۲:۲۷۸-۲۸۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور جو سود وصول طلب رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ قبول کرو۔ اور اگر توبہ کرلو تو تمھیں اپنے اصل مال واپس لینے کا حق ہے۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔ اور اگر تمھارا قرض دار تنگ دست ہو تو اس کی آسودگی تک اسے مہلت دو۔ اور اگر معاف کردو تو یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔[۲]

اس طرح قرآن نے حصولِ دولت کے جن طریقوں کو ممنوع ٹھیرایا ہے وہ مختصراً یہ ہیں:

(۱) دوسرے کا مال اس کی رضا کے بغیر اور بلاعوض لینا، یا بالعوض اور برضا یا بلاعوض اور برضا اس طرح لینا کہ رضامندی کسی دباؤ یا دھوکے کا نتیجہ ہو، (۲) رشوت، (۳) غصب، (۴) خیانت، خواہ وہ افراد کے مال میں ہو یا پبلک کے مال میں، (۵) چوری اور ڈاکہ، (۶) مالِ یتیم میں بے جا تصرف، (۷) ناپ تول میں کمی بیشی، (۸) فحش پھیلانے والے ذرائع کا کاروبار، (۹) گانے بجانے کا پیشہ، (۱۰) قحبہ گری اور زنا کی آمدنی، (۱۱) شراب کی صنعت اور اس کی بیع اور اس کا حمل ونقل، (۱۲) جوا اور تمام وہ طریقے جن سے کچھ لوگوں کا مال دوسرے لوگوں کی طرف منتقل ہونا محض بخت واتفاق پر مبنی ہو، (۱۳) بت گری، بت فروشی اور بت خانوں کی خدمات، (۱۴) قسمت بتانے اور فال گیری وغیرہ کا کاروبار، (۱۵) سود، خواہ اس کی شرح کم ہو یا زیادہ اور خواہ وہ شخصی ضروریات کے قرضوں پر ہو یا تجارتی وصنعتی اور زراعتی ضروریات کے قرضوں پر۔

۸۔ بخل اور اِکتناز کی ممانعت

دولت حاصل کرنے کے غلط طریقوں کو حرام کرنے کے ساتھ قرآن مجید جائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کو بھی جمع کرکے روک رکھنے کی سخت مذمت کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ بخل ایک بہت بڑی برائی ہے۔

---

[۱] اس سے معلوم ہوا کہ بیع کی صورت میں اصل رأس المال پر جو منافع کسی شخص کو حاصل ہو، یا شرکت فی البیع کی صورت میں حصہ رسدی کے مطابق جو منافع شرکا میں تقسیم ہو، وہ حلال ہے، لیکن قرض کے معاملے میں اصل سے زائد اگر کوئی چیز قرض خواہ قرض دار سے وصول کرے تو وہ حرام ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ تجارتی منافع کی طرح جائز منافع قرار نہیں دیتا۔

[۲] آیت کے الفاظ سے یہ بات خود ظاہر ہوتی ہے کہ یہ حکم قرض کے معاملے سے تعلق رکھتا ہے اور اس طرح کے کسی معاملے میں اصل سے زائد اگر کوئی چیز قرض خواہ اپنے قرض دار سے لینے کی شرط کرے تو یہ ربوٰ ہے۔ اس میں نہ شرح کی کمی بیشی سے کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ یہ سوال قابلِ لحاظ ہے کہ قرض لینے والا کس غرض کے لیے لے رہا ہے۔ آج کل جو لوگ سود کی حرمت کو صرف ان قرضوں تک محدود قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں جو کوئی شخص اپنی ذاتی ضروریات کے لیے لے اور کاروباری قرضوں کے سود یا بنک کے سود کو حلال قرار دیتے ہیں، ان کی بات بالکل بے دلیل ہے۔ اس کی دلیل نہ قرآن میں کہیں موجود ہے، نہ حدیث میں، نہ فقہ میں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ (الھمزۃ ۱۰۴: ۱-۴)

بڑی خرابی ہے ہر اس شخص کے لیے جو عیب چین اور بدگو ہے، جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کے پاس ہمیشہ رہے گا۔ ہرگز نہیں، وہ پھینکا جائے گا توڑ ڈالنے والی آگ میں۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ (التوبۃ ۹: ۳۴)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں دردناک سزا کی خبر دے دو۔

وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (التغابن ۶۴: ۱۶)

اور جو دل کی تنگی (یا نفس کی بخیلی) سے محفوظ رہے، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ۔ (آل عمران ۳: ۱۸۰)

اور جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے فضل کے معاملے میں بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے۔ بلکہ یہ ان کے لیے بہت برا ہے۔ جس مال میں انھوں نے بخل کیا ہے اسی کا طوق قیامت کے روز ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔[1]

۹۔ زرپرستی اور حرصِ مال کی مذمت

اس کے ساتھ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ زرپرستی، دولتِ دنیا کی حرص وہوس، اور خوشحالی پر فخر وغرور انسان کی گمراہی اور بالآخر اس کی تباہی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے:

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ (التکاثر ۱۰۲: ۱ تا ۳)

تم لوگوں کو زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر نے مستغرق کر رکھا ہے، قبر میں جانے تک تم اسی فکر میں منہمک رہتے ہو، یہ ہرگز تمھارے لیے نافع نہیں ہے، جلدی ہی تم کو اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا ۖ فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا ۖ وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ ۝ (القصص ۲۸: ۵۸)

کتنی ہی بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جو اپنی معیشت پر اترائیں، اب دیکھ لو ان کے گھروں کو، کم ہی کوئی ان کے بعد ان گھروں میں بسا ہے، اور ہم ہی ان کے وارث ہوئے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ (السبا ۳۴: ۳۴-۳۵)

ہم نے جس بستی میں کوئی متنبہ کرنے والا بھیجا اس کے دولت مند لوگوں نے اس سے کہا کہ جو پیغامِ رسالت تم لے کر آئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال و اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز عذاب پانے والے نہیں ہیں۔

---

[1] قرآن مجید میں اس مضمون کو جگہ جگہ مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو، سورۂ محمد، آیت ۳۸۔ الحدید، آیت ۲۴۔ العنکبوت، آیت ۳۴۔ المعارج، آیت ۲۱۔ المدثر، آیت ۴۵۔ الفجر، آیات ۱۵ تا ۲۰۔ اللیل، آیت ۱۱۔ الماعون، آیات ۱، ۲، ۳، ۷۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔ بے جا خرچ کی مذمت

دوسری طرف قرآن مجید اس بات کی بھی سخت مذمت کرتا ہے کہ انسان جائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کو ناجائز کاموں میں اڑائے، یا اپنے ہی عیش اور لطف ولذت پر اسے صرف کرتا چلا جائے اور اپنا معیارِ زندگی زیادہ سے زیادہ بلند کرنے کے سوا اپنی دولت کا کوئی اور مصرف اس کی نگاہ میں نہ ہو۔

وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الانعام ۶:۱۴۱)

خرچ میں حد سے نہ گزرو، اللہ فضول خرچ کو پسند نہیں کرتا۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶-۲۷)

فضول خرچی نہ کرو، فضول خرچ لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا ناشکرا ہے۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ (الاعراف ۷:۳۱)

کھاؤ اور پیو، مگر حد سے نہ گزرو، اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

قرآن کی نگاہ میں انسان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اپنی ذات پر اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے میں اعتدال سے کام لے۔ اس کے مال پر اس کی اپنی ذات کا اور اس کے متعلقین کا حق ہے جسے ادا کرنے میں اس کو بخل بھی نہ کرنا چاہیے، لیکن صرف یہی ایک حق نہیں ہے کہ وہ سب کچھ اسی پر لٹادے اور کوئی دوسرا حق نہ پہچانے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

اور اپنا ہاتھ نہ تو اپنی گردن سے باندھ رکھ (کہ کچھ خرچ نہ کرے) اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے کہ ملامت زدہ اور حسرت زدہ بن کر بیٹھا رہ جائے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ (الفرقان ۲۵:۶۷)

(اور اللہ کے نیک بندے وہ ہیں) جو خرچ میں نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ؕ۔ (القصص ۲۸:۷۷)

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس کے ذریعے سے آخرت کے گھر کی بہتری کے لیے کوشش کر اور اپنا دنیا کا حصہ بھی فراموش نہ کر، اور (خلقِ خدا کے ساتھ) احسان کر جس طرح خدا نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے، اور (اپنی دولت کے ذریعے سے) زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش نہ کر۔

۱۱۔ دولت خرچ کرنے کے صحیح طریقے

معقول حد کے اندر اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے بعد آدمی کے پاس اس کی حلال طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو حصہ بچے اسے خود ان کاموں پر صرف کرنا چاہیے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (البقرۃ ۲:۲۱۹)

لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (راہِ خدا میں) وہ کیا خرچ کریں، کہو جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ ۔ (البقرۃ ۲:۱۷۷)

نیکی اس چیز کا نام نہیں کہ تم نے مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لیا، بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخر پر اور ملائکہ اور کتاب اور نبیوں پر، اور مال دے اللہ کی محبت میں اپنے رشتے داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو اور خرچ کرے غلامی سے لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں......

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (آل عمران ۳:۹۲)

تم نیکی کا مقام ہرگز نہ پا سکو گے جب تک کہ خرچ نہ کرو اپنے وہ مال جو تمھیں محبوب ہیں اور جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ اللہ کو معلوم ہوگا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ ۔ (النساء ۴:۳۶ تا ۳۸)

اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اور نیک سلوک کرو والدین کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ، رشتے دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی اور ہم نشین دوست کے ساتھ، مسافر کے ساتھ اور ان غلاموں کی ساتھ جو تمھارے قبضے میں ہوں۔ درحقیقت اللہ اترانے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، جو خود بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کرتے ہیں، اور اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے انھیں بخشا ہے۔ ایسے ناشکروں کے لیے ہم نے رُسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور وہ (لوگ بھی اللہ کو ناپسند ہیں) جو اپنے مال دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ ۲:۲۷۳)

(راہِ خدا میں خرچ کے مستحق) وہ تنگ حال لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسے گھر گئے ہیں کہ زمین میں اپنی روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔[1] ناواقف آدمی ان کی خودداری کی وجہ سے ان کو غنی سمجھتا ہے، مگر تم ان کے چہروں سے ان کو پہچان سکتے ہو، وہ پیچھے

---

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس سے مراد وہ چار سو رضا کار تھے جو عرب کے مختلف حصوں سے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینہ آ گئے تھے اور اپنی زندگی انھوں نے اس کام کے لیے وقف کر رکھی تھی کہ تعلیم حاصل کریں اور تبلیغ، تعلیم اور جہاد کی جس مہم پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جب اور جہاں بھیجنا چاہیں بھیج دیں۔ ان خدمات کے لیے اپنا سارا وقت دے دینے کی وجہ سے وہ اپنی معاش کے لیے دوڑ دھوپ نہ کر سکتے تھے۔ (زمخشری، ج ۱،ص ۱۲۶، المطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۳)۔ اسی طرح اب جو لوگ اپنا سارا وقت تعلیم تبلیغ اور اجتماعی بھلائی کے دوسرے کاموں کے لیے وقف کر چکے ہوں اور اپنے ذاتی کاروبار کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ پاتے ہوں وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پڑ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔ جو کچھ مال تم ان پر خرچ کرو گے اللہ کو اس کا علم ہوگا۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَى حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ○ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ○ (الدھر ۷۶:۸-۹)

(اور نیک لوگ) اللہ کی محبت میں کھانا کھلاتے ہیں مسکین اور یتیم اور قیدی کو اور کہتے ہیں کہ ہم محض اللہ کی خوش نودی کے لیے تمھیں کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکریے کے خواہش مند نہیں ہیں۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ○ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ○ (المعارج ۷۰:۲۴-۲۵)

(اور دوزخ کی آگ سے محفوظ) وہ لوگ ہیں جن کے مالوں میں ایک طے شدہ حصہ ہے مدد مانگنے والے اور محروم کے لیے (یعنی انھوں نے اپنے مال میں ان کا باقاعدہ حصہ مقرر کر رکھا ہے)۔

وَ الَّذِينَ يَبْتَغُونَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ۔ (النور ۲۴:۳۳)

اور تمھارے غلاموں میں سے جو (فدیہ دے کر آزادی حاصل کرنے کا) معاہدہ کرنا چاہیں ان سے معاہدہ کر لو اگر تم ان کے اندر کوئی بھلائی پاتے ہو۔ اور (اس فدیے کی ادائیگی کے لیے) ان کو اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تمھیں عطا کیا ہے۔

ان مصارف کو قرآن نہ صرف یہ کہ ایک بنیادی نیکی کہتا ہے بلکہ تاکیداً وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایسا نہ کرنے میں معاشرے کی مجموعی ہلاکت ہے:

وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَأَحْسِنُوا ۛ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ○ (البقرۃ ۲:۱۹۵)

خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو، اور احسان کرو، اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

۱۲۔ مالی کفارے

www.kitabosunnat.com

اس عام اور رضا کارانہ انفاق فی سبیل اللہ کے علاوہ قرآن مجید بعض گناہوں یا کوتاہیوں کی تلافی کے لیے مالی کفارے بھی مقرر کرتا ہے۔ مثلاً جو شخص قسم کھا کر توڑ دے اس کے لیے حکم ہے کہ:

فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ ۖ فَمَن لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ۔ (المائدۃ ۵:۸۹)

اس کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے جیسا اوسط درجے کا کھانا تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑے دینا ہے، یا ایک غلام آزاد کرنا۔ مگر جو ایسا نہ کر سکتا ہو وہ تین روزے رکھے۔

اسی طرح جو شخص اپنی بیوی کو ماں بہن سے تشبیہ دے کر اپنے لیے حرام کر لے پھر اس سے رجوع کرنا چاہے اس کے لیے حکم ہے:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ...... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ...... فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا۔ (المجادلہ ۵۸:۳-۴)

قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں (شوہر) ایک غلام آزاد کرے ......اور جو غلام نہ پاتا ہو وہ مسلسل دو مہینے کے روزے رکھے......اور جو اس کی قدرت نہ رکھتا ہو وہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

ایسے ہی کفارے حج کے سلسلے میں بھی بعض کوتاہیوں کے معاملے میں تجویز کیے گئے ہیں (البقرۃ ۲:۱۹۶۔ المائدۃ ۵:۹۵) اور ایسا ہی فدیہ روزوں کے معاملے میں مقرر کیا گیا ہے۔ (البقرۃ ۲:۸۴)

۱۳۔ انفاق کے مقبول ہونے کی لازمی شرائط

لیکن یہ خرچ قرآن کی رُو سے صرف اُسی صورت میں راہِ خدا کا خرچ قرار پا سکتا ہے جبکہ اس میں خود غرضی نہ ہو، ریاکاری اور نمائش نہ ہو، احسان جتانے اور اذیّت دینے کی کوشش نہ ہو، اپنا بدتر مال چھانٹ کر نہ دیا جائے بلکہ عمدہ اور بہتر مال دیا جائے، اور اس میں اللہ کی محبت اور اس کی خوش نودی کے سوا کوئی مقصود پیشِ نظر نہ ہو:

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا۝ (النساء ۴:۳۸)

(اور اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا) جو اپنے مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ جس شخص کا رفیق شیطان ہوا اس کو بہت ہی برا رفیق ملا۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ۔ (البقرۃ ۲:۱۹۶)

اللہ کی خوش نودی کے لیے جب حج اور عُمرے کی نیت کرو، تو اسے پورا کرو، اور اگر کہیں گِھر جاؤ تو جو قربانی میسر آئے، اللہ کی جناب میں پیش کر دو اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ مگر جو شخص مریض ہو یا جس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اسی بنا پر سر مونڈ لے، تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ۔ (المائدہ ۵:۹۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، احرام کی حالت میں شکار نہ مارو اور اگر تم میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اسی کے ہم پلہ ایک جانور اسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہوگا جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے اور یہ نذرانہ کعبہ پہنچایا جائے گا یا نہیں تو اس گناہ کے کفارے میں چند مسکینوں کو کھانا کھلانا ہوگا، یا اس کے بعد روزے رکھنے ہوں گے تا کہ وہ اپنے کیے کا مزہ چکھے۔ پہلے جو ہو چکا اسے اللہ نے معاف کر دیا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ ۲:۱۸۴)

اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی تعداد پوری کرے اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ اگر تم سمجھو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ۔ (البقرۃ ۲:۲۶۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے صدقات احسان جتا کر اور اذیت دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کر دو جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ ۲:۲۶۲-۲۶۳)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر اپنے خرچ کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ اذیت دیتے ہیں، انھی کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس اور ان کے لیے کسی خوف اور غم کا موقع نہیں ہے۔ ایک بھلی بات اور ایک درگزر کا فعل اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے اذیت ہو اور اللہ بے نیاز اور بردبار ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝ (البقرۃ ۲:۲۶۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی راہ میں خرچ کرو ان عمدہ چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں اور جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں، ردی چیزیں چھانٹ کر اللہ کی راہ میں نہ دو، حالانکہ اگر وہ تمھیں دی جائیں تو تم ہرگز انھیں نہ لو الّا یہ کہ اغماض برت جاؤ۔ خوب جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات رکھتا ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَاۗءَ فَھُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (البقرۃ ۲:۲۷۱)

اگر علانیہ صدقات دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مند لوگوں کو دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اور تمھاری بہت سی برائیوں کو دور کرنے والا ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

۱۴۔ انفاق فی سبیل اللہ کی اصل حیثیت

یہ راہِ خدا کا خرچ، جسے قرآن کبھی انفاق، کبھی انفاق فی سبیل اللہ، کبھی صدقہ اور کبھی زکوٰۃ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، محض ایک نیکی اور خیرات نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور اسلام کے پانچ ارکان ___ ایمان، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ___ میں تیسرا رکن

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ قرآن مجید میں ۳۷ مقامات پر اس کا اور نماز کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور پورے زور کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں لازمۂ اسلام اور مدار نجات ہیں۔[1] وہ کہتا ہے کہ زکوٰۃ ہمیشہ سے اسلام کا رکن رہی ہے:

وَ جَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْهِمْ فِعْلَ الْخَیْرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوةِ وَ اِیْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَ كَانُوْا لَنَا عٰبِدِیْنَ ۝ (الانبیاء ۲۱:۷۳)

اور ان کو (یعنی ابراہیمؑ، لوطؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کو) ہم نے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی طرف ہم نے نیک کاموں کا اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ یُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَ ذٰلِكَ دِیْنُ الْقَیِّمَةِ ۝ (البینۃ ۹۸:۵)

اور اہل کتاب کو اس کے سوا کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے، یکسو ہو کر، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی صحیح دین ہے۔

وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۝ وَ كَانَ یَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ ۪ وَ كَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِیًّا ۝ (مریم ۱۹:۵۴-۵۵)

اور ذکر کرو اس کتاب میں اسماعیلؑ کا۔ وہ وعدے کا سچا اور رسول نبی تھا اور وہ اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا، اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ آدمی تھا۔

اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ...... وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ (البقرۃ ۲:۸۳)

اور یاد کرو، ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے...... اور یہ کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۝ (مریم ۱۹:۳۰-۳۱)

(عیسیٰؑ ابن مریمؑ نے کہا) کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا اور مجھ کو برکت والا بنایا جہاں بھی میں رہوں اور مجھے ہدایت دی کہ جب تک زندہ رہوں نماز اور زکوٰۃ کا پابند رہوں۔

اسی طرح یہ زکوٰۃ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں بھی دین اسلام کا ایک رکن ہے۔ مسلم ملت میں کسی شخص کو شامل ہونے کے لیے جس طرح ایمان اور نماز ضروری ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی ضروری ہے۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۙ ...... فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ (الحج ۲۲:۷۸)

(اللہ نے تمھارے لیے) تمھارے باپ ابراہیمؑ کا طریقہ مقرر کیا ہے، اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا ہے...... پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو

---

[1] مثال کے طور پر قرآن مجید کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں:
البقرۃ: آیات ۳، ۴۳، ۸۳، ۱۱۰، ۱۷۷، ۲۷۷۔ النساء: ۷۷، ۱۶۲۔ المائدۃ: ۱۲، ۵۵۔ الانفال: ۳۔ التوبۃ: ۵، ۱۱، ۱۸، ۷۱۔ الرعد: ۲۲۔ ابراہیم: ۳۱۔ مریم: ۳۱، ۵۵۔ الانبیاء: ۷۳۔ الحج: ۳۵، ۴۱، ۷۸۔ المومنون: ۲۔ النور: ۳۷، ۵۶۔ النمل: ۳۔ لقمان: ۴۔ الاحزاب: ۳۳۔ فاطر: ۲۹۔ الشوریٰ: ۳۸۔ المجادلۃ: ۱۳۔ المعارج: ۲۳۔ المزمل: ۲۰۔ المدثر: ۴۳۔ البینۃ: ۵۔ الماعون: ۵۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

(البقرۃ ۲:۲-۳)

یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں، راہ بتانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو بے دیکھے ماننے والے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ...... الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ (الانفال ۸:۲-۴)

مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر ان کے سامنے کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں...... جو نماز قائم کرتے ہیں اور اس رزق میں سے خرچ کرتے ہیں جو ہم نے انھیں دیا ہے۔ یہی لوگ حقیقت میں مومن ہیں۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝ (المائدۃ ۵:۵۵)

تمھارے رفیق اللہ اور اس کے رسول اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، جو نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ خدا کے سامنے جھکنے والے ہیں۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ (التوبۃ ۹:۱۰۳)

پس اگر (مشرکین اپنے شرک سے) توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمھارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔

یہ زکوٰۃ صرف معاشرے کی بھلائی کے لیے نہیں ہے بلکہ خود زکوٰۃ دینے والوں کی اپنی روحانی ترقی اور ان کے اخلاق کی درستی اور ان کی فلاح و نجات کے لیے بھی ضروری ہے۔ یہ ایک ٹیکس نہیں ہے بلکہ نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔ انسان کی اصلاح نفس کے لیے قرآن جو دستور العمل دیتا ہے، یہ اس کا ایک لازمی جز ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ؕ (التوبہ ۹:۱۰۳)

اے نبیؐ! ان کے اموال میں سے ایک صدقہ وصول کر کے انھیں پاک کر دو اور ان میں اوصاف حمیدہ کو نشو و نما دو، اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔ تمھاری دعا ان کے لیے باعث تسکین ہو گی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ؕ (آل عمران ۳:۹۲)

تم نیکی کا مقام کبھی نہ پا سکو گے جب تک اپنی محبوب چیزیں خرچ نہ کرو۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

(التغابن ۶۴:۱۶)

اور خرچ کرو، یہ تمھارے اپنے ہی لیے بہتر ہے، اور جو دل کی تنگی سے بچ گیا، ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

۱۵۔ لازمی زکوٰۃ اور اس کی شرح

قرآن نے اس تعلیم و ہدایت سے معاشرے کے افراد میں رضا کارانہ انفاق فی سبیل اللہ کی ایک عام روح پھونک دینے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی کہ آپ کم سے کم انفاق کی ایک حد مقرر کر کے ایک فریضہ کے طور پر اسلامی ریاست کی طرف سے اس کی تحصیل اور تقسیم کا انتظام کریں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً۔ (التوبۃ: ۱۰۳)

(اے نبیؐ) ان کے اموال میں سے ایک صدقہ وصول کرو۔

یہ "ایک صدقہ" کا لفظ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ عام صدقات، جو فرداً فرداً بطور خود لوگ دیتے ہیں، ان کے علاوہ ایک خاص مقدارِ صدقہ ان پر فرض کر دی جائے، اور اس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود کریں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اقسام کی ملکیتوں کے بارے میں ایک کم سے کم حد مقرر فرما دی جس سے کم پر فرض زکوٰۃ عائد نہ ہوگی، پھر بقدر نصاب یا اس سے زائد ملکیتوں پر مختلف اموال کے معاملے میں زکوٰۃ کی حسب ذیل شرح مقرر فرمائی[1]

۱۔ سونے چاندی اور زرِ نقد کی صورت میں جو دولت جمع[2] ہو اس پر اڑھائی فیصد سالانہ۔

۲۔ زرعی پیداوار پر، جب کہ وہ بارانی زمینوں سے ہو ۱۰ فیصد۔

۳۔ زرعی پیداوار پر جب کہ وہ مصنوعی آب پاشی سے ہو، ۵ فیصد۔

۴۔ معدنیات پر جب کہ وہ نجی ملکیت میں ہوں اور، دفینوں پر ۲۰ فیصد۔

۵۔ مواشی پر، جو افزائش نسل اور فروخت کی غرض سے پالے جائیں۔ زکوٰۃ کی شرح بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ جانوروں کے معاملے میں مختلف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ مقدار زکوٰۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اسی طرح مسلمانوں پر فرض کی ہے جس طرح روزانہ پانچ وقت کی چند رکعت نمازیں آپؐ نے اس کے حکم سے فرض کی ہیں۔ دینی فریضے اور لزوم کے اعتبار سے ان دونوں کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن مجید اس بات کو اسلامی حکومت کے بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (الحج ۲۲:۴۱)

(یہ اہل ایمان، جن کو دفاعی جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، وہ لوگ ہیں) جنھیں اگر ہم نے زمین میں اقتدار بخشا تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ...... وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ○ (النور ۲۴:۵۶)

۱۔ الشوکانی، نیل الاوطار، ج ۴، ص ۹۸-۱۲۶، مصطفی البابی، مصر، ۱۳۴۷ھ

۲۔ بعد میں اجماع سے یہ طے کیا گیا کہ تجارتی اموال پر بھی اڑھائی فیصد سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی جائے۔ الشوکانی، ج ۴، ص ۱۱۷۔ تجارتی زکوٰۃ کا یہ اصول ان کارخانوں پر بھی عائد ہوگا جو فروخت کے لیے مختلف قسم کے سامان تیار کرتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے یہ وعدہ کیا ہے کہ انھیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا...... اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رسولؐ کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

لیکن، جیسا کہ اوپر کی آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، فرض زکوٰۃ کی تحصیل اور تقسیم کا انتظام اگر چہ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، مگر اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں، یا مسلم حکومت کے اس طرف سے غفلت برتنے کی صورت میں، مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا، بالکل اسی طرح جس طرح نماز کا فرض ساقط نہیں ہوتا۔ کوئی اگر وصول کرنے اور تقسیم کرنے والا نہ ہو تو ہر صاحبِ نصاب مسلمان کو خود اپنے مال سے زکوٰۃ نکالنی اور تقسیم کرنی چاہیے۔

۱۶۔ اموالِ غنیمت کا خُمس

فرض زکوٰۃ عائد کرنے سے جو فنڈ فراہم ہوتا ہے اس پر قرآن نے ایک اور مد کا اضافہ بھی کیا ہے اور وہ ہے اموالِ غنیمت (Spoils of War) کا ایک حصہ۔ قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ہر لڑائی میں جو غنیمت کا مال فوج کے ہاتھ آئے اسے سپاہی بطورِ خود نہ لوٹ لیں بلکہ سب کچھ لا کر اپنے کمانڈر کے حوالے کر دیں، اور کمانڈر اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے ان سپاہیوں میں تقسیم کرے جنھوں نے معرکے میں حصہ لیا ہو، اور پانچواں حصہ الگ کر کے حکومت کے حوالے کر دے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ (الانفال:۴۱)

تم کو معلوم ہو کہ جو کچھ بھی تم حاصل کرو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول اور قرابت داروں[1] اور یتامیٰ اور مسافر کے لیے ہے۔

۱۷۔ مصارفِ زکوٰۃ

ان دونوں مدات سے جو مال حاصل ہو وہ قرآن کی رُو سے خزانۂ عامہ (Public Exchequer) کا کوئی حصہ نہیں ہے جس کا مقصد زکوٰۃ دینے والوں سمیت تمام لوگوں کے لیے آسایشیں اور ضروری خدمات بہم پہنچانا ہوتا ہے، بلکہ قرآن نے اسے حسب ذیل مصارف کے لیے مخصوص کیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ (التوبۃ ۹:۶۰)

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں غنیمت کے خمس میں سے ایک حصہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کے لیے لیتے تھے، کیونکہ زکوٰۃ میں آپؐ کا اور آپؐ کے رشتہ داروں کا کوئی حصہ نہ تھا۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد اس امر میں اختلاف ہوا کہ رسولؐ اور قرابت داروں کا حصہ کس کو دیا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ یہ حصہ آنحضرتؐ کے لیے سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے تھا اور اب یہ آپؐ کے خلیفہ اور اس کے متعلقین کا حق ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ ہی کے متعلقین کا حق ہے۔ آخر کار اس بات پر اتفاق ہوا کہ وہ حصہ جو آنحضرتؐ اور ان کے متعلقین کے لیے تھا، اب اسلامی حکومت کی جنگی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ (الجصاص: ج ۳، ص ۷۵-۷۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صدقات تو مخصوص ہیں فقرا[1] کے لیے اور مساکین[2] کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام کریں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو[3]، نیز وہ صرف ہونے چاہییں غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں[4]، قرض داروں کی مدد میں، اللہ کی راہ میں[5] اور مسافروں کی خبر گیری میں[6]، اللہ کی طرف سے ایک فریضہ کے طور پر۔

❁❁❁❁❁❁

---

1. فقر کے اصل معنی حاجت کے ہیں اور فقیر ہر وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت سے کم معاش پانے کے باعث مدد کا محتاج ہو۔ (لسان العرب، ج ۵،ص ۶۰، ۶۱، بیروت، ۱۹۵۶ء)
2. حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ مسکین وہ شخص ہے جو کما نہ سکتا ہو یا کمانے کا موقع نہ پاتا ہو۔ (الجصاص، ج ۳،ص ۱۵۱) اس تعریف کی رُو سے تمام وہ غریب بچے جو ابھی کمانے کے قابل نہ ہوئے ہوں، اور اپاہج اور بوڑھے جو کمانے کے قابل نہ رہے ہوں، اور بیروزگار یا بیمار جو عارضی طور پر کمانے کے موقع سے محروم ہو گئے ہوں، مسکین ہیں۔
3. نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین قسم کے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے روپیہ دیا جاتا تھا۔ (۱) جو مخالفین اسلام کمزور مسلمانوں کو تکلیفیں دیتے یا اسلام سے عداوت میں سخت تھے انھیں روپیہ دے کر نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ (۲) جو لوگ اپنی قوم یا قبیلے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے زبردستی روکتے تھے انھیں روپیہ دے کر اس روش سے باز آ جانے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ (۳) جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے تھے ان کی مالی مدد کی جاتی تھی تاکہ ان کا اضطراب رفع ہو اور وہ مطمئن ہو کر مسلمانوں کے گروہ میں رہیں۔ (الجصاص، ج ۳،ص ۱۵۲)
4. اس سے مراد وہ مسلمان بھی ہیں جو لڑائیوں میں دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر غلام بنا لیے جاتے تھے اور وہ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے ہاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتے اور فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیز وہ غلام بھی مراد ہیں جو پہلے سے غلام چلے آ رہے تھے۔
5. اللہ کی راہ سے مراد جہاد اور حج ہے۔ جہاد میں جانے والا رضا کار اگر اپنی ضروریات کی حد تک مال دار بھی ہو، تب بھی وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے، کیونکہ جہاد کے لیے تیاری کرنے اور سفر وغیرہ کے مصارف بہم پہنچانے کے لیے آدمی کا ذاتی مال کافی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حج کے سفر میں اگر آدمی کا زادِ راہ ختم ہو جائے تو وہ بھی زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ (الجصاص، ج ۳،ص ۱۵۶-۱۵۷۔ نیل الاوطار، ج ۴،ص ۱۴۴-۱۴۶)
6. مسافر اپنے گھر پر چاہے مال دار بھی ہو، لیکن حالت سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اسے زکوٰۃ لینے کا حق پہنچتا ہے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۱۵۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

مسئلہ ملکیت زمین

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

اسلام میں انفرادی ملکیت کی حد

اسلام میں انفرادی ملکیت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کے حصول کے لیے جائز اور ناجائز طریقے بتائے گئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حلال طریقوں سے جو دولت بھی انسان کو حاصل ہو وہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ جس پر جتنا چاہے فضل کرے اور حرام طریقوں سے جو مال حاصل کیا جائے اس کا حصول جرم ہے اور اس جرم کی سزا نوعیتِ جرم کے لحاظ سے اسلام میں تجویز کی گئی ہے۔ ناجائز ملکیت خواہ چھوٹی سے چھوٹی ہو، بہر حال ناجائز ہے اور جائز ملکیت خواہ بڑی سے بڑی ہو بہر حال جائز ہے۔ اس کے بعد اسلام ملکیت پر تصرف کے طریقوں سے بحث کرتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ملکیت چھوٹی ہو یا بڑی، تصرف کے تمام غلط طریقوں کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے اور اس کی مختلف صورتوں کے لیے مختلف سزائیں تجویز کی ہیں۔ رہے صحیح طریقے تو ان میں سے بعض کو اس نے لازم کر دیا ہے، جیسے زکوٰۃ اور بعض کے لیے ترغیب دی ہے تا کہ فرد خود اپنی رضا کارانہ نیکی کے ذریعے سے اپنے اخلاقی و روحانی ارتقا کا بھی سامان کرے اور معاشرے میں بھی کش مکش اور نفرت کے بجائے آپس میں محبت اور خیر خواہی پیدا ہو۔ (استفسارات اول، ص۴۱۶، طبع اول)

ریاست کی طرف سے زائد ٹیکس

ناجائز املاک یا جائز املاک کے ناجائز تصرف کے بارے میں شریعت میں جو قوانین تجویز کیے گئے ہیں ان میں ضبطی جایداد تک کی گنجایش ہے۔ علاوہ بریں اسلام میں ایک عادل حکومت کو جو شوریٰ کے طریق پر چلائی جاتی ہو اور جو اپنی آمد و صرف کے متعلق معاشرے کے سامنے جواب دہ ہو، افراد پر مختلف قسم کے ٹیکس عائد کرنے کا حق بھی ہے۔ ٹیکس عائد کرنے کی اس پالیسی کے لیے دو اہم رہنما اصول ہمیں قرآن سے ملتے ہیں۔

ایک یہ کہ دولت دولت مندوں ہی کے درمیان نہ گھومتی رہے، دوسرے یہ کہ ٹیکس کا محل وہ دولت ہے جو عفو (زائد از ضرورت) کی تعریف میں آتی ہو۔ ان دو قاعدوں کو ملحوظ رکھ کر منصفانہ طریقوں سے ٹیکس اس طرح عائد کیا جانا چاہیے کہ جن کے پاس جتنی زیادہ دولت ہو وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے اتنا ہی زیادہ حصہ ادا کرے۔ مگر اس میں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ آدمی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے جائز طریقوں سے حلال دولت کمانے کا محرک (Incentive) بالکل ہی ختم ہو کر نہ رہ جائے۔ میں نے جہاں تک دین کا مطالعہ کیا ہے، مجھے اس تصور کی اسلام میں کوئی گنجایش نظر نہیں آئی کہ ملکیت کی بجائے خود ایک حد [بلالحاظ اس امر کے کہ وہ جائز نوعیت کی ملکیت ہو یا ناجائز نوعیت کی] مقرر کر دی جائے اور اس سے زائد پر ریاست آپ سے آپ قابض ہو جانے کا حق رکھتی ہو۔(استفسارات اول، ص ۴۱۷، طبع اول)

کیا اسلامی حکومت شرعی احکام کو منسوخ کرنے کی مجاز ہے؟

اسلامی حکومت شریعت کے ان احکام کو بھی منسوخ نہیں کرسکتی جو عبادات و اعتقادات کے درجے میں نہیں آتے لیکن ہیں بہر حال اسلامی احکام ہی۔ البتہ بعض خاص حالات میں خاص خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے وہ عارضی طور پر کچھ مباح چیزوں کو ممنوع کرسکتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداً زیارت قبور کو منع کر دیا اور بعد میں اس کی اجازت دے دی۔ بعد کی اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ زیارت قبول فی الاصل مباح تھی لیکن عارضی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس لیے منع کیا کہ سابق شرک کے جو اثرات معاشرے نے مہیا کر رکھے تھے ان کو دور کرنے کے لیے یہ عارضی ممانعت ضروری تھی۔ اسی طرح آپؐ نے شراب کی حرمت کے بعد ان خاص قسم کے برتنوں کے استعمال کو بھی کچھ مدت کے لیے منع کر دیا جن میں پہلے شراب بنائی اور استعمال کی جاتی تھی اور بعد میں ان کے استعمال کی اجازت دے دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت عارضی طور پر مباحات پر ایسی پابندیاں عائد کرسکتی ہے جو کسی اہم تر شرعی مصلحت کے لیے ضروری ہوں۔ لیکن اول تو اس طرح کی پابندیاں عائد کرنے والی حکومت وہ ہونی چاہیے جو کسی بیرونی فلسفے سے متاثر اور مرعوب نہ ہو۔ بلکہ اسلامی اصولوں پر کام کرتی ہو۔ دوسرے اس طرح کی پابندیوں کو مستقل قانون بنانا درست نہیں ہے۔ انھیں صرف اس وقت تک استعمال کرنا چاہیے جب تک اسلامی قوانین کے اجرا و نفاذ سے حالات معمول پر نہ آجائیں۔

(استفسارات اول، ص ۴۰۵، طبع اول)

اسلامی قانون اراضی: شبہات کا ازالہ

سوال: زرعی اصلاحات کے سلسلے میں جاگیروں کی واپسی میں واجبی حدود سے زائد واپس لینے کی دلیل بیان فرمائیں، جب کہ حضرت زبیرؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑے اور چابک کی جولانگاہ تک کی زمین دی تھی۔

جواب: (اس) سوال کے سلسلے میں یہ بات اصولی طور پر جان لینے کی ہے کہ حکومت کی عطا کردہ جاگیروں پر جاگیرداروں کے حقوقِ ملکیت اس طرح قائم نہیں ہو جاتے جس طرح کسی شخص کو اپنی زرخرید املاک یا موروثی ملکیتوں پر حاصل ہوتے ہیں۔ جاگیروں کے معاملے میں حکومت کو ہر وقت نظر ثانی کرنے کا حق حاصل ہے اور کسی عطیہ کو نامناسب پاکر حکومت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

منسوخ بھی کرسکتی ہے اور اس میں ترمیم بھی کرسکتی ہے۔

اس کی کئی نظیریں احادیث وآثار میں موجود ہیں۔ ابیض بن حمال ماذنی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مارب میں ایک ایسی زمین دی جس سے نمک نکلتا تھا۔ بعد میں لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو توجہ دلائی کہ وہ تو نمک کی بڑی کان ہے تو آپؐ نے اجتماعی مفاد کے خلاف پاکر اپنا عطیہ منسوخ فرمادیا۔ اس سے صرف یہی بات معلوم نہیں ہوتی کہ سرکاری عطایا پر نظرثانی کی جاسکتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو حد اعتدال سے زیادہ دے دینا اجتماعی مفاد کے خلاف ہے، اور اگر ایسا عطیہ دیا جاچکا ہو تو اس پر نظرثانی کرنی چاہیے۔ یہی بات اس روایت سے معلوم ہوتی ہے جس میں ذکر آتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت طلحہؓ کو ایک زمین کے عطیے کا فرمان لکھ کر دیا اور فرمایا کہ فلاں فلاں اصحاب کی شہادت ثبت کرالو جن میں سے ایک حضرت عمرؓ بھی تھے۔ جب حضرت طلحہؓ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے تو آپ نے اس پر اپنی مہر لگانے سے انکار کردیا اور کہا: ''اَھٰذَا کُلُّہٗ لَکَ دون الناس؟ کیا اتنی ساری زمین دوسروں کو چھوڑ کر تنہا تم اکیلے کو دے دی جائے؟ [ملاحظہ ہو کتاب الاموال لابی عبید، ص۲۷۶-۲۷۵)

رہا حضرت زبیرؓ کا معاملہ، تو جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ زمین ان کو دی ہے اس وقت بے حساب زمینیں غیر آباد پڑی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ کسی طرح ان کو آباد کیا جائے۔ اس پر آپؐ نے اس زمانے میں بھی بکثرت لوگوں کو افتادہ اراضی کے بڑے بڑے رقبے عطا فرمائے تھے۔ (معاشیات اسلام: ص ۲۲۰-۲۲۱)

سوال: بے دخلی مزارعین کے سلسلے میں یہ تو واضح ہے کہ فصل کی برداشت سے پہلے بے دخلی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ بے دخلی روکی جائے۔ اگر کوئی اور صورت ہو تو مع دلیل بیان کریں۔

جواب: بے دخلی کے متعلق حکومت ایسا قانون بنانے کی مجاز ہے کہ کوئی مالک کسی مزارع کو معقول وجوہ کے بغیر بے دخل نہ کرسکے۔ اس کے ناجائز ہونے کی دلیل کیا ہے؟ اگر کوئی نص اس میں مانع نہیں ہے تو پھر یہ اجازت امام کے ان اختیارات میں آپ سے آپ شامل ہے جو اسے لوگوں کے درمیان عدل قائم کرنے اور اجتماعی فتنوں کی روک تھام کرنے کے لیے مصالح عامہ کی خاطر دیے گئے ہیں۔ اس وقت جب کہ ہماری آبادی کی بہت بڑی اکثریت کا مدارِ زندگی کلیۃً زمین پر ہے، مالکوں کو یہ کھلا ہوا اختیار دے دینا کسی طرح بھی مصلحتِ عامہ کے مطابق نہیں ہے کہ وہ جب جس کاشت کار کو چاہیں بغیر کسی معقول وجہ کے اپنی زمین سے بے دخل کردیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کہیں کوئی کاشت کار اطمینان سے نہ بیٹھ سکے اور لاکھوں زراعت پیشہ لوگوں کی زندگی ہر وقت معلق رہے۔

(رسائل ومسائل، حصہ دوم، ص ۲۹۹ تا ۳۰۲، مارچ ۱۹۸۲ء۔ اشاعت تیرھویں)

(بحوالہ ترجمان القرآن، شعبان ۱۳۷۰ھ، جون ۱۹۵۱ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اسلامی حکومت اور قومی ملکیت

سوال: اسلامی حکومت کی نیشنلائزیشن (Nationalisation) کے بارے میں کیا پالیسی ہونی چاہیے؟

جواب: میں نے جہاں تک اس مسئلے کا اسلام کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام ذرائع پیداوار کو قومی بنانے کے پروگرام کو بطور اصول کے اختیار نہیں کرتا۔ یہ چیز اسلام کے سارے اجتماعی نظام کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے کسی ملک یا ریاست کے معاشی مسائل کا یہ صحیح حل نہیں ہے کہ سارے وسائل پیدائش کو قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ البتہ کسی صنعتی یا تجارتی شعبے کے بارے میں اگر تجربے سے معلوم ہو کہ اسے شخصی تحویل میں رکھ کر فروغ دینا ممکن ہی نہیں ہے، تو ایسی صورت میں اسے ریاست کے کنٹرول میں لیا جاسکتا ہے۔ (رسائل و مسائل، حصہ چہارم، ص ۱۴۹، اپریل ۱۹۸۱ء)۔

قرآن اور شخصی ملکیت

[یہ قاعدہ کلیہ ہے] کہ جب کسی رواجِ عام کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے تو اس کو ہمیشہ رضا اور جواز ہی پر محمول کیا جائے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی جگہ لوگوں نے کسی زمین کو گزرگاہ بنا رکھا ہو اور وہاں کوئی نوٹس اس فعل کی ممانعت کے لیے نہ لگایا گیا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہاں راستہ چلانا جائز ہے۔ اس جواز کے لیے کسی اثباتی اجازت کا ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے کہ وہاں ممانعت کا نہ ہونا خود ہی اجازت کا مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ اسی طرح زمین کی ملکیت کا مسئلہ بھی ہے۔ اسلام سے پہلے ہزاروں سال سے دنیا میں یہ دستور جاری تھا۔ قرآن نے اس کی ممانعت نہ کی۔ کوئی صریح حکم اس کے موقوف کرنے کے لیے نہ دیا۔ کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ لینے کے لیے نہ بنایا۔ کہیں اشارۃً اس رواج کی مذمت تک نہ کی۔ اس کے معنی یہی تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پرانے دستور کو جائز رکھا، اور یہی معنی لے کر مسلمان نزولِ قرآن کے بعد سے اب تک زمین کو اسی طرح شخصی ملکیت بناتے رہے جس طرح اس سے پہلے وہ شخصی ملکیت بنائی جاتی رہی تھی۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ قرآن نے پرانے دستور کو موقوف نہیں کیا بلکہ اگر آپ قرآن کا غائر مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے ایجاباً اسے جائز تسلیم کیا ہے اور اسی کی بنیاد پر معیشت اور معاشرت کے متعلق احکام دیے ہیں۔

دیکھیے زمین سے انسان کی دو ہی اغراض وابستہ ہیں: زراعت یا سکونت۔ قرآن ان دونوں اغراض کے لیے زمین کی شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے:

كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ ۔ (الانعام ۶:۱۴۱)

اس کے پھلوں سے کھاؤ جب کہ وہ پھل لائے اور اس کی فصل کٹنے کے دن اس کا (یعنی خدا کا) حق ادا کرو۔

یہاں خدا کا حق ادا کرنے سے مراد زکوٰۃ و صدقہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین اجتماعی ملکیت ہو تو نہ زکوٰۃ دینے کا سوال پیدا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہوتا ہے نہ لینے کا۔ یہ حکم صرف اسی بنیاد پر دیا جاسکتا تھا جب کہ کچھ لوگ زمین کے مالک ہوں اور وہ اس کی پیداوار میں سے خدا کا حق نکالیں، اور کچھ دوسرے لوگ زمین کے مالک نہ ہوں اور ان کو پیداوار کا وہ حصہ دیا جائے جو خدا کے لیے نکالا گیا ہو۔ فرمایئے، یہ حکم دے کر قرآن نے ملکیت زمین کے پرانے نظام کی توثیق کی یا نہیں؟ اسی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ۔ (البقرۃ ۲:۲۶۷)

اے ایمان لانے والو، خرچ کرو اپنی پاک کمائیوں میں سے اور ان چیزوں میں سے جو ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔

یہاں زمین کی پیدوار میں سے خرچ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ اس سے مراد زکوۃ وخیرات ہے۔ اس حکم کی بجا آوری وہی شخص کرے گا جو پیدوار کا مالک ہوگا، اور انھی لوگوں پر انفاق کیا جائے گا جو صاحب مال وجایداد نہیں ہیں۔ چنانچہ قران مجید میں یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ خیرات کے مستحق کون ہیں؟ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ۔ (البقرۃ ۲:۲۷۳) اور إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ ...... الخ (التوبۃ ۹:۶۰)

رہی دوسری غرض تو اس کے متعلق سورۂ النور میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ...... فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۔ (النور ۲۴:۲۷-۲۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو جب تک کہ پوچھ نہ لو، اور جب داخل ہو تو اس گھر والوں کو سلام کرو...... اور اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو اندر نہ جاؤ تاوقتیکہ تم کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دی گئی ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سکونت کے لیے بھی زمین کے شخصی قبضہ وملکیت کی توثیق کرتا ہے اور ایک مالک کے اس حق کا استقرار کرتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس کی اجازت کے بغیر اس کے حدود میں قدم نہ رکھے۔

(مسئلہ ملکیتِ زمین: مارچ ۱۹۶۹ء،ص ۲۳-۲۵)

❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

زمین کی شخصی ملکیت

ازروئے حدیث

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے عہد میں زمین کا انتظام کس طریقے پر کیا گیا تھا، اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ شریعت کی رُو سے اسلامی حکومت کے زیر حکم آنے والی اراضی چار بڑی اقسام پر منقسم ہوتی ہیں:

(۱) وہ جن کے مالک اسلام قبول کرلیں۔

(۲) وہ جن کے مالک اپنے دین پر ہی رہیں مگر ایک معاہدے کے ذریعے سے اپنے آپ کو اسلامی حکومت کی تابعیت میں دیں۔

(۳) وہ جن کے مالک بزور شمشیر مغلوب ہوں۔

(۴) وہ جو کسی کی ملک میں نہ ہوں۔

ان میں سے ہر ایک کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفا نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اسے ہم الگ الگ بیان کریں گے۔

قسم اول کا حکم

پہلی قسم کی املاک کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اصول پر عمل فرمایا وہ یہ تھا:

اِنَّ الْقَوْمَ اِذَا اَسْلَمُوا اَحْرَزُوْا دِمَائَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ۔ (ابوداؤد، کتاب الخراج، باب فی اقطاع الارضین)۔ جب لوگ اسلام قبول کر لیں تو وہ اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیتے ہیں۔

اِنَّہٗ مَنْ اَسْلَمَ عَلٰی شَیْءٍ فَھُوَ لَہٗ۔ (کتاب الاموال لابی عبید)۔ آدمی اسلام قبول کرتے وقت جن املاک کا مالک ہوتا ہے وہ اسی کی مِلک رہیں گی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ اصول جس طرح املاکِ منقولہ پر چسپاں ہوتا تھا اسی طرح غیر منقولہ پر بھی چسپاں ہوتا تھا، اور اس معاملے میں جو برتاؤ غیر زرعی جایدادوں کے ساتھ تھا وہی زرعی جایدادوں کے ساتھ بھی تھا۔ حدیث اور آثار کا پورا ذخیرہ اس پر شاہد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں کسی جگہ بھی اسلام قبول کرنے والوں کی املاک سے ذرہ برابر بھی کوئی تعرض نہیں فرمایا۔ جو جس چیز کا مالک تھا اسی کا مالک رہنے دیا گیا۔ اس باب میں اسلامی قانون کی تشریح امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

جو لوگ اسلام قبول کرلیں ان کا خون حرام ہے۔ قبول اسلام کے وقت جن اموال کے وہ مالک ہوں وہ انھی کی مِلک میں رہیں گے۔ اسی طرح ان کی زمینیں بھی ان ہی کی مِلک رہیں گی اور وہ زمینیں عُشری قرار دی جائیں گی۔ اس کی نظیر مدینہ ہے جس کے باشندوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے اور ان پر عُشر لگا دیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ طائف اور بحرین کے لوگوں سے بھی کیا گیا۔ اسی طرح بدویوں میں سے بھی جن جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ اپنے اپنے چشموں اور اپنے اپنے علاقوں کے مالک تسلیم کیے گئے...... ان کی زمین عُشری زمین ہے۔ وہ اس سے بے دخل نہیں کیے جا سکتے اور انھیں اس پر بیع اور وراثت کے جملہ حقوق حاصل ہیں۔ بالکل اسی طرح جن علاقوں کے باشندے اسلام قبول کرلیں وہ اپنی املاک کے مالک رہیں گے۔ (کتاب الخراج: ص ۳۵)

اسلامی قانون معیشت کے دوسرے جلیل القدر محقق امام ابو عبید القاسم بن سلّام لکھتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفا سے جو آثار ہم تک پہنچے ہیں وہ اراضی کے بارے میں تین قسم کے احکام لائے ہیں۔ ایک قسم ان اراضی کی جن کے مالک اسلام قبول کرلیں تو قبول اسلام کے وقت وہ جن اراضی کے مالک ہوں وہ ان ہی کی مِلک رہیں گی اور وہ عُشری زمینیں قرار پائیں گی۔ عُشر کے سوا ان پر اور کچھ نہ لگے گا...... (کتاب الاموال: ص ۵۵)

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

جس علاقے کے باشندے اسلام لے آئے وہ اپنی زمینوں کے مالک رہے، جیسے مدینہ، طائف، یمن، اور بحرین۔ اسی طرح مکہ اگرچہ بزورِ شمشیر فتح ہوا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے باشندوں پر احسان کیا اور ان کی جانوں سے تعرض نہ کیا اور ان کے اموال کو غنیمت میں نہ ٹھہرایا...... پس جب ان کے اموال ان کی مِلک میں چھوڑ دیے گئے اور اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے تو ان کی املاک کا حکم بھی وہی ہو گیا جو دوسرے مسلمان ہونے والے لوگوں کی املاک کا تھا، اور ان کی زمینیں بھی عُشری قرار دی گئیں۔ (کتاب الاموال: ص ۵۱۲)

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ زاد المعاد میں لکھتے ہیں:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص اسلام لانے کے وقت جس چیز پر قابض تھا وہ اس کے قبضے میں رہنے دی گئی۔ یہ نہیں دیکھا کہ اسلام لانے سے پہلے وہ کس ذریعے سے اس کے قبضے میں آئی تھی۔ بلکہ وہ اس کے ہاتھ میں اسی طرح رہنے دی گئی جس طرح وہ پہلے سے چلی آ رہی تھی۔ (زاد المعاد: ص ۹۶)

یہ ایک ایسا قاعدہ کلیہ ہے جس میں استثنا کی کوئی ایک مثال بھی عہدِ نبوت اور عہدِ خلافت راشدہ کے نظائر میں نہیں ملتی۔ اسلام نے اپنے پیرووں کی معاشی زندگی میں جو اصلاحیں بھی جاری کیں آیندہ کے لیے کیں، مگر جو ملکیتیں پہلے سے لوگوں کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قبضے میں چلی آرہی تھیں ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

قسم دوم کا حکم

دوسری قسم ان لوگوں کی تھی جنھوں نے اسلام قبول تو نہ کیا، مگر مصالحانہ طریقے سے اسلامی حکومت کے تابع بن کر رہنا قبول کرلیا۔ ایسے لوگوں کے بارے میں جو اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمایا وہ یہ تھا کہ جن شرائط پر بھی ان سے مصالحت ہوئی ہو انھیں بے کم وکاست پورا کیا جائے۔ چنانچہ حدیث میں آپؐ کا ارشاد ہے:

لَعَلَّكُمْ تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا فَيَظْهَرُوْنَ عَلَيْكُمْ فَيَتَّقُوْنَ بِاَمْوٰلِهِمْ دُوْنَ اَنْفُسِهِمْ وَاَبْنَائِهِمْ فَتُصَالِحُوْنَهُمْ عَلٰى صُلْحٍ فَلَا تُصِيْبُوْا مِنْهُمْ فَوْقَ ذَالِكَ فَاِنَّهٗ لَايَصْلُحُ۔ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

اگر کبھی ایسا ہو کہ کسی قوم سے تمھاری جنگ ہو، پھر وہ تمھارے سامنے آکر اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں بچانے کے لیے اپنے مال دینے پر تیار ہو جائیں، اور تم ان سے صلح کرلو، تو ایسی صورت میں جس چیز پر ان سے تمھاری صلح ہو اس سے زائد کچھ نہ لینا کیونکہ وہ تمھارے لیے جائز نہیں ہے۔

اَلَا مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوِنْتَقَصَهٗ اَوْكَلَّفَهٗ فَوْقَ طَاقَتِهٖ اَوْ اَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ فَاَنَا حَجِيْجُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (ابوداؤد)

خبردار رہو، جو شخص کسی معاہد ذمی پر ظلم کرے گا، یا ازروئے معاہدہ اس کے جو حقوق ہوں ان کے اندر کوئی کمی کرے گا، یا اس کی برداشت سے زیادہ بار ڈالے گا، یا اس کی رضامندی کے بغیر کوئی چیز لے آئے گا، اس کے خلاف میں خود قیامت کے روز مدعی بنوں گا۔

اسی اصول کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران، اَیلہ، اَذرُعات، ہجر اور دوسرے جن جن علاقوں اور قبیلوں کے ساتھ صلح کی ان سب کو ان کی زمینوں اور جایدادوں اور صنعتوں اور تجارتوں پر بدستور بحال رہنے دیا اور صرف وہ جزیہ وخراج ان سے وصول کرنے پر اکتفا فرمایا جس پر ان سے معاہدہ ہوا تھا۔ پھر خلفائے راشدینؓ نے بھی عمل کیا۔ عراق، شام، الجزیرہ، مصر، ارمینیہ، غرض جہاں جہاں بھی کسی شہر اور کسی بستی کے لوگوں نے صلح کے طریقوں پر اپنے آپ کو اسلامی حکومت کے حوالے کیا ان کی املاک بدستور ان کے قبضے میں رہنے دیں گئیں اور ان سے مالِ صلح کے سوا کوئی چیز کبھی وصول نہ کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بعض اہم مصلحتوں کی بنا پر نجران کے باشندوں کو اندرونِ عرب سے شام وعراق کی طرف منتقل بھی کیا گیا تو ان میں سے جس جس کے پاس نجران میں جتنی زرعی اور سکنی جایداد تھی اس کے بدلے میں نہ صرف اتنی جایداد اس کو دوسری جگہ دی گئی بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے شام وعراق کے گورنروں کے نام فرمان عام لکھا کہ جس علاقے میں بھی وہ جاکر آباد ہوں فَلْيُوَسِّعْهُمْ مِنْ خَرِيْبِ الْاَرْضِ ''وہ فراخ دلی کے ساتھ افتادہ زمینوں میں سے ان کو دیں۔'' (کتاب الاموال لابی عبید: ص ۱۸۹)

اس قاعدہ کلیہ میں بھی کسی استثنا کی مثال عہدِ نبوت اور عہدِ خلافت راشدہ کے نظائر سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ چنانچہ یہ بھی فقہائے اسلام کا متفق علیہ قانون ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اس کو اپنی کتاب الخراج میں ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانونی دفعہ کے طور پر اس طرح ثبت فرماتے ہیں:

غیر مسلموں میں سے جس قوم کے ساتھ اس بات پر امام کی صلح ہو جائے اور وہ مطیع ہو جائیں اور خراج ادا کریں تو وہ اہلِ ذمہ ہیں، ان کی اراضی اراضی خراج ہیں، ان سے بس وہی کچھ لیا جائے گا جس پر ان سے صلح ہوئی ہو، ان کے ساتھ عہد پورا کیا جائے گا اور ان پر کسی چیز کا اضافہ نہ کیا جائے گا۔ (کتاب الخراج: ص ۳۵)

قسم سوم کے احکام

رہے وہ لوگ جو آخر وقت تک مقابلہ کریں اور بزور شمشیر مغلوب ہوں، تو ان کے بارے میں تین مختلف طرز عمل ہم کو عہدِ نبوت وخلافتِ راشدہ میں ملتے ہیں:

ایک وہ طرز عمل جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اختیار فرمایا، یعنی فتح کے بعد لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ کا اعلانِ عام اور مفتوحین کو جان ومال کی پوری معافی۔ اس صورت میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اہلِ مکہ اپنی زمینوں اور جایدادوں کے بدستور مالک رہے، اور اسلام قبول کرنے کے بعد ان کی زمینیں عُشری زمینیں قرار دے دی گئیں۔

دوسرا وہ طرزِ عمل جو آپ نے خیبر میں اختیار فرمایا، یعنی مفتوحہ علاقے کو مالِ غنیمت قرار دینا۔ اس صورت میں سابق مالکوں کی ملکیت ساقط کر دی گئی، ایک حصہ خدا اور رسولؐ کے حق میں لے لیا گیا، اور باقی زمین کو ان لوگوں پر تقسیم کر دیا گیا جو فتح خیبر کے موقع پر لشکر اسلام میں شامل تھے۔ یہ تقسیم شدہ زمینیں جن جن لوگوں کے حصے میں آئیں وہ ان کے مالک قرار پائے اور ان پر عُشر لگا دیا گیا۔ (کتاب الاموال لابی عبید: ص ۵۱۳)

تیسرا وہ طرز عمل جو حضرت عمرؓ نے ابتداً شام اور عراق میں اختیار فرمایا اور بعد میں تمام مفتوح ممالک کا بندوبست اسی کے مطابق ہوا۔ وہ یہ تھا کہ آپ نے مفتوح علاقے کو فاتحین فوج میں تقسیم کرنے کے بجائے اس کو تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا، اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتاً اپنے ہاتھ میں لے لیا، اصل باشندوں کو حسب سابق ان کی زمینوں پر بحال رہنے دیا، ان کو ذمی قرار دے کر ان پر جزیہ وخراج عائد کر دیا اور اس جزیہ وخراج کا مصرف یہ قرار دیا کہ وہ عام مسلمانوں کی فلاح وبہبود پر صَرف ہو، کیونکہ بنیادی نظریے کے اعتبار سے وہی ان مفتوح علاقوں کے اصل مالک تھے۔

اس آخری صورت میں بظاہر "اجتماعی ملکیت" کے تصور کا ایک دھندلا سا شائبہ پایا جاتا ہے، مگر جس طرح یہ پورا معاملہ طے ہوا تھا اس کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس اجتماعی ملکیت کو اشتراکیت کے تصور سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب مصر وشام اور عراق کے وسیع علاقے فتح ہوئے تو حضرت زبیرؓ اور حضرت بلالؓ اور ان کے ہم خیال لوگوں نے حضرت عمرؓ سے مطالبہ کیا کہ ان علاقوں کی زمینیں اور جایدادیں خیبر کی طرح فاتح فوج میں تقسیم کر دی جائیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا اور حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ جیسے اکابر صحابہ نے اس معاملے

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

میں ان کی تائید کی۔ اس انکار کے وجوہ کیا تھے؟ اس پر وہ تقریریں روشنی ڈالتی ہیں جو اس موقع پر ہوئیں۔ حضرت معاذؓ نے کہا:

> اگر آپ اسے تقسیم کریں گے تو خدا کی قسم اس کا نتیجہ وہ ہوگا جو آپ ہرگز پسند نہ کریں گے۔ بڑی بڑی زرخیز زمینوں کے ٹکڑے فوج میں تقسیم ہو جائیں گے۔ پھر یہ لوگ مرکھپ جائیں گے اور کسی کی وارث کوئی عورت ہوگی اور کسی کا وارث کوئی بچہ ہوگا۔ پھر جو دوسرے لوگ اسلام کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اٹھیں گے انھیں دینے کے لیے حکومت کے پاس کچھ نہ ہوگا۔ لہٰذا آپ وہ کام کیجیے جس میں آج کے لوگوں کے لیے بھی گنجایش ہو اور بعد والوں کے لیے بھی۔

حضرت علیؓ نے فرمایا:

> ملک کی کاشت کار آبادی کو اس کے حال پر رہنے دیجیے تاکہ وہ سب مسلمانوں کے لیے معاشی قوت کا ذریعہ ہوں۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

> یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں زمین تم لوگوں پر تقسیم کردوں اور بعد میں آنے والوں کو اس حال میں چھوڑوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ ہو...... آخر بعد کی نسلوں کے لیے کیا رہے گا؟...... کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ آیندہ آنے والوں کے لیے کچھ نہ رہے؟......اور مجھے یہ بھی اندیشہ ہے کہ اگر میں اسے تمھارے درمیان تقسیم کردوں تو تم پانی پر آپس میں فساد کرنے لگو گے۔

اس بنیاد پر جو فیصلہ کیا گیا وہ یہ تھا کہ زمین اس کے سابق باشندوں ہی کے پاس رہنے دی جائے، اور ان کو ذمی بنا کر ان پر جزیہ وخراج لگا دیا جائے، اور یہ خراج مسلمانوں کی عام فلاح پر صرف ہو۔ اس فیصلے کی اطلاع حضرت عمرؓ نے اپنے عراق کے گورنر، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو جن الفاظ میں دی تھی وہ یہ ہیں:

> فَانظُرْ مَااَجلَبُوْا بِہٖ عَلَیْکَ فِی الْعَسْکَرِ مِنْ کُرَعٍ اَوْمَالٍ فَاقْسِمْہُ بَیْنَ مَنْ حَضَرَ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ وَاتْرُکِ الْاَرَضِیْنَ وَ الْاَنْھَارَ لِعُمَّالِھَا لِیَکُوْنَ ذَالِکَ فِی اَعْطِیَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ، فَاِنَّا قَسَمْنَاھَا بَیْنَ مَنْ حَضَرَ لَمْ یَکُنْ لِمَنْ بَعْدَ ھُمْ شَیْءٌ۔[1]
>
> جو کچھ اموال منقولہ سپاہیوں نے دورانِ جنگ میں بطورِ غنیمت حاصل کیے ہیں اور لشکر میں جمع کرا دیے ہیں، انھیں تو انھی لوگوں میں تقسیم کردو جو جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ مگر نہروں اور زمینوں کو انھی لوگوں کے ہاتھوں میں رہنے دو جو ان پر کام کرتے تھے تاکہ وہ مسلمانوں کی تنخواہوں کے لیے محفوظ رہیں۔ ورنہ اگر ہم ان کو بھی موجودہ لوگوں میں تقسیم کردیں تو پھر بعد والوں کے لیے کچھ نہ رہے گا۔

اس نئے بندوبست کا اساسی نظریہ تو یہی تھا کہ اب ان مفتوحہ اراضی کے مالک مسلمان ہیں، اور سابق مالکوں کی اصل حیثیت صرف کاشتکارانہ ہے، اور حکومت مسلمانوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے ان کے ساتھ معاملہ کر رہی ہے۔[2] لیکن عملاً ذمی بنا لینے کے بعد ان کو جو حقوق دیے گئے وہ مالکانہ حقوق سے کچھ بھی مختلف نہ تھے۔ وہ انھی رقبوں پر قابض رہے جن پر پہلے قابض

۱۔ اس پوری بحث کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج: ص ۲۰-۲۱ اور کتاب الاموال: ص ۵۷-۶۳۔

۲۔ اس نظریے کی توضیح اس واقعے سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ عتبہ بن فرقد حضرت عمرؓ سے ملنے آئے اور ان کو اطلاع دی کہ میں نے فرات کے کنارے زمین کا ایک ٹکڑا خریدا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کس سے؟ انھوں نے عرض کیا اس کے مالکوں سے۔ آپ نے مہاجرین وانصار کی طرف اشارہ کرکے فرمایا اس کے مالک تو یہاں بیٹھے ہیں۔ (کتاب الاموال: ص ۷۴)

(بقیہ اگلے صفحے پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ ان پر خراج کے سوا کوئی دوسری چیز حکومت یا مسلمانوں کی طرف سے عائد نہ کی گئی اور ان کو اپنی زمینوں پر بیع اور رہن اور وراثت کے وہ تمام حقوق بدستور حاصل رہے جو پہلے حاصل تھے۔ اس معاملے کو امام ابویوسفؒ ایک قانونی ضابطے کی شکل میں یوں بیان فرماتے ہیں:

جس سرزمین کو امام بزور شمشیر فتح کرے اس کے معاملے میں وہ اختیار رکھتا ہے کہ اگر چاہے تو فاتح فوج میں اسے تقسیم کر دے۔ اس صورت میں وہ عُشری زمین ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ تقسیم کرنا مناسب نہ سمجھے اور بہتری یہی خیال کرے کہ اسے اس کے پرانے باشندوں کے ہاتھوں میں رہنے دے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے عراق میں کیا، تو وہ ایسا کرنے کا اختیار بھی رکھتا ہے۔ اس صورت میں وہ زمین خراجی ہوگی اور خراج لگ جانے کے بعد پھر امام کو یہ حق باقی نہ رہے گا کہ اس کے باشندوں سے اس کو چھین لے۔ وہ ان کی مِلک ہوگی، وہ اس کو وراثت میں ایک دوسرے کی طرف منتقل کریں گے، اس کی خرید و فروخت کر سکیں گے، ان پر خراج لگا دیا جائے گا، اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ ڈالا جائے گا۔ (کتاب الخراج: ص ۳۵-۳۶)

قسم چہارم کے احکام

مذکورہ بالا تین قسمیں تو ان اراضی کی تھیں جو پہلے سے مختلف قسم کے لوگوں کی ملکیت میں تھیں اور اسلامی نظام قائم ہونے کے بعد یا تو ان کی پچھلی ملکیتوں ہی کی توثیق کر دی گئی، یا بعض حالات میں اگر ردوبدل کیا بھی گیا تو صرف ہاتھوں میں کیا گیا نہ کہ بجائے خود نظامِ ملکیت میں۔ اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جن زمینوں کا کوئی مالک نہ تھا، یا نہ رہا تھا، ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفا نے کیا طرزِ عمل اختیار فرمایا۔

اس نوعیت کی اراضی دو بڑی اصناف پر مشتمل تھیں:

ایک 'مَوَات' یعنی افتادہ زمینیں، خواہ وہ عادیُ الارض ہوں (جن کے مالک مر کھپ گئے ہوں) یا جن کا کبھی کوئی مالک رہا ہی نہ ہو، یا جو جھاڑیوں اور دلدلوں اور سیلابوں کے نیچے آ گئی ہوں۔

دوسری 'خالصہ' زمینیں، یعنی جن کو سرکاری املاک قرار دیا گیا تھا۔ ان میں کئی طرح کی اراضی شامل تھیں۔ ایک وہ جن کے مالکوں نے خود ان سے دست بردار ہو کر حکومت کو اختیار دے دیا تھا کہ انھیں جس طرح چاہے استعمال کرے۔[۱] دوسری وہ جن کے مالکوں کو اسلامی حکومت نے بے دخل کر کے خالصہ کر لیا تھا۔ مثلاً مضافاتِ مدینہ میں بنی نضیر کی زمینیں۔ تیسری وہ جو مفتوحہ

(بقیہ سابقہ صفحہ)۔ اور حضرت علیؓ کا وہ ارشاد بھی اس نظریے پر روشنی ڈالتا ہے کہ جب عراق کے پرانے زمین داروں میں سے ایک نے آ کر آپ کے سامنے قبول اسلام کا اعلان کیا تو آپ نے فرمایا کہ اب جزیہ تجھ سے ساقط ہو گیا لیکن تیری زمین خراجی ہی رہے گی، کیونکہ وہ ہماری ہے۔ (کتاب الاموال: ص ۸۰)

۱؎ ابن عباس کی روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انصار نے وہ تمام زمینیں جن تک ان کی آب پاشی کا پانی نہ پہنچتا تھا، آپ کے حوالے کر دیں تاکہ آپ ان سے جو چاہیں کام لیں۔ (کتاب الاموال: ص ۲۸۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

علاقوں میں خالصہ قرار دی گئی تھیں۔ مثلاً وہ اراضی جو عراق میں کسریٰ اور اس کے اہلِ خاندان کے قبضے میں تھیں، یا جن کے مالک جنگ میں مارے گئے تھے یا بھاگ گئے تھے، اور حضرت عمرؓ نے ان کو خالصہ قرار دے دیا تھا۔[1]

ان دونوں اقسام کا حکم ہم الگ الگ بیان کریں گے۔

حقوق ملکیت بر بنائے آبادکاری

'مَوَات' کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدیم ترین اصول کی تجدید فرمائی جس سے دنیا میں ملکیت زمین کا آغاز ہوا ہے۔ جب انسان نے اس کرہ خاکی کو آباد کرنا شروع کیا تو اصول یہی تھا کہ جو جہاں رہ پڑا ہے وہ جگہ اسی کی ہے، اور جس جگہ کو کسی نے کسی طور پر کارآمد بنالیا ہے اس کے استعمال کا وہی زیادہ حق دار ہے۔ یہی قاعدہ تمام عطیاتِ فطرت پر انسان کے مالکانہ حقوق کی بنیاد ہے، اور اسی کی توثیق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر اپنے ارشادات میں فرمائی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے:

عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ عَمَرَ اَرْضًا لَيْسَتْ لِاَحَدٍ فَهُوَ حَقُّ بِهَا۔ قَالَ عُرْوَةُ قَضٰى بِهٖ عُمَرُ فِي خِلَافَتِهٖ۔ (بخاری، احمد، نسائی)

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے کسی ایسی زمین کو آباد کیا جو کسی دوسرے کی مِلک نہ ہو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔ عروہ بن زبیر کہتے ہیں کہ اسی پر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل درآمد کیا۔

عَنْ جَابِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحْيٰ اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهٗ۔ (احمد، ترمذی، نسائی، ابن حبان)

جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ جس کسی نے مردہ زمین کو زندہ کیا (یعنی بےکار پڑی ہوئی زمین کو کارآمد بنالیا) وہ زمین اسی کی ہے۔

عَنْ سَمُرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ اَحَاطَ حَائِطًا عَلٰى اَرْضٍ فَهِيَ لَهٗ۔ (ابوداؤد)

سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے کسی افتادہ زمین پر احاطہ کھینچ لیا وہ اسی کی ہے۔

عَنْ اَسْمَرَبْنِ مُضَرِّسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ سَبَقَ اِلٰى مَآءٍ لَمْ يَسْبِقْهُ اِلَيْهِ مُسْلِمٌ فَهُوَ لَهٗ۔ (ابوداؤد)

اُسمر بن مُضَرِّس سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی ایسے کنویں کو پائے جس پر پہلے کوئی مسلمان قابض نہ ہو وہ کنواں اسی کا ہے۔

عَنْ عُرْوَةَ قَالَ اَشْهَدُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَضٰى اَنَّ الْاَرْضَ اَرْضُ اللّٰهِ وَالْعِبَادَ عِبَادُ اللّٰهِ، وَمَنْ اَحْيٰ مَوَاتًا فَهُوَ حَقٌّ بِهَا، جَآءَ نَا بِهٰذَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالصَّلٰوتِ عَنْهُ۔ (ابوداؤد)

عروہ بن زبیر (تابعی) کہتے ہیں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ فرمایا تھا کہ زمین خدا کی ہے اور بندے بھی خدا کے ہیں، جو شخص مردہ زمین کو زندہ کرے وہی اس زمین کا زیادہ حق دار ہے۔ یہ قانون ہم تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے انھی بزرگوں نے پہنچایا ہے جن کے ذریعے سے پنج وقتہ نماز پہنچی ہے۔ (یعنی صحابہ کرامؓ)

---

[1] اس طرح کی اراضی کی دس اقسام امام ابو یوسف اور ابوعبید رحمہما اللہ نے اپنی کتابوں میں گنائی ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس فطری اصول کی تجدید و توثیق کرنے کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے دو ضابطے مقرر فرما دیے۔ ایک یہ کہ جو شخص دوسرے کی مملوکہ زمین کو آباد کرے وہ اس فعل آباد کاری کی بنا پر ملکیت کا حق دار نہ ہو جائے گا۔ دوسرے یہ جو شخص خواہ مخواہ احاطہ کھینچ کر یا نشان لگا کر کسی زمین کو روک رکھے اور اس پر کوئی کام نہ کرے اس کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جائے گا۔ پہلے ضابطے کو آپ نے اس طرح بیان فرمایا ہے:

عَنْ سَعِيْدِ بْنِ زَيْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَحْيٰ اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهٗ وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ۔

(احمد، ابوداؤد، ترمذی)

سعید بن زید کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کسی نے کسی مردہ زمین کو زندہ کر لیا وہ اسی کی ہے، اور دوسرے کی زمین میں ناروا طور پر آباد کاری کرنے والے کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔

دوسرے ضابطے کا مآخذ یہ روایات ہیں:

عَنْ طَاؤُسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَادِيُّ الْاَرْضِ لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ ثُمَّ لَكُمْ مِنْ بَعْدُ فَمَنْ اَحْيٰ اَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهٗ وَلَيْسَ لِمُحْتَجِرٍ حَقٌّ بَعْدَ ثَلٰثِ سِنِيْنَ۔ (ابو یوسف، کتاب الخراج)

طاؤس (تابعی) کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غیر مملوکہ زمین جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو خدا اور رسول کی ہے، پھر اس کے بعد وہ تمھارے لیے ہے۔ پس جو کوئی کسی مردہ زمین کو زندہ کر لے وہ اسی کی ہے۔ اور بے کار روک کر رکھنے والے کے لیے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔

عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ عَلَى الْمِنْبَرِ مَنْ اَحْيٰى اَرْضًا مَّيْتَةً فَهِيَ لَهٗ وَلَيْسَ لِمُحْتَجِرٍ حَقٌّ بَعْدَ ثَلٰثِ سِنِيْنَ وَذٰلِكَ اَنَّ رِجَالًا كَانُوْا يَحْتَجِرُوْنَ مِنَ الْاَرْضِ مَالَا يَعْلَمُوْنَ۔ (ابو یوسف: کتاب الخراج)

سالم بن عبداللہ (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پوتے) روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بر سر منبر فرمایا کہ جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے مگر خواہ مخواہ روک رکھنے والے کے لیے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں ہے۔ یہ اعلان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ بعض لوگ زمینوں کو یوں ہی روک رکھتے تھے اور ان پر کوئی کام نہ کرتے تھے۔

یہ مسئلہ فقہائے اسلام کے درمیان متفق علیہ ہے۔ اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف اس امر میں ہے کہ آیا محض آباد کاری کا فعل کر لینے ہی سے کوئی شخص ارض مَوات کا مالک ہو جاتا ہے یا ثبوت ملکیت کے لیے حکومت کی منظوری و اجازت ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس کے لیے حکومت کی منظوری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں احادیث بالکل صاف ہیں، لہٰذا آباد کار کا حقِ ملکیت حکومت کی اجازت اور منظوری پر موقوف نہیں ہے، وہ خدا اور رسول کے دیے ہوئے حق کی بنا پر مالک ہو جائے گا۔ اس کے بعد حکومت کا کام یہ ہے کہ جب معاملہ اس کے سامنے آئے تو وہ اس حق کو تسلیم کرے اور نزاع کی صورت میں اس کا استقرار کرائے۔ امام مالکؒ بستی کے قریب کی زمینوں اور دور دراز کی افتادہ اراضی میں فرق کرتے ہیں۔ پہلی قسم کی زمینیں ان کے نزدیک اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ رہیں دوسری

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قسم کی زمینیں تو ان کے لیے امام کے عطیے کی شرط نہیں۔ وہ محض احیا سے آدمی کی مِلک ہو جاتی ہیں۔

اس معاملے میں حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز دونوں کا طرز عمل یہ تھا کہ اگر کوئی شخص کسی زمین کو افتادہ سمجھ کر آباد کر لیتا ہے، اور بعد میں دوسرا شخص آ کر ثابت کرتا کہ زمین اس کی تھی، تو اس کو اختیار دیا جاتا تھا کہ یا تو آباد کار کے عمل کا معاوضہ ادا کر کے اپنی زمین لے لے، یا زمین کی قیمت لے کر حقِ ملکیت اس کی طرف منتقل کر دے۔[1]

عطیۂ زمین من جانب سرکار

پھر موات اور خالصہ دونوں طرح کی زمینوں میں سے بکثرت قطعات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی لوگوں کو عطا فرمائے، اور آپ کے بعد خلفائے راشدینؓ بھی برابر اس طرح کے عطیے دیتے رہے۔ اس کی بہت سی نظیریں حدیث و آثار کے ذخیرے میں موجود ہیں جن میں سے چند یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ عروہ بن زبیرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اور حضرت عمرؓ بن خطاب کو چند زمینیں عطا کی تھیں۔ پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حضرت زبیرؓ نے خاندانِ عمرؓ کے لوگوں سے ان کے حصے کی زمین خرید لی اور اس خریداری کی توثیق کے لیے حضرت عثمانؓ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے کہا کہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف کی شہادت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زمینیں ان کو اور عمرؓ بن خطاب کو عطا کی تھیں، سو میں نے خاندانِ عمرؓ سے ان کا حصہ خرید لیا ہے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا کہ عبدالرحمٰن سچی شہادت دینے والے آدمی ہیں خواہ وہ ان کے حق میں پڑتی ہو یا ان کے خلاف۔ (مسند امام احمد)

۲۔ علقمہ بن وائل اپنے والد (وائل بن حُجر) سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حضر موت میں ایک زمین عطا کی تھی۔ (ابوداؤد، ترمذی)

۳۔ حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ بیان کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر حضرت زبیر کو خیبر میں ایک زمین عطا فرمائی تھی جس میں کھجور کے درخت بھی تھے اور دوسرے درخت بھی۔ اس کے علاوہ عروہ بن زبیر کا بیان ہے کہ آپؐ نے ان کو ایک نخلستان بنی نضیر کی زمینوں میں سے بھی دیا تھا۔ نیز عبداللہ بن عمر روایت کرتے ہیں کہ ایک اور وسیع خطۂ زمین بھی آپ نے حضرت زبیر کو دیا تھا اور اس کی صورت یہ تھی کہ آپ نے ان سے فرمایا گھوڑا دوڑاؤ، جہاں جا کر تمھارا گھوڑا ٹھہر جائے گا وہاں تک کی زمین تمھیں دے دی جائے گی۔ چنانچہ انھوں نے گھوڑا دوڑایا اور جب ایک جگہ جا کر گھوڑا ٹھہر گیا

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب الخراج لابی یوسف، ص ۳۰-۷-۳۰ و کتاب الاموال لابی عبید، ص ۲۸۵-۲۸۹۔ شیخ علی متقی نے کنز العمال میں اس مسئلے پر تمام احادیث و آثار کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ جو اصحاب اس کی پوری تفصیلات دیکھنا چاہیں وہ کتاب مذکور کے جزدوم میں احیائے موات کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تو وہاں سے انھوں نے اپنا کوڑا آگے پھینک دیا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اچھا، جہاں ان کا کوڑا گرا ہے وہاں تک کی زمین انھیں دے دی جائے۔ (بخاری، احمد، ابوداؤد، کتاب الخراج لابی یوسف، کتاب الاموال لابی عبید)

۴۔ عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ دونوں کو زمینیں عطا فرمائیں۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

۵۔ ابورافع بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خاندان والوں کو ایک زمین عطا کی تھی مگر وہ اسے آباد نہ کر سکے اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انھوں نے اسے ۸ ہزار دینار میں فروخت کر دیا۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

۶۔ ابن سیرین کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار میں سے ایک صاحب سُلیط کو ایک زمین عطا فرمائی۔ وہ اس کے انتظام کے لیے اکثر باہر جاتے رہتے اور بعد میں آکر انھیں معلوم ہوتا کہ ان کے پیچھے اتنا اتنا قرآن نازل ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ یہ احکام دیے۔ اس سے ان کی بڑی دل شکنی ہوتی۔ آخر کار انھوں نے ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ زمین میرے اور آپ کے درمیان حائل ہوگئی ہے، آپ اسے مجھ سے واپس لے لیں۔ چنانچہ وہ واپس لے لی گئی۔ بعد میں حضرت زبیرؓ نے اس کے لیے درخواست کی اور آپ نے وہ زمین ان کو دے دی۔ (کتاب الاموال لابی عبید)

۷۔ بلالؓ بن حارث مُزَنی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عقیق کی پوری زمین عطا فرمائی تھی۔ (کتاب الاموال)

۸۔ عَدِیؓ بن حاتم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فراب بن حَیّان عجلی کو یمامہ میں ایک زمین عطا کی تھی۔ (کتاب الاموال)

۹۔ عرب کے مشہور طبیب حارث بن کَلدَہ کے بیٹے نافع نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ بصرہ کے علاقے میں ایک زمین ہے جو نہ تو اراضیِ خراج میں شامل ہے اور نہ مسلمانوں میں سے کسی کا مفاد اس سے وابستہ ہے۔ آپ مجھے وہ عطا کر دیں میں اپنے گھوڑوں کے لیے اس میں چارہ کاشت کروں گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر ابوموسیٰ اشعری کو فرمان لکھا کہ اگر اس زمین کی کیفیت وہی ہے جو نافع نے مجھ سے بیان کی ہے تو وہ ان کو دے دی جائے۔ (کتاب الاموال)

۱۰۔ موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں زبیر بن عوام، سعد بن ابی وقاص، عبداللہ بن مسعود، اسامہ بن زید، خباب بن اَرَتؓ، عمّار بن یاسر اور سعد بن مالک رضی اللہ عنہم کو زمینیں عطا کی تھیں۔ (کتاب الخراج، کتاب الاموال)

۱۱۔ عبداللہ بن حسنؓ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ کی درخواست پر حضرت عمرؓ نے ان کو یَنْبُع کا علاقہ عطا کیا تھا۔ (کنز العمال)

۱۲۔ امام ابویوسف متعدد معتبر حوالوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان سب زمینوں کو خالصہ قرار دیا تھا جو کسریٰ اور آلِ کسریٰ نے چھوڑی تھیں، یا جن کے مالک بھاگ گئے تھے، یا جنگ میں مارے گئے تھے، یا جو دلدل اور سیلاب اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جھاڑیوں کے نیچے آ گئی تھیں۔ پھر جن لوگوں کو بھی آپ زمینیں عطا کرتے تھے انھی اراضی میں سے کرتے تھے۔ (کتاب الخراج)

عطیہ زمین کے بارے میں شرعی ضابطہ

یہ عطائے زمین کا طریقہ محض شاہانہ بخشش وانعام کی نوعیت نہ رکھتا تھا بلکہ اس کے چند قواعد تھے جو ہم کو احادیث وآثار میں ملتے ہیں۔

۱۔ پہلا قاعدہ یہ تھا کہ جو شخص زمین لے کر اس پر کچھ کام نہ کرے اس کا عطیہ منسوخ سمجھا جائے گا۔ اس کی نظیر میں امام ابو یوسف یہ روایت لاتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ مُزَینہ اور جُہَینہ کے لوگوں کو کچھ زمین دی تھی۔ مگر انھوں نے وہ بیکار رکھ چھوڑی۔ پھر کچھ اور لوگ آئے اور انھوں نے اسے آباد کر لیا۔ اس پر مُزَینہ اور جُہَینہ کے لوگ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں دعویٰ لے کر آئے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اگر یہ میرا یا ابوبکرؓ کا عطیہ ہوتا تو میں اسے منسوخ کر دیتا لیکن یہ عطیہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے، اس لیے میں مجبور ہوں۔ البتہ قانون یہی ہے کہ مَنْ كَانَتْ لَهُ اَرْضٌ ثُمَّ تَرَكَهَا ثَلٰثَ سِنِيْنَ فَلَمْ يَعْمُرْهَا فَعَمَرَهَا قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَهُمْ اَحَقُّ بِهَا۔ جس کے پاس کیک زمین ہو اور وہ اس کو تین برس تک بیکار ڈال رکھے اور آباد نہ کرے، پھر کچھ دوسرے لوگ آ کر اسے آباد کر لیں تو وہی اس زمین کے زیادہ حق دار ہیں۔

۲۔ دوسرا قاعدہ یہ تھا کہ جو عطیہ صحیح طور پر استعمال نہ آ رہا ہو اس پر نظر ثانی کی جا سکتی ہے۔ اس کی نظیر میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور یحییٰ بن آدم نے الخراج میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلال بن حارث مُزَنی کو پوری وادئ عقیق دے دی تھی۔ مگر وہ اس کے بڑے حصے کو آباد نہ کر سکے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ زمین تم کو اس لیے نہیں دی تھی کہ تم نہ خود اس کو استعمال کرو اور نہ دوسروں کو استعمال کرنے دو۔ اب تم اس میں سے بس اتنی رکھ لو جسے استعمال کر سکو۔ باقی ہمیں واپس کر دو تا کہ ہم اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔ بلال بن حارث نے اس سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر اصرار کیا۔ آخر کار جتنا رقبہ ان کے زیر استعمال تھا اسے چھوڑ کر باقی پوری زمین آپ نے ان سے واپس لے لی اور دوسرے مسلمانوں میں اس کے قطعات بانٹ دیے۔

۳۔ تیسرا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت صرف اراضی مَوات اور اراضئ خالصہ ہی میں سے زمینیں عطا کرنے کی مجاز ہے۔ یہ حق اس کو نہیں ہے کہ ایک شخص کی زمین چھین کر دوسرے کو دے دیں۔ یا اصل مالکان اراضی کے سر پر خواہ مخواہ ایک شخص کو جاگیردار یا زمین دار بنا کر مسلط کر دے اور اس کو مالکانہ حقوق عطا کر کے اصل مالکوں کی حیثیت اس کے ماتحت کاشت کاروں کی سی بنا دے۔

۴۔ چوتھا قاعدہ یہ تھا کہ حکومت زمینیں انھی لوگوں کو دے گی جنھوں نے فی الحقیقت اجتماعی مفاد کے لیے کوئی قابلِ قدر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خدمات انجام دی ہوں، یا جن سے اب اس نوعیت کی کوئی خدمت متعلق ہو، یا جن کو عطیہ دینا کسی نہ کسی طور پر اجتماعی مفاد کے لیے مناسب ہو۔ رہیں شاہانہ غلط بخشیاں جن سے ڈوم ڈھاڑیوں اور خوشامدی لوگوں کو نوازا گیا ہو، یا وہ عطیے جو ظالموں اور جباروں نے اجتماعی مفاد کے برعکس خدمات انجام دینے والوں کو دیے ہوں، تو وہ کسی طرح جائز عطایا کی تعریف میں نہیں آتے۔

جاگیروں کے معاملے میں صحیح شرعی رویہ

موخرالذکر دونوں اصولوں کی بنیاد اس پورے طرزِ عمل پر قائم ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفا نے برتا تھا۔ اس کی تشریح امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب الخراج میں اس طرح فرماتے ہیں:

امام عادل کو حق ہے کہ جو مال کسی کی مِلک نہ ہو اور جس کا کوئی وارث بھی نہ ہو اس میں سے ان لوگوں کو عطیے اور انعام دے جن کی اسلام میں خدمات ہوں...... جس شخص کو ولاۃ مہدیّین (راہِ راست پر چلنے والے فرماں رواؤں) نے کوئی زمین عطا کی ہو اسے واپس لینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ لیکن جو زمین کسی حاکم نے ایک سے چھینی اور دوسرے کو بخشی تو اس کی حیثیت اس مال کی سی ہے جو ایک سے غصب کیا گیا اور دوسرے کو عطا کر دیا گیا۔

کچھ دور آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:

پس جن جن اقسام کی زمینوں کا ہم نے ذکر کیا ہے کہ امام ان کو عطا کر سکتا ہے۔ ان میں سے جو زمین بھی عراق اور عرب اور الجبال اور دوسرے علاقوں میں ولاۃ مہدیّین نے کسی کو دی ہے، بعد کے خلفا کے لیے حلال نہیں ہے کہ اسے واپس لیں یا ان لوگوں کے قبضے سے نکالیں جن کے پاس ایسی زمینیں اس وقت موجود ہیں، خواہ وہ انھوں نے وراثت میں پائی ہوں یا وارثوں سے خریدی ہوں۔

آخر میں اس بحث کو ختم کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

پس یہ نظیریں ثابت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی زمینیں عطا کی ہیں اور آپ کے خلفا بھی دیتے رہے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس کو بھی زمین دی یہ دیکھ کر دی کہ ایسا کرنے میں صلاح اور بہتری ہے، مثلاً نو مسلم کی تالیفِ قلب، یا زمین کی آبادی۔ اسی طرح خلفائے راشدینؓ نے بھی جس کو زمین دی یہ دیکھ کر دی کہ اس نے اسلام میں کوئی عمدہ خدمت انجام دی ہے، یا وہ اعدائے اسلام کے مقابلے میں کارآمد ہو سکتا ہے، یا یہ کہ ایسا کرنے میں بہتری ہے۔ (کتاب الخراج: ص ۳۲-۳۵)

یہ تصریحات امام ابویوسفؒ نے دراصل عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے اس سوال کے جواب میں فرمائی ہیں کہ جاگیروں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اور ایک فرماں روا کہاں تک جاگیریں عطا اور ضبط کرنے کا مجاز ہے؟ اس کا جو کچھ جواب امام صاحب نے دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے عطائے زمین بجائے خود تو ایک جائز فعل ہے، مگر نہ سب زمین دینے والے یکساں ہیں اور نہ سب لینے والے۔ ایک عطیہ وہ ہے جو عادل، متدیّن، راست رو اور خدا ترس حکمرانوں نے دیا ہو۔ اعتدال کے ساتھ دیا ہو۔ دین اور ملت کے سچے خادموں کو، یا کم از کم مفید اور کارآمد لوگوں کو دیا ہو۔ کسی ایسی غرض کے لیے دیا ہو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جس کا فائدہ بحیثیت مجموعی ملک اور ملت ہی کی طرف پلٹتا ہو اور ایسے مال میں سے دیا ہو جس کے دینے کے وہ مجاز تھے۔ دوسرا عطیہ وہ ہے جو ظالموں اور جباروں اور نفس پرستوں نے دیا ہو۔ بڑے لوگوں کو دیا ہو۔ بری اغراض کے لیے دیا ہو، بے تحاشا دیا ہو اور ایسے مال میں سے دیا ہو جس کے دینے کا اُن کو حق نہ تھا۔ یہ دو مختلف طرح کے عطیے ہیں اور دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے۔ پہلا عطیہ جائز ہے اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو برقرار رکھا جائے۔ دوسرا عطیہ ناجائز ہے اور انصاف چاہتا ہے کہ اسے منسوخ کیا جائے۔ بڑا ظالم ہے وہ جو دونوں طرح کے عطیوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دے۔

حقوقِ ملکیت کا احترام

یہ شواہد و نظائر اس پورے دور کے عمل درآمد کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس میں قرآن کے منشا کی تفسیر خود قرآن کے لانے والے نے اور اس کے براہِ راست شاگردوں نے اپنے اقوال اور اعمال میں کی تھی۔ اس نقشے کو دیکھنے کے بعد کسی شخص کے لیے اس طرح کا کوئی شبہ تک کرنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ زمین کے معاملے میں اسلام کے پیشِ نظر یہ اصول تھا کہ اسے شخصی ملکیتوں سے نکال کر اجتماعی ملکیت بنا دیا جائے۔ اس کے بالکل برعکس اس نقشے سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام کی نگاہ میں زمین سے انتفاع کی فطری اور صحیح صورت صرف یہی ہے کہ وہ افراد کی ملکیت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اتنا ہی نہیں کیا کہ اکثر و بیش تر حالات میں سابق ملکیتوں ہی کو برقرار رکھا، بلکہ جن صورتوں میں آپ نے پچھلی ملکیتیں منسوخ کیں ان میں بھی نئی انفرادی ملکیتیں پیدا کر دیں، اور آیندہ کے لیے غیر مملوکہ اراضی پر نئی ملکیتوں کے قیام کا دروازہ کھول دیا، اور خود سرکاری املاک کو بھی افراد میں تقسیم کر کے انھیں حقوقِ ملکیت عطا فرمائے۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ سابق نظامِ ملکیت کو محض ایک ناگزیر برائی کے طور پر تسلیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ ایک اصول برحق کی حیثیت سے اس کو باقی رکھا گیا اور آیندہ کے لیے اسی کو جاری کیا گیا۔

اس کا مزید ثبوت وہ احکام ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوقِ ملکیت کے احترام کے متعلق دیے ہیں۔ مسلم نے متعدد حوالوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے بہنوئی سعید بن زید رضی اللہ عنہ پر ایک عورت نے مروان بن حَکَم کے زمانے میں دعویٰ دائر کیا کہ انھوں نے میری زمین کا ایک حصہ ہضم کر لیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت سعیدؓ نے مروان کی عدالت میں جو بیان دیا وہ یہ تھا کہ میں اس کی زمین کیسے چھین سکتا تھا جب کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ مَنْ اَخَذَ شِبْرًا مِنَ الْاَرْضِ ظُلْمًا طُوِّقَهٗ اِلٰی سَبْعِ اَرَضِیْنَ۔ جس شخص نے بالشت بھر زمین بھی ازراہِ ظلم لی اس کی گردن میں سات تہوں تک اسی زمین کو طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔

اسی مضمون کی احادیث مسلم نے حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ سے بھی نقل کی ہیں۔ (مسلم، کتاب المساقات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والمزارعہ، باب تحریم الظلم وغصب الارض)

ابوداؤد، نسائی اور ترمذی نے متعدد حوالوں سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ۔ دوسرے کی زمین میں بلا استحقاق آبادکاری کرنے والے کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔

رافع بن خدیج کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ زَرَعَ فِيْ اَرْضِ قَوْمٍ بِغَيْرِ اِذْنِهِمْ فَلَيْسَ لَهُ مِنَ الزَّرْعِ شَيْءٌ وَلَهُ نَفَقَتُهُ۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، ترمذی)
جس نے دوسرے لوگوں کی زمین میں ان کی اجازت کے بغیر کاشت کی وہ اس کھیتی پر تو کوئی حق نہیں رکھتا، البتہ اس کا خرچ اسے دلوادیا جائے گا۔

عروہ بن زبیرؓ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں ایک شخص نے ایک انصاری کی زمین میں کھجور کے درخت لگادیے تھے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا کہ وہ درخت اکھاڑ کر پھینک دیے جائے اور زمین اصل مالک کے حوالے کی جائے۔ (ابوداؤد)

یہ احکام کس چیز کی شہادت دیتے ہیں؟ کیا اس بات کی کہ زمین کی شخصی ملکیت کوئی برائی تھی جسے مٹانا مطلوب تھا مگر ناگزیر سمجھ کر مجبوراً برداشت کیا گیا؟ یا اس بات کی کہ یہ سراسر ایک جائز و معقول حق تھا جس کا احترام افراد اور حکومت دونوں پر فرض کردیا گیا؟

(مسئلہ ملکیتِ زمین: مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۲۷-۵۳)

❀❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

مزارعت کا مسئلہ

شخصی ملکیت کی نفی کرنے والی احادیث کی حقیقت

اب ہمیں اُن احادیث کی تحقیق کرنی چاہیے جن سے یہ گمان ہوتا ہے کہ شریعت زمین کی شخصی ملکیت کو صرف خود کاشتی کی حد تک محدود کر دینا چاہتی ہے اور اسی غرض کے لیے اس نے بٹائی اور نقد لگان کی ممانعت کی ہے۔ اس مسئلے کی پوری تحقیق کے لیے ہم پہلے ان احادیث کو بتمام وکمال نقل کریں گے جن پر اس گمان کی بنا قائم ہے، پھر ان پر تنقید کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس معاملے میں اصل احکام شریعت کیا ہیں۔

احادیث کا تتبع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن روایات میں مزارعت یا کرایہ زمین کی ممانعت وارد ہوئی ہے، یا جن میں یہ حکم آیا ہے کہ آدمی کے پاس خود کاشت سے زائد جتنی زمین ہو اسے دوسروں کو مفت دے دے یا روک رکھے، وہ ۶ صحابیوں سے مروی ہیں: رافعؓ بن خدیج، جابرؓ بن عبداللہؓ، ابوہریرہؓ، ابوسعید خدریؓ، زیدؓ بن ثابت اور ثابتؓ بن ضحاک۔ سہولتِ بیان کی خاطر ہم ان میں سے ہر ایک کی روایات کو الگ الگ نقل کرتے ہیں۔

رافعؓ بن خدیج کی روایات

اس مسئلے نے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ جن صحابی کی ذریعے سے شہرت پائی ہے وہ حضرت رافعؓ بن خدیج ہی ہیں، اس لیے پہلے انھی روایات کو لیجیے۔

(۱) رافع کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زراعت کے لیے زمینیں لیتے تھے اور تہائی، چوتھائی، اور ایک خاص مقدار غلہ کرایہ کے طور پر مقرر کرتے تھے۔ ایک روز میرے چچاؤں میں سے ایک آئے اور انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لیے نافع تھا مگر ہمارے لیے اللہ اور رسول کی تابعداری زیادہ نافع ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نَهَانَا اَنْ نُحَاقِلَ بِالْاَرْضِ فَنكرِيُهَا عَلَى الثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَالطَّعَامِ الْمُسَمّٰى وَاَمَرَ رَبَّ الْاَرْضِ اَنْ يَزْرَعَهَا اَوْيُزْرِعَهَا وَكَرِهَ كِرَائَهَا وَمَا سِوٰى ذَالِكَ۔ (مسلم)

آپؐ نے ہم کو اس بات سے منع کر دیا کہ ہم زمینوں میں مزارعت کا معاملہ کریں اور تہائی اور چوتھائی اور مقرر مقدار غلہ کے عوض انہیں کرایہ پر دیں اور آپ نے حکم دیا ہے کہ مالکِ زمین یا تو خود کاشت کرے یا دوسرے کو کاشت کرنے کے لیے دے دے اور آپ نے زمین کے کرایہ کو اور اس کے سوا دوسری صورتوں کو ناپسند فرمایا ہے۔

(۲) ایک اور روایت میں حضرت رافعؓ اپنے چچا کا نام ظُہیر بن رافع بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم لوگ اپنی کھیتی باڑی کا معاملہ کس طرح کرتے ہوں؟ انھوں نے مزارعت کی تفصیل بتائی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا:

فَلَا تَفْعَلُوا، اِزْرَعُوْهَا اَوْ اَزْرِعُوْهَا اَوْ اَمْسِكُوْهَا۔ (مسلم، بخاری، ابن ماجہ)

ایسا نہ کیا کرو، یا خود زراعت کرو، یا دوسروں کو زراعت کے لیے دے دو، یا اپنی زمینوں کو روک رکھو۔

(۳) ایک اور روایت میں حضرت رافعؓ خود اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی کھیتی کو پانی دے رہے تھے۔ وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا۔ آپ نے پوچھا یہ کس کی کھیتی ہے اور کسی کی زمین ہے؟ انھوں نے عرض کیا:

زَرْعِي بِبَذْرِيْ وَعَمَلِيْ لِي الشَّطْرُ وَلِبَنِيْ فُلَانِ الشَّطْرُ۔

میری کھیتی ہے اس میں تخم اور عمل میرا ہے۔ آدھی پیداوار میری ہوگی اور آدھی بنی فلاں کی۔

اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَرْبَيْتُمَا، فَرُدَّ الْاَرْضَ عَلٰى اَهْلِهَا وَخُذْ نَفَقَتَكَ۔ (ابوداؤد)

تم نے سودی معاملہ کیا۔ زمین اس کے مالکوں کو واپس کر دو اور اپنا خرچ ان سے وصول کر لو۔[1]

۴۔ مجاہد کی روایت ہے کہ رافعؓ بن خدیج نے کہا:

نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ اَمْرٍ كَانَ لَنَا نَافِعًا اِذَا كَانَتْ لِاَحَدِنَا اَرْضٌ اَنْ يُعْطِيَهَا بِبَعْضِ خِرَاجِهَا وَبِدَرَاهِمَ وَقَالَ اِذَا كَانَتْ لِاَحَدِكُمْ اَرْضٌ فَلْيَمْنَحْهَا اَخَاهُ اَوْ لِيَزْرَعْهَا۔ (ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا جو ہمارے لیے نافع تھا، یعنی اس بات سے کہ اگر ہم میں سے کسی کے پاس کوئی زمین ہو تو وہ اسے اس کی پیداوار اور نقدی کے عوض زراعت کے لیے کسی دوسرے شخص کو دے، اور آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی کے پاس کوئی زمین ہو تو یا وہ اپنے کسی بھائی کو یوں ہی دے دے یا خود کاشت کرے۔

۵۔ سعید بن مسیّب نے رافعؓ بن خدیج سے یہ روایت نقل کی ہے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ وَقَالَ اِنَّمَا يَزْرَعُ ثَلٰثَةٌ، رَجُلٌ لَهُ اَرْضٌ فَيَزْرَعُهَا، وَرَجُلٌ مُنِحَ اَرْضًا فَهُوَ يَزْرَعُ مَامُنِحَ، وَرَجُلٌ اسْتَكْرٰى اَرْضًا بِذَهَبٍ اَوْفِضَّةٍ۔ (ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی)

[1] اس حدیث کے سلسلۂ سند میں ایک راوی بکر بن عامر البجلی ہے جس کے معتبر ہونے میں کلام کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو نیل الاوطار۔ ج ۵ ص ۲۳۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ (بٹائی پر کاشت کرانے) اور مزابنہ (درختوں پر کھجور کی بیع) سے منع فرمایا اور فرمایا کہ زراعت تین ہی آدمی کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جس کی اپنی زمین ہو اور وہ اس میں خود کاشت کرے۔ دوسرا وہ جسے کوئی زمین یوں ہی دے دی جائے اور وہ اس میں کھیتی باڑی کرے۔ تیسرا وہ جو سونے اور چاندی کے عوض زمین کرائے پر لے۔ [ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی]

مگر نسائی نے ایک دوسری روایت کے ذریعے سے یہ بتایا ہے کہ دراصل اس حدیث کا صرف پہلا ٹکڑا نَهَى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمایا ہوا ہے۔ باقی کلام سعید بن مسیب کا اپنا تشریحی کلام ہے جو بعد میں اصل حدیث کے ساتھ خلط ملط ہو گیا۔

۶۔ سلیمان بن یسار نے رافعؓ بن خدیج سے جو روایت نقل کی ہے اس میں وہ اپنے کسی چچا کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے آ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلَا يُكْرِيهَا بِطَعَامٍ مُسَمًّى۔

جس کے پاس کوئی زمین ہو وہ غلے کی ایک مقدار ٹھہرا کر اسے کرائے پر نہ دے۔

اور دوسری روایت کی رُو سے ان کے چچا نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

مَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا أَوْ لِيُزْرِعْهَا أَخَاهُ وَلَا يُكَارِيهَا بِثُلُثٍ وَلَا بِرُبْعٍ وَلَا بِطَعَامٍ مُسَمًّى۔ (ابن ماجہ، ابوداؤد)

جس کے پاس کوئی زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود زراعت کرے یا اپنے کسی بھائی کو زراعت کے لیے دے دے، مگر کرائے پر نہ دے، نہ تہائی پیداوار پر، نہ چوتھائی پر اور نہ ایک مقرر مقدار پر۔ [ابن ماجہ، ابوداؤد، نسائی]

۷۔ رافعؓ بن خدیج کے صاحب زادے اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ابو رافع نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے آ کر ہم لوگوں کو بتایا کہ:

نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ أَمْرٍ كَانَ يَرْفُقُ بِنَا، وَطَاعَةُ اللّٰهِ وَطَاعَةُ رَسُوْلِهِ أَرْفَقُ، نَهَانَا أَنْ يَّزْرَعَ أَحَدُنَا إِلَّا أَرْضًا يَمْلِكُ رَقَبَتَهَا أَوْ مَنِيْحَةً يَمْنَحُهَا رَجُلٌ۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک ایسے کام سے روک دیا ہے جو ہمارے لیے فائدہ مند تھا، مگر اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت ہمارے لیے زیادہ فائدہ مند ہے۔ آپ نے ہمیں اس بات سے منع فرما دیا کہ کوئی شخص کسی زمین میں زراعت کرے الا یہ کہ یا تو وہ خود اس زمین کا مالک ہو، یا کوئی دوسرا شخص اس کو بلا معاوضہ زراعت کے لیے دے دے۔ [ابوداؤد]

۸۔ ابنِ عمرؓ کی روایت ہے کہ ہم اپنی زمین کرائے پر دیا کرتے تھے، پھر جب ہم نے رافعؓ بن خدیج کی حدیث سنی تو یہ کام چھوڑ دیا۔ دوسری روایت میں ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ ہم مخابرہ (یعنی بٹائی پر کاشت کا معاملہ) کرتے تھے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ پھر رافع نے دعویٰ کیا کہ اللہ کے نبی نے اس سے منع کیا تھا۔ لہٰذا ان کے قول کی وجہ سے ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ (مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جابر بن عبداللہ کی روایات

رافع بن خدیج کے بعد اس مضمون کے احکام کا دوسرا بڑا ماخذ جابرؓ بن عبداللہ کی روایات ہیں۔ ان میں حسب ذیل احادیث وارد ہوئی ہیں:

۱۔ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ كِرَاءِ الْاَرْضِ۔ (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے کرائے سے منع فرمادیا۔

۲۔ نَهٰى عَنِ الْمُخَابَرَةِ۔ (مسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ (بٹائی پر کاشت کرانے) سے منع فرمادیا۔

۳۔ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ تُؤْخَذَ الْاَرْضُ اَجْرًا اَوْ حَظًّا۔ (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ زمین اجرت پر یا پیداوار کے حصے پر کاشت کے لیے لی جائے۔

۴۔ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا فَاِنْ لَّمْ يَزْرَعْهَا فَلْيُزْرِعْهَا اَخَاهُ۔

جس کے پاس کوئی زمین ہو اسے چاہیے کہ خود کاشت کرے، اور اگر خود نہ کرتا ہو تو اپنے کسی بھائی کو کاشت کے لیے دے دے۔

یہ حدیث مختلف روایتوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ آئی ہے۔ ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

مَنْ كَانَتْ لَهٗ فَضْلُ اَرْضٍ فَلْيَزْرَعْهَا اَوْلِيَمْنَحْهَا اَخَاهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهٗ۔

جس کے پاس فاضل زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو دے دے، لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو پھر اپنی زمین کو روک رکھے۔

دوسری روایت میں ہے:

فَلْيَهِبْهَا اَوْ لِيُعِرْهَا۔

اسے چاہیے کہ ہبہ کردے یا عاریۃً دے دے۔

ایک اور روایت میں ہے:

وَلَا يُوَاجِرْهَا اِيَّاهُ۔

اس کو اجرت پر نہ دے۔

ایک اور روایت میں ہے:

وَلَا يُكْرِيْهَا۔ (مسلم، بخاری، ابن ماجہ)

اس کو کرائے پر نہ دے۔

۵۔ نَهٰى عَنْ بَيْعِ اَرْضِ الْبَيْضَاءِ سَنَتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالی زمین کو دو تین سال کے لیے بیچنے سے منع فرمایا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری روایت میں ہے:

عَنْ بَيْعِ السِّنِينَ

چند سال کے لیے بیع کرنے سے۔

عَنْ بَيْعِ ثَمَرِ سِنِينَ۔ (مسلم)

چند سال کے ثمرہ کی بیع سے

۶۔سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْهٰى عَنِ الْمُزَابَنَةِ وَالْحُقُوْلِ۔

جابرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزابنہ اور حقول سے منع کرتے ہوئے سنا۔

پھر حضرت جابرؓ نے خود ہی مزابنہ، کی تشریح یہ کی کہ اس سے مراد کھجوروں کے بدلے ثمرہ بیچنا ہے، اور ''حقول'' کی تشریح میں کہا کہ اس سے مراد زمین کو کرائے پر دینا ہے۔(مسلم)

۷۔سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَّمْ يَذَرِ الْمُخَابَرَةَ فَلْيُؤْذَنْ بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔

(ابوداؤد)

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص مخابرہ نہ چھوڑے اس کو اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

مزید تائیدی روایات

باقی چار صحابیوں کی روایات جو مذکورہ بالا حدیث کی مزید تصدیق و تائید کرتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

حضرت ابو ہریرہؓ سے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَتْ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا اَوْ لِيَمْنَحْهَا اَخَاهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُمْسِكْ اَرْضَهٗ۔

(بخاری، مسلم، ابن ماجہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو وہ یا تو خود کاشت کرے، یا اپنے بھائی کو بلا معاوضہ دے دے لیکن اگر وہ نہ دینا چاہے تو اپنی زمین کو روک رکھے۔

نَهٰى عَنِ الْمُحَاقَلَةِ وَالْمُزَابَنَةِ۔ (مسلم، ترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ اور مزابنہ سے منع فرمایا۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے

نَهٰى عَنِ الْمُزَابَنَةِ وَالْمُحَاقَلَةِ، وَالْمُزَابَنَةُ اِشْتِرَاهُ الثَّمَرِ فِيْ رُؤُسِ النَّخْلِ، وَالْمُحَاقَلَةُ كِرَءُ الْاَرْضِ۔ (مسلم، ابن ماجہ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محاقلہ سے منع فرمایا۔ مزابنہ سے مراد درختوں پر کھجور کے ثمرہ کی خریداری ہے۔ اور محاقلہ سے مراد زمین کا کرایہ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ثابتؓ بن ضحاک سے:

نَهٰى عَنِ الْمُزَارَعَةِ۔ (مسلم)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت سے منع فرما دیا۔

زیدؓ بن ثابت سے:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْمُخَابَرَةِ، قُلْتُ وَمَا الْمُخَابَرَةُ؟ قَالَ اَنْ تَاْخُذَ الْاَرْضَ بِنِصْفٍ اَوْ ثُلُثٍ اَوْ رُبُعٍ۔ (ابوداؤد)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مخابرہ سے منع فرمایا۔ ثابت بن حجاج نے حضرت زید بن ثابت سے پوچھا کہ مخابرہ کے کیا معنی ہیں؟ حضرت زید نے جواب دیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم آدھی یا تہائی یا چوتھائی پیداوار کے عوض زمین لو۔

(مسئلہ ملکیت زمین: ص ۵۴ تا ۶۳)

تنقید بلحاظ نقل و روایت

اوپر ہم نے وہ تمام روایات لفظ بلفظ نقل کر دی ہیں جن پر اس مسئلے کا مدار ہے کہ اسلام میں بٹائی اور نقد لگان کی ممانعت کی گئی ہے اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین عطا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ غالباً اس سلسلے کی کوئی قابل ذکر اور لائق اعتنا روایت ہم سے چھوٹ نہیں گئی ہے۔ آیئے اب ہم ذرا ان پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آیا فی الواقع اس معاملے میں اسلام کا مسلک وہی ہے جو ان کثیر التعداد روایات سے ظاہر ہوتا ہے؟

ہر شخص جانتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک مفتی اور معلم ہی نہ تھے بلکہ ملک کے حاکم بھی تھے اور عملاً پورا نظم و نسق آپ کے ہاتھ میں تھا۔

ہر شخص یہ بھی جانتا ہے کہ زمین کا معاملہ دو چار یا دس پانچ افراد کی نجی اور شخصی زندگی کا کوئی اتفاقی و ہنگامی معاملہ نہیں ہے کہ اس کا حکم بس چند آدمیوں کے کان میں چپکے سے کہہ دیا جاتا۔ یہ تو ایک پوری سلطنت کے نظم و نسق سے تعلق رکھنے والی چیز ہے جس سے لاکھوں آدمیوں کی معیشت مستقل طور پر متاثر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں جو کچھ پالیسی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کی تھی وہ آپ کے زمانے میں اور آپ کے خلفا کے زمانے میں ایک نہایت مشہور و معروف بات ہونی چاہیے تھی۔

پھر کوئی ایسا شخص جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت اور آپؐ کے خلفائے راشدین کی زندگی اور آپؐ کے صحابہ کرام کے حالات سے کچھ بھی واقفیت رکھتا ہو یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ان لوگوں میں سے تھے جو زبان سے ایک چیز کو غلط کہیں اور اسے رائج رہنے دیں اور زبان سے ایک دوسرے طریقے کو برحق کہیں اور عملاً اس کو جاری نہ کریں۔ یا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک طریقے کو روکنا اور دوسرے طریقے کو رائج کرنا چاہتے ہوں اور صحابہ کرامؓ مان کر نہ دیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یا یہ کہ خلفائے راشدین کو یہ معلوم ہو چکا ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی رواج کا انسداد کر کے ایک دوسرا اصلاحی طریقہ جاری کرنا چاہتے تھے اور پھر وہ اپنے تمام زمانہ خلافت میں آپؐ کے منشا کو عملی جامہ پہنانے سے باز رہ جائیں۔

یہ تین حقیقتیں ایسی ظاہر و باہر ہیں جن سے کسی صاحبِ عقل و فکر اور صاحبِ علم و نظر آدمی کے لیے مجالِ انکار نہیں ہے۔ اب اگر آپ یہ سنیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر امیر معاویہ کی خلافت کے وسط تک، یعنی تقریباً پچاس سال تک مذکورہ بالا پانچ چھ اصحاب کے سوا کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بٹائی اور لگان پر زمین کاشت کے لیے دینے کو منع فرمایا ہے، اور یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اور تمام اکابر صحابہ اور آپ سے قریب ترین تعلق رکھنے والے تمام بڑے بڑے گھرانے بٹائی پر زمینیں دیتے رہے اور یہ کہ خلافتِ راشدہ کے پورے عہد میں یہی طریقہ رائج رہا، تو کیا آپ حیرت سے ھَک دک نہ رہ جائیں گے؟ حقیقت میں یہ ہے نہایت حیرت انگیز بات، مگر واقعہ یہی ہے۔ ہم ان روایات کو یہاں نمبروار نقل کرتے ہیں جن سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

(۱) نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمینیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپؐ کے بعد حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے زمانے میں برابر کرائے پر دیتے رہے۔ امیر معاویہؓ کی خلافت کے ابتدائی زمانے میں بھی ان کا یہی طریقہ رہا۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ کی خلافت کا آخری زمانہ آیا (یعنی تقریباً ۵۰ھ یا اس کے بعد کا زمانہ) تو ان کو یہ خبر پہنچی کہ رافعؓ بن خدیج نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس فعل کی ممانعت کا حکم روایت کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ رافع بن خدیج سے ملنے گئے اور میں ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے رافع سے پوچھا کہ یہ کیا روایت ہے جو تم بیان کرتے ہو؟ رافع نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زمینوں کے کرائے سے منع فرماتے تھے۔ اس پر ابن عمرؓ نے زمینیں کرائے پر دینی بند کر دیں اور جب کبھی ان سے ان کے متعلق پوچھا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ رافع بن خدیج کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرما دیا تھا۔

اسی سے ملتی جلتی روایت خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے حضرت سالمؒ روایت کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت عبداللہ کے سوال پر حضرت رافع نے ان کو جواب دیا کہ میں نے اپنے دو چچاؤں کو، جو بدری صحابی تھے، گھر والوں سے یہ کہتے سنا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے کرائے سے منع کیا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ نے فرمایا:

لَقَدْ كُنْتُ أَعْلَمُ فِي عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ الْأَرْضَ تُكْرٰى.

مجھے معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں زمینیں کرائے پر دی جاتی تھیں۔

مگر حضرت عبداللہؓ نے اس ڈر سے کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا ہو اور مجھے نہ معلوم ہوا ہو، اپنی زمینیں کرائے پر دینی بند کر دیں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عبداللہ بن عمرؓ وہ شخص ہیں جن کی حقیقی بہن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں تھیں۔جن کے والد حضرت عمرؓ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے معتمد ترین وزیر رہے اور پھر خود دس سال تک اسلامی حکومت کے خلیفہ رہے۔کیا یہ ممکن تھا کہ ان کو پورے زمانہ خلافتِ راشدہ میں یہ خبر نہ ہوتی کہ زمینوں کے بارے میں اسلام کا قانون کیا ہے اور کیا یہ ممکن تھا کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں ان کا اپنا بیٹا خود ان کی طرف سے ان کے گھر کی زمین داری کا انتظام ایسے طریقے پر کرتا رہتا جو اسلامی قانون میں ممنوع تھا؟ [1]

(۲) ابن عمرؓ ہی کی روایت ہے، اور عبداللہ بن عباس اور انس بن مالک کی روایات اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر حملہ کیا۔اس کا کچھ حصہ صلحاً فتح ہوا اور کچھ بزورِ شمشیر مغلوب ہوا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آدھے علاقے کو حکومت کی ضروریات کے لیے مخصوص فرما دیا اور آدھے علاقے کو اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم کر کے ان پندرہ سو مجاہدین پر بانٹ دیا جو غزوۂ خیبر میں شریک تھے (یعنی بارہ سو پیادوں کا اکہرا حصہ اور تین سو سواروں کا دوہرا حصہ)۔پھر آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ یہودی باشندوں کو علاقہ مفتوحہ سے نکال دیں۔مگر یہودیوں نے آکر عرض کیا کہ آپ ہمیں یہاں رہنے دیں، ہم آپ کی طرف سے یہاں کاشت کریں گے، آدھی پیداوار آپ لے لیجیے گا اور آدھی ہم لے لیں گے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ آپؐ کے پاس کام کرنے والے آدمیوں کی کمی ہے، ان کی بات مان لی، اور ان سے فرمایا کہ ہم جب تک چاہیں گے تم کو رکھیں گے اور جب چاہیں گے تمھیں یہاں سے نکال دیں گے۔چنانچہ ان شرائط پر آپؐ نے ان سے معاملہ طے کر لیا۔وہ کاشت کاروں کی حیثیت سے خیبر میں کام کرتے تھے۔آدھی زمین کی مالک حکومت تھی اور بقیہ نصف کے مالک وہ پندرہ سو حصہ دار تھے جن پر اٹھارہ سو قطعات تقسیم کیے گئے تھے۔بٹائی کے معاہدے کی رو سے جو نصف پیداوار وہاں سے آتی تھی اس کو حکومت اور

---

[1] یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو یہ اطمینان تھا کہ مزارعت اور کرایہ زمین ناجائز نہیں ہے تو پھر رافع بن خدیج کی روایت سن کر انھوں نے یہ طریقہ کیوں چھوڑ دیا؟ یہ بظاہر ایک شبہ ڈالنے والی بات ہے۔لیکن جو شخص حضرت ابن عمرؓ کی طبیعت اور ان کے مزاج سے واقف ہو وہ اس طرح کی کسی غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا۔واقعہ یہ ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں احتیاط، ورع کی حد سے گزر کر تشدد تک پہنچ گئی تھی اور آخر عمر میں تو اس نے ایک حد تک وہم کی سی صورت اختیار کر لی تھی۔مثلاً وہ وضو میں اتنا مبالغہ کرتے تھے کہ آنکھوں کے اندرونی حصوں کو بھی دھویا کرتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار اسی کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔اپنے بچوں کو اگر پیار کر لیتے تو پھر کلی کے بغیر نماز نہ پڑھتے۔اگر دوران نماز امام کے ساتھ آکر شامل ہوتے تو بعد میں صرف چھوٹی ہوئی نماز ادا نہ کرتے بلکہ سجدۂ سہو بھی کرتے۔(تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو: زاد المعاد، ج ۱، ص ۲۲۶) اس شدتِ احتیاط کی بنا پر اگر انھوں نے رافع بن خدیج کی حدیث سن کر اپنی زمینیں کرائے پر دینی بند کر دیں تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ انھیں عمل کی صحت میں واقعی کوئی شک ہو گیا تھا جسے وہ پچاس برس تک زمانہ نبوت وخلافت راشدہ میں کرتے رہے اور جس پر اکابر صحابہ وخلفائے راشدین کو اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عمل کرتے دیکھ چکے تھے۔اگر ان کے دل میں مزارعت کے جواز کے متعلق ذرہ برابر بھی کوئی شک ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کی زبان سے یہ شکایت آمیز فقرہ نکلتا (جیسا کہ مسلم کی ایک روایت ہے) کہ لَقَدْ مَنَعَنَا رَافِعٌ نَفْعَ اَرْضِنَا۔ رافع نے ہم کو ہماری زمین کے نفع سے محروم کر دیا۔
کیا کوئی شخص یہ توقع کر سکتا ہے کہ ابن عمر کو اگر کسی درجہ میں بھی یہ گمان ہوتا کہ یہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے تو ان کی زبان اس پر حرف شکایت سے آلودہ ہو سکتی تھی؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا حصہ بھی عام حصہ داروں کے ساتھ تھا۔ چنانچہ آپؐ اس میں سے ہر سال ایک خاص مقدار میں غلہ اور کھجوریں اپنی ازواج مطہرات کو برابر برابر دیا کرتے تھے۔ یہ بندوبست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر حیات تک جاری رہا۔ اسی پر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں عمل کیا۔ اسی پر حضرت عمرؓ اپنے ابتدائی زمانے میں کاربند رہے۔ پھر جب یہودیوں نے خیبر میں پیہم شرارتیں کیں اور حضرت عمرؓ کی رائے یہ ہوئی کہ معاہدے کے مطابق ان کو وہاں سے نکال دیا جائے، تو آپ نے اعلان کیا کہ خیبر میں جس جس کا حصہ ہے وہ جا کر اپنی زمین سنبھال لے۔ ازواج مطہرات کے سامنے حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ آپ میں سے جو جو پسند کریں وہ اتنی زمین لے لیں جس کی پیداوار اسی قدر ہو جس قدر غلہ اور ثمرہ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ملتا آرہا ہے، اور جو چاہیں اپنے حصہ کی زمین حکومت کے انتظام میں رہنے دیں اور اتنا ہی غلہ اور ثمرہ حکومت سے لیتی رہیں۔ اس تجویز کے مطابق بعض ازواجِ مطہرات نے غلہ اور ثمرہ پسند کیا اور حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما نے زمین لے لی۔[1] اس کے بعد حضرت عمرؓ نے یہودیوں کو خیبر سے منتقل کر کے تیما اور اریحا میں بسا دیا۔ (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

یہ عہد نبوت وخلافت کے مشہور ترین واقعات میں سے ہے اور اس کی صحت میں کسی شک کی گنجایش نہیں ہے۔ اس میں صریح طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دی ہے، اپنی طرف سے بھی، حکومت کی طرف سے بھی، اور ان پندرہ سو افراد کی طرف سے بھی جن کا حصہ خیبر میں تھا۔ اس طریقے پر آپؐ اپنے آخری لمحۂ حیات تک عامل رہے اور آپؐ کے بعد شیخین کا عمل بھی اسی پر رہا۔ کیا اس کے بعد بھی کسی کو یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اسلامی قانون میں بٹائی پر زمین کاشت دینے کے لیے ممنوع تھا؟

اس کے جواب میں جو لوگ کہتے ہیں کہ خیبر کا معاملہ بٹائی کا نہیں بلکہ خراج کا معاملہ تھا، ان کی بات صحیح نہیں ہے۔ خیبر کی آدھی زمین جو حکومت کی ملک قرار دی گئی تھی اس کی بٹائی تو بے شک خراج تھی۔ لیکن جو بقیہ نصف اراضی مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دی گئی تھیں ان کی بٹائی کو ''خراج'' کا نام کیسے دیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ''خیبر کے یہودی باقاعدہ ذمی رعایا نہ تھے، کیونکہ ان پر جزیہ نہیں لگایا گیا تھا، اس لیے مسلمان مجاز تھے کہ ان سے جو چاہتے لیتے''، ان کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید میں جزیہ کے احکام غزوۂ خیبر کے وقت نازل ہی نہ ہوئے تھے۔ پھر بھلا احکام جزیہ کی غیر موجودگی میں جزیہ نہ عائد کیے جانے پر کسی قانونی استدلال کی بنا کیسے رکھی جاسکتی ہے؟ اہلِ خیبر کا ذمہ ہونا تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت نے ان کو ایک باضابطہ قرارداد کے مطابق اپنے ملک میں آباد رہنے دیا، ان پر خراج عائد کیا اور ان پر دیوانی وفوجداری قوانین اسی طرح نافذ کیے جس طرح وہ مسلمان رعایا پر نافذ

---

[1] واضح رہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث نہیں تھی جو آپ کی ازواج میں تقسیم ہوئی، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو چونکہ تمام امت کی مائیں قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپؐ کے بعد نکاح سے روک دیا تھا اس لیے ان کا نفقہ امت پر واجب تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیے جا رہے تھے۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ جب خیبر کی قرارداد ہو چکی اور مسلمان یہودیوں کی بستیوں میں چلنے پھرنے لگے تو بعض مسلمان یہودیوں پر کچھ دست درازی کر بیٹھے۔ اس کی شکایت یہودیوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی۔ اس پر آپؐ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ "اللہ نے تمھارے لیے یہ حلال نہیں کیا کہ اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت گھسو اور ان کے بال بچوں کو مارو پیٹو اور ان کے پھل کھا جاؤ، حالانکہ جو کچھ ان پر واجب تھا وہ انھوں نے تم کو ادا کر دیا ہے۔"[1] کیا یہ اہلِ خیبر کے ذمی ہونے کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ اسلامی قانون فوجداری میں قسامت کے قاعدہ کا تو مآخذ ہی وہ واقعہ ہے جو خیبر میں ایک مسلمان کے خفیہ قتل کا پیش آیا تھا۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہودیوں کو قانون کی نگاہ میں مسلمانوں کے برابر حیثیت حاصل تھی۔ اگر کہا جائے کہ جب یہ بات تھی تو آیت جزیہ کے نزول کے بعد ان پر جزیہ کیوں نہ لگایا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ نزولِ آیت سے پہلے ایک معاہدہ طے ہو چکا تھا ان پر ایک نئی شرط کا اضافہ کر دینا کیونکر جائز ہو سکتا تھا۔ اگر کہا جائے کہ جب وہ ذمی تھے تو پھر ان کو خیبر سے نکالا کیوں گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا اخراج اس قرارداد کے مطابق تھا جو انھیں ذمی بناتے وقت ان سے طے ہو چکی تھی۔ نیز یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو صرف حجاز سے نکالا تھا، سلطنت سے نہیں نکالا تھا۔ آپ نے سلطنت کے ایک حصے سے ان کو منتقل کیا اور دوسرے حصے (یعنی تیما اور اَریحا) میں لے جا کر بسا دیا۔[2]

پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ معاملہ مزارعت کا نہیں تھا کیونکہ اس میں مدت کا تعین نہ ہوا تھا، ان کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ ان سے طے کیا تھا اس میں منجملہ شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ: نُقِرُّكُم بِهَا عَلٰى ذَالِكَ مَاشِئْنَا۔ ہم اس قرارداد پر جب تک چاہیں گے تم کو یہاں رکھیں گے۔

اس میں مدت کا تعین بلحاظ وقت نہیں بلکہ بلحاظ مشیّتِ مالک کیا گیا تھا اور یہ ان مخصوص حالات کی وجہ سے تھا جن میں اس وقت یہودیوں سے معاملہ طے ہوا تھا۔ اتنی سی بات کی وجہ سے یہ فیصلہ کر دینا درست نہیں ہے کہ خیبر کا معاملہ سرے سے مزارعت کا معاملہ ہی نہ تھا، حالانکہ اپنی دوسری تفصیلات میں وہ صریحاً ایک مزارعت کا معاملہ نظر آتا ہے۔[3]

(۳) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے (اور خیال رہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ وہی ہیں جن سے اوپر بٹائی اور لگان کی ممانعت اور خود کاشت کرنے یا مفت زمین دینے کی ہدایت نقل کی جا چکی ہے) کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو انصار نے آکر عرض کیا: اَقْسِمْ بَيْنَنَا وَبَيْنَا اِخْوَانِنَا النَّخْلَ۔ آپ ہمارے نخلستانوں کو ہمارے درمیان اور ہمارے مہاجر

---

[1] ابو داؤد، کتاب الخراج والامارۃ والفیء، باب فی تعشیر اہل الذمہ، الخ، ج ۳ ص ۴۳۵-۴۳۶، حدیث ۳۰۹۰۔
[2] اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے علامہ ابن قیم کی زاد المعاد جلد دوم، میں حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں۔ ص ۹، ۱۰۸، ۱۱۱، ۲۰۱، ۲۰۶۔
[3] واضح رہے کہ حنفیہ کے نزدیک مزارعت کے لیے مدت کا تعین ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ لسان الحکام میں ہے: وَفِي النَّوَازِلِ عَنْ مُحَمَّدِبْنِ سَلَمَةَ اَلْمُزَارَعَةُ مِنْ غَيْرِبَيَانِ الْمُدَّةِ جَائِزَةٌ اَيْضًا (ص ۱۹۵) اور اَلْفِقْهُ عَلَى الْمَذَاهِبِ الْاَرْبَعَةِ میں مذہب حنفی کے احکام بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: وَيَصِحُّ عَقْدُ الْمُزَارَعَةِ بِدُوْنِ بَيَانِ الْمُدَّةِ اِذَا كَانَ وَقْتُ الزَّرْعِ مَعْرُوْفًا۔ (ج ۳، ص ۹) [اور عقد مزارعت بیان مدت کے بغیر بھی صحیح ہے، بشرطیکہ زراعت کا وقت معلوم ہو۔]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں۔

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انصار نے مہاجرین سے کہا: تکفونا العَمَلَ وَنُشْرِ کُکُم فِي الثَّمَرَةِ۔ آپ لوگ ہماری طرف سے ان نخلستانوں میں کام کریں اور ہم آپ کو ثمرہ میں شریک کریں گے۔ اس پر مہاجرین نے کہا: سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا۔ یہ بات بخوشی منظور ہے۔ (بخاری)

(۴) قیس بن مسلم حضرت ابوجعفر (یعنی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ مدینے میں مہاجرین کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو تہائی یا چوتھائی حصہ پیداوار کے عوض کاشت نہ کرتا ہو۔ امام بخاری اس روایت کو نقل کرنے کے بعد پھر اس کی تائید میں مزید نظائر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بٹائی پر معاملہ حضرت علیؓ نے کیا ہے، سعد بن مالک اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کیا ہے، عمر بن عبدالعزیز اور قاسم اور عروہ نے کیا ہے[۱]، آلِ ابوبکرؓ، آل علیؓ، آلِ عمرؓ[۲] سب بٹائی پر کاشت کراتے رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ لوگوں سے اس طرح معاملہ کیا کرتے تھے کہ اگر "عمرؓ اپنے پاس سے بیج دے گا تو آدھی پیدوار لے گا اور اگر کاشت کار اپنا بیج لائیں تو ان کا حصہ اتنا ہوگا۔[۳] (بخاری: باب المزارعۃ بالشطر ونحوہ)

(۵) حضرت ابوجعفر (امام محمد باقر) کی ایک اور روایت ہے جس میں وہ تصریح کرتے ہیں کہ كَانَ اَبُوبَكْرٍ يُعْطِي الْاَرْضَ عَلَى الشَّطْرِ۔ حضرت ابوبکر اپنی زمین نصف نصف کی بٹائی پر زراعت کے لیے دیتے تھے۔ (طحاوی)

(۶) ابن ابی شیبہ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ لَا بَاْسَ بِالْمُزَارَعَةِ بِالنِّصْفِ۔ نصف کی بٹائی پر زمین کاشت کے لیے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (کنز العمال)

(۷) طاؤس کی روایت ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اپنی زمین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر زراعت کے لیے دیتے رہے، (ابن ماجہ)۔ اس حدیث میں غلطی صرف اتنی ہے کہ طاؤس نے حضرت عثمان کے عہد کا بھی ذکر کر دیا ہے، حالانکہ حضرت معاذ بن جبلؓ کا انتقال حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ لیکن محض اس غلطی کی بنا پر طاؤس جیسے شخص کی پوری روایت کو غلط نہیں کہا جا سکتا۔[۴] خصوصاً

۱۔ قاسم بن ابی بکر کے اثر کو پوری سند کے ساتھ عبدالرزاق نے اور باقی پانچوں بزرگوں کے آثار کو سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ نے بیان کیا ہے۔

۲۔ ان تینوں خاندانوں میں مزارعت کا رواج ہونے کی پوری سند عبدالرزاق اور ابن ابی شیبہ نے دی ہے۔

۳۔ حضرت عمر کے اس عمل کو پوری سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ اور بیہقی نے بیان کیا ہے۔

۴۔ طاؤس کے متعلق محدثین بالعموم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت معاذؓ کے حالات سے وہ خوب واقف تھے اور ان کے بارے میں ان کی روایات مستند ہیں اگرچہ وہ ان سے ملے نہیں تھے۔ چنانچہ امام شافعی لکھتے ہیں: طَاؤُسُ عَالِمٌ بِاَمْرِ مُعَاذٍ وَاِنْ لَّمْ يَلْقِهِ لِكَثْرَةِ مَنْ لَقِيَهُ مِمَّنْ اَدْرَكَ مُعَاذًا۔ طاؤس معاذؓ کو خوب جانتے ہیں اگرچہ وہ ان سے ملے نہیں ہیں کیوں کہ معاذؓ کے بہت سے ملنے والوں سے ان کی ملاقات ہوئی ہے اور ابن حجر اس قول کو نقل کرنے کے بعد اس پر اضافہ کرتے ہیں کہ وَهٰذَا مِمَّا لَا اَعْلَمُ عَنْ اَحَدٍ فِيْهِ خِلَافًا۔ [یہ وہ بات ہے جس کے بارے میں کسی کا اختلاف میرے علم میں نہیں ہے۔]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جب کہ اس روایت کی سند میں سب ثقہ لوگ ہیں۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ وہ شخص ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کا قاضی اور عامل زکوٰۃ مقرر فرمایا تھا، جن کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ: اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَالْحَرَامِ۔ وہ صحابہ میں سب سے زیادہ حلال وحرام کی واقفیت رکھتے ہیں۔ اور جنھیں حضرت عمرؓ نے ابوعبیدہؓ کے بعد پورے شام کا فوجی گورنر مقرر کیا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے شخص کو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ زمین کے بارے میں اسلام کا قانون کیا ہے؟

(۸) موسیٰ بن طلحہؓ کی روایت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہ بن مسعودؓ، عمارؓ بن یاسر، خبابؓ بن اَرَتّ اور سعدؓ بن مالک کو زمینیں عطا کیں تھیں۔ ان میں سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور سعدؓ بن مالک اپنی زمینیں تہائی اور چوتھائی پیداوار کی بٹائی پر کاشت کے لیے دیتے تھے۔ (کتاب الخراج لابی یوسف)

ان شواہد ونظائر سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ مزارعت کا طریقہ عہد نبوت وخلافت میں بالعموم رائج تھا۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ، اور صحابہ کے تمام زراعت پیشہ گھرانے اس پر عامل تھے، اور رافع بن خدیج وغیرہ حضرات کی روایات پھیلنے تک پورے ۵۰ سال کے دوران میں کسی کو یہ بات سرے سے معلوم ہی نہ تھی کہ اس معاملے میں کسی قسم کے امتناعی احکام موجود ہیں۔

تنقید بلحاظ عقل ودرایت

اب ذرا اس معاملے کو ایک دوسرے رُخ سے بھی دیکھیے۔ اسلام کے احکام ایک دوسرے کی ضد اور ایک دوسرے سے متناقض ومتصادم نہیں ہیں۔ اس کی ہدایات اور اس کے قوانین میں سے ہر چیز اس کے مجموعی نظام میں اس طرح ٹھیک بیٹھتی ہے کہ دوسرے تمام قوانین کے ساتھ اس کا جوڑ مل جاتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اس دین کے من جانب اللہ ہونے کا ایک نمایاں ثبوت قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ہم یہ مان لیں کہ شریعت میں مزارعت ناجائز ہے، اور یہ کہ شارع زمین کی ملکیت کو خود کاشتی تک محدود کرنا چاہتا ہے، اور یہ کہ شارع آدمی کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ خود کاشتی کی حد سے زائد جتنی زمین اس کے پاس موجود ہو اسے یا تو دوسروں کو مفت دے دے یا بیکار ڈال رکھے، تو ذرا سا غور کرنے پر ہمیں علانیہ یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ احکام اسلام کے دوسرے اصول اور قوانین سے مناسبت نہیں رکھتے اور ان کو اسلامی نظام میں ٹھیک بٹھانے کے لیے دور دور تک اس نظام کی بہت سی چیزوں میں ترمیم ناگزیر ہوجاتی ہے۔ مثال کے طور پر تناقض کی چند نہایت صریح صورتیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ اسلامی نظام میں ملکیت کے حقوق صرف ہٹے کٹے مردوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ عورتوں، بچوں، بیماروں اور بوڑھوں کو بھی یہ حقوق پہنچتے ہیں۔ اگر مزارعت ممنوع ہو تو ان سب کے لیے زرعی ملکیت بالکل بے معنی ہوکر رہ جاتی ہے۔

۲۔ اسلامی قانونِ وراثت کی رُو سے جس طرح ایک آدمی کی میراث اس کے مرنے پر بہت سے آدمیوں کے درمیان بٹ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہے، اسی طرح بسا اوقات بہت سے مرنے والوں کی میراث ایک آدمی کے پاس جمع ہوسکتی ہے۔اب یہ کتنی عجیب بات ہے، کہ اسلام کا قانونِ وراثت تو بیسیوں اور سیکڑوں ایکڑ تک زمین ایک شخص کے پاس سمیٹ لائے، مگر اس کا قانونِ زراعت اس کے لیے ایک محدود رقبے کے سوا باقی تمام ملکیت سے انتفاع کو حرام قرار دے۔

۳۔ اسلامی قانونِ بیع وشرا نے کسی نوعیت کی جائز اشیا کے معاملے میں بھی انسان پر یہ پابندی عائد نہیں کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص حد تک ہی ان کو خرید سکتا ہو اور اس حد سے زیادہ کی خریداری کا مجاز نہ ہو۔خرید وفروخت کا یہ غیر محدود حق جس طرح تمام جائز چیزوں کے معاملے میں آدمی کو حاصل ہے اسی طرح زمین کے معاملے میں بھی حاصل ہے۔لیکن یہ بات پھر نہایت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ دیوانی قانون کی رُو سے تو ایک شخص جتنی چاہے زمین خرید سکے، مگر قانونِ زراعت کی رُو سے وہ ایک خاص حد سے زائد ملکیت کا نفع اٹھانے کا حق دار نہ ہو۔

۴۔ اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیّت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق وواجبات ادا کیے جاتے رہیں، بلا حد ونہایت رکھی جاسکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمال کی اشیا، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملے میں بھی قانوناً ملکیت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔پھر آخر تنہا زرعی جایداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس ایک معاملے میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ آدمی کے حقوقِ ملکیت کو مقدار کے لحاظ سے محدود کردیا جائے، یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک حد خاص سے زائد ملکیت کو آدمی کے لیے عملاً بیکار کردیا جائے۔[1]

۵۔ اسلام نے احسان اور فیاضی کی تعلیم تو زندگی کے ہر معاملے میں دی ہے، لیکن واجبی حقوق وصول کرلینے کے بعد پھر کسی معاملے میں بھی ہم اس کا یہ طریقہ نہیں دیکھتے کہ وہ فیاضی کو آدمی پر فرض قرار دیتا ہو۔مثلاً جو شخص زکوٰۃ ادا کرچکا ہے، اسلام اس کو یہ ترغیب تو ضرور دیتا ہے کہ وہ اپنا ضرورت سے زائد روپیہ حاجت مند لوگوں کو بخش دے، مگر وہ اس بخشش وسخاوت کو فرض نہیں کرتا اور نہ یہ کہتا ہے کہ حاجت مند کو قرض کی شکل میں روپیہ دینا، یا مضاربت کے اصول پر روپیہ دے کر اس کے کاروبار میں شریک ہوجانا حرام ہے، بلکہ مدد صرف عطا اور بخشش ہی کی شکل میں ہونی چاہیے۔اسی طرح مثلاً جس شخص کے پاس ضرورت سے زائد مکانات ہوں، یا ایک بڑا مکان اس کی ذاتی ضرورت سے زیادہ کی گنجایش رکھتا ہو، اسلام بہت پسند کرتا ہے کہ آدمی اپنے مکانات اور گنجایشوں سے ان لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا مفت موقع دے دے جو گھر

---

[1] اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام کا اصولی قانون تو یہی ہے کہ جو اوپر ہم نے بیان کیا ہے۔البتہ کسی خاص حالت میں [وقتی مصالح عامہ کے تحت] یہ ضرورت محسوس ہو کہ زمین کی زیادہ سے زیادہ ملکیت کے لیے مقدار کی ایک حد مقرر کی جائے تو عارضی طور پر اتنی مدت کے لیے ایسا کیا جاسکتا ہے جب تک وہ ضرورت باقی رہے۔لیکن اس طرح کے کسی فیصلے سے اسلام کے اصولی قانون میں کوئی مستقل ترمیم نہیں ہوسکتی۔آگے چل کر ہم اس مسئلے پر مفصل بحث کر رہے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ موقع لازماً مفت ہی دیا جانا چاہیے، کرایہ پر مکان دینا حرام ہے۔ ایسا ہی معاملہ ضرورت سے زائد کپڑوں اور برتنوں اور سواریوں وغیرہ کا بھی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو فیاضانہ طریقے سے مفت دے دینا پسند تو ضرور کیا گیا ہے مگر فرض نہیں کیا گیا اور فروخت کرنے یا کرائے پر دینے کو حرام نہیں ٹھہرایا گیا۔ اب آخر زرعی زمین میں وہ کیا خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اسی کے معاملے میں اسلام اپنے اس عام اصول کو بدل دے اور آدمی سے اس کی پیداوار پر زکوٰۃ وصول کر لینے کے بعد اسے اس بات پر مجبور کرے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد زمین لازماً دوسروں کو مفت دے دے اور شرکت یا مضاربت کے اصول پر ان سے معاملہ ہرگز نہ کرے۔

۶۔ اسلامی قانون نے تجارت، صنعت اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع ونقصان کی شرکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ معاملہ کر لے۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا روپیہ دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ تو اس سے کاروبار کر، نفع ہو تو اس میں آدھے یا چوتھائی کا میں حق دار ہوں۔ ایک شخص دوسرے کو اپنا سرمایہ کسی عمارت کی شکل میں، کسی مشین یا انجن کی شکل میں، کسی موٹر یا کشتی یا جہاز کی شکل میں بھی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ تو اس پر کام کر، جو نفع ہو اس میں میرا اتنا حصہ ہے۔ لیکن آخر اس بات کے لیے کون سے معقول وجوہ ہیں کہ ایک شخص اپنا سرمایہ زمین کی شکل میں دوسرے کو دے کر یہ نہ کہہ سکے کہ تو اس میں کاشت کر، پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف کا میں شریک ہوں؟

یہ چند نمایاں ترین مثالیں ہیں جن پر نگاہ ڈال کر آدمی بیک نظر دیکھ سکتا ہے کہ یہ مزارعت کی حرمت اور یہ خود کاشتی کی قید اور ملکیتِ زمین کے لیے رقبے کی حد بندی اسلام کے مجموعی نظام میں کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اسے کھپانا ہو تو دوسرے بہت سے اصول وقوانین کو بدلنا پڑے گا۔ دوسرے اصول وقوانین اپنی جگہ رہیں تو یہ ہر قدم پر ان سے متصادم ہوتی رہے گی۔

امتناعی احکام کا اصل مفہوم

پھر کیا نقل وعقل کے ان دلائل کی بنا پر یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ تمام احادیث غلط ہیں جو اس کثرت سے ثقہ راویوں نے اتنے صحابیوں سے روایت کی ہیں؟ نہیں، اصل بات یہ نہیں ہے کہ یہ روایتیں جھوٹی یا ضعیف ہیں۔ اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ ان میں ادھوری بات بیان ہوئی ہے جس کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ خود رافعؓ بن خدیج اور جابرؓ بن عبداللہ وغیرہ حضرات کی دوسری روایتیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں اور بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ کی توضیحات کو جب ہم دیکھتے ہیں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کچھ اور تھا اور وہ روایات میں بیان کسی اور طرح ہو گیا۔

رافعؓ بن خدیج کی توضیحات

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، امیر معاویہؓ کے ابتدائی دورِ حکومت تک تمام بلادِ اسلامیہ میں بالعموم سب ہی بٹائی اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لگان کا معاملہ کرتے تھے اور کسی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ اس میں کسی قسم کی شرعی قباحت ہے۔ اس لیے جب ۵۰ ھ کے لگ بھگ زمانے میں یکا یک یہ خبر مشہور ہوئی کہ بعض صحابی اس چیز کی ممانعت کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں تو ہر طرف ایک کھلبلی سی مچ گئی اور لوگ مجبور ہوئے کہ صحابہ کرام کے پاس جا کر تحقیق کریں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فی الواقع کیا حکم دیا ہے، کن حالات میں دیا ہے، اور کس چیز کے متعلق دیا ہے؟ اس سلسلے میں خود ان صحابیوں سے بھی پوچھ گچھ کی گئی جن سے مزارعت اور کرایہ پر زمین کی ممانعت کے احکام مروی ہوئے تھے، اور دوسرے صحابہ سے بھی پوچھا گیا۔ اس طرح جو بات کھلی وہ ہم ذیل میں خود انھی بزرگوں کی زبان سے نقل کرتے ہیں۔

حنظلہ بن قیس کہتے ہیں، میں نے رافعؓ بن خدیج سے پوچھا سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنا کیسا ہے؟ انھوں نے کہا کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے بعد انھوں نے مزید تشریح کے طور پر فرمایا:

إِنَّمَا كَانَ النَّاسُ يُوَاجِرُونَ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمَاذِيَانَاتِ وَإِقْبَالِ الْجَدَاوِلِ وَأَشْيَاءِ مِنَ الزَّرْعِ فَيَهْلِكُ هٰذَا وَيَسْلَمُ هٰذَا وَيَسْلَمُ هٰذَا وَيَهْلِكُ هٰذَا، فَلَمْ يَكُنْ لِلنَّاسِ كِرَاءٌ إِلَّا هٰذَا فَلِذٰلِكَ زَجَرَ عَنْهُ، وَأَمَّا شَيْءٌ مَّعْلُومٌ مَضْمُونٌ فَلَا بَأْسَ بِهِ۔ (مسلم، ابوداود، نسائی)

اصل بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ اپنی زمینیں اجرت پر دیتے ہوئے طے کیا کرتے تھے کہ پانی کی نالیوں کے سرے پر اور ان کے کناروں پر اور کھیت کے بعض مخصوص حصوں میں جو پیداوار ہوگی وہ مالک زمین لے گا۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک جگہ کی کھیتی برباد ہوتی اور دوسری جگہ کی بچ جاتی اور کبھی اس جگہ کی بچ جاتی اور اس جگہ کی برباد ہو جاتی۔ اس زمانے میں زمینیں کرائے پر دینے کا کوئی دوسرا دستور اس کے سوا نہ تھا۔ اسی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ رہا ایک واضح اور متعین حصہ، تو اس پر معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

حنظلہ بن قیس کی دوسری روایت میں رافعؓ بن خدیج کے الفاظ یہ ہیں:

كُنَّا نُكْرِي الْأَرْضَ بِالنَّاحِيَةِ مِنْهَا مُسَمًّى لِسَيِّدِ الْأَرْضِ قَالَ فَمَهْمَا يُصَابُ ذَالِكَ وَتَسْلَمُ الْأَرْضُ وَمَهْمَا يُصَابُ الْأَرْضُ وَيَسْلَمُ ذَالِكَ، فَنُهِينَا۔ وَأَمَّا الذَّهَبُ وَالْوَرِقُ فَلَمْ يَكُنْ يَوْمَئِذٍ۔ (بخاری)

ہم لوگ زمینیں اس طرح کرایہ پر دیتے تھے کہ مالک زمین کھیت کے ایک خاص حصے کی پیداوار کو اپنے لیے مخصوص کر لیتا تھا۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ اسی حصے پر آفت آ جاتی اور باقی زمین بچ جاتی اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہی حصہ بچ جاتا اور ساری زمین پر آفت آ جاتی۔ اسی لیے ہم کو ایسا معاملہ کرنے سے روک دیا گیا۔ رہا سونا چاندی تو اس پر معاملہ کرنے کا اس زمانے میں دستور ہی نہ تھا۔

حنظلہ بن قیس کی تیسری روایت میں یہ ذکر ہے کہ حضرت رافعؓ نے فرمایا:

حَدَّثَنِي عَمَّايَ أَنَّهُمْ كَانُوا يُكْرُوْنَ الْأَرْضَ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِمَا يَنْبُتُ عَلَى الْأَرْبِعَاءِ أَوْ شَيْءٍ يَسْتَثْنِيهِ صَاحِبُ الْأَرْضِ فَنَهَى النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ ذَالِكَ۔ فَقُلْتُ لِرَافِعٍ فَكَيْفَ هِيَ بِالدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ فَقَالَ رَافِعٌ لَيْسَ بِهَا بَأْسٌ بِالدِّيْنَارِ وَالدِّرْهَمِ۔ (بخاری، احمد، نسائی)

میرے دو چچاؤں نے مجھ سے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لوگ اپنی زمینوں کو اس پیداوار کے عوض کرائے پر دیتے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھے جو پانی کی نالیوں پر پیدا ہو یا زمین کے کسی ایسے حصے میں پیدا ہو جسے مالک زمین مستثنیٰ کر لیتا تھا۔ اس طریقے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا۔ اس پر میں نے رافع سے پوچھا کہ دینار اور درہم کے عوض معاملہ کرنا کیسا ہے؟ رافع نے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

حضرت رافعؓ کی ایک اور روایت جو حنظلہ الزرقی کے واسطے سے آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

كُنَّا اَكْثَرُ الْاَنْصَارِ حَقْلًا، كُنَّا نَكْرِى الْاَرْضَ عَلٰى اَنَّ لَنَا هٰذِهٖ وَلَهُمْ هٰذِهٖ فَرُبَمَا اَخْرَجَتْ هٰذِهٖ وَلَمْ تُخْرِجْ هٰذِهٖ فَنَهَانَا عَنْ ذَالِكَ وَاَمَّا الْوَرِقُ فَلَمْ يَنْهَنَا۔ (مسلم، ابن ماجہ، بخاری، مگر بخاری میں اَمَّا الْوَرِقُ فَلَمْ يَنْهَنَا کے الفاظ نہیں ہیں)

ہم لوگ انصار میں سب سے زیادہ کھیتی باڑی کرنے والے تھے ہم زمین اس طرح کرایہ پر دیا کرتے تھے کہ کھیت کے اس حصے کی پیداوار ہماری اور اس حصے کی پیداوار تمھاری۔ اب کبھی ایسا ہوتا کہ ایک حصے میں فصل ہوتی اور دوسرے میں نہ ہوتی۔ اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو یہ معاملہ کرنے سے منع فرما دیا۔ رہا چاندی کے عوض معاملہ کرنا تو اس سے آپ نے منع نہیں فرمایا۔

خود رافع بن خدیج کے چچازاد بھائی اُسید بن ظُہیرؓ روایت کرتے ہیں:

كَانَ اَحَدُنَا اِذَا اسْتَغْنٰى عَنْ اَرْضِهٖ اَوِ افْتَقَرَ اِلَيْهَا اَعْطَاهَا بِالثُّلُثِ وَالرُّبُعِ وَالنِّصْفِ وَاشْتَرَطَ ثَلٰثَ جَدَاوِلَ وَالْقُصَارَةَ وَمَا يَسْقِى الرَّبِيْعُ وَكَانَ الْعَيْشُ اِذْ ذَاكَ شَدِيْدً اَوْكَانَ يَعْمَلُ فِيْهَا بِالْحَدِيْدِ وَبِمَاشَآءَ اللّٰهُ وَيُصِيْبُ مِنْهَا مَنْفَعَةً فَاَتَانَا رَافِعُ بْنُ خَدِيْجٍ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَاكُمْ عَنْ اَمْرٍ كَانَ لَكُمْ نَافِعًا وَطَاعَةُ اللّٰهِ وَطَاعَةُ رَسُوْلِهٖ اَنْفَعُ لَكُمْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ يَنْهَاكُمْ عَنِ الْحَقْلِ وَيَقُوْلُ مَنِ اسْتَغْنٰى عَنْ اَرْضِهٖ فَلْيَمْنَحْهَا اَخَاهُ اَوْ لِيَدَعْ۔ (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن ماجہ)

ہم میں سے کوئی شخص اپنی زمین سے بے نیاز ہوتا، یا اسے کرائے پر دینے کا حاجت مند ہوتا تو اسے تہائی یا چوتھائی یا نصف پیداوار کی بٹائی پر دوسرے کو دے دیتا اور ساتھ ہی شرط کر لیتا تھا کہ تین نالیاں اور گانٹھیں (یا گھنڈیاں ۱) اور بڑی نالی کے کنارے کی پیداوار اس کی ہے۔ اس زمانے میں زندگی بڑی سخت تھی۔ آدمی دن بھر ہل چلاتا یا دوسرا کام کرتا تب تھوڑا سا فائدہ حاصل کرتا تھا۔ ایک روز رافع بن خدیج ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو ایسے کام سے روک دیا ہے جو تمھارے لیے نافع تھا۔ مگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت تمھارے لیے زیادہ نافع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو زمینیں کرائے پر دینے سے منع فرماتے ہیں، اور آپ کا ارشاد ہے کہ جو زمین سے مستغنی ہو وہ یا تو اپنے بھائی کو مفت دے دے یا یوں ہی رہنے دے۔ ۲

جابرؓ بن عبداللہ کی توضیح

رافع بن خدیج کی طرح حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے بھی جب معاملہ کی تفصیلات دریافت کی گئیں تو اصل معاملہ جس سے

---

۱ لغت میں قُصارۃ یا قُصریٰ سے مراد ہے بَقِيَّةُ الْحَبِّ فِيْ سُنْبُلٍ بَعْدَ مَا يُدَاسُ۔ یعنی وہ غلہ جو کھلیان کے بعد بالوں میں بچا رہتا ہے۔ میں خود ایک ''غیر زراعت پیشہ'' آدمی ہوں، اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ اردو میں اسے کیا کہتے ہیں۔ میرے جیل کے دونوں رفیق ماشاء اللہ زراعت پیشہ ہیں۔ ان کے اعتماد پر میں نے اس لفظ کا ترجمہ ''گانٹھ'' یا ''گھنڈی'' لکھ دیا ہے۔ گانٹھ کے راوی مولانا امین احسن صاحب ہیں اور گھنڈی کے راوی طفیل محمد صاحب۔ غالباً یہ فرق پنجاب اور یوپی کی اصطلاحوں کا ہے۔

۲ اس جگہ یہ معلوم کرنا بھی شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ رافع بن خدیج کی عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت بمشکل ۲۲ سال کی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک انیس بیس سال کے نوجوان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور سمجھنے اور دوسروں سے جا کر روایت کرنے میں تھوڑی بہت غلطی کر جانا کچھ بہت زیادہ مستبعد امر نہ تھا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا، یہ کھلا:

كُنَّا نُخَابِرُ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَنُصِيْبُ مِنَ الْقُصْرٰى وَمِنْ كَذَا وَمِنْ كَذَا، فَقَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ اَرْضٌ فَلْيَزْرَعْهَا اَوْ لِيُحْرِثْهَا اَخَاهُ وَاِلَّا فَلْيَدَعْهَا۔ (احمد، مسلم)

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بٹائی پر زمینیں کاشت کے لیے دیتے تھے اور کچھ گانٹھوں (یا گھنڈیوں) میں سے اور کچھ اس چیز میں سے اور کچھ اس چیز میں سے بھی وصول کرتے تھے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو اسے چاہیے کہ یا خود کاشت کرے یا اپنے کسی بھائی کو کاشت کرادے ورنہ اپنی زمین پڑی رہنے دے۔

زیدؓ بن ثابت کی توضیح

حضرت زیدؓ بن ثابت سے جب عروہ بن زبیرؓ نے معاملے کی تحقیق کی تو انھوں نے فرمایا:

يَغْفِرُ اللّٰهُ لِرَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ اَنَا وَاللّٰهِ اَعْلَمُ بِالْحَدِيْثِ مِنْهُ، اِنَّمَا اَتٰى رَجُلَانِ النَّبِىَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدِ اقْتَتَلَا، فَقَالَ اِنْ كَانَ هٰذَا شَاْنُكُمْ فَلَا تُكْرُوا الْمَزَارِعَ، فَسَمِعَ رَافِعُ ابْنُ خَدِيْجٍ قَوْلَهٗ فَلَا فلاتكروا المزارع

(ابوداؤد، ابن ماجہ)

خدا معاف کرے رافع بن خدیج کو، میں اس بات کو ان سے زیادہ جانتا ہوں، اصل بات یہ تھی کہ دو آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے جن کے درمیان سخت جھگڑا ہوا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم لوگوں کا یہ حال ہے تو اپنی زمینیں کرائے پر نہ دیا کرو۔ رافع نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بس اتنی بات سن لی کہ "اپنی زمینیں کرائے پر نہ دیا کرو"۔

سعدؓ بن ابی وقاص کی توضیحات

حضرت سعدؓ نے اس معاملے کی جو حقیقت بیان کی ہے وہ یہ ہے:

اِنَّ اَصْحٰبَ الْمَزَارِعِ فِىْ زَمَنِ النَّبِىِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا يُكْرُوْنَ مَزَارِعَهُمْ بِمَا يَكُوْنُ عَلَى السَّوَاقِىْ وَمَا سَعِدَ بِالْمَاءِ مِمَّا حَوْلَ النَّبْتِ فَجَاؤُا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاخْتَصَمُوْا فِىْ بَعْضِ ذَالِكَ فَنَهَاهُمْ اَنْ يُكْرُوْا بِذَالِكَ وَقَالَ اَكْرُوْا بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ۔ (احمد، نسائی)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مالکانِ زمین کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنی زمینیں اس شرط پر زراعت کے لیے دیتے تھے کہ نالیوں کے دونوں جانب کی پیداوار، اور کھیتی کے اس حصے کی پیداوار جس پر پانی خود بخود پہنچ جائے، مالک زمین کی ہوگی۔ اس پر لوگوں کے جھگڑے ہوئے اور ان کے مقدمات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ تب آپ نے ایسی شرطوں پر زمینیں دینے سے منع فرما دیا اور فرمایا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں کرایہ طے کرو۔

دوسری روایت میں وہ فرماتے ہیں:

كُنَّا نَكْرِ الْاَرْضَ بِمَا عَلَى السَّوَاقِىْ مِنَ الزَّرْعِ وَمَا سُعِدَ بِالْمَاءِ مِنْهَا فَنَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ذَالِکَ وَاَمَرَنَا اَنْ نُکْرِیَهَا بِذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ۔ (ابوداؤد)

ہم لوگ زمینیں اس شرط پر زراعت کے لیے دیتے تھے کہ کھیتی کا جو حصہ نالیوں کے کناروں پر ہے اور جس پر پانی خود پہنچ جائے اس کی پیداوار مالک کی ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا معاملہ کرنے سے ہم کو روک دیا اور حکم دیا کہ سونے اور چاندی کی شکل میں کرایہ طے کریں۔

ابن عباسؓ کی توضیحات

تابعین میں جو فقہا سب سے زیادہ مشہور ہیں ان میں سے ایک حضرت طاؤس ہیں۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے جو معلومات حاصل کی ہیں وہ اس مسئلے پر سے باقی ماندہ پردے بھی اٹھا دیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

لَمَّا سَمِعَ اِكْثَارَ النَّاسِ فِيْ كِرَاءِ الْاَرْضِ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ اِنَّمَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا مَنَحَهَا اَحَدُكُمْ اَخَاهُ (اَیْ قَالَ لَهٗ تَحْرِيْضًا لِلنَّاسِ عَلَى الْاِحْسَانِ) وَلَمْ يَنْهَ عَنْ كِرَائِهَا۔ (ابن ماجہ)

ابن عباس نے جب کرایۂ زمین کے بارے میں سنا کہ لوگوں میں بہت چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں تو انھوں نے کہا کہ سبحان اللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی زمین اپنے بھائی کو مفت کیوں نہیں دے دیتا (یعنی آپ لوگوں کو احسان کی ترغیب دینا چاہتے تھے) آپ نے کرایہ پر دینے سے منع نہیں فرمایا تھا۔

دوسری مفصل روایت میں یہ ہے کہ طاؤس اپنی زمینیں بٹائی پر دیا کرتے تھے۔ اس پر مجاہد نے ان سے کہا کہ چلو رافع بن خدیج کے بیٹے کے پاس چلیں، وہ اپنے والد سے ایک حدیث روایت کرتے ہیں۔ مگر طاؤس نے ان کو ڈانٹ دیا اور کہا خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام سے منع فرمایا ہے تو میں اسے ہرگز نہ کرتا۔ لیکن جو شخص رافع بن خدیج سے زیادہ علم رکھتا ہے، یعنی ابن عباسؓ، اس نے مجھ سے کہا کہ:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَاَنْ يَّمْنَحَ الرَّجُلُ اَخَاهُ اَرْضَهٗ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّاْخُذَ عَلَيْهَا خَرْجًا مَّعْلُوْمًا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو یوں ہی زمین دے دے تو یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان لے۔

دوسری روایت میں ابنِ عباسؓ کے الفاظ یہ ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَنْهَ عَنْهَا، اِنَّمَا قَالَ يَمْنَحُ اَحَدُكُمْ اَخَاهُ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَنْ يَّاْخُذَ عَلَيْهَا خَرْجًا مَّعْلُوْمًا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا۔ آپ نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو یوں ہی زمین دے دے تو یہ اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اس پر ایک مقرر لگان وصول کرے۔

ایک اور روایت میں ابنِ عباسؓ کے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: لَمْ يُحَرِّمِ الْمُزَارَعَةَ وَلٰكِنْ اَمَرَ اَنْ يَّرْفُقَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزارعت کو حرام نہیں کر دیا تھا۔ بلکہ آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ لوگ ایک دوسرے کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ساتھ رفاقت کا برتاؤ کریں۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی)

تحقیقِ مسئلہ

ان تمام شہادتوں اور عقلی ونقلی دلائل پر ایک جامع نگاہ ڈالنے سے مسئلے کی جو حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے وہ یہ ہے:

۱۔ اسلام اس تخیل سے قطعی نا آشنا ہے کہ زرعی جایداد کی ملکیت دوسری اقسام کی املاک اور جایدادوں سے کوئی الگ نوعیت رکھتی ہے جس کی بنا پر ان سب کے برعکس اس کی جائز ملکیت کے لیے رقبے کے لحاظ سے کوئی حد مقرر کردی جائے، یا یہ فیصلہ کردیا جائے کہ ہر شخص اور خاندان کے قبضے میں صرف اتنی ہی زمین رہنی چاہیے جس میں وہ خود کاشت کرسکے، یا خود کاشتی سے زائد ملکیت کا حق دینے کے بعد دوسری ایسی پابندیاں لگادی جائیں جن کی وجہ سے یہ حق بے معنی ہو کر رہ جائے۔ ایسی حد بندیوں کے لیے فی الحقیقت کتاب وسنت میں کوئی اصل موجود نہیں ہے۔

۲۔ جو شخص خود کاشت نہ کرے، یا نہ کرسکتا ہو، یا خود کاشتی کی حد سے زائد زمین رکھتا ہو، اس کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اپنی زمین دوسرے لوگوں کے لیے دے اور پیداوار میں تہائی یا چوتھائی یا نصف، جس پر بھی فریقین میں معاہدہ ہو، اپنا حصہ مقرر کرلے۔ جس طرح تجارت اور صنعت اور دوسرے کاروباری معاملات میں مضاربت جائز ہے، بالکل اسی طرح زراعت میں مزارعت بھی جائز ہے۔

۳۔ لیکن مضاربت کی طرح مزارعت بھی صرف اپنی سادہ صورت ہی میں جائز ہے، یعنی یہ کہ مالک زمین اور کاشت کار کے درمیان حصے کا تعین سیدھے سیدھے طریقے سے اس طرح ہو کہ زمین میں جتنی پیداوار بھی ہوگی وہ اس تناسب سے فریقین میں تقسیم ہوجائے گی۔ اس کے ساتھ ایسی کوئی شرط لگانا جس سے ایک فریق کا حصہ متعین اور دوسرے کا حصہ مشتبہ ہو، یا جس میں کسی ایک کا یا دونوں کا حصہ محض بخت واتفاق پر منحصر ہوجائے، پورے معاملے کو ناجائز کردیتا ہے، کیونکہ اس طرح کی شرطیں مزارعت میں سود خواری اور قمار بازی کی خصوصیات پیدا کردیتی ہیں۔

۴۔ رہا نقد لگان، تو اگر وہ کرایہ پر زمین کی نوعیت رکھتا ہو تو جائز ہے، لیکن اگر پیداوار کا تخمینہ کرکے مالکِ زمین اس میں اپنا حصہ پیشگی ایک مخصوص رقم کی شکل میں وصول یا معین کرلے تو اصولاً اس میں اور سود خواری میں کوئی فرق نہیں۔ کرایہ میں لحاظ صرف اس امر کا ہونا چاہیے کہ مالک اپنی چیز کو کرائے دار کے لیے مہیا کرنے اور مہیا رکھنے کا، اور اس نقصان کا جو کرایہ دار کے استعمال سے اس کی چیز کو پہنچتا ہے، معاوضہ طلب کرے۔ وہ چیز خواہ مکان ہو، یا فرنیچر، یا سواری یا زمین، بہرحال اس پہلو سے اس کا معاوضہ یقیناً لیا جاسکتا ہے اور زیادہ نقصان دہ یا کم نقصان دہ استعمال کے لحاظ سے اس معاوضے میں کمی وبیشی بھی ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر چیز کا مالک معاوضے کا تعین اس لحاظ سے کرے کہ کرایہ دار میری چیز کو جس معاشی کاروبار میں استعمال کررہا ہے اس میں اندازاً اس کو اتنا نفع ہوگا، لہٰذا اس میں سے مجھے اتنا معاوضہ لازماً ملنا چاہیے، تو یہ پورا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معاوضہ قطعی سود ہو جائے گا۔ خواہ وہ اس طریقے پر مکان کے معاملے میں طے کیا جائے، یا سواری کے معاملے میں یا زمین کے معاملے میں۔ کرایہ دار کے منافع میں حصہ لینے کی نیت جو شخص رکھتا ہو اسے سیدھی طرح مضاربت کرنی چاہیے اگر وہ تجارت وصنعت کے نفع میں شریک ہونا چاہتا ہے، یا مزارعت کرنی چاہیے اگر وہ زراعت کے نفع میں حصہ بٹانا چاہتا ہے۔ لیکن ایک فریق کا حصہ ایک مخصوص رقم کی شکل میں معین ہو اور دوسرے کا حصہ مشتبہ اور بخت واتفاق پر منحصر رہے، یہ نہ تجارت وصنعت میں جائز ہے اور نہ زراعت میں۔

فقہا کے مذاہب

آخر میں ایک نظریہ بھی دیکھ لیجیے کہ اس مسئلے میں فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب کا فتویٰ کیا ہے۔ علامہ شوکانی اپنی کتاب نیل الاوطار میں لکھتے ہیں:

حازمی کہتا ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعودؓ، عمار بن یاسرؓ، سعیدؒ بن میتب، محمدؒ بن سیرین، عمرؒ بن عبدالعزیز، ابن ابی لیلیٰ، ابن شہاب زہری اور حنفیہ سے قاضی ابویوسف اور محمد بن حسن کہتے ہیں کہ کھیت کی پیداوار اور باغ کے ثمرے، دونوں کی بٹائی پر مالک زمین اور کاشت کار کے درمیان اور مالکِ باغ اور باغبان کے درمیان معاملہ ہوسکتا ہے۔[1] یہ دونوں معاملے ایک ساتھ بھی ہوسکتے ہیں جس طرح خیبر میں کیے گئے تھے کہ ایک گروہ سے باغوں کی رکھوالی اور زمینوں کی کاشت کا معاملہ یکجا طے ہوا تھا، اور الگ الگ بھی ہوسکتے ہیں۔ جن احادیث میں مزارعت کی نہی وارد ہوئی ہے ان کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ وہ دراصل تنزیہ پر مبنی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان سے مراد وہ صورت ہے جب کہ مالکِ زمین نے زمین کے کسی خاص حصے کی پیداوار اپنے لیے مخصوص کی ہو۔

اور طاؤس اور ایک قلیل گروہ کہتا ہے کہ زمین کا کرایہ مطلقاً ناجائز ہے خواہ وہ زمین کی پیداوار کے ایک حصے کی شکل میں ہو، یا سونے اور چاندی کی شکل میں، یا کسی اور صورت میں۔[2] اسی رائے کی طرف ابنِ حزم گئے ہیں اور انھوں نے بڑے زور سے اس کی تائید کی ہے اور اپنی حجت میں ان احادیث سے استدلال کیا ہے جو اس کی مطلقاً ممانعت کرتی ہیں۔[3]

اور شافعیؒ اور ابوحنیفہؒ اور عترت (یعنی فقہائے امامیہ) اور بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ زمین کا کرایہ ان تمام شکلوں میں طے کرنا جائز ہے

---

[1] ان بزرگوں کے علاوہ صحابہ میں سے حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، زبیرؓ بن العوام، اسامہؓ بن زید، معاذؓ بن جبل، ابن عمرؓ، خبابؓ بن ارت، اور ابن عباسؓ سے اور فقہا میں طاؤس، اوزاعی اور ثوری سے بھی یہی مذہب منقول ہے۔ ان میں سے اکثر کے حوالے ہماری پچھلی نقل کردہ روایات میں گزر چکے ہیں۔

[2] تعجب ہے کہ طاؤس کی طرف مزارعت کے عدم جواز کا مسلک یہاں کیسے منسوب کردیا گیا۔ طاؤس کا مذہب تو یہ تھا کہ وہ بٹائی کو جائز اور نقد لگان کو ناجائز کہتے تھے۔ (نیل الاوطار، ج ۵، ص ۲۴۶)

[3] ابن حزم کی طرف بھی اس مذہب کی نسبت صحیح نہیں ہے۔ محلّٰی میں ابن حزم خود لکھتے ہیں: "زمین کو نصف، ثلث یا ربع پیداوار کے بدلے بٹائی پر دینا حدیث خیبر سے ثابت ہے۔ یہ آپؐ کا آخری عمل تھا جو وفات تک جاری رہا اور آپؐ کے بعد ابوبکرؓ، عمرؓ اور تمام صحابہ نے اس پر عمل درآمد کیا۔ لہٰذا یہ آپؐ کا آخری فعل ان تمام احادیث کے اس حصے کا ناسخ ہوگا جن میں مزارعت کی مطلقاً ممانعت آئی ہے۔ باقی رہا انھی روایات کا وہ حصہ جس میں زمین کو نقد لگان پر دینے سے منع کیا گیا ہے، تو یہ ممانعت علیٰ حالہٖ قائم رہے گی، کیونکہ ان کا ناسخ کوئی عمل یا حکم نہیں ملتا۔ (المحلّٰی: ج ۸، ص ۲۱۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو اشیا کی خرید و فروخت کے لیے قیمت کا کام دے سکتی ہیں، خواہ وہ سونا ہو، چاندی ہو، استعمالی سامان ہو، یا غلہ ہو۔ لیکن یہ کرایہ خود اس زمین کی پیداوار کے ایک حصے کی صورت میں طے نہیں کیا جا سکتا جو کرایہ پر دی جا رہی ہو۔ ابن المنذر کہتا ہے کہ سونے اور چاندی کی شکل میں زمین کا کرایہ طے کرنے کے جواز پر تو تمام صحابہ متفق ہیں اور ابن بطال کہتا ہے کہ تمام فقہائے امصار بھی اس کے جواز پر متفق ہیں۔

لیکن پیداوار کی بٹائی کے ناجائز ہونے پر مذکورۂ بالا اصحاب ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اس کی ممانعت میں وارد ہوئی ہیں اور خیبر کے معاملے کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ خیبر تو بزور شمشیر فتح ہوا تھا اور اس کے باشندے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ہو چکے تھے، اس لیے اس کی پیداوار میں سے جو کچھ بھی آپؐ نے لیا وہ بھی آپؐ ہی کا تھا اور جو کچھ چھوڑ دیا وہ بھی آپ ہی کا تھا۔ حازمی کہتا ہے کہ یہ مذہب عبداللہؓ بن عمر اور عبداللہؓ بن عباس اور رافع بن خدیج اور اُسید بن حضیر اور ابو ہریرہؓ اور نافع سے مروی ہے[1] اور اسی کی طرف مالکؒ، شافعی اور کوفیوں میں سے ابوحنیفہؒ گئے ہیں۔

امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ غلّے اور ثمرے کے سوا ہر دوسری صورت میں زمین کا کرایہ طے کرنا جائز ہے۔ غلے اور ثمرے کی شکل میں کرایہ لینے سے وہ اس لیے منع کرتے ہیں کہ یہ معاملہ غلے سے غلے کی بیع نہ بن جائے اور ان کے نزدیک ممانعت کے احکام کا اصل منشا یہی ہے۔ فتح الباری کے مصنف نے ان کا مذہب اس طرح نقل کیا ہے مگر ابن المنذر کہتا ہے کہ امام مالک کے قول کا مطلب یہ لینا چاہیے کہ اگر کرایہ اس غلے میں سے طے ہو جو کرایہ پر دی جانے والی زمین سے پیدا ہو گا، تو یہ ناجائز ہے، رہی یہ صورت کہ کرایہ پر لینے والا شخص ایک مقرر مقدار غلہ ادا کرنے کا ذمہ لے یا موجودہ غلے میں سے ادا کر دے تو اس کے جواز میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ خود زمین ہی کی پیداوار میں سے ایک حصہ کرائے کے طور پر مقرر کرنا جائز ہے بشرطیکہ تخم مالکِ زمین کا ہو۔ امام احمد کا یہ مذہب حازمی نے نقل کیا ہے۔[2]

حال ہی میں الفقه علی المذاهب الاربعه کے نام سے ایک نفیس کتاب مصر سے شائع ہوئی ہے جس میں اسلامی فقہ کے چاروں مذاہب کے احکام نہایت عمدہ ترتیب اور تفصیل کے ساتھ ان کی اصل کتابوں سے لے کر درج کیے گئے ہیں۔ اس کی تیسری جلد کے آغاز میں مزارعت کے مسئلے پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ ذیل میں ہم اس کا ایک ضروری خلاصہ درج کرتے ہیں تاکہ ہر شخص خود دیکھ لے کہ اس مسئلے میں فقہائے اسلام کے مختلف مذاہب کا فتویٰ کیا ہے۔

مذہب حنفی کی تفصیل

''مزارعت'' (یعنی بٹائی) دراصل مالک زمین اور عامل (کاشت کار) کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی رو سے یا تو عامل زمین کو اجرت پر لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی زمین میں کاشت کرے گا اور پیداوار کا ایک حصہ مالک زمین کو اجرت پر دے گا، یا مالکِ زمین عامل کی خدمات اجرت پر لیتا ہے اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کی زمین میں کام کرے گا اور پیداوار کا ایک حصہ اپنے کام کی اجرت میں پائے گا۔ اس نوعیت کا معاملہ حنفیہ میں مختلف فیہ ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ امام

---

[1] ان میں سے اکثر بزرگوں کی طرف اس مذہب کی نسبت صحیح نہیں ہے۔

[2] نیل الاوطار: ج ۵، ص ۲۳۲۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے۔ اور مذہبِ حنفی میں فتویٰ انھی دونوں بزرگوں کے قول پر ہے نہ کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول پر۔ لیکن خود امام ابوحنیفہ بھی مزارعت کو مطلقاً ناجائز نہیں فرماتے، بلکہ ان کے نزدیک اگر مالک زمین صرف زمین ہی دے کر الگ نہ ہو جائے بلکہ تخم اور ہل بیل وغیرہ میں بھی عامل کے ساتھ شریک ہو تو اس صورت میں پیداوار کی بٹائی پر معاملہ کرنا جائز ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک (جس پر مذہب حنفی میں فتویٰ ہے) مزارعت کی جائز صورتیں یہ ہیں:

۱۔ یہ کہ زمین ایک کی ہو اور تخم، آلاتِ زراعت، اور عمل دوسرے کا ہو اور فریقین میں یہ قرارداد ہو جائے کہ زمین کا مالک پیداوار کا اتنا حصہ (مثلاً آدھا)، تہائی یا چوتھائی) لے گا۔

۲۔ یہ کہ زمین اور تخم اور آلاتِ زراعت سب کچھ مالک کا ہو اور صرف عمل دوسرے شخص کا ہو اور پھر یہ طے ہو جائے کہ عامل کو پیداوار میں سے اتنا حصہ ملے گا۔

۳۔ یہ کہ زمین اور تخم مالک دے اور آلات زراعت اور عمل دوسرے کا ہو، اور پھر بٹائی میں دونوں کے حصے کا تناسب طے ہو جائے۔

۴۔ یہ کہ زمین بھی دونوں کی ہو، تخم بھی دونوں لائیں، آلات اور عمل میں بھی دونوں شریک ہوں، اور پھر آپس میں حصے مقرر کرلیں۔

اور اس معاملے کی ناجائز صورتیں یہ ہیں:

۱۔ یہ کہ زمین دونوں فریقوں کی ہو، اور ایک فریق زمین کے ساتھ صرف بیج دے اور دوسرا فریق زمین کے ساتھ صرف ہل بیل دے۔ (بعض علما نے اس صورت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے اگر کسی علاقے میں اس طریقے کا رواج عام ہو)۔

۲۔ یہ کہ ایک کی زمین ہو، دوسرے کا تخم ہو، تیسرے کے ہل بیل ہوں اور چوتھے کا عمل ہو۔ یا ہل بیل اور عمل تیسرے کا ہو۔

۳۔ یہ کہ تخم اور ہل بیل ایک کا ہو اور عمل اور زمین دوسرے کی ہو۔

۴۔ یہ کہ زمین ایک کی ہو، اور تخم میں دونوں شریک ہوں اور عمل کے بارے میں یہ شرط ہو کہ وہ مالکِ زمین کے سوا کوئی اور کرے گا۔

۵۔ یہ کہ کسی ایک فریق کا حصہ مقدار کی شکل میں (مثلاً ۵۰ من یا ۱۰۰ من) معین کیا جائے، یا وہ بٹائی کے حصے کے علاوہ ایک خاص مقدارِ غلہ زائد لے، یا اس زمین کی پیداوار کے علاوہ کوئی اور جنس باہر سے فراہم کر کے دینے کی ذمہ داری کسی فریق پر ڈالی جائے۔

مذہبِ حنبلی

حنابلہ کا مذہب اس معاملے میں تقریباً وہی ہے جو امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ہے فرق صرف یہ ہے کہ وہ اس بات کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ضروری قرار دیتے ہیں کہ تخم مالکِ زمین کو مہیا کرے۔

لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بعد میں مذہب حنبلی کے علمانے اس شرط میں کچھ ترمیم کردی۔ چنانچہ آگے چل کر جہاں الفقه علیٰ المذاهب الاربعه کا مصنف مذہبِ حنبلی کے تفصیلی احکام بیان کرتا ہے، وہاں وہ کہتا ہے:

صحیح یہ ہے کہ تخم مالکِ زمین کی طرف سے ہونا شرط نہیں ہے۔ دراصل شرط یہ ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک کچھ رأس المال دے۔ پس یہ صورت بھی صحیح ہے کہ ایک شخص صرف زمین دے اور دوسرا شخص تخم اور عمل اور آلاتِ زراعت کے ساتھ شریک ہو اور یہ بھی درست ہے کہ تخم یا ہل بیل یا دونوں مالکِ زمین کے ذمہ ہوں اور دوسرے کے ذمہ عمل اور تخم یا عمل اور ہل بیل ہوں۔ (الفقه علی المذاهب الاربعه: ص ۲۱)

مذہبِ مالکی

مالکیہ کے نزدیک مزارعت کی یہ صورت جائز نہیں ہے کہ ایک شخص زمین دے اور دوسرا تخم اور عمل اور آلات کے ساتھ شریک ہو، اور پیداوار کو دونوں فریق کسی طے شدہ تناسب کے مطابق آپس میں بانٹ لیں۔ اس کے بجائے مزارعت کی جو شکل وہ تجویز کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ زمین، عمل، اور آلات زراعت میں سے ہر ایک کی ایک قیمت روپے یا اموالِ تجارت (باستثنا غلہ) کے حساب سے مشخص کی جائے۔ مثلاً یہ کہ زمین کو اتنی مدت تک استعمال کرنے کی قیمت پچاس روپے یا اتنے گز کپڑا ہے اور اس مدت کے دوران میں جو زراعت کا عمل اس پر کیا جائے گا اس کی قیمت اتنے روپے یا اتنا کپڑا ہے اور اس مدت میں آلاتِ زراعت جن سے کام لیا جائے گا ان کے استعمال کی قیمت اس قدر ہے۔ پھر جو فریق ان میں سے جس جس چیز کے ساتھ شریک ہوگا اس کے متعلق یہ قرار دیا جائے گا کہ وہ گویا اتنے سرمایہ کے ساتھ اس مشترک کاروبار میں حصہ دار بن رہا ہے۔ مگر تخم لازماً دونوں فریق برابر برابر لائیں گے اور جو کچھ منافع اس مشترک کاروبار سے حاصل ہوگا وہ اس سرمایہ کی نسبت سے فریقین کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، جس کے ساتھ وہ شریک ہوئے ہیں۔

مذہبِ شافعی

شافعیہ کے نزدیک بٹائی کی تمام صورتیں ناجائز ہیں خواہ بیج اور زمین مالک دے یا بیج اور عمل کاشت کار کا ہو۔ ان کا خیال یہ ہے کہ زمین کی اجرت خود اسی زمین کی پیداوار میں سے مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں کاشت کار یہ جانے بغیر عمل کرتا ہے کہ اس کے حصے میں کتنا غلہ آئے گا، اس لیے یہ دھوکے کا سودا ہے۔ اس کے بجائے صحیح صورت یہ ہے کہ یا تو مالکِ زمین کاشت کار کی خدمات ایک مقرر اجرت پر حاصل کرے اور کھیتی مالک کی ہو۔ یا پھر کاشت کار ایک مقرر اُجرت پر مالک سے زمین لے لے اور کھیتی کاشت کار کی ہو۔ یہ صاف صاف معاملہ کرنے کے بجائے ایسا معاملہ کیوں کیا جائے جس میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فریقین کو کچھ معلوم نہ ہو کہ ان کے حصے میں کتنا کچھ غلہ آئے گا؟ شافعیہ کا کہنا یہ ہے کہ احادیث میں مخابرۃ اور مزارعت کی جو ممانعت وارد ہوئی ہے اس کا مطلب یہی ہے۔

لیکن شافعیہ کے نزدیک یہ جائز ہے کہ ایک شخص اپنا باغ دوسرے کو رکھوالی کے لیے دے اور اس کے عمل کی اجرت مقرر کرنے کے بجائے ثمرے میں اس کا حصہ طے کرے۔ نیز ان کے نزدیک یہ بھی جائز ہے کہ اگر باغ میں کچھ زمین زراعت کے لیے فارغ ہو تو اسی باغبان کو اس میں زراعت کی بھی اجازت دے دی جائے اور باغ کا مالک اس کی پیداوار میں سے اپنا حصہ بٹائی کے طریقے پر طے کرے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ مزارعت بجائے خود ایک مستقل معاملے کے طور پر نہ ہو بلکہ اسی باغبانی کے معاملے میں شامل اور اس کی تابع ہو، اور اسی شخص کے ساتھ طے ہو جس سے باغبانی کا معاملہ کیا گیا ہے۔

ان تفصیلات پر نگاہ ڈالنے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ فرقہ ظاہریہ کی ایک ذرا سی جماعت کو چھوڑ کر پوری امت کے ماہرین قانون میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں ہے کہ زرعی جایداد کی ملکیت کو صرف خود کاشتی کی حد تک محدود ہونا چاہیے، یا یہ کہ خود کاشتی کی حد سے زائد جتنی زمین آدمی کے پاس ہو اسے مفت دینے یا بے کار ڈال رکھنے کے سوا کوئی تیسری صورت اس کے استعمال کی شریعت میں نہیں ہے۔ زائد زمین کی کاشت دوسروں سے کرانے کی کیا صورت جائز ہے اور کیا ناجائز، اس میں تو صرف مختلف مذاہب کے درمیان اختلاف ہے، مگر فقہ کے ہر مذہب میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی ضرور جائز ہے جس سے ایک آدمی اپنی زمین کی کاشت دوسرے سے کرا سکتا ہے۔ (مسئلۂ ملکیت زمین، مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۵۲-۱۰۱)

زمین کے انتظام کے لیے تدابیرِ اصلاح

اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اصول اسلام کے مطابق ہم کس قسم کی اصلاحی تدابیر اختیار کر سکتے ہیں جن سے زمین کے انتظام کی موجودہ خرابیاں دور ہوں اور وہ انصاف قائم ہو سکے جو اسلامی معیار کے لحاظ سے مطلوب ہے۔

۱۔ زمینداری و جاگیرداری کا معاملہ

ہمارے ملک میں یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے کہ بعض جگہ بہت بڑے بڑے رقبے جو ہزاروں سے گزر کر لاکھوں ایکڑ تک بھی وسیع ہیں، کچھ خاندانوں کے پاس جاگیر یا زمینداری کے طور پر مدتوں چلے آ رہے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو انگریزی حکومت نے ملک پر قابض ہونے کے بعد غداریوں کے صلے میں اصل حق داروں سے چھین کر دیے تھے۔ بعض انگریزی دور سے بھی پہلے مختلف زمانوں میں جا و بے جا طریقوں سے موجودہ مالکوں کے اسلاف کو عطا کیے گئے تھے۔ بعض جزوی یا کلی طور پر خریدے بھی گئے تھے اور بعض ایسے بھی تھے کہ سرداران قبائل نے گزشتہ صدیوں میں کسی وقت ان پر قبضہ کر لیا تھا۔ ان سب کے متعلق آج یہ تحقیق کرنا سخت مشکل ہے کہ کس کی ملکیت کس طرح شروع ہوئی، اور آیا وہ شرعاً جائز نوعیت کی تھی یا ناجائز نوعیت کی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتنے بڑے بڑے رقبوں کی ملکیت سے، جن سب کا جائز ہونا بھی متحقق نہیں ہے، ہمارے نظام معیشت میں سخت ناہمواری پیدا ہوگئی ہے۔ اس حالت میں شرعاً یہ درست ہوگا کہ ایک عارضی تدبیر کے طور پر ملکیت کی ایک حد مقرر کر دی جائے اور اس حد سے زائد جو رقبے لوگوں کے پاس ہوں ان کو ایک منصفانہ شرح سے خرید کر آگے غیر مالک کاشت کاروں کے ہاتھ منصفانہ شرح پر فروخت کر دیا جائے۔ لیکن یہ حد بندی نہ تو دائمی ہو سکتی ہے، کیونکہ اسے شریعت کے بہت سے قواعد کو بدلے بغیر مستقل بنانا ممکن نہیں ہے، اور نہ اس کو دائمی قانون بنا دینے کی کوئی ضرورت ہے، کیونکہ آئندہ کے لیے اگر اسلام ملک کا قانون ہو اور اس کے مطابق عمل درآمد ہونے لگے تو سرے سے وہ خرابیاں ہی پیدا نہیں ہو سکتیں جن کے لیے ایسی حد بندی کی کوئی ضرورت ہو۔

۲۔ قانونی زراعت پیشگی کا خاتمہ

ثانیاً ایسے تمام قوانین کا خاتمہ ہونا چاہیے جن کی بدولت قانونی طور پر ایک مستقل ''زراعت پیشہ طبقہ'' پیدا کر دیا گیا ہے، دیہاتی معاشرت میں معاشی اور معاشرتی حیثیت سے اس کے امتیازی حقوق قائم کر دیے گئے ہیں، اور ''غیر زراعت پیشہ طبقوں'' کے لیے زراعت پیشگی کے دائرے میں قدم رکھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ غیر اسلامی ہے، غیر معقول ہے اور ان بے شمار بے انصافیوں کا سرچشمہ ہے جو ''نظام جاگیرداری'' کی خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں۔ زرعی جایدادوں کی خرید و فروخت پر سے تمام پابندیاں اٹھ جانی چاہییں۔ دوسری سب املاک کی طرح اور خود شہری زمینوں کی طرح دیہاتی زمینیں بھی کھلے بندوں قابل بیع و شرا ہونی چاہییں۔ شُفعہ کے قوانین نے جو قطعی غیر اسلامی اور انتہا درجہ غیر معقول اور سخت مخرب اخلاق صورت اختیار کر لی ہے اس کو منسوخ ہونا چاہیے۔ زراعت کا پیشہ تمام دوسرے پیشوں کی طرح ہر بندۂ خدا کے لیے کھلا رہنا چاہیے اور گاؤں کی زندگی میں زمین دار کو ازروئے قانون ایسی کوئی حیثیت حاصل نہ ہونی چاہیے جس کی بدولت دوسرے سب اس کی رعیت اور اس کے دبیل بن کر رہنے پر مجبور ہو جائیں۔

۳۔ زرعی قوانین کی تدوینِ جدید

ثالثاً ایک ایسا زرعی قانون بننا چاہیے جس کے ذریعے سے مالکانِ زمین اور غیر مالک کاشت کاروں کے باہمی تعلق کو صحیح اور منصفانہ بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ مزارعت (بٹائی) ہو تو اس کو بالکل سیدھی سادھی شرکت کے اصول پر قائم ہونا چاہیے اور ازروئے قانون یہ طے ہو جانا چاہیے کہ مزارعت کی کن کن صورتوں میں مالک اور مزارع کے درمیان زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کس کس نسبت سے حصہ تقسیم ہو سکتا ہے۔ نقد کرایہ ہو یا مزدوری پر کاشت کرائی جائے تو اس میں بھی مالک اور مستاجر کے درمیان، اور مالک اور مزدور کے درمیان حقوق و فرائض کا تعین ہو جانا چاہیے۔[1] یہ بھی طے ہونا چاہیے کہ مالکانِ زمین کاشت

[1] اگرچہ ان امور کو شریعت نے عُرف اور باہمی قرارداد پر چھوڑ دیا ہے، لیکن جہاں ظلم کی غیر معمولی صورتیں پیدا ہوگئی ہوں ایسی جگہ اسلامی حکومت کو اختیار ہے کہ انصاف قائم کرنے کے لیے ایسے امور میں مداخلت کریں اور واضح احکام مدون کر کے ظلم کی روک تھام کر دے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کاروں سے اپنے حصے یا لگان کے علاوہ کوئی مال یا غلہ یا خدمات لینے کے مجاز ہوں گے۔ ناجائز طور پر اس طرح کی خدمات یا اشیا یا زبردستی جمائے ہوئے رسمی حقوق وصول کرنے کو جرم قابلِ دست اندازی پولیس ہونا چاہیے۔ بے دخلی اور فسخِ معاملہ کے متعلق بھی قواعد مقرر ہونے چاہییں کہ وہ کن کن صورتوں میں ہو سکتی ہیں اور کن کن صورتوں میں نہیں ہو سکتیں۔ نیز زمین کو بے کار ڈال رکھنے پر بھی شریعت کے احکام اور اسپرٹ کے مطابق پابندیاں عائد ہونی چاہییں۔ جہاں تک موات اور حکومت کی عطا کردہ زمینوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں تو خود احکامِ شریعت ہی میں یہ تصریح ہے کہ تین سال سے زیادہ مدت تک اگر آدمی ان کو بے کار ڈال رکھے تو اس کے حقوق سوخت ہو جاتے ہیں۔ رہیں زرخرید زمینیں تو انھیں افتادہ چھوڑ دینے سے اگرچہ ملکیت ساقط نہیں ہو سکتی، لیکن اس پر ایسا کوئی تعزیری محصول ضرور لگایا جا سکتا ہے جس سے مالکانِ زمین کا میلان کم ہو سکے کہ وہ کاشت کاروں سے من مانی شرطیں تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اگر کاشت کار نہیں مانتے تو اپنی زمین کو بے کار رکھ چھوڑنا زیادہ پسند کرتے ہیں بہ نسبت اس کے کہ کسی بندۂ خدا کو اس پر کام کرنے کا موقع دیں۔

۴۔ شرعی طریقے پر تقسیمِ میراث

رابعاً شریعت کے قانونِ میراث کو زرعی جایدادوں کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔ موجودہ نسل ہی میں جو لوگ شرعاً حق دار ہیں اگر ان کے اندر میراث کی تقسیم کو لازم کر دیا جائے تو بہت سی وہ بڑی بڑی جایدادیں جو پرانے جاہلی رواج کی وجہ سے یکجا سمٹی ہوئی ہیں، مستحقین میں بٹ جائیں گی اور دولت کے پھیلاؤ کا سلسلہ چل پڑے گا۔ اس صورت میں یہ جو اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ زمین اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو جائے گی جو معاشی حیثیت سے قابلِ عمل نہ رہیں گے یہ درحقیقت صحیح نہیں ہے۔ آپ زمین کی خرید و فروخت سے بے جا رکاوٹیں ہٹا دیجیے۔ مزارعت کے لیے عمدہ اور واضح طریقے مقرر کر دیجیے۔ اور مشترک کاشت (کوآپریٹو فارمنگ) کے طریقوں کو رواج دیجیے۔ اس کے بعد چاہے قانونِ میراث کی بدولت زمین تقسیم در تقسیم ہو کر ایک ایک گز کے ٹکڑوں میں ہی کیوں نہ بٹ جائے ایسی صورت حال کبھی پیدا نہ ہونے پائے گی جس میں یہ حصے ناقابل عمل ہو کر رہ جائیں۔ جن لوگوں کے پاس اس طرح کے چھوٹے ٹکڑے رہ جائیں گے وہ بآسانی اپنا حصہ بیچ سکیں گے، یا دوسروں کے حصے خرید سکیں گے یا مناسب شرائط پر کاشت کے لیے دے سکیں گے، یا مشترک کاشت میں شریک ہو جائیں گے۔

۵۔ عُشر کی تحصیل و تقسیم کا نظم

خامساً شریعت کے احکام کے مطابق اس امر کا انتظام ہونا چاہیے کہ زرعی پیداوار کا عشر اور زمین داروں کے مواشی کی زکوٰۃ باقاعدہ وصول ہو اور اسے شرعی مصارف میں صرف کیا جائے۔ اسلامی معیار کے مطابق انصاف پر قائم کرنے، اور قوم کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مختلف طبقات میں عداوت ونزاع کے بجائے الفت وموافقت پیدا کرنے کے لیے یہ ایک ضروری تدبیر ہے جس کے فوائد کسی دوسری تدبیر سے حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

یہ ہے وہ اصل رخ جس کی طرف ہماری اصلاحی کوششوں کو مڑنا چاہیے۔ میں نے اس جگہ تمام ممکن تدابیر کا استقصا نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے کہ صاحبِ علم اور تجربہ کار اصحاب اس پر مزید تجویزوں کا اضافہ کریں۔ میرا مدعا یہاں صرف یہ دکھانا تھا کہ اصلاحِ احوال کی مساعی کا صحیح رخ وہ نہیں ہے جس کی طرف قلم اور قدم چل پڑے ہیں، بلکہ یہ ہے جس کی طرف اسلام ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ وَمَا تَوۡفِیۡقِیۡۤ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ

(مسئلہ ملکیت زمین: مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۱۱۰-۱۱۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

اسلام اور قانونِ وراثت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

تقسیمِ میراث کا قانون

کسی مرد یا عورت کی وفات پر اس کے متروکہ مال کے متعلق قرآن کا قانون یہ ہے کہ یہ مال اس کے والدین، اس کی اولاد اور اس کی بیوی یا شوہر کے درمیان ایک مقرر نسبت کے ساتھ تقسیم کیا جائے اور اگر والدین اور اولاد نہ ہوں تو اس کے حقیقی اور علاتی اور اخیافی (یعنی صرف ماں شریک اور صرف باپ شریک) بھائی بہنوں کو حصہ دیا جائے۔ اس کے متعلق مفصل احکام سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں۔[1] (ملاحظہ ہو آیت ۷ تا ۱۲ اور آیت ۱۷۶)[2]

---

[1] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی جو تشریح فرمائی ہے اس کی رُو سے قریب ترین رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں میراث قریب تر رشتہ داروں کو پہنچے گی اور ان کی غیر موجودگی میں بدرجہ آخر اسے ان لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا جو غیروں کی بہ نسبت میت سے کوئی قرابت رکھتے ہوں۔ لیکن اگر کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو تو پھر یہ مال اسلامی حکومت کے خزانے میں داخل ہوگا۔ (نیل الاوطار، ج ۶ ص ۴۷-۵۶)

[2] لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ (النساء ۴: ۷-۸)

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ [اللہ کی طرف سے] مقرر ہے۔ اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ (النساء ۴: ۹-۱۰)

لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (النساء ۴: ۱۱)

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اگر [میت کی وارث] دو...... (بقیہ اگلے صفحہ پر)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس معاملے میں قرآن نے جو اصول اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو مال ایک شخص کی زندگی میں یکجا مرتکز ہو گیا ہو وہ اس کے مرنے کے بعد مرتکز نہ رہنے دیا جائے بلکہ اس کے قرابت داروں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ اصول توریث خلفِ اکبر (Primo geniture) اور مشترک خاندانی جائداد (Joint Family System) اور ایسے ہی دوسرے طریقوں کے برعکس ہے، جن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مرتکز شدہ دولت مرنے والے کے بعد بھی مرتکز ہی رہے۔

کیا متبنّٰی وارث ہے؟

اسی طرح قرآن متبنّٰی بنانے کے طریقے کو بھی رد کر دیتا ہے اور یہ قاعدہ مقرر کرتا ہے کہ جو لوگ واقعی رشتہ دار ہیں، میراث میں حق انھی کا ہے، کسی غیر آدمی کو بیٹا بنا کر مصنوعی طور پر وارث نہیں بنایا جا سکتا:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ (الاحزاب ۳۳:۴)

اللہ نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا بیٹا نہیں بنایا ہے، یہ تو ایک بات ہے جو تم بس اپنے منہ سے نکالتے ہو۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الاحزاب ۳۳:۶)

اور رشتہ دار ہی اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

لیکن حقیقی وارث رشتہ داروں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کر دینے کے بعد قرآن ان کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ تقسیم

(بقیہ سابقہ صفحہ)...... سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔ اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے۔ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصہ کی حق دار ہو گی یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاۗءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَاۗرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ؀ (النساء ۴:۱۲)

اور تمھاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمھیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصہ تمھارا ہے جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ وہ تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔ اور اگر وہ مرد یا عورت [جس کی میراث تقسیم طلب ہے] بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔ اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے، جب کہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میراث کے موقع پر جو غیر وارث رشتہ دار آئیں ان کو بھی وہ اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ دیں:

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ۔ (النساء ۴: ۸-۹)

اور جب تقسیم کے موقع پر رشتہ دار اور یتیم اور مسکین لوگ آئیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دو اور ان سے اچھی طرح بات کرو لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ رہے ہوتے تو انھیں کیسے کیسے اندیشے لاحق ہوتے، پس چاہیے کہ لوگ اللہ سے ڈریں۔

وصیت کا قاعدہ

قرآن مجید وراثت کا قانون مقرر کرنے کے ساتھ آدمی کو یہ ہدایت بھی دیتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکے کے بارے میں وصیت کردے:

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (البقرہ ۲: ۱۸۰)

تم پر لکھ دیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ کافی مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے جائز طریقے پر وصیت کردے، یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

اس حکم کا منشا یہ ہے کہ ایک تو مرنے والا خصوصیت کے ساتھ اپنے والدین کے حق میں اپنی اولاد کو حسنِ سلوک کی وصیت کر جائے، کیوں کہ ان سے بوڑھے دادا دادی کی خدمت کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ دوسرے اس کے خاندان میں جو افراد ایسے ہوں جنھیں قانون کے مطابق میراث میں سے حصہ نہیں پہنچتا، مگر مرنے والا انھیں مدد کا مستحق سمجھتا ہو تو انھیں اپنے ترکے میں سے حصہ دینے کی وصیت کردے۔ اس کے علاوہ ایک شخص اگر بہت مال چھوڑ رہا ہو تو وہ رفاہ عام کے کاموں کے لیے بھی وصیت کرنے کا مجاز ہے۔ کیوں کہ مذکورہ بالا آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وصیت کی اجازت صرف والدین اور رشتہ داروں تک ہی محدود رہے۔[1]

وصیت اور میراث کے اس قانون سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شخصی املاک کے ترکوں کے معاملے میں اسلامی اسکیم یہ ہے کہ دو تہائی تو لازماً قانونِ میراث کے مطابق تقسیم ہو، اور ایک تہائی مرنے والے کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس غرض کے لیے چاہے اسے صرف کرنے کی وصیت کردے، بشرطیکہ وہ جائز طریقے پر ہو، یعنی وہ کام بھی جائز ہو جس

[1] نیل الاوطار، ج ۶، ص ۳۲-۳۳۔ اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح سے قرآن کا جو منشا معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے لیے اپنے رشتہ داروں کو غریب و محتاج چھوڑ کر رفاہ عام پر خرچ کرنے کی وصیت کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں بخاری، مسلم اور دوسری کتب حدیث سے آنحضرتؐ کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں وہ یہ ہے کہ تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انھیں اس حال میں چھوڑے کہ وہ محتاج ہوں اور لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لیے وصیت کی گئی ہے اور اس میں کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو۔[۱]

نادان لوگوں کے مفاد کی حفاظت

جو لوگ خفیف العقل ہونے کی وجہ سے اپنی املاک میں صحیح تصرف نہ کر سکتے ہوں اور ان کو ضائع کر رہے ہوں، یا بجا طور پر اندیشہ ہو کہ ضائع کر دیں گے، ان کے بارے میں قرآن ہدایت کرتا ہے کہ ان کی املاک ان کے اختیار میں نہ دی جائیں، بلکہ وہ ان کے سرپرست یا قاضی کے انتظام میں رہیں اور انھیں صرف اس وقت سونپی جائیں جب اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ وہ اپنے معاملات کو ٹھیک طرح سنبھال سکیں گے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاۗءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْھُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْھُمْ وَقُوْلُوْا لَھُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۝ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْھُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْھِمْ اَمْوَالَھُمْ ۚ ۔ (النساء۴: ۵-۶)

اور اپنے اموال، جنھیں اللہ نے تمھارے لیے زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔ البتہ انھیں اس میں سے کھلاؤ اور پہناؤ اور ان سے معقول بات کرو۔ اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں اور تم ان میں ہوش مندی محسوس کرو تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔

اس آیت میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا ہے کہ شخصی املاک اگرچہ ان اشخاص ہی کی ملک ہیں جو ان پر قانوناً حق ملکیت رکھتے ہیں، لیکن وہ بالکلیہ انھی کی نہیں ہیں، بلکہ ان کے ساتھ اجتماعی مفاد بھی وابستہ ہے۔ اسی بنا پر قرآن اموالھم (ان کے مال) کہنے کے بجائے اموالکم (تمھارے مال) کے الفاظ استعمال کرتا ہے اور اسی بنیاد پر وہ سرپرستوں اور قاضیوں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ جہاں شخصی املاک میں بے جا تصرف سے معاشرے کا اجتماعی نقصان کیا جا رہا ہو، یا ایسے نقصان کا معقول اندیشہ ہو، وہاں مالک کے حق ملکیت اور حق انتفاع کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا حق تصرف اپنے ہاتھ میں لے لیں۔[۲]

سرکاری املاک میں اجتماعی مفاد کا لحاظ

جو جائدادیں اور اموال اور آمدنیاں حکومت کی ملک ہوں، ان کے بارے میں قرآن ہدایت کرتا ہے کہ ان کا صرف محض دولت مند طبقوں کے مفاد میں نہیں بلکہ عام لوگوں کے مفاد میں ہونا چاہیے اور خصوصیت کے ساتھ ان کے صرف میں معاشرے کے کمزور طبقات کی بھلائی کا زیادہ لحاظ رکھا جانا چاہیے:

۱۔ وصیت کے قانون کی تشریح کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حق وصیت پر تین حدود عائد کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ اپنے ایک تہائی مال کی حد تک وصیت کے اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو از روئے قانون وراثت کا حصہ پہنچتا ہو ان کے لیے کوئی وصیت دوسرے وارثوں کی رضامندی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ تیسرے یہ کہ کسی وارث کی وراثت سے محروم کرنے یا اس کے حصے میں کمی کرنے کی وصیت نہیں کی جا سکتی۔ (نیل الاوطار، ج ۶، ص ۳۱-۳۵)

۲۔ ابن العربی، احکام القرآن، ج ۱، ص ۱۳۳۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۴۵۲۔ الجصاص، احکام القرآن، ج ۲، ص ۷۲-۷۳۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ .... لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ .... وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ .... وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (الحشر ۵۹: ۷ تا ۱۰)

جو کچھ پھیر دے اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں کے لوگوں سے وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے[1] اور قرابت داروں کے لیے[2] اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافر کے لیے، تاکہ یہ مال صرف تمھارے مال داروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے......... نیز وہ ان غریب مہاجرین کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال دیے گئے ہیں......... اور وہاں انصار کا حق بھی ہے جو مہاجرین کے آنے سے پہلے ایمان کے ساتھ دارالاسلام میں مقیم تھے......... اور اس میں بعد کے آنے والوں کا حق بھی ہے۔

ٹیکس عائد کرنے کے متعلق اسلام کا اصولی ضابطہ

ٹیکس عائد کرنے کے بارے میں قرآن اس اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ٹیکسوں کا بار صرف ان لوگوں پر پڑنا چاہیے جو اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھتے ہوں اور ان کی دولت کے بھی صرف اس حصے پر یہ بار ڈالا جانا چاہیے جو ان کی ضرورت سے زائد بچتا ہو:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (البقرۃ ۲: ۲۱۹)

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہو جو کچھ تمھاری ضرورت سے بچے۔

اسلامی نظامِ معیشت کی خصوصیات

قرآن کے ان ۲۲ نکات میں انسان کی معاشی زندگی کے لیے جو اسکیم مرتب کی گئی ہے اس کے بنیادی اصول اور نمایاں خصائص یہ ہیں:

۱۔ یہ اسکیم معاشی انصاف ایسے طریقے سے قائم کرتی ہے جس سے ایک طرف ہر طرح کے معاشی ظلم اور بے جا استحصال کا سد باب بھی ہو اور دوسری طرف معاشرے میں اخلاقی فضائل کا نشو ونما بھی ہو سکے۔ قرآن کے پیش نظر ایسا معاشرہ بنانا نہیں ہے جس میں کوئی کسی کے ساتھ خود نیکی نہ کر سکے اور افراد کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا ہر کام ایک اجتماعی مشین کے ذریعے سے ہوتا رہے، کیوں کہ اس طرح کے معاشرے میں اخلاقی فضائل کے نشو ونما کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ قرآن اس کے برعکس وہ معاشرہ بناتا ہے جس میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ رضا کارانہ اور بے غرضانہ فیاضی، ہمدردی اور احسان کا برتاؤ کریں اور اس کی بدولت ان کے درمیان آپس کی محبت فروغ پائے۔ اس غرض کے لیے وہ زیادہ تر انحصار لوگوں کے اندر ایمان پیدا کرنے اور ان کو

---

[1] اس سے مراد اسلامی ریاست کے نظم ونسق اور دفاع کے مصارف ہیں۔ اسی مد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفا اپنا گزارہ لیتے تھے اور اپنے عمّال (باستثناء عاملین زکوٰۃ) کی تنخواہیں بھی دیتے تھے۔ عاملین زکوٰۃ کی تنخواہیں خود مالِ زکوٰۃ میں سے دی جاتی تھیں۔

[2] سورہ الحشر حاشیہ نمبر ۲۰

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تعلیم و تربیت کے ذریعے سے بہتر انسان بنانے کی تدبیروں پر کرتا ہے۔ پھر جو کسر باقی رہ جاتی ہے اس کو پورا کرنے کے لیے وہ ان جبری احکام سے کام لیتا ہے جو اجتماعی فلاح کے لیے ناگزیر ہیں۔

۲۔ اس میں معاشی اقدار کو اخلاقی اقدار سے الگ رکھنے کے بجائے دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے اور معیشت کے مسائل کو مجرد معاشی نقطۂ نظر سے لے کر حل کرنے کے بجائے انھیں اس مجموعی نظام حیات کے تناسب میں رکھ کر حل کیا گیا ہے جس کی عمارت اسلام نے کلیتہً خدا پرستانہ تصورِ کائنات و فلسفۂ اخلاق پر استوار کی ہے۔

۳۔ اس میں زمین کے معاشی وسائل و ذرائع کو نوعِ انسانی پر خدا کا فضل عام قرار دیا گیا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ شخصی، گروہی یا قومی اجارہ داریوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور اس کے بجائے خدا کی زمین پر بنی نوع انسان کو اکتساب رزق کے زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک کھلے مواقع دیے جائیں۔

۴۔ اس میں افراد کو شخصی ملکیت کا حق دیا گیا ہے مگر غیر محدود نہیں۔ فرد کے حق ملکیت پر دوسرے افراد اور معاشرے کے مفاد کی خاطر ضروری پابندیاں عائد کرنے کے ساتھ یہ اسکیم ہر فرد کے مال میں اس کے اقربا ہمسایوں، دوستوں، حاجت مندوں اور کم نصیب انسانوں اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کے حقوق بھی قائم کرتی ہے۔ ان حقوق میں سے بعض جبری طور پر قابل تنفیذ ہیں اور بعض کو سمجھنے اور ادا کرنے کے لیے خود افراد کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے ذریعے سے تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے۔

۵۔ انسانی زندگی کے معاشی نظام کو چلانے کی فطری صورت اس اسکیم کی رو سے یہ ہے کہ افراد اُسے آزادانہ سعی و جہد کے ذریعے سے چلائیں اور ترقی دیں۔ لیکن یہ آزادانہ سعی و جہد اس میں بے قید نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ معاشرے کی اور خود ان افراد کی اپنی اخلاقی و تمدنی اور معاشی بھلائی کے لیے اسے بعض حدود سے محدود کیا گیا ہے۔

۶۔ اس میں عورت اور مرد دونوں کو ان کی کمائی ہوئی اور میراث یا دوسرے جائز ذرائع سے پائی ہوئی دولت کا یکساں مالک قرار دیا گیا ہے اور دونوں صنفوں کو اپنے حق ملکیت سے متمتع ہونے کے یکساں حقوق دیے گئے ہیں۔

۷۔ اس میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف تو لوگوں کو بخیلی اور رہبانیت سے روک کر خدا کی نعمتوں کے استعمال پر ابھارا گیا ہے اور دوسری طرف انھیں اسراف اور فضول خرچی اور عیاشی سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

۸۔ اس میں معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ دولت کا بہاؤ نہ تو غلط ذرائع سے کسی خاص سمت میں چل پڑے اور نہ جائز ذرائع سے آئی ہوئی دولت کہیں ایک جگہ سمٹ کر بے کار رک رہ جائے۔ اس کے ساتھ یہ انتظام بھی کرتی ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ استعمال اور گردش میں آئے اور اس کی گردش سے خصوصیت کے ساتھ ان عناصر کو حصہ ملے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنا مناسب حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۹۔ یہ اسکیم معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے قانون اور ریاست کی مداخلت پر زیادہ انحصار نہیں کرتی۔ چند ناگزیر تدابیر کو ریاست کی ذمہ داری قرار دینے کے بعد وہ اس مقصد کے لیے اپنی بقیہ تدابیر کا نفاذ افراد کی ذہنی و اخلاقی تربیت اور معاشرے کی اصلاح کے ذریعے سے کرتی ہے تاکہ آزاد سعی و جہد کی معیشت کے منطقی تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے معاشی انصاف کا مقصد حاصل ہو سکے۔

۱۰۔ معاشرے کے مختلف عناصر میں طبقاتی کش مکش پیدا کرنے کے بجائے وہ اس کے اسباب کو ختم کر کے ان کے درمیان تعاون اور رفاقت کی روح پیدا کرتی ہے۔

یہ اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جس طرح عملاً ریاست اور معاشرے کے نظام میں نافذ کیے گئے تھے اس سے ہم کو احکام اور نظائر کی شکل میں بہت سی مزید تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔لیکن یہ بحث اس باب کے موضوع سے خارج ہے۔اس کے متعلق حدیث، فقہ، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں وسیع مواد موجود ہے جس کی طرف تفصیلات کے لیے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

اس میں فقہائے امت کے درمیان ایسا مکمل اتفاق ہے تو پھر کوئی شخص بھی اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فقہائے اسلام یا تو قرآن کی سمجھ نہیں رکھتے تھے، یا پھر وہ سب جان بوجھ کر قرآن کی خلاف ورزی پر متفق ہو گئے تھے۔

میراث کے متعلق قرآن وسنت کے اصولی احکام

۱۔ میراث کا مسئلہ مورث کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے

میراث کا سوال آدمی کی زندگی میں نہیں بلکہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ کچھ مال چھوڑ کر مر گیا ہو۔قرآن میں اس بنیادی قاعدے کو متعدد مقامات پر وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ایک جگہ فرمایا:

مردوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب تر رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لیے اس مال میں سے حصہ ہے جو والدین اور قریب تر رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔(النساء ۴:۷)

دوسری جگہ فرمایا:

اگر کوئی شخص ہلاک ہو جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو جو کچھ اس نے چھوڑا اس کا نصف بہن کے لیے ہے۔ (النساء ۴:۱۷۶)

اسی طرح سورۂ نساء کی آیت ۱۱، ۱۲ میں میراث کا قانون بیان کرتے ہوئے بار بار تَرَکَ اور تَرَکْتُمْ اور تَرَکْنَ کے الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ وراثت کا حکم صرف ترکے سے متعلق ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مذکورہ بالا بنیادی قاعدے سے جو اصول نکلتے ہیں وہ یہ ہیں:

(الف) میراث کا کوئی حق مورث کی موت سے پہلے پیدا نہیں ہوتا۔

(ب) میراث کے حقوق صرف ان لوگوں کو پہنچتے ہیں جو مورث کی موت کے بعد فی الواقع زندہ موجود ہوں، نہ کہ زندہ فرض کر لیے گئے ہوں۔

(ج) مورث کی زندگی ہی میں جو لوگ وفات پا چکے ہوں، ان کا کوئی حق اس کے ترکے میں نہیں ہے، کیونکہ وہ اس وقت مر چکے تھے جب کہ سرے سے کوئی حق وراثت پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا کوئی شخص ان پہلے فوت شدہ لوگوں کا وارث یا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے مورث کے ترکے میں اپنے کسی حق کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ البتہ اگر وہ بجائے خود اپنا کوئی شرعی حق اس کی میراث میں رکھتا ہو تو وہ اسے پا سکتا ہے۔

۲۔ میراث کی تقسیم خدمات پر نہیں، قرب پر ہے۔ مورث کے وفات پا جانے پر جو لوگ زندہ ہوں ان کے درمیان میراث تقسیم کرنے کے لیے قرآن جو قاعدہ مقرر کرتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ جو حاجت مند یا قابل رحم ہو اس کو دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ جو رشتے میں مورث سے قریب تر ہو، یا بالفاظ دیگر مورث جس سے رشتے میں قریب تر ہو، وہ حصہ پائے اور قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر حصہ نہ پائے۔ یہ قاعدہ سورۂ نساء کی آیت ۷ کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

اس مال میں سے جو چھوڑا ہو والدین اور قریب تر رشتہ داروں نے۔

۳۔ قریب ترین رشتہ دار کون ہیں؟ ایک آدمی کے قریب ترین رشتہ دار کون ہیں، اس کو قرآن خود بیان کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا کتنا حصہ ہے۔ اس کے بیان کی رو سے وہ رشتہ دار یہ ہیں۔

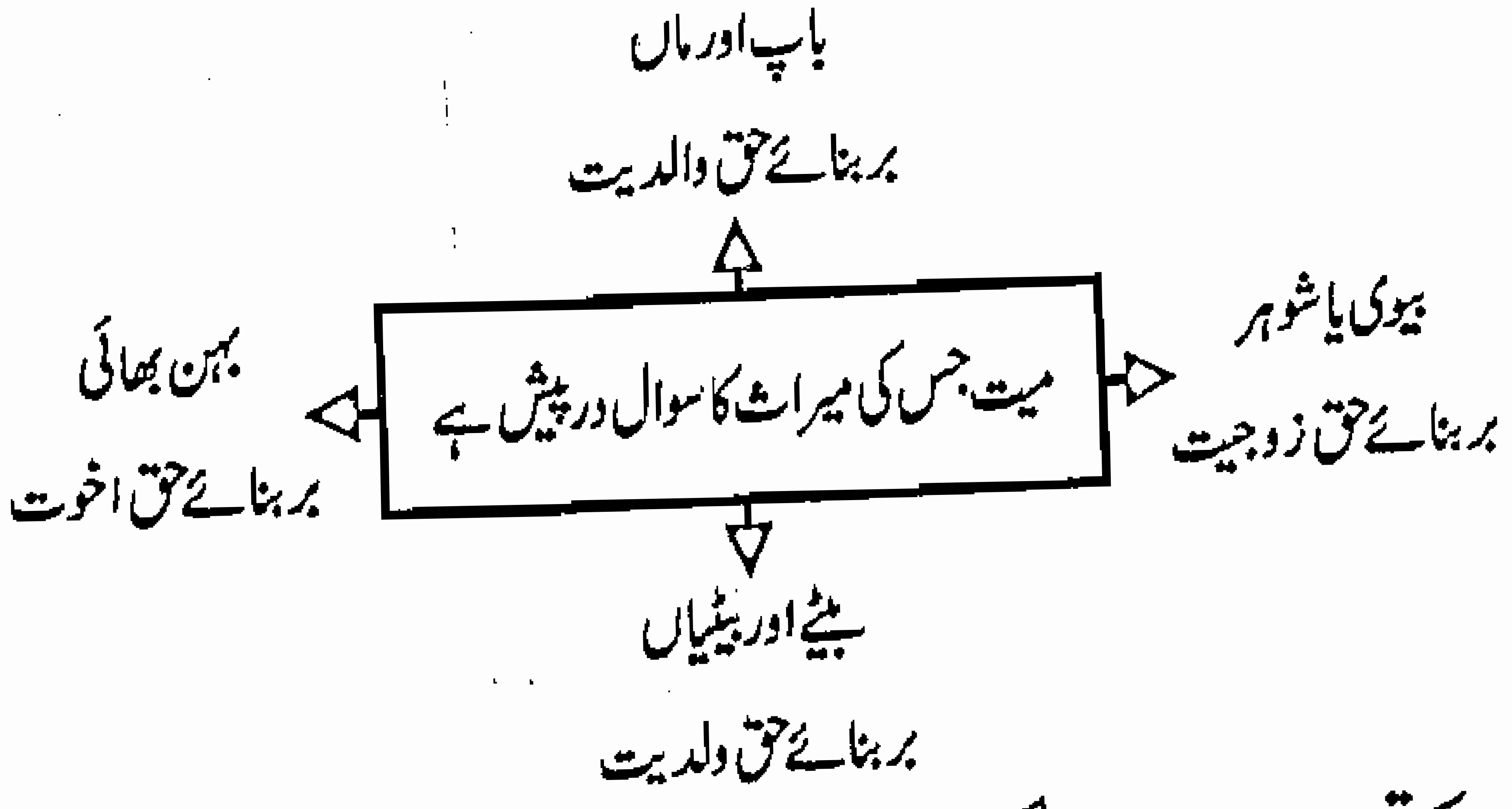

۴۔ وراثت میت کے قریبی ہونے پر ملے گی: تقسیم وراثت کی اس اسکیم میں جس رشتہ دار کو بھی کوئی حصہ ملتا ہے میت کے ساتھ خود اپنے قریبی تعلق کی بنا پر ملتا ہے۔ کوئی دوسرا نہ تو قریبی حق دار کی موجودگی میں اس کے حق کا شریک بن سکتا ہے، اور نہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا قائم مقام بن کر اس کا حصہ لے سکتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(الف) حق پدری حقیقی ماں، باپ کو ملے گا: حق مادری و پدری میت کے حقیقی ماں اور باپ کو پہنچتا ہے، ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا اس حق کو نہیں پا سکتا۔ البتہ اگر باپ نہ ہو تو حق پدری دادا کو اور دادا بھی نہ ہو تو پردادا کو پہنچے گا۔ اسی طرح اگر ماں نہ ہو تو حق مادری دادی اور نانی کو اور دادی اور نانی بھی نہ ہوں تو پردادی اور پرنانی کو پہنچ جائے گا۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ حقیقی ماں باپ کے قائم مقام ہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ کی غیر موجودگی میں باپ کا باپ اور ماں کی غیر موجودگی میں ماں کی ماں اور باپ کی ماں خود حق پدری و مادری رکھتے ہیں۔

(ب) حق ولدیت کے مستحق افراد: حق ولدیت صرف انھی بیٹوں اور بیٹیوں کو پہنچتا ہے جو میت کے نطفے یا اس کے بطن سے پیدا ہوئے ہوں۔ ان کی موجودگی میں یہ حق کسی طرح بھی اولاد کی اولاد کو نہیں پہنچ سکتا۔ البتہ اگر ان میں سے کوئی بھی موجود نہ ہو تو حق ولدیت اولاد کی اولاد کو پہنچ سکتا ہے۔ باپ اور ماں کے برعکس ایک آدمی کے بچے چونکہ بہت سے ہو سکتے ہیں اس لیے یہ بات اکثر پیش آتی ہے کہ ایک یا چند بچے آدمی کی زندگی میں مر جائیں اور ایک یا چند بچے اس کے مرنے کے بعد زندہ رہیں۔ اسی وجہ سے حق والدیت کے برعکس حق ولدیت کے معاملے میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ اولاد کی موجودگی میں اولاد کی اولاد کو میراث نہیں پہنچتی۔ اس معاملے کی اصولی نوعیت کو جو لوگ نہیں سمجھتے وہ اس صورتِ حال کو دیکھ کر یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ جب باپ کے مرنے پر حق والدیت دادا کو پہنچ جاتا ہے تو بیٹے کے مر جانے کی صورت میں حق ولدیت پوتے کو کیوں نہیں پہنچتا؟ حالانکہ یہ اعتراض اگر صحیح ہو سکتا تھا تو صرف اس صورت میں جب کہ ایک آدمی بیک وقت تین چار آدمیوں کا بیٹا ہوتا اور پھر ان میں سے کسی ایک کے مر جانے پر دادا کو حصہ پہنچ جاتا، یا پھر ایک آدمی کی زندگی میں اس کی ساری اولاد کے مر جانے کے باوجود اس آدمی کے پوتوں پوتیوں کو حصہ نہ دیا جاتا۔ پھر یہ لوگ اس پر مزید ایک غلطی یہ کرتے ہیں کہ باپ کی غیر موجودگی میں دادا کے حقِ پدری پانے کو "قائم مقامی" (Representation) کے قاعدے پر مبنی سمجھ لیتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ جس طرح باپ کے سر کتے ہی دادا اس کی جگہ آ کھڑا ہوتا ہے اسی طرح بیٹے کے سر کتے ہی پوتے کو اس کی جگہ آ کھڑا ہونے کی اجازت دی جائے۔ حالانکہ یہ معاملہ راشن ڈپو کے خریداروں کی قطار کا نہیں ہے بلکہ اصول قرب و بعد کا ہے۔ جب تک وہ شخص موجود ہے جس کا ایک آدمی براہ راست نطفہ ہے اس وقت تک حق پدری کسی ایسے شخص کو نہیں پہنچ سکتا جس کا وہ بالواسطہ نطفہ ہو۔ اسی طرح جب تک وہ اولاد موجود ہے جو آدمی کی صلب سے براہ راست پیدا ہوئی ہے اس وقت تک بالواسطہ اولاد بھی "اولاد" کا حق لینے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں دادا اس بنا پر حق پدری نہیں پاتا کہ وہ باپ کی جگہ آ کھڑا ہوا ہے بلکہ اس بنا پر پاتا ہے کہ بلاواسطہ پدر کی غیر موجودگی میں بالواسطہ پدر خود یہ حق رکھتا ہے۔

ج۔ حق زوجیت کا حق: حق زوجیت صرف اس شخص کو پہنچ سکتا ہے جس سے میت کا اپنا ازدواجی رشتہ ہو اور چونکہ یہ رشتہ بالواسطہ نہیں ہو سکتا اس لیے مورث کی زندگی میں شوہر یا بیوی کے مر جانے سے اس کا حق میراث بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ قائم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقامی کا اصول یہاں بھی نہیں پایا جاتا کہ شوہر کے جینِ حیات اگر بیوی مر چکی ہو تو اس کے وارثوں میں سے کوئی اس کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے شوہر کے ترکے میں سے حقِ زوجیت مانگ سکے، یا شوہر بیوی کی زندگی میں مر چکا ہو تو اس کے وارثوں میں سے کوئی عورت کے مال میں سے حقِ زوجیت کا طلب گار ہو سکے۔

د۔ حقِ اخوت کا حق: حقِ اخوت اولاد اور باپ کے نہ ہونے کی صورت میں صرف بھائی بہنوں ہی کو پہنچتا ہے۔ خواہ وہ حقیقی ہوں یا علاتی (یعنی باپ کی طرف سے) یا اخیافی (یعنی ماں کی طرف سے)۔ قائم مقامی کا اصول یہاں بھی نہیں ہے کہ بھائی کی غیر موجودگی میں اس کی اولاد قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اس کا حصہ پائے۔ بھتیجوں کو اگر حصہ پہنچے گا تو ذوی الفروض کے نہ ہونے کی صورت میں، یا ذوی الفروض کے حصے ادا ہو جانے کے بعد عصبات ہونے کی حیثیت سے اپنے ذاتی حق کی بنا پر پہنچے گا نہ کہ کسی کا قائم مقام ہونے کی حیثیت سے۔

۵۔ قرآن مجید کے بیان کردہ حصے دار: قرآن مجید نے صرف ان رشتہ داروں کے حقوق بیان کیے ہیں جو مذکورہ بالا چار حقوق میں سے کوئی حق رکھتے ہوں اور ان کے حصے اس نے خود مقرر کر دیے ہیں۔ اس کے بعد دو سوالات کا جواب باقی رہ جاتا ہے۔ اول یہ کہ قرآن نے جو حصے مقرر کر دیے ہیں ان کو ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ کہاں جائے گا؟ اور دوم یہ کہ قرآن نے جن رشتہ داروں کے حقوق مقرر کیے ہیں وہ اگر نہ ہوں تو کن کو وراثت پہنچے گی؟ ان دونوں سوالات کا جواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مستند شارح قرآن ہونے کی حیثیت سے خود قرآن ہی کے اشارات کی بنا پر یہ دیا ہے کہ قریب ترین رشتہ داروں کے حق ادا ہو چکنے کے بعد یا ان کی غیر موجودگی میں حقِ میراث ان قریب تر جدی رشتہ داروں کو پہنچے گا جو ایک آدمی کے فطرتاً پشتیبان اور حامی و ناصر ہوتے ہیں۔ یہی معنی ہیں ''عصبات'' کے یعنی آدمی کے وہ اہلِ خاندان جو اس کے لیے تعصب کرنے والے ہوں اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو پھر یہ حق ''ذوی الارحام'' (رحمی رشتہ داروں مثلاً ماموں، نانا، بھانجے اور بیٹی یا پوتی کی اولاد) کو دیا جائے گا۔ یہاں بھی نہ تو قائم مقامی کا اصول کام کرتا ہے اور نہ یہ اصول کہ جو محتاج اور قابلِ رحم ہو اس کو میراث دی جائے۔ بلکہ قرآن کے بتائے ہوئے چار اصول اس معاملے میں کارفرما ہیں:

ایک یہ کہ قریب ترین کے بعد حصہ قریب تر کو پہنچے گا اور قریب تر کی موجودگی میں بعید تر حصہ نہ پائے گا۔ (مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ)

دوسرے یہ کہ غیر ذوی الفروض کو وارث قرار دینے میں یہ دیکھا جائے گا کہ میت کے لیے نفع کے لحاظ سے قریب تر، یعنی اس کی حمایت و نصرت میں فطرتاً زیادہ سرگرم کون ہو سکتے ہیں۔ (اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا)

تیسرے یہ کہ عورتوں کی بہ نسبت مرد فطرۃً عصبہ ہونے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن ماں اور باپ میں سے عصبہ باپ کو قرار دیتا ہے اور اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ فرض حصے ادا کرنے کے بعد ماقبی ترکہ قریب ترین مرد کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دو۔ لیکن بعض حالات میں عورت بھی عصبہ ہو سکتی ہے، مثلاً یہ کہ میت کی وارث بیٹیاں ہی ہوں اور کوئی مرد عصبہ موجود نہ ہو تو بیٹیوں کا حصۂ فرض ادا کرنے کے بعد باقی میت کی بہن کو دیا جائے گا کیونکہ وہ اس کی پشتیبان ہوتی ہے۔

چوتھا اصول قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے کہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ (رحمی رشتہ دار اجنبیوں کی بہ نسبت ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں)۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اَلْخَالُ وَارِثُ مَنْ لَا وَارِثَ لَهٗ (جس کا کوئی اور وارث نہ ہو اس کا وارث اس کا ماموں ہے)۔

یہ ہیں تقسیم میراث کے اسلامی اصول جن کو سمجھنے میں کوئی ایسا شخص غلطی نہیں کر سکتا جس نے کبھی قرآن کو سمجھ کر پڑھا ہو اور اس کے مضمرات پر غور کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ عصبات کی تعیین اور ذوی الارحام کی میراث کے مسائل کو چھوڑ کر قانونِ وراثت کے بنیادی اصولوں میں تمام امت کے علما شروع سے آج تک متفق رہے ہیں اور زمانہ حال سے پہلے کبھی اسلامی تاریخ کے دوران میں یہ آواز نہیں سنی گئی کہ قرآن کے اس قانون کو سمجھنے میں ساری امت کے علما بالاتفاق غلطی کر گئے ہیں۔

قائم مقامی کے اصول کی غلطی

اب میں یہ بتاؤں گا کہ فوت شدہ بیٹے اور بیٹی کی اولاد کو وارث قرار دینے پر اصولاً کیا اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور یہ تجویز ایک معقول اور منظم قانونِ میراث کو کس طرح غیر معقول اور پراگندہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

پہلا اعتراض اور اس کا جواب

اس پر پہلا اعتراض یہ ہے کہ یہ اسلامی قانونِ میراث میں ''قائم مقامی'' کا ایک بالکل غلط نظریہ داخل کر دیتی ہے جس کا کوئی ثبوت قرآن میں ہم کو نہیں ملتا۔ قرآن کی رو سے جو شخص بھی میراث کا کوئی حصہ پاتا ہے خود میت کا اقرب ہونے کی حیثیت سے پاتا ہے، نہ کہ کسی دوسرے اقرب کے قائم مقام کی حیثیت سے۔ اولاد کی غیر موجودگی میں اولاد کی اولاد اور والدین کی غیر موجودگی میں والدین کے والدین اس لیے میراث نہیں پاتے کہ وہ کسی کے قائم مقام ہیں، بلکہ اس لیے پاتے ہیں کہ بلاواسطہ اولاد اور بلاواسطہ والدین کی غیر موجودگی میں بالواسطہ اولاد اور بالواسطہ والدین کو آپ سے آپ حق ولدیت اور حق والدیت پہنچ جاتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ بیوی اور شوہر کے وارث چونکہ کوئی بالواسطہ یا بلاواسطہ حق زوجیت نہیں رکھتے اس لیے ایک مرد کے مرنے پر اس کی فوت شدہ بیوی یا ایک عورت کے مرنے پر اس کے فوت شدہ شوہر کا حصہ کسی حال میں بھی اس کے وارثوں کو نہیں ملتا۔ ورنہ اگر قائم مقامی کا اصول واقعی اسلامی قانون میں موجود ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ساس اور خسر اور سالے اور سوتیلے بچے میراث میں حصہ نہ پاتے۔

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ قائم مقامی کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد یہ تجویز اس کو صرف بیٹے، بیٹیوں کی اولاد تک محدود رکھتی ہے، حالانکہ اس کے لیے کوئی معقول دلیل موجود نہیں ہے۔ اگر قائم مقامی کا اصول واقعی کوئی صحیح اصول ہے تو پھر قانون یہ ہونا چاہیے:

ہر ایسا شخص جو مورث کی وفات کے بعد زندہ موجود ہونے کی صورت میں شرعاً وارث ہوتا وہ اگر مورث کی زندگی ہی میں مر گیا ہو تو اس کے تمام شرعی وارثوں کو اس کا قائم مقام مانا جائے گا اور وہ مورث کی وفات کے بعد میراث میں سے حصہ پائیں گے۔

مثلاً ایک شخص کی بیوی اس کی زندگی میں مر چکی تھی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اب شوہر کے ترکے میں اس فوت شدہ بیوی کے وارث اس کے قائم مقام نہ مانے جائیں؟ ایک شخص کا باپ اس کی زندگی میں مر گیا تھا۔ قائم مقامی کا اصول تسلیم کر لینے کے بعد کون سی معقول دلیل ایسی ہے جس کی بنا پر اس متوفی باپ کے تمام وارثوں کو اس کا قائم مقام مان کر سب کو اس شخص کے ترکے میں حصہ دار نہ بنایا جائے؟ ایک شخص کے چار چھوٹے بچے اس کی زندگی میں مر چکے تھے۔ کیا وجہ ہے کہ ان بچوں کی ماں ان کی قائم مقام نہ مانی جائے اور شوہر کے مرنے پر حق زوجیت کے علاوہ اسے ان مرے ہوئے بچوں کا حصہ بھی بحیثیت قائم مقام نہ ملے؟ ایک شخص کا ایک شادی شدہ لڑکا اس کی زندگی میں لاولد مر گیا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ اس کی بیوہ اس کی قائم مقام ہو کر خسر کے ترکے میں سے حصہ نہ لے؟ صرف اولاد کی اولاد تک اس قائم مقامی کے اصول کو محدود رکھنا اور دوسرے سب لوگوں کو اس سے مستثنیٰ کر دینا اگر کسی قرآنی دلیل پر مبنی ہے تو اس کی نشان دہی کی جائے اور اگر کسی عقلی دلیل پر مبنی ہے تو اسے بھی چھپا کر نہ رکھا جائے۔ ورنہ پھر سیدھی طرح یہ کہہ دیا جائے کہ جس طرح قائم مقامی کا اصول خود ساختہ ہے اسی طرح اس کا انطباق بھی من مانے طریقے پر کیا جائے گا۔

تیسرا اعتراض اور اس کا جواب

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ تجویز ان اصولوں کے بالکل خلاف ہے جو قانونی سمجھ بوجھ رکھنے والا کوئی آدمی قرآن مجید کے احکام میراث سے سمجھ سکتا ہے۔ قرآن کی رو سے کوئی حق وراثت مورث کی زندگی میں پیدا نہیں ہوتا مگر یہ تجویز اس مفروضے پر قائم ہے کہ یہ حق مورث کی زندگی ہی میں قائم ہو جاتا ہے اور صرف اس کا نفاذ مورث کے مرنے تک ملتوی رہتا ہے۔ قرآن کی رو سے میراث میں صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں مگر یہ تجویز ان لوگوں کا حق بھی ثابت کرتی ہے جو اس کی زندگی میں مر چکے ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

چوتھا اعتراض اور اس کا جواب

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ قرآن بعض رشتہ داروں کے حصے قطعی طور پر مقرر کر دیتا ہے جن میں کمی بیشی کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، مگر قائم مقامی کا اصول خود قرآن کے مقرر کیے ہوئے بعض حصوں میں کمی اور بعض میں بیشی کر دیتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ ایک شخص کے دو ہی لڑکے تھے اور دونوں اس کی زندگی میں وفات پا گئے۔ ایک لڑکا اپنے پیچھے چار بچے چھوڑ کر مرا۔ دوسرا لڑکا صرف ایک بچہ چھوڑ کر مرا۔ قرآن کی رو سے یہ پانچوں پوتے حق ولدیت میں بالکل برابر ہیں، اس لیے دادا کے ترکے میں سے ان سب کو برابر حصہ ملنا چاہیے، مگر قائم مقامی کے اصول پر اس کی جائداد میں سے آٹھ آنے ایک پوتے کو ملیں گے اور باقی چار پوتوں کے حصے میں صرف دو دو آنے آئیں گے۔

ایک اور غلط تجویز

حال میں بعض لوگوں نے وراثت کے متعلق اپنی تجویز اس طرح مرتب کی ہے:

"مورث کا کوئی ایسا نسبی رشتہ دار جو اس کے ترکے میں سے اس کی وفات کے بعد حصہ پاتا، لیکن جو مورث کی وفات سے پہلے ہی فوت ہو گیا ہو، اس کی جگہ اس کا قریب ترین نسبی رشتہ دار لے لے گا اور مورث کی وفات کے وقت وہی حصہ پائے گا جو اس فوت شدہ کو ملتا۔ اگر وہ متعدد ہیں تو وہ حصہ ان میں قرآنی قانونِ وراثت کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا۔"

اس تجویز میں دو مرحلوں پر "نسبی رشتہ دار" کی قید لگائی گئی ہے۔ پہلے مرحلے میں مورث کے وفات یافتہ ممکن وارثوں میں سے صرف اس کے نسبی رشتہ داروں کو حصہ پانے کے لیے منتخب کر لیا جاتا ہے اور دوسروں کو یونہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے مرحلے میں ان مردہ حصہ داروں کے بھی صرف نسبی رشتہ داروں کو میراث پانے کے لیے چھانٹ لیا جاتا ہے اور باقیوں کو محروم کر دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ دو دو مرحلوں پر "نسبی رشتہ دار" کی یہ قید قرآن کے کس حکم سے اخذ کی گئی ہے؟ اگر قرآن واقعی یہ اجازت دیتا ہے کہ ایک شخص کے جو ممکن وارث اس کی زندگی میں مر چکے ہوں انھیں اس کی وفات کے بعد میراث وصول کرنے کی خاطر قانونی زندگی عطا کی جائے تو پھر یہ انعام سارے ممکن وارثوں پر عام ہونا چاہیے۔ ان میں سے صرف نسبی رشتہ داروں کو چھانٹ لینے کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر ان نسبی رشتہ داروں کو بھی قانونی زندگی عطا کر کے آپ ان کے صرف نسبی رشتہ داروں کو وراثت دیتے ہیں اور دوسرے حق داروں کو محروم الارث کر دیتے ہیں۔ کیا آپ قرآن سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ ایک شخص اگر مورث کی وفات کے وقت قانونی مفروضے کے طور پر نہیں بلکہ واقعی زندہ ہوتا اور مورث کی وراثت میں سے حصہ پانے کے بعد مرتا تو اس کے صرف نسبی رشتہ دار ہی اس کی میراث پاتے؟

اچھا تھوڑی دیر کے لیے ان اصولی اعتراضات کو بھی جانے دیجیے۔ اس تجویز میں "نسبی رشتہ دار" سے ماں باپ تو خارج

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہ ہوں گے۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کی زندگی میں اس کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ باپ کی ایک دوسری بیوی بھی تھی جس سے اولاد موجود ہے اور باپ کی اس بیوی سے بھی اولاد ہے جس کے بطن سے یہ شخص پیدا ہوا ہے۔ اس شخص کے اپنے بیٹے بیٹیاں بھی موجود ہیں۔ اب اس شخص کا انتقال ہوتا ہے۔ آپ اپنے قاعدے کے مطابق اس کے فوت شدہ باپ کا حصہ نکالنے پر مجبور ہیں اور وہ کل میراث کا 1/6 وصول کر لیتا ہے۔ پھر اس حصے کو آپ اس کے نسبی رشتہ داروں میں تقسیم کرتے ہیں، یعنی اس کے وہ سب بیٹے بیٹیاں جو اس کی دونوں بیویوں کے بطن سے پیدا ہوئے تھے اور اس کے وہ پوتے اور پوتیاں اور نواسے نواسیاں بھی جن کے ماں باپ اس کی زندگی میں مر چکے تھے۔ اس طرح میت کی اولاد کے ساتھ اس کے سگے اور سوتیلے بھائی بہن ہی نہیں بلکہ بھتیجے اور بھانجے تک بھی ترکے میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ صریح احکام قرآنی کے خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے جس شخص کی اولاد موجود ہو اس کے سگے اور سوتیلے بھائیوں کو میراث کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا اور نہ اس کے مرے ہوئے بھائی بہنوں کی اولاد کوئی حصہ پانے کی حق دار ہے، مگر آپ نے اس کے فوت شدہ باپ کو حصہ دار قرار دے کر اس کی زندہ اولاد کی حق تلفی کر دی۔

یہ صرف ایک مثال ہے۔ ایسی اور بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ مرے ہوئے باپ، ماں، دادا، دادی، نانی وغیرہ کو جو سب نسبی رشتہ دار کی تعریف میں آتے ہیں، قانونی طور پر زندہ وارثوں کی طرح میراث کا حق دار قرار دینے اور پھر ان کے نسبی رشتہ داروں میں یہ حصہ تقسیم کرنے سے کیا پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

اس مختصر بحث سے میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ علمائے اسلام کے متفق علیہ قانونِ میراث میں آج جو ترمیمات تجویز کی جا رہی ہیں ان کی علمی و عقلی حیثیت کیا ہے۔ باقی رہا یہ سوال کہ یتیم بچوں کے معاملے میں پیچیدگی پیدا ہونے کا اصل سبب کیا ہے اور اس کا حل کیسے ہو، تو اس کا جواب بھی کچھ ایسا مشکل نہیں ہے۔ اہل علم کے مشورے سے ایسی صورتیں تلاش کی جا سکتی ہیں جن کی اصول شریعت کے اندر گنجائش بھی ہے اور جن سے یہ مسئلہ بھی مجوزہ ترمیمات کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقے سے حل ہو سکتا ہے۔

(تفہیمات حصہ سوم ص ۱۸۴، دسمبر ۱۹۸۵ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

تقسیم میراث کے قانونی احکام

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ (النساء ۴:۷)

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، خواہ تھوڑا ہو یا بہت، اور یہ حصہ (اللہ کی طرف سے) مقرر ہے۔

اس آیت میں واضح طور پر پانچ قانونی حکم دیے گئے ہیں: ایک یہ کہ میراث صرف مردوں ہی کا حصہ نہیں ہے بلکہ عورتیں بھی اس کی حق دار ہیں۔ دوسرے یہ کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ کتنی ہی کم ہو، حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک وارث دوسرے وارثوں سے ان کا حصہ خرید لے۔ تیسرے اس آیت سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری ہوگا۔ خواہ وہ منقولہ ہوں، یا غیر منقولہ، زرعی ہوں یا صنعتی یا کسی اور صنف مال میں شمار ہوتے ہوں۔ چوتھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میراث کا حق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ مرا ہو۔ پانچویں اس سے یہ قاعدہ بھی نکلتا کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۳۲۴۔ النسآء حاشیہ ۱۲)

مرد اور عورت کا حصہ

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۚ فَإِن كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِن كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ (النساء ۴:۱۱)

تمھاری اولاد کے بارے میں اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ: مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے، اگر (میت کے وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انھیں ترکہ کا دو تہائی دیا جائے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے۔

میراث کے معاملے میں اولین اصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بارے سے سبکدوش رکھا ہے، لہٰذا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔

یہی حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوں تو خواہ دو لڑکیاں ہوں یا دو سے زائد، بہرحال اس کے کل ترکے کا ۲/۳ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہوگا اور باقی ۱/۳ دوسرے وارثوں میں۔ لیکن اگر میت کا صرف ایک لڑکا ہو تو اس پر اجماع ہے کہ دوسرے وارثوں کی غیر موجودگی میں وہ کل مال کا وارث ہوگا، اور دوسرے وارث موجود ہوں تو ان کا حصہ دینے کے بعد باقی سب مال اسے ملے گا۔

(تفہیم القرآن، ج ۱ص ۳۲۶۔ النسآء حواشی ۱۵-۱۶)

والدین کا حصہ- میت کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں

وَلِاَبَوَیۡهِ لِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ کَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ۔ (النساء ۴:۱۱)

اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے اور اگر میت کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔

میت کے صاحب اولاد ہونے کی صورت میں بہرحال میت کے والدین میں سے ہر ایک ۱/۶ کا حق دار ہوگا خواہ میت کی وارث صرف بیٹیاں ہوں، یا صرف بیٹے ہوں، یا بیٹے اور بیٹیاں ہوں، یا ایک بیٹا ہو، یا ایک بیٹی، رہے باقی ۲/۳ تو ان میں دوسرے وارث شریک ہوں گے۔

ماں باپ کے سوا کوئی اور وارث نہ ہو تو باقی ۲/۳ باپ کو ملے گا۔ ورنہ ۲/۳ میں باپ اور دوسرے وارث شریک ہوں گے۔

بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ ۱/۳ کے بجائے ۱/۶ کر دیا گیا ہے۔ اس طرح ماں کے حصے میں سے جو ۱/۶ لیا گیا ہے وہ باپ کے حصے میں ڈالا جائے گا کیونکہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ میت کے والدین اگر زندہ ہوں تو اس کے بہن بھائیوں کو حصہ نہیں پہنچتا۔ (تفہیم القرآن، ج ۱ص ۳۲۷۔ النساء حواشی ۱۷، ۱۸، ۱۹)

ترکے میں میاں بیوی کا حصہ [صاحب اولاد اور بے اولاد ہونے کی صورت میں]

وَلَکُمۡ نِصۡفُ مَا تَرَكَ اَزۡوَاجُکُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَکُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّةٍ یُّوۡصِیۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَکۡتُمۡ اِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّکُمۡ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ کَانَ لَکُمۡ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ وَصِیَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَیۡنٍ ؕ۔ (النسآء ۴:۱۲)

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکے کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جب کہ وصیت جو انہوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انہوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تمھارے ترکے میں سے چوتھائی کی حق دار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو، ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں، اولاد ہونے کی صورت میں وہ $\frac{1}{8}$ کی اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں $\frac{1}{4}$ کی حصہ دار ہوں گی اور یہ $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{8}$ سب بیویوں میں برابری کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔ (تفہیم القرآن، ج ا، ص ۳۲۸۔ النسآء حاشیہ ۲۲)

کلالہ

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُورَثُ كَلَالَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِن كَانُوا أَكْثَرَ مِن ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ ۚ مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصَىٰ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۔ (النسآء ۴: ۱۲)

اور اگر وہ مرد یا عورت (جس کی میراث تقسیم طلب ہے) بے اولاد بھی ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ نہ ہوں، مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی اور بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کے ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے، جب کہ وصیت جو کی گئی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو میت نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔

اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے مراد اخیافی بھائی اور بہن ہیں یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ رہے سگے بھائی بہن، اور وہ سوتیلے بھائی بہن جو باپ کی طرف سے میت کے ساتھ رشتہ رکھتے ہوں تو ان کا حکم اسی سورہ کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔

(تفہیم القرآن، ج ا، ص ۳۲۹۔ النسآء حاشیہ ۲۳)

وراثتِ کلالہ کا حکم

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ ۚ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَا إِن لَّمْ يَكُن لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِن كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِن كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ ۗ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ أَن تَضِلُّوا ۗ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝ (النسآء ۴: ۱۷۶)

لوگ تم سے کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں کہو اللہ تمھیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکے میں سے نصف پائے گی، اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حقدار ہوں گی اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا۔ اللہ تمھارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

یہ آیت اس سورہ کے نزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت ۹ ہجری میں نازل ہوئی اور سورہ نساء اس سے بہت پہلے ایک مکمل سورہ کی حیثیت سے پڑھی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو ان آیات کے سلسلے میں شامل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نہیں کیا گیا جو احکام میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے ضمیمہ کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا ہے۔

کلالہ کے معنی

کلالہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کلالہ وہ شخص ہے جو لا ولد بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لا ولد مرنے والے کو کلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخری وقت تک اس معاملے میں متردد رہے۔ لیکن عامۂ فقہا نے حضرت ابوبکرؓ کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ یہاں کلالہ کی بہن کو نصف ترکے کا وارث قرار دیا گیا ہے حالانکہ اگر کلالہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

ماں باپ شریک بہن بھائیوں کی میراث

یہاں ان بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے جو میت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں، یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبہ میں اس معنی کی تصریح کی تھی اور صحابہ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر مجمع علیہ مسئلہ ہے۔

بھائی بہن کے پورے ترکہ کا وارث

بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحب فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔

یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔

(تفہیم القرآن، ج ا، ص ۴۳۱-۴۳۲۔ النسآء حواشی ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲ اور ۲۲۳)

وراثت میں اخیافی بھائی بہنوں کا حصہ

س: قدوری [کتاب الفرائض، باب الحجب] میں یہ عبارت درج ہے، ان تترک المرأة زوجا و اما اوجدة واخوة من ام واخا من اب و ام فلزوج النصف وللام السدس ولاولادالام الثلث ولاشیء لاخوة للاب و الام۔ یعنی اگر ایک عورت کے وارثوں میں اس کا شوہر اور ماں یا دادی اور اخیافی [ماں شریک] بھائی اور سگا بھائی موجود ہوں تو شوہر کو آدھا حصہ، ماں کو چھٹا حصہ اور اخیافی بھائی بہنوں کو ایک تہائی حصہ ملے گا اور سگے بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا یہ احناف کا مفتیٰ بہ قول ہے؟ کیا یہ قرین انصاف ہے کہ برادر حقیقی تو محروم ہو جائے اور اخیافی بھائی وارث قرار پائے؟ لفظ کلالہ کی قانونی تعریف بھی واضح فرمائیں۔ کیا والدہ اور دادی کے زندہ ہونے کے باوجود بھی ایک میت کو کلالہ قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج: قدوری سے جو مسئلہ آپ نے نقل کیا ہے، اس میں سلف کے مابین اختلاف ہے۔ اگر کوئی عورت مر جائے اور پیچھے شوہر، ماں، سگے بھائی بہن اور اخیافی [یعنی ماں جائے] بھائی بہن چھوڑے، تو حضرت علیؓ، ابوموسیٰ اشعریؓ اور ابی ابن کعب رضی اللہ عنہم کا فتویٰ یہ ہے کہ اس کی نصف میراث شوہر کو، ⅙ ماں کو اور ⅓ اخیافی بھائی بہنوں کو دیا جائے گا اور سگے بھائی بہنوں کو کچھ نہ ملے گا۔ اسی فتوے کو علما احناف نے لیا ہے اور یہی ان کا مفتیٰ بہ قول ہے۔ بخلاف اس کے حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابت کا یہ مذہب ہے کہ ⅓ میراث سگے اور اخیافی بھائی بہنوں میں برابر برابر تقسیم کی جائے گی۔ حضرت عمرؓ پہلے قولِ اول کے قائل تھے مگر بعد میں انھوں نے قول ثانی اختیار کر لیا۔ ابن عباسؓ سے دو روایتیں مروی ہیں، مگر زیادہ معتبر روایت یہی ہے کہ وہ بھی قول ثانی کے قائل تھے۔ اسی پر قاضی شریح نے فیصلہ کیا ہے اور امام شافعی، امام مالک اور سفیان ثوری رحمہم اللہ کا مذہب بھی یہی ہے۔ حنفیہ کا استدلال یہ ہے کہ اخیافی بھائی بہن ذوی الفروض ہیں اور سگے بھائی عصبات ہیں اور ذوی الفروض کا حق عصبات پر مقدم ہے لہٰذا جب ذوی الفروض سے کچھ نہ بچے تو عصبات کو کوئی حق نہ پہنچے گا۔ دوسرے گروہ کا استدلال یہ ہے کہ ماں جائے ہونے میں جب سگے اور اخیافی بھائی بہن یکساں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ برابر کے حصہ دار نہ ہوں۔

کلالہ کے جو معنی حضرت ابوبکرؓ نے بیان فرمائے ہیں اور جنھیں حضرت عمرؓ نے بھی قبول کیا ہے وہ یہ ہیں:

من لّا ولد له ولّا والد۔ یعنی کلالہ وہ ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ باپ۔ اس طرح ماں یا دادی کی موجودگی کسی میت کے کلالہ ہونے میں مانع نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۰۷ تا ۲۰۹۔ اشاعت تیرھویں)

(بحوالہ ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۷۱ھ ستمبر ۱۹۵۲ء)

میراث صرف رشتہ داروں کا حق ہے

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا (النساء ۴:۳۳)

اور ہم نے ہر اس ترکے کے حق دار مقرر کر دیے ہیں جو والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔ اب رہے وہ لوگ جن سے تمھارے عہد و پیمان ہوں تو ان کا حصہ انھیں دو، یقیناً اللہ ہر چیز پر نگران ہے۔

اہل عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارے کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے وہ ایک دوسرے کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میراث کے حقدار بن جاتے تھے۔ اسی طرح جسے بیٹا بنالیا جاتا تھا وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔ اس آیت میں جاہلیت کے اس طریقے کو منسوخ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ وراثت تو اسی قاعدے کے مطابق رشتہ داروں میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے، البتہ جن لوگوں سے تمھارے عہد و پیمان ہوں ان کو اپنی زندگی میں تم جو چاہو دے سکتے ہو۔

(تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۳۴۸، ۳۴۹۔ النساء حاشیہ ۵۵)

شوہروں کی وفات کے بعد اس کے خاندان والوں کو عورت کا وارث بننے کی ممانعت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (النساء ۴:۱۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ زبردستی عورتوں کے وارث بن بیٹھو۔ اور نہ یہ حلال ہے کہ انھیں تنگ کر کے اس مہر کا کچھ حصہ اڑا لینے کی کوشش کرو جو تم انھیں دے چکے ہو۔ ہاں اگر وہ کسی صریح بدچلنی کی مرتکب ہوں (تو ضرور تمھیں تنگ کرنے کا حق ہے)۔ ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمھیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند نہ ہو مگر اللہ نے اسی میں بہت بھلائی رکھ دی ہو۔

اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے خاندان والے اس کی بیوہ کو میت کی میراث سمجھ کر اس کے ولی وارث نہ بن بیٹھیں۔ عورت کا شوہر جب مر گیا تو وہ آزاد ہے۔ عدت گزار کر جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کر لے۔

مال اڑانے کے لیے نہیں بلکہ بدچلنی کی سزا دینے کے لیے۔

اگر عورت خوبصورت نہ ہو، یا اس میں کوئی اور ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے، تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے۔ حتی الامکان اسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں بعض دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسن صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر اسے اپنی ان خوبیوں کے اظہار کا موقع ملے تو وہی شوہر جو ابتداءً محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا، اس کے حسن سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتدا میں عورت کی بعض باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقع دے تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی برائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ آدمی ازدواجی تعلق کو منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے۔ طلاق بالکل آخری چارۂ کار ہے جس کو ناگزیر حالات ہی میں استعمال کرنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق یعنی طلاق اگرچہ جائز ہے مگر تمام جائز کاموں میں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند اگر کوئی چیز ہے تو وہ طلاق ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لایحب الذواقین والذواقات، یعنی نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے پھریں۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۳۳۴، ۳۳۵۔ النسآء حاشیہ ۳۰)

تقسیم میراث کے موقع پر آنے والے یتیموں اور مسکینوں کا حق

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ (النساء ۴: ۸-۹)

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انھیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔

خطاب میت کے وارثوں سے ہے اور انھیں ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقع پر جو دور و نزدیک کے رشتہ دار اور کنبہ کے غریب و مسکین لوگ اور یتیم بچے آ جائیں ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ میراث میں از روئے شرع ان کا حصہ نہیں ہے تو نہ سہی، وسعت قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان کو بھی کچھ نہ کچھ دے دو اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۳۲۵۔ النسآء حاشیہ ۱۳)

وراثت میں دادی کا حصہ

ایک دادی اپنے پوتے کی میراث کا مطالبہ لے کر آئی جس کی ماں مر چکی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں پاتا جس کی رو سے تجھ کو ماں کا حصہ پہنچتا ہو۔ پھر انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ رسول اللہ نے تو اس معاملے میں کوئی حکم نہیں دیا ہے۔ اس پر مغیرہ بن شعبہؓ اور محمد بن مسلمہ نے اٹھ کر شہادت دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو چھٹا حصہ [یعنی حصہ مادری] دلوایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے اسی کے مطابق فیصلہ کر دیا [بخاری و مسلم] [سنت کی آئینی حیثیت ص ۱۱۳]

(تفہیم الاحادیث ج ۷ ص ۱۹۵، اشاعت دوم)

پوتے کی محرومی وراثت

س: دادا کی زندگی میں اگر کسی کا باپ مر جائے تو پوتے کو وارثت میں سے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ یہ مشہور شرعی مسئلہ ہے جس پر اس وقت حکومت کی طرف سے عمل ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مختلف مسلک کیا ہیں اور آپ کس مسلک کو مزاج اسلامی سے قریب تر خیال فرماتے ہیں۔ اگر آپ کا مسلک بھی مذکورہ ہی ہے تو اس الزام سے بچنے کی کیا صورت ہے کہ اسلامی نظام جو یتیم کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دستگیری کا اس قدر مدعی ہے، ایک یتیم کو محض اس لیے دادا کی وراثت سے محروم قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے باپ کو دادا کی وفات سے بعد تک زندہ نہ رکھ سکا؟

ج: فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ[1] ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا جسے فقہاء کے اس متفقہ فیصلے کی بنا قرار دیا جا سکے۔ لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پوتا بہرحال اپنے باپ کے واسطے ہی سے دادا کے مال میں حقدار ہو سکتا ہے نہ کہ براہ راست خود۔ اسی طرح بہو اپنے شوہر کے واسطے سے خسر کے مال میں سے حصہ پا سکتی ہے نہ کہ براہِ راست خود۔ اگر ایک شخص کا بیٹا اس کی زندگی میں مر جائے اور وہ شادی شدہ نہ ہو، تو آپ خود مانیں گے کہ اس کا حصہ ساقط ہو جائے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ باپ کے مرنے پر اس کے ترکے میں سے اس کے فوت شدہ بیٹے کا حصہ بھی نکالا جائے اور پھر اس بیٹے کی میراث اس کی ماں اور اس کے بھائیوں وغیرہ کو پہنچائی جائے۔ اسی طرح اگر اس فوت شدہ لڑکے کی کوئی بیوی موجود ہو تو آپ خود مانیں گے کہ وہ اپنے خسر کے ترکہ میں سے حصہ پانے کی مستحق نہیں ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا نکاح ثانی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ پھر آپ کو کیوں اصرار ہے کہ صرف اس کا بیٹا موجود ہونے کی صورت میں اس کا حصہ ساقط نہ ہو بلکہ وہ اس کے بیٹے کو پہنچے۔

رہا یتیم کی پرورش کا سوال، تو شریعت کی رو سے اس کے چچا اس کے ولی ہوتے ہیں اور ان پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی پرورش کریں۔ نیز شریعت نے وصیت کا حکم اسی لیے دیا ہے کہ اگر کوئی مرنے والا اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو اور اس کے خاندان میں کچھ لوگ مستحق موجود ہوں تو وہ ان کے حق میں وصیت کرے۔ ⅓ حصۂ مال کی حد تک وہ وصیت کر سکتا ہے اور اس میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اگر وہ کوئی یتیم پوتا چھوڑ رہا ہے، یا کوئی بیوہ بہو چھوڑ رہا ہے جو بے سہارا ہو، یا کوئی بیوہ بھاوج یا غریب بھائی یا بیوہ بہن چھوڑ رہا ہے تو اس کے لیے وصیت کر جائے۔ یہ گنجائش اسی لیے رکھی گئی ہے کہ قانونی وارثوں کے سوا خاندان میں جو لوگ مدد کے محتاج ہوں ان کی مدد کا انتظام کیا جا سکے۔

[رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۰۹ تا ۲۱۱۔ اشاعت تیرھویں) (بحوالہ ترجمان القرآن جمادی الاخری ۱۳۷۰ھ، مارچ ۱۹۵۱ء]

❀❀❀❀❀❀❀

[1] وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابۂ کرام کے دور سے لے کر آج تک تمام امت کے فقہا متفق رہے ہیں اور اس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، اہل حدیث، شیعہ وغیرہ گروہوں کے علما میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ (یتیم پوتے کی میراث کا مسئلہ ص ۱۷۳) پر مکمل بحث بھی اسی پمفلٹ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

وصیت

وصیت کے لیے نصاب شہادت

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ؕ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِىْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ ۙ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ○ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ (المائدہ۵:۱۰۶-۱۰۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمھاری جماعت میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آ جائے تو غیر مسلموں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں۔ پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو [مسجد میں] روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ''ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں، اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو [ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں] اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔'' لیکن اگر پتہ چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کیا ہے تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لیے اہل تر ہوں ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو، اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ''ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے۔'' اس طریقے سے زیادہ توقع کی جا سکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے، یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہو جائے۔'' (تفہیم القرآن ج ۱ص ۵۱۱-۵۱۲)

جسمانی اعضا عطیہ کرنے کی وصیت کرنا، بالخصوص آنکھوں کا

آنکھوں کے عطیے کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آ سکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھول دیا جائے تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندے میں دینے کی وصیت کر دے۔ جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ اس جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس کے معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رو سے یہ زندہ انسانوں کا فرض ہے کہ اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے۔ ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مردہ انسانوں کے بعض کارآمد اجزا زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے۔ [جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم دوم کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے] انسانی کھال کو اتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش کی جائے گی تا کہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس، یا منی پرس بنائے جا سکیں [چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ایک ٹینری کر چکی ہے] انسانی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی حتی کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دورِ وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضا نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے ''مفید'' استعمالات کو روک سکیں گے اور کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

(رسائل و مسائل سوم ص ۲۰۹-۲۱۰ بحوالہ ترجمان القرآن، جنوری ۱۹۵۲ء)

کیا وارث میت کے جسم کے کسی حصہ کو عطیہ دینے کے مجاز ہیں؟

مرنے والا اپنے آپ کو جسم کا مالک سمجھتا ہے، حالانکہ وہ مالک نہیں ہے۔ میت کا جسم وارثوں کی ملکیت بھی نہیں۔ وہ شرعاً صرف اس کی تجہیز و تکفین کے ذمے دار ہیں۔ اس لیے وہ بھی اس کے جسم یا اس کے کسی حصے کو ہبہ یا بیع کرنے کے مجاز نہیں۔ یہ بات شریعت کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ انسانی جسم کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے۔ (استفسارات اول ص ۲۰۸، طبع اول)

کیا پختہ قبر کی وصیت کرنا جائز ہے؟

کوئی ایسی وصیت جو شریعت میں ناجائز ہو، اس کا پورا کرنا جائز نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص مرتے وقت قانونِ وراثت میں رد و بدل کرنا چاہے یا عورتوں کو اپنی میت پر نوحہ کرنے کی وصیت کر جائے تو چونکہ ایسے فعل خلاف شریعت ہیں، اس لیے ان پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ (استفسارات اول ص ۲۱۴، طبع اول)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانون تقسیم وراثت کے تقرر سے پہلے وصیت کا حکم [قانون وراثت کی دینی حیثیت]

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (البقرۃ ۲: ۱۸۰-۱۸۱)

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔ پھر جنھوں نے وصیت سنی اور بعد میں اسے بدل ڈالا، تو اس کا گناہ ان بدلنے والوں پر ہوگا۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا، جبکہ وراثت کی تقسیم کے لیے ابھی کوئی قانون مقرر نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ہر شخص پر لازم کیا گیا کہ وہ اپنے وارثوں کے حصے بذریعہ وصیت مقرر کر جائے تاکہ اس کے مرنے کے بعد نہ تو خاندان میں جھگڑے ہوں اور نہ کسی حق دار کی حق تلفی ہونے پائے۔ بعد میں جب تقسیم وراثت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود ایک ضابطہ بنا دیا (جو سورۂ نساء میں ہے)، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام وصیت اور احکام میراث کی توضیح میں حسب ذیل دو قاعدے بیان فرمائے۔

بذریعہ وصیت کمی یا بیشی

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا، یعنی جن رشتے داروں کے حصے قرآن میں مقرر کر دیئے گئے ہیں، ان کے حصوں میں نہ تو وصیت کے ذریعے سے کوئی کمی وبیشی کی جا سکتی ہے، نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصے کے علاوہ کوئی چیز بذریعۂ وصیت دی جا سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیت کل جائداد کے صرف ایک تہائی حصے کی حد تک کی جا سکتی ہے۔

ان دو تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسب قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے ان غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے، جو اس کے اپنے گھر میں یا اس کے خاندان میں مدد کے مستحق ہوں، یا جنھیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو، یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے۔ بعد کے لوگوں نے وصیت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا یہاں تک کہ بالعموم وصیت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآن مجید میں اسے ایک حق قرار دیا گیا ہے، جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے، تو بہت سے وہ سوالات خود ہی حل ہو جائیں، جو میراث کے بارے میں لوگوں کو الجھن میں ڈالتے ہیں۔ مثلاً ان پوتوں اور نواسوں کا معاملہ جن کے ماں باپ دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں۔ (تفہیم القرآن، ج ۱ ص ۱۴۰-۱۴۱، البقرہ حاشیہ ۱۸۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ادائیگی قرض سے پہلے وصیت کا ذکر، کیوں؟

مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (النسآء ۴:۱۱)

(یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے) جبکہ وصیت جو میت کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ تم نہیں جانتے کہ تمھارے ماں باپ اور تمھاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

وصیت کا ذکر قرض پر مقدم اس لیے کیا گیا ہے کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے کے حق میں ضروری نہیں ہے، اور وصیت کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ لیکن حکم کے اعتبار سے امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔ یعنی اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میت کے ترکے میں سے وہ ادا کیا جائے گا، پھر وصیت پوری کی جائے گی اور اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

کل کا ⅓ حصہ کی حد تک وصیت کرنے کا اختیار ہے، اور یہ وصیت کا قاعدہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے کہ قانونِ وراثت کی رو سے جن عزیزوں کو میراث میں سے حصہ نہیں پہنچتا ان میں سے جس کو یا جس جس کو آدمی مدد کا مستحق پاتا ہو اس کے لیے اپنے اختیار تمیزی سے حصہ مقرر کر دے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی موجود ہے، یا کسی بیٹے کی بیوہ مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے، یا کوئی بھائی یا بہن یا بھاوج یا بھتیجا یا بھانجا یا اور کوئی عزیز ایسا ہے جو سہارے کا محتاج نظر آتا ہے، تو اس کے حق میں وصیت کے ذریعہ سے حصہ مقرر کیا جا سکتا ہے اور اگر رشتہ داروں میں کوئی ایسا نہیں ہے تو دوسرے مستحقین کے لیے یا کسی رفاہِ عام کے کام میں صرف کرنے کے لیے وصیت کی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی کل ملکیت میں سے ⅔ یا اس سے کچھ زائد کے متعلق شریعت نے میراث کا ضابطہ بنا دیا ہے جس میں سے شریعت کے نامزد کردہ وارثوں کو مقررہ حصہ ملے گا اور ⅓ یا اس سے کچھ کم کو خود اس کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے کہ اپنے مخصوص خاندانی حالات کے لحاظ سے (جو ظاہر ہے کہ ہر آدمی کے معاملے میں مختلف ہوں گے) جس طرح مناسب سمجھے تقسیم کرنے کی وصیت کر دے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں ظلم کرے، یا بالفاظ دیگر اپنے اختیار تمیزی کو غلط طور پر اس طرح استعمال کرے جس سے کسی کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہوں تو اس کے لیے یہ چارہ کار رکھ دیا گیا ہے کہ خاندان کے لوگ باہمی رضا مندی سے اس کی اصلاح کر لیں یا قاضی شرعی سے مداخلت کی درخواست کی جائے اور وہ وصیت کو درست کر دے۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا. (النساء ۴:۱۱)

اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

یہ جواب ہے ان سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں رہ گئی ہے۔

(تفہیم القرآن، ج ۱ص ۳۲۷-۳۲۸۔ النسآء حواشی ۲۰-۲۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وصیت اور قرض میں ضرر رسانی

غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللهِ ۗ وَاللهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللهِ ۗ وَمَن يُطِعِ اللهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ وَمَن يَعْصِ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خٰلِدًا فِيهَا ۖ وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ ○ (النسآء ۴: ۱۲-۱۴)

بشرطیکہ وہ ضرر رساں نہ ہو۔ یہ حکم ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ دانا و بینا اور نرم خو ہے۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اسے اللہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہے گا اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کر جائے گا اسے اللہ آگ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رسوا کن سزا ہے۔

وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہوں اور قرض میں ضرر رسانی یہ ہے کہ محض حقداروں کو محروم کرنے کے لیے آدمی خواہ مخواہ اپنے اوپر ایسے قرض کا اقرار کرے جو اس نے فی الواقع نہ لیا ہو، یا اور کوئی ایسی چال چلے جس سے مقصود یہ ہو کہ حق دار میراث سے محروم ہو جائیں۔ اس قسم کے ضرار کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔[1] اور ایک دوسری حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدمی تمام عمر اہل جنت کے سے کام کرتا رہتا ہے مگر مرتے وقت وصیت میں ضرر رسانی کر کے اپنی کتاب زندگی کو ایسے عمل پر ختم کر جاتا ہے جو اسے دوزخ کا مستحق بنا دیتا ہے۔[2] یہ ضرار اور حق تلفی اگرچہ ہر حال میں گناہ ہے، مگر خاص طور پر کلالہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں اس میں عموماً یہ میلان پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور نسبتاً دور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کر دے۔

اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار

یہاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا اظہار دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی نہ بچ سکے گا۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے جو حصے جس طرح مقرر کیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کیونکہ بندوں کی مصلحت جس چیز میں ہے اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے۔ اور اللہ کی صفتِ حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے تاکہ وہ مشقت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں۔

---

1. تفہیم الاحادیث، ج ۷ ص ۲۱۵۔ اشاعت دوم
2. تفہیم الاحادیث، ج ۷ ص ۲۱۵۔ اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانون وراثت کو تبدیل کرنے والوں کے لیے دائمی عذاب کی دھمکی

یہ ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کو ہمیشگی کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت کو تبدیل کریں، یا ان دوسری قانونی حدود کو توڑیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں۔

مسلمانوں کی جسارت

لیکن سخت افسوس ہے کہ اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں نے بالکل یہودیوں کی سی جسارت کے ساتھ خدا کے قانون کو بدلا اور اس کی حدوں کو توڑا۔ اس قانونِ وراثت کے معاملے میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچتی ہیں۔ کہیں عورتوں کو میراث سے مستقل طور پر محروم کیا گیا ہے۔ کہیں صرف بڑے بیٹے کو میراث کا مستحق ٹھیرایا گیا۔ کہیں سرے سے تقسیم میراث ہی کے طریقے کو چھوڑ کر ''مشترک خاندانی جائداد'' کا طریقہ اختیار کر لیا گیا۔ کہیں عورتوں اور مردوں کا حصہ برابر کر دیا گیا اور اب ان پرانی بغاوتوں کے ساتھ تازہ ترین بغاوت یہ ہے کہ بعض مسلمان ریاستیں اہل مغرب کی تقلید میں ''وفات ٹیکس'' (Death Duty) اپنے ہاں رائج کر رہی ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ میت کے وارثوں میں ایک وارث حکومت بھی ہے جس کا حصہ رکھنا اللہ میاں بھول گئے تھے! حالانکہ اسلامی اصول پر اگر میت کا ترکہ کسی صورت میں حکومت کو پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ کسی مرنے والے کا کوئی قریب و بعید رشتہ دار موجود نہ ہو اور اس کا چھوڑا ہوا مال تمام اشیائے متروکہ (Unclaimed Properties) کی طرح داخل بیت المال ہو جائے۔ یا پھر حکومت اس صورت میں کوئی حصہ پا سکتی ہے جب کہ مرنے والا اپنی وصیت میں اس کے لیے کوئی حصہ مقرر کر جائے۔

(تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۳۲۹ تا ۳۳۱۔ النساء حواشی ۲۴ تا ۲۵ الف)

انبیاؑ کی میراث

اِنَّ النَّبِیَّ لَا یُوْرَثُ اِنَّمَا مِیْرَاثُہٗ فِیْ فُقَرَآءِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمَسَاکِیْنِ

نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو کچھ وہ چھوڑتا ہے وہ مسلمانوں کے فقرا اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔[1]

اس حدیث کی بعض لوگ سورہ النمل کی آیت ورث سلیمان داؤد کی روشنی میں تردید کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں وراثت سے مراد مال و جائداد کی وراثت نہیں بلکہ نبوت اور خلافت میں حضرت داؤد کی جانشینی ہے۔ مال و جائداد کی میراث اگر بالفرض منتقل ہوئی بھی ہو تو وہ تنہا حضرت سلیمانؑ ہی کی طرف منتقل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ حضرت داؤدؑ کی دوسری اولاد بھی موجود تھی۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۵۶۱ سورۂ النمل حاشیہ ۲۰)

[1] تفہیم الاحادیث، ج ۷ ص ۱۹۶۔ اشاعت دوم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کا مسئلہ

لا نورث، ماترکنا صدقة

ہم لوگ وراثت نہیں چھوڑا کرتے۔ جو کچھ بھی ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذاتی املاک اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت کو تو نبوت کے ابتدائی دس گیارہ سال میں خرچ کر چکے تھے اور تبلیغ دین کی مصروفیت نے آپ کے لیے اس امر کا بھی کوئی موقع باقی نہ چھوڑا تھا کہ اپنی کسب معاش کے لیے کچھ کر سکیں۔ اس کے بعد مکہ کے آخری اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ کی معیشت کا انحصار ان فتوح پر رہا جو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے آپ کو عطا کرتا تھا۔ پھر جب اسلامی حکومت کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک طرف حکمران کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے بنی نضیر کی فئے میں آپ کا حصہ مقرر فرما دیا، اور دوسری طرف خیبر اور فدک کی زمینوں میں، جن کو مال غنیمت کے طور پر تقسیم کیا گیا تھا، دوسرے شرکائے جنگ کے ساتھ آپ کو بھی حصہ ملا۔ ان میں سے پہلے حصے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت فرمائی وہ یہ تھی کہ:

ان اللہ عزوجل اذا اطعم نبیا طعمة فھی للذی یقوم من بعدہ

یعنی اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بسر اوقات کے لیے جو ذریعۂ معاش عطا کرتا ہے وہ اس کے بعد اس شخص کا حصہ ہے جو اس کی جگہ اس کا کام سنبھالے۔

اور دوسرے حصے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

نحن لا نورث، ماترکنا صدقة۔ (بخاری)

ہم لوگ وراثت نہیں چھوڑا کرتے۔ جو کچھ بھی ہم چھوڑیں، وہ صدقہ ہے۔

اسی کی وجہ ذرا سا غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے صدقہ کیوں کر دیا اور پچھلے تمام انبیا کا طریقہ یہ کیوں رہا ہے کہ نبوت کے زمانے کی کمائی کو وہ صرف بسر اوقات ہی کا ذریعہ بناتے تھے۔ ذاتی مِلک بنا کر میراث میں منتقل نہ کرتے تھے، انبیا علیہم السلام کو جس نازک منصب پر اللہ تعالیٰ قائم کرتا تھا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی اپنی ذات ایسے ہر شبہ سے بالاتر رہے کہ وہ یہ کام کسی ذاتی غرض سے کر رہے ہیں۔ اسی لیے ہر نبی کی زبان سے اللہ تعالیٰ یہ اعلان کراتا تھا کہ:

لَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ، اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ

میں تم سے اس کام پر کوئی اجر نہیں چاہتا، میرا اجر تو صرف اللہ کے ذمہ ہے۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ صدقہ اس بنیاد پر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم زمانۂ رسالت کی کمائی کو اجر رسالت بنانا پسند نہ فرماتے تھے۔ اس چیز کو ''کمیونزم'' سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ (مسئلہ ملکیت زمین ص ۲۱-۲۲)

لا تقسم ورثتی دینارا ولا درھما، ما ترکت بعد نفقة نسائی و مونة عاملی، فھو صدقة۔ (بخاری، مسلم، موطاء

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسند احمد)

میرے وارث کوئی دینار و درہم آپس میں تقسیم نہ کریں۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے، میری بیویوں کا نفقہ اور میرے عامل کا حق الخدمت ادا کرنے کے بعد سب صدقہ ہے۔

پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی وفات کے وقت کوئی ذاتی جائداد تھی بھی کہ اس میں میراث جاری ہوتی؟ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ نبوت کے منصب پر سرفراز ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام وقت دعوت حق کے کام پر صرف ہونے لگا تھا اور کاروبار تجارت بند ہو چکا تھا۔ مکہ معظمہ میں جب تک قیام رہا، اس اثاثے پر گزر بسر ہوتی رہی جو آپ کے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہلے کا بچا بچایا موجود تھا۔ ہجرت فرمائی تو گویا دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مدینہ طیبہ پہنچ کر آپ بالکل بے سروسامان تھے۔ ابتدائی زمانہ انتہائی عسرت اور تنگ دستی کے ساتھ گزرا۔ پھر جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اموال غنیمت میں سے پانچواں حصہ نکالنے کا حکم دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ جس قدر مناسب سمجھیں، اور ضرورت محسوس فرمائیں اپنی ذات پر اور اپنے قرابتداروں کی حاجات پر صرف کرنے کے لیے اس حصے میں سے لے لیا کریں، باقی اللہ کے کام میں اور یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کی خبر گیری میں صرف فرمائیں۔

وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰی وَ الْیَتٰمٰی وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ ۙ (الانفال: آیت ۴۱)

یہ پہلا ذریعۂ معاش تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا۔

اس کے بعد ہجرت کے چوتھے سال اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے یہودی قبیلے بنی النضیر پر آپ کو فتح عطا فرمائی اور وہ اپنی جائدادیں چھوڑ کر شہر سے چلے گئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ ۭ۔ (الحشر ۶-۷)

اور جو کچھ دلوایا اللہ نے ان سے اپنے رسول کو نہیں دوڑائے اس پر تم نے گھوڑے اور اونٹ، مگر اللہ مسلط کر دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ جو کچھ دلوا دے اللہ (اس طریقے پر) اپنے رسول کو بستیوں کے لوگوں سے تو وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قرابتداروں اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافروں کے لیے تاکہ یہ مال تمھارے دولت مندوں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے ان تمام اموال، جائدادوں اور علاقوں کو جو براہ راست جنگی کارروائی کے ذریعے سے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فتح نہ ہوئے ہوں بلکہ اسلامی حکومت کے رعب اور دبدبے سے مسخر ہو جائیں، غنیمت سے الگ کر کے حکومت کی مِلک قرار دے دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق عطا فرمایا کہ وہ اپنی اور اپنے قرابتداروں کی ضروریات کے لیے اس سرکاری مال میں سے جس قدر مناسب سمجھیں لے لیں۔

ان احکام کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ میں بنی النضیر کے چھوڑے ہوئے باغوں میں چند نخلستان، خیبر میں سے کچھ اراضی اور فدک میں سے کچھ اراضی اپنے لیے مخصوص کر لی تھی۔ اس جائداد کی آمدنی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کرتے تھے، اپنے قرابتداروں کی مدد فرماتے تھے، اور جو کچھ بچتا تھا، اسے اللہ کی راہ میں صرف فرما دیتے تھے۔

غور کیا جائے تو صاف سمجھ میں آجاتا ہے کہ ان دونوں ذرائع (غنیمت اور فَے) سے جو کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کیا گیا اس کی نوعیت یہ نہیں تھی کہ آپؐ نے اپنے ذاتی کاروبار سے کوئی جائداد پیدا کی ہو اور وہ آپؐ کے بعد بھی آپ کی مِلک رہے اور آپؐ کے وارثوں میں تقسیم ہو، بلکہ اس کی نوعیت یہ تھی کہ آپؐ اسلامی حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا سارا وقت سرکاری کام پر صرف فرماتے تھے اور اپنا کوئی ذاتی ذریعہ معاش نہ رکھتے تھے۔ اس لیے آپ کو یہ حق عطا فرمایا گیا کہ حکومت کی املاک میں سے اتنی جائداد اپنے تصرف میں رکھیں جس سے آپ کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے نبوت کا یہ کارِ عظیم اپنے لیے جائدادیں اور جاگیریں پیدا کرنے کے لیے تو نہیں کیا تھا۔ یہ تو ایک خدمت تھی جو خالص اللہ کے لیے آپ انجام دے رہے تھے اور اس کا اجر اللہ ہی کے ذمہ تھا۔ ریاست کے مال میں آپ کا حصہ بس اتنا تھا کہ آپ اپنے نفس کے اور اپنے اہل وعیال کے اور حاجت مند قرابتداروں کے حقوق ادا کر سکیں۔ یہ حصہ آپؐ کی حیاتِ طیبہ تک ہی باقی رہ سکتا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اس کو ذاتی املاک کی طرح وارثوں میں تقسیم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی ہی میں صاف کر دیا تھا۔

لَا تقسم ورثتی دینارا ولا درهما، ما ترکت بعد نفقة نسائی و مؤنة عاملی فهو صدقة۔ (بحاری، مسلم، موطا، مسند احمد)

میرے وارث کوئی دینار و درہم آپس میں تقسیم نہ کریں۔ میں نے جو کچھ چھوڑا ہے، میری بیویوں کا نفقہ اور میرے عامل کا حق الخدمت ادا کرنے کے بعد وہ سب صدقہ ہے۔

لا نورث ماترکنا فهو صدقة، انما یاکل آل محمد من هذا المال لیس لهم ان یزید و اعلی الماکل۔ (بخاری، مسند احمد، مسلم)

ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم نے چھوڑا، وہ صدقہ ہے۔ محمدؐ کے گھر والے تو اس مال میں سے بس کھا لیتے ہیں۔ کھانے بھر سے زیادہ لینے کا انھیں حق نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان اللہ عزوجل اذا اطعم نبیا طعمۃ ثم قبضہ جعلہ للذی یقوم بعدہ۔ (مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق)

اللہ عزوجل کسی نبی کو بسر اوقات کے لیے جو کچھ دیتا ہے وہ اس کی وفات کے بعد اس شخص کے حوالے کر دیتا ہے جو اس کا جانشین ہو۔

اس مال کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایات کچھ خفیہ نہ تھیں، بلکہ تمام جلیل القدر صحابہ ان کو جانتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ ہی تنہا ان کے راوی نہیں ہیں۔ حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ، حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر، حضرت عثمان، حضرت ابوہریرہ اور تمام ازواج مطہرات کی یہ شہادت نہایت مستند روایات سے ہم تک پہنچی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ترکے کی یہی نوعیت بیان فرمائی تھی۔ اس فرمان مبارک کے ہوتے ہوئے کون شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا آپؐ کی چھوڑی ہوئی جائداد کے معاملے میں کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کے مجاز ہو سکتے تھے۔

مطالبہ میراث کیسے اٹھا

اب دیکھیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مطالبۂ میراث کس طرح اٹھا اور آپؐ کے خلفا نے اس پر اپنے اپنے زمانوں میں کیا کارروائی کی۔ شرعی قاعدے کے مطابق میراث کا مطالبہ کرنے کے حق دار تین فریق ہو سکتے ہیں۔ ایک سیدہ فاطمۃ الزہراؓ بیٹی کی حیثیت سے، دوسرے حضرت عباس چچا کی حیثیت سے، تیسرے جملہ ازواج مطہرات بیویوں کی حیثیت سے۔ ان میں سے پہلے دو فریقوں یعنی سیدہ فاطمہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت ابوبکرؓ کے خلیفہ مقرر ہونے کے فوراً بعد خیبر، فدک اور مدینہ طیبہ کی اس تمام جائداد کے متعلق، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تصرف میں تھی۔ اپنا دعویٰ پیش کیا اور بعض روایات کے مطابق حضرت فاطمہؓ نے استدلال کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ جب تمھاری وفات کے بعد تمھارا ترکہ تمھارے اہل وعیال ہی میں تقسیم ہونا ہے تو آخر میرے باپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ان کے ترکے میں سے مجھے کیوں میراث نہ ملے؟ اس کے جواب میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ فرمایا وہ یہ تھا:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا نورث ما ترکنا صدقۃ۔ وقال لست تارکا شیئا کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل بہ الا عملت بہ فانی اخشی ان ترکت شیئا من امرہ ان ازیغ۔ (بخاری، کتاب فرض الخمس، مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی، جو کچھ ہم نے چھوڑا، وہ صدقہ ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ میں کوئی ایسا کام نہ رہنے دوں گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور میں وہ نہ کروں، کیوں کہ مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے آپؐ کے اوامر میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا تو گمراہ ہو جاؤں گا۔

(تفصیلی بحث رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۸۳ تا ۳۹۹ ملاحظہ ہو۔ نیز احادیث کی تخریج تفہیم الاحادیث ج ۷ ص ۲۰۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ولكن اعول من كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يعوله و انفق على من كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينفق عليه. (ترمذى، كتاب السير ماجاء فى تركة النبى صلى الله عليه وسلم، مسند احمد، مرويات ابوبكر صديقؓ)

مگر میں ان سب لوگوں کی عیالداری کروں گا جن کی عیال داری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے اور ان سب لوگوں پر خرچ کروں گا، جن پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خرچ فرمایا کرتے تھے۔

والله لقرابة رسول الله صلى الله عليه وسلم احب الى ان اصل من قرابتي۔ (بخارى، كتاب المغازى، باب حديث بنى النضير)

خدا کی قسم! میرے لیے اپنے رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کرنے کی بہ نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں سے صلۂ رحمی کرنا زیادہ محبوب ہے۔

جناب سیدہ اور حضرت عباسؓ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو کے متعلق جتنی مستند روایات ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے کسی میں بھی یہ بات کہیں اشارۃً وکنایۃً بھی مذکور نہیں ہے کہ جناب سیدہؓ، یا حضرت عباسؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی یہ بات سن کر جواب میں فرمایا ہو کہ آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک غلط بات منسوب کر رہے ہیں۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس فرمان کی نسبت صحیح تھی تو پھر خلیفۂ رسول کے لیے واجب العمل قانون اس کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھا۔ آخر اس فرمان کی زد صرف جناب سیدہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما ہی کے مفاد پر تو نہ پڑتی تھی۔ خود خلیفہ کی اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کا مفاد بھی اسی کی لپیٹ میں آجاتا تھا۔ کیونکہ وہ بھی اس کی بنا پر اپنے شوہر کی میراث سے محروم ہوتی تھیں۔ خلیفہ برحق نے آخر انھی کو اس قانون سے کب مستثنیٰ کیا؟[1]

اب رہ گیا تیسرا فریق، یعنی ازواج مطہرات کا گروہ تو اس نے بھی ارادہ کیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنا نمائندہ بنا کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس بھیجے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے میں سے اپنے آٹھویں حصے کا مطالبہ کرے۔ مگر حضرت عائشہؓ نے اس کی مخالفت کی اور تمام ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا:

الا تتقين الله، الم تعلمن ان النبى صلى الله عليه وسلم كان يقول لا نورث ما تركنا صدقة۔ يريد بذلك نفسه انما ياكل آل محمد فى هذا المال۔

کیا آپ اللہ سے نہیں ڈرتیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم نے چھوڑا وہ صدقہ ہے۔ محمدؐ کے اہل وعیال تو بس اس مال میں سے کھا سکتے ہیں۔

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل اور مستند روایات کے لیے ملاحظہ ہو:

☆ بخارى، كتاب الجهاد فرض الخمس۔ كتاب المناقب فضائل اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم۔ كتاب المغازى۔ كتاب الفرائض، مسلم: كتاب الجهاد، باب حكم الفئى۔ ☆ نسائى كتاب قسم الفئى ☆ ترمذى كتاب السير، باب ماجاء فى تركة النبى صلى الله عليه وسلم۔ ☆ مسند احمد مرويات ابى بكر صديق رضى الله عنه۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ بات سن کر سب ازواج مطہرات اپنے دعوے سے دست بردار ہوگئیں۔[1]

ایک بات اس سلسلے میں یہ کہی جاتی ہے کہ فَدَک کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو دیا جائے گا۔ جناب سیدہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے خاص طور پر اسی کا مطالبہ کیا تھا اور شہادت میں حضرت علیؓ اور ام ایمن کو پیش کیا تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کی شہادت قبول نہ کی اور فدک کی جائداد ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

مگر یہ قصہ حدیث کی مستند روایات میں سے کسی میں بھی مذکور نہیں ہے۔ البتہ بلاذری اور ابن سعد نے اسے نقل کیا ہے اور ان کے بیان میں بھی کافی اضطراب ہے۔ ابن سعد کی روایت یہ ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے یہ بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھی، بلکہ ام ایمن سے سنی تھی، اور انھی کو شہادت میں پیش کر دیا۔ بخلاف اس کے بلاذری کی روایت یہ ہے کہ جناب سیدہ نے خود یہ دعویٰ کیا تھا کہ میرے والد صلی اللہ علیہ وسلم نے فدک مجھے دیا ہے۔ پھر ایک روایت کی رو سے انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ام ایمن کو شہادت میں پیش کیا اور دوسری روایت کی رو سے ام ایمن اور رباح (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام) کو۔[2]

یہ تو ہے اس قصے کی حیثیت باعتبار روایت، اب قانونی حیثیت سے دیکھیے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل یا تو ہبہ ہو سکتا تھا یا وصیت۔ اگر کہا جائے کہ ہبہ تھا تو وہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی ہی میں فدک کا قبضہ حضرت فاطمہؓ کو دے دیا ہوتا۔ ورنہ محض زبان سے کسی چیز کو کسی کے لیے نامزد کر دینا، اور یہ نیت کرنا کہ وہ چیز مالک کے مرنے کے بعد معطی لہ کو ملے گی، ہبہ نہیں بلکہ وصیت ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ یہ وصیت تھی، تو قرآن مجید میں میراث کا قانون نازل ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود یہ اعلان فرما چکے تھے کہ "لا وصية لوارث" اب ترکے کی تقسیم کے معاملے میں کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔" پھر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہی اعلان کردہ قانون کے خلاف دوسرے وارثوں کو چھوڑ کر ایک خاص وارث کے حق میں کوئی وصیت فرمائی ہو گی۔

علاوہ بریں ہبہ یا وصیت کے سوال کو نظر انداز کر کے صرف اس شہادت ہی کو دیکھا جائے جو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کی گئی تھی تو وہ صریح قرآنی قانون شہادت کے لحاظ سے ناکافی تھی۔ قرآن کی رو سے یا تو دو مردوں کی شہادت معتبر ہے۔ یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت۔ جناب سیدہؓ (اگر یہ قصہ درست مانا جائے) صرف ایک عورت، یا ایک مرد اور ایک عورت کی گواہی لائی تھیں۔ اس صورت میں قانون کے خلاف فیصلہ کیسے کیا جا سکتا تھا؟ کیا شخصیتوں کو دیکھ کر شہادت کا شرعی نصاب بدل جاتا ہے؟

---

1. بخاری، کتاب المغازی، باب حديث بنی النضير۔ کتاب الفرائض، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم، لانورث...... مسلم کتاب الجهاد، باب حكم الفئی۔ موطا۔ باب ماجاء في تركة النبي صلى الله عليه وسلم۔
2. طبقات ابن سعد، ذكر ميراث النبي صلى الله عليه وسلم ☆ فتوح البلدان للبلاذری، ذکر فدک۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں دوبارہ اٹھا۔ ان کی خلافت پر دو سال گزر چکے تھے کہ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے ان کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکے کا مسئلہ پیش کیا، اور انھوں نے خیبر و فدک کو مستثنیٰ کر کے مدینے والی جائداد دونوں صاحبوں کی تولیت میں اس شرط پر دے دی، کہ وہ اس کی آمدنی انھی مصارف پر خرچ کریں گے، جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں صرف فرمایا کرتے تھے۔[1]

لیکن اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان اس جائداد کے انتظام پر نزاع واقع ہوگئی اور وہ اس قضیے کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے۔ اس کا نہایت مفصل قصہ مالک بن اوس بن حدثان کے حوالے سے تمام معتبر کتب حدیث میں روایت ہوا ہے۔

حضرت مالک کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ ان کے حاجب نے آکر عرض کیا کہ عثمان بن عفان، عبدالرحمٰن بن عوف، زبیر بن العوام اور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم) حاضری کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی۔ اور وہ تشریف لے آئے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر آیا اور اطلاع دی کہ عباس بن عبدالمطلب اور علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما تشریف لائے ہیں اور وہ بھی اجازت کے طالب ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اجازت دینے پر دونوں صاحب اندر تشریف لے آئے اور سلام کے بعد بیٹھتے ہی حضرت عباسؓ نے کہا کہ اے امیر المومنین میرے اور اس کے (اپنے بھتیجے حضرت علیؓ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) مقدمے کا فیصلہ فرما دیجیے۔ اس کے ساتھ چچا نے بھتیجے کے حق میں کچھ سخت سست الفاظ بھی استعمال کیے۔ دوسرے حاضرین نے کہا، واقعی امیر المومنین ان کا قضیہ بہت طول کھینچ گیا ہے۔ آپ انھیں اس جھگڑے سے نجات دلا یئے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، ٹھہریئے، میں آپ صاحبوں کو اس خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "ہماری وراثت جاری نہیں ہوتی۔ جو کچھ ہم نے چھوڑا، وہ صدقہ ہے؟" چاروں صاحبوں نے کہا "ہاں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کو اسی طرح اللہ کا واسطہ دے کر پوچھا "کیا آپ دونوں صاحب جانتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا اور ایسا فرمایا تھا؟ دونوں نے جواب دیا" جی ہاں، واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اچھا اب میں آپ لوگوں کو اس معاملے کی حقیقت بتاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فے کے معاملے میں اپنے رسول کو وہ مخصوص اختیارات عطا فرمائے تھے، جو کسی دوسرے کو عطا نہیں فرمائے۔ پھر سورۂ حشر کی آیت {وما افاء اللہ علی رسولہ} آخر تک تلاوت کر کے حضرت عمرؓ نے فرمایا، اس آیت کی رو سے یہ اموال فے خالصۃً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے۔ مگر خدا کی قسم! حضورؐ نے آپ لوگوں کو چھوڑ کر ان سب کو اپنے لیے سمیٹ لیا، اور نہ ان کے معاملے میں کوئی خود غرضی برتی۔ بلکہ انھیں آپ

---

[1] بخاری، کتاب فرض الخمس، و کتاب المغازی، مسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق، مسلم۔ کتاب الجهاد، باب حکم الفئی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہی لوگوں میں تقسیم کر دیا، یہاں تک کہ تین جائدادیں (مدینہ، فدک اور خیبر والی) بچ گئیں۔ ان جائدادوں میں سے حضورؐ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا سال بھر کا نفقہ لے لیتے تھے اور باقی ساری آمدنی انھی کاموں میں صرف فرماتے تھے جن میں اللہ کا مال صرف کیا جاتا ہے۔ یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ان اموال کے معاملے میں زندگی بھر رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ یہ بات آپ سب لوگوں کے علم میں ہے؟ چاروں صاحبوں نے جواب دیا ''جی ہاں'' پھر حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا، میں آپ دونوں کو بھی اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، آپ یہ بات جانتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا ''جی ہاں، ہم جانتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا، پھر اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا اور ابو بکرؓ نے یہ کہہ کر کہ اب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ولی ہوں، ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ان کے معاملے میں اسی طریقے پر عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ اس میں ابو بکرؓ بالکل سچے تھے اور ٹھیک حق کے تابع تھے۔ پھر اللہ نے ابو بکرؓ کو بھی اٹھا لیا اور میں ان کا ولی ہوا۔ میں نے اپنی امارت کے پہلے دو سال تک ان اموال کو اپنے ہاتھ میں لے کر اسی طرح عمل کیا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر رضی اللہ عنہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں بھی اس میں سچا اور تابع حق تھا۔ (پھر حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما سے مخاطب ہو کر فرمایا) آپ دونوں صاحب میرے پاس آئے اور آپ نے مجھ سے جائداد کے معاملے میں گفتگو کی۔ اس وقت آپ دونوں کے درمیان اتفاق تھا۔ اے عباس آپ نے مجھ سے بھتیجے کی میراث طلب کی، اور اے علی آپ نے مجھ سے اپنی بیوی کے واسطے سے ان کے والد کی میراث مانگی۔ میں نے آپ سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ((لا نورث ماتر کنا صدقة)) لہٰذا اگر آپ چاہیں تو میں اس شرط پر یہ جائداد آپ کے حوالے کر سکتا ہوں کہ آپ اس میں اسی طرح عمل کریں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد ابو بکر رضی اللہ عنہ عمل کرتے تھے اور خلیفہ ہونے کے بعد سے میں عمل کر رہا ہوں۔ لیکن اگر یہ شرط آپ کو منظور نہ ہو تو مجھ سے اس معاملے میں بات نہ کیجیے۔ پھر حضرت عمرؓ نے چاروں صاحبوں کو خدا کا واسطہ دے کر پوچھا کہ اس جائداد کو حوالے کرتے وقت میری یہی شرط تھی؟ انھوں نے بھی اسے تسلیم کیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اس سے مختلف کوئی فیصلہ کروں۔ اس خدا کی قسم جس کے حکم سے زمین و آسمان قائم ہیں، میں کوئی دوسرا فیصلہ نہیں کروں گا۔ اگر آپ اس شرط پر عمل نہیں کر سکتے تو یہ جائداد میرے حوالے کر دیجیے، میں اس کا انتظام کر لوں گا۔[1]

یہ ہے اس معاملے کی پوری تاریخ جو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں پیش آئی۔ اسے دیکھ کر ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ کیا گیا، وہ ظلم تھا، یا عدل اور حق؟ اس کے ساتھ دو باتیں اور بھی ہیں جو صحیح رائے قائم

[1] بخاری، کتاب الخمس، کتاب المغازی، کتاب النفقات، کتاب الفرائض۔ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنة ☆ مسلم۔ کتاب الجهاد ☆ ترمذی۔ کتاب ابواب السیر، باب ماجاء فی ترکة النبی صلی الله علیه وسلم ☆ ابوداؤد کتاب الخراج والفئی۔ باب فی صفایا رسول الله صلی الله علیه وسلم ☆ مسند احمد مرویات عمر فاروق رضی الله عنه۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرنے کے لیے نگاہ میں رہنی چاہییں۔

اول یہ کہ اصل بحث صرف یہ تھی کہ اس جائداد کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میراث میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یہ بحث نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل وعیال اور قرابتداروں کو بیت المال سے نفقہ پانے کا حق ہے یا نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے خود اپنی ذات اور اپنے خاندان والوں سے زیادہ ان حضرات کی خدمت کی۔ ان کے حق کو ہر دوسرے حق پر مقدم رکھا، اور جو وظائف ان کے لیے جاری کیے، وہ خیبر اور فدک اور مدینہ طیبہ کی جائدادوں کے محاصل سے کہیں بڑھ کر تھے۔

دوسری بات جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس مسئلے میں فیصلہ کن ہے، وہ یہ کہ خود سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی اس جائداد کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث قرار دے کر وارثوں میں تقسیم نہیں کیا۔ بلکہ اسے بدستور وقف فی سبیل اللہ ہی رہنے دیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعی میراث ہی تھی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اپنے زمانۂ اقتدار میں وارثوں کو اس سے محروم رکھنا کیسے جائز ہو گیا؟ اسے ظلم ہی کہنے کو کسی کا جی چاہتا ہو تو پھر اسے اتنا انصاف تو کرنا ہی چاہیے کہ جس جس نے اس کا ارتکاب کیا ہے ان سب کو ظالم کہے۔ ایک ہی فعل پر کسی کے حق میں ایک فیصلہ اور کسی دوسرے کے حق میں دوسرا فیصلہ کرنا حق پرست آدمی کا کام نہیں ہے۔ (رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۸۳-۳۹۹)

آیت تطہیر میں حضرت علیؓ شامل ہیں یا نہیں؟ کیا ان کا میراث نبوی کا مطالبہ برحق تھا؟

آیت تطہیر میں بلاشبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ شامل ہیں اور خدانخواستہ کوئی مومن بھی ان کے رجس (اخلاقی و اعتقادی گندگی) میں مبتلا ہونے کا قائل نہیں، بلکہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث کے اس مقدمے میں آخر رجس اور طہارت کی بحث پیدا ہونے کا کیا محل ہے؟ نیک نیتی کے ساتھ بھی تو ایک حکم کا منشا سمجھنے اور ایک معاملۂ خاص پر اس کو منطبق کرنے میں ان کے اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف ہوسکتا تھا۔ اس سے لازماً یہی معنی کیوں نکالے جائیں کہ انھوں نے دانستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میراث رسول کا مطالبہ کیا؟

بہرحال اس معاملے میں دو واقعے ناقابل انکار ہیں۔ ایک یہ کہ اہل بیت کی طرف سے میراث کا مطالبہ ہوا اور اس مطالبے میں سیدہ فاطمہ، حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم تینوں شامل ہیں؟ دوسرے یہ کہ جب پانچ سال تک حضرت علی رضی اللہ عنہ خود خلیفہ تھے اور حجاز (جہاں حضورؐ کی تمام متروکہ جائداد واقع تھی) پوری طرح ان کے تحتِ اختیار تھا، اس وقت انھوں نے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تقسیم نہیں کی۔ اب ان دونوں واقعات کی جو توجیہ (شیعہ حضرات) کرنا چاہیں کرلیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہم اس کی جو توجیہہ کرتے ہیں اس میں رجس کی کسی شائبے کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ ہمارے نزدیک ابتداً یہ مطالبہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے اٹھا تھا، (اور غلط فہمی قطعاً کوئی اخلاقی یا اعتقادی گندگی نہیں ہے) بعد میں جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے پوری طرح اس معاملے کی حقیقت واضح کر دی، تو حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم بھی مطمئن ہو گئے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں شیخین کے فیصلے کو ناجائز سمجھتے اور پھر بھی اس کو بدل کر حق داروں تک ان کا حق پہنچانے سے احتراز کرتے۔ ہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس سے بالاتر مانتے ہیں کہ وہ ایک چیز کو باطل سمجھتے ہوں اور پھر قصداً اس پر قائم رہیں اور ایک چیز کو نہ صرف اپنا بلکہ دوسرے حق داروں کا بھی حق جانتے ہوں، اور پھر بھی اسے ادا نہ کریں۔ یہ بلاشبہ رجس ہے جس کے ادنیٰ غبار سے بھی ہم اہل بیت اطہار کے دامن کو آلودہ نہیں مان سکتے۔ (رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۴۲۵-۴۲۶)

دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے

لَا يَتَوَارَثُ اَهْلُ مِلَّتَيْنِ شَتّٰى (مسند احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دار قطنی) حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن عاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو مختلف ملتوں کے لوگ ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ (بخاری، مسلم، نسائی، احمد، ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد) حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔ (المبسوط ج ۳۰ صفحات ۳۰-۳۲)

امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ اور امام احمدؒ اس بات کے قائل ہیں کہ ایک مذہب کے پیرو دوسرے مذہب کے پیرو کی وراثت نہیں پا سکتے۔ ان کا استدلال مندرجہ بالا حدیث ہے۔ (اسی سے ایک ملتے جلتے مضمون کی ایک حدیث ترمذی نے حضرت جابرؓ سے اور ابن حبان نے حضرت عبداللہؓ بن عمر اور بزار نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی ہے) اس کے برعکس امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ کافروں کے مذاہب خواہ باہم کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن کفر بحیثیت مجموعی ایک ہی ملت ہے، اس لیے یہودی عیسائی کا اور عیسائی یہودی کا، اور اسی طرح ایک مذہب کا کافر دوسرے مذہب کے کافر کا وارث ہو سکتا ہے اگر ان کے نسب یا نکاح یا کسی سبب کی بنا پر کوئی ایسا تعلق ہو جو ایک کی وراثت دوسرے کو پہنچنے کا مقتضی ہو۔ اس مسلک پر مفصل بحث کرتے ہوئے مسلک حنفی کے مشہور امام شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں: "کفار آپس میں ان سب اسباب کی بنا پر بھی ایک دوسرے کے وارث ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے ہیں، اور ان کے درمیان بعض ایسی صورتوں میں بھی توارث ہو سکتا ہے، جن میں مسلمانوں کے درمیان نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے بس دو ہی دین قرار دیے ہیں ایک دین حق، دوسرے دین باطل، چنانچہ فرمایا (لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ) اور اس نے لوگوں کے دو ہی فریق رکھے ہیں ایک فریق جنتی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اور وہ مومن ہے اور دوسرا فریق دوزخی ہے اور وہ بحیثیت مجموعی تمام کفار ہیں اور اس نے دو ہی گروہوں کو ایک دوسرے کا مخالف قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا (هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِیْ رَبِّهِمْ) (یہ دو مد مقابل فریق ہیں جن کے درمیان اپنے رب کے معاملے میں جھگڑا ہے) (الحج آیت ۱۹) یعنی ایک فریق تمام کفار بحیثیت مجموعی ہیں اور ان کا جھگڑا اہل ایمان سے ہے۔

ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اپنے اعتقاد کے مطابق باہم الگ الگ ملتیں ہیں، بلکہ مسلمانوں کے مقابلے میں وہ سب ایک ہی ملت ہیں، کیونکہ مسلمان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کا اقرار کرتے ہیں اور وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ کافر قرار پاتے ہیں اور مسلمانوں کے معاملے میں وہ سب ایک ملت ہیں۔ (تفہیم القرآن، ج ۶ ص ۵۰۷، الکافرون حاشیہ ۵)

دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمان کی وراثت

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا. (الانفال ۸:۷۲)

رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کر کے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمھارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔

اس آیت میں آزاد مسلمانوں اور غلام مسلمانوں کے تعلقات کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلے مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ سے یہ بتایا گیا ہے کہ جو مسلمان دارالکفر میں رہنا پسند قبول کریں یا رہنے پر مجبور ہوں ان سے دارالاسلام کے مسلمانوں کے تمدنی تعلقات نہیں رہ سکتے، نہ وہ باہم رشتہ قائم کر سکتے ہیں اور نہ انھیں ایک دوسرے کا ورثہ و ترکہ مل سکتا ہے۔

جہاں تک مجھے علم ہے قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔ رہا ان مہاجرین کا معاملہ جن کے ایسے رشتے دار دارالکفر میں رہ گئے ہوں جن کے وہ وارث ہو سکتے ہیں تو ان کے بارے میں بھی میرا خیال یہی ہے کہ نہ وہ ہندوستان میں اپنی میراث پا سکتے ہیں اور نہ ان کے ہندوستانی رشتے دار پاکستان میں ان سے میراث پانے کا حق رکھتے ہیں۔[1] (رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۱۵۱-۱۵۲ بیسویں اشاعت)

زرعی جائدادوں میں تقسیم میراث کا شرعی طریقہ

شریعت کے قانونِ میراث کو زرعی جائدادوں کے معاملے میں پوری قوت کے ساتھ نافذ کرنے کی کوشش کی جائے۔

موجودہ نسل ہی میں جو لوگ شرعاً حق دار ہیں اگر ان کے اندر میراث کی تقسیم کو لازم کر دیا جائے تو بہت سی وہ بڑی بڑی جائدادیں جو پرانے جاہلی رواج کی وجہ سے یکجا سمٹی ہوئی ہیں مستحقین میں بٹ جائیں گی اور دولت کے پھیلاؤ کا سلسلہ چل پڑے گا۔ اس صورت میں یہ جو اندیشہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ زمین اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو جائے گی جو معاشی حیثیت سے قابل

---

[1] تفصیل رسائل و مسائل حصہ دوم کے صفحات ۱۵۱ تا ۱۸۴ ملاحظہ فرمائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عمل نہ رہیں گے، یہ درحقیقت صحیح نہیں ہے۔ آپ زمین کی خرید وفروخت سے بے جا رکاوٹیں ہٹا دیجیے۔ مزارعت کے لیے عمدہ اور واضح طریقے مقرر کر دیجیے اور "مشترک کاشت" (کوآپریٹو فارمنگ) کے طریقوں کو رواج دیجیے۔ اس کے بعد چاہے قانونِ میراث کی بدولت، زمین تقسیم در تقسیم ہو کر ایک ایک گز کے ٹکڑوں میں ہی کیوں نہ بٹ جائے ایسی صورت حال کبھی پیدا نہ ہونے پائے گی جس میں یہ حصے ناقابل عمل ہو کر رہ جائیں۔ جن لوگوں کے پاس اس طرح کے چھوٹے ٹکڑے رہ جائیں گے وہ بآسانی اپنا حصہ بیچ سکیں گے یا دوسروں کے حصے خرید سکیں گے، یا مناسب شرائط پر کاشت کے لیے دے سکیں گے، یا مشترک کاشت میں شریک ہو جائیں گے۔ (مسئلہ ملکیت زمین ص ۱۱۳-۱۱۴)

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ

("اسلام میں یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ" ایک عرصے سے اخبارات میں موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ منکرین حدیث کے لیے چونکہ اس کی آڑ میں حدیث کے متعلق اپنے گمراہ کن خیالات پیش کرنے کا ایک نادر موقع ہے اس لیے انھوں نے اسے ایک جذباتی پس منظر میں رکھ کر اس پر خوب لے دے کی ہے۔ ان حالات میں اس امر کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ نہ صرف اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی جائے بلکہ اس کے مالہ وما علیہ پر بھی اظہار خیال کیا جائے۔ وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر مصنف نے ذیل کا مضمون لکھا جو دو خطوط کی صورت میں روزنامہ نوائے وقت میں شائع ہوا۔ اس مضمون سے نہ صرف مسئلہ زیر بحث کو سمجھنے میں رہنمائی ملے گی بلکہ اس ذہن کی کجی کا بھی اندازہ ہوگا جو اس کے پیچھے کام کر رہا ہے۔)

پہلا خط

ایک مدت سے بعض حضرات نے یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا ہے کہ یتیم پوتے کا اپنے دادا کی میراث سے محروم ہونا قرآن کے خلاف ہے۔ چونکہ وراثت سے یتیم پوتے کی محرومی ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر صحابہ کرام کے دور سے لے کر آج تک تمام امت کے فقہا متفق رہے ہیں اور اس میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری، اہل حدیث، شیعہ وغیرہ گروہوں کے علما میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، اس لیے اس پروپیگنڈے کے اثرات بڑے دور رس ہیں۔ اگر ایک دفعہ یہ مان لیا جائے کہ یہ مسئلہ قرآن کے خلاف ہے اور دوسری طرف یہ دیکھا جائے کہ اس میں فقہائے امت کے درمیان ایسا مکمل اتفاق ہے تو پھر کوئی شخص بھی اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فقہائے اسلام یا تو قرآن کی سمجھ نہیں رکھتے تھے یا پھر وہ سب جان بوجھ کر قرآن کی خلاف ورزی پر متفق ہو گئے تھے۔

دوسرا خط

"نوائے وقت" میں یتیم پوتے کی وراثت کے متعلق میرے سابق مضمون کی اشاعت کے بعد تونسہ شریف سے ایک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صاحب نے مجھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ایک خط کا تراشا بھیجا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ میں اس پر اظہار رائے کروں۔ نیز اس سلسلے میں کچھ سوالات بھی کیے ہیں۔ میں ان کا خط اور اس کے جواب میں ان کو جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ آپ کے پاس بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں۔ کیونکہ اس میں ان بیشتر قابل لحاظ اعتراضات کا جواب آ گیا ہے جو میرے مضمون کی اشاعت کے بعد نوائے وقت میں بعض اصحاب نے اٹھائے ہیں۔

صرف ایک دو باتیں وضاحت طلب باقی رہ جاتی ہیں جو آپ کے ہاں شائع شدہ مراسلات میں کہی گئی ہیں۔ ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ میں نے پہلے تو کبھی یہ لکھا تھا کہ قرآن وحدیث میں یتیم پوتے کی محرومی کے متعلق کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، اور اب اسے قرآن وحدیث سے ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن میں گزارش کروں گا کہ انھوں نے میرا مدعا سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ میرا مطلب صرف یہ تھا کہ قرآن وحدیث میں صراحۃً تو کہیں یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ بیٹوں کی موجودگی میں پوتوں کو وراثت نہ دی جائے (اور اسی طرح قرآن وحدیث میں کوئی صریح حکم یہ بھی نہیں ہے کہ پوتوں کو وراثت ضرور دی جائے) لیکن تقسیمِ میراث کی اُس اسکیم پر اگر غور کیا جائے جو کتاب وسنت میں بیان ہوئی ہے تو نتیجہ یہی مستنبط ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں پوتوں کو وراثت نہ دی جائے اور یہ استنباط تمام علمائے امت کا متفق علیہ ہے۔ ایک تازہ خط میں خلافت کے قریش تک محدود ہونے پر فقہائے سلف کے اجماع کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اس اجماع سے بعد کے علما نے اختلاف کیا ہے اس لیے پوتے کی وراثت کے معاملے میں بھی اجماع کی خلاف ورزی کی جا سکتی ہے۔ مگر اس معاملے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اجماع جن ارشاداتِ نبویؐ پر مبنی تھا انھی ارشادات میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ قریش میں خلافت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ وہ ''دین کو قائم کرتے رہیں۔'' اسی بات کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں واضح کر دیا تھا کہ ''یہ حکومت قریش میں رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتے رہیں اور اس کے حکم پر ٹھیک ٹھیک چلتے رہیں۔'' پس بعد کے ادوار میں غیر قریش کی خلافت کے جواز کا فتویٰ اجماعِ سلف کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہیں دیا گیا بلکہ ان اوصاف کے فقدان کی وجہ سے دیا گیا ہے جو قریش میں خلافت کے رہنے کے لیے شرط کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے اس معاملے میں یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ بعد کے علما نے سابق اجماع کو توڑ دیا۔ اس سلسلے میں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کسی اجماع کا ماخذ اگر قرآن وسنت میں سرے سے موجود ہی نہ ہو تب تو اس پر نظر ثانی ہو سکتی ہے لیکن اگر اس کا ماخذ قرآن وسنت میں ہو تو پھر اس پر نظر ثانی خود قرآن و سنت کے دلائل کی بنیاد پر ہی ممکن ہے جیسا کہ اوپر میں نے قریش کے استحقاق خلافت کے معاملے میں واضح کیا ہے۔

اب میں تونسہ شریف سے آمدہ خط کا ضروری حصہ اور اس کا جواب ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

''(۱) وراثت کے متعلق مولانا آزاد مرحوم کے خط سے جس نئے نظریۂ فکر کی نشان دہی ہوتی ہے کیا اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے؟

www.KitaboSunnat.com

(۲) اس عبارت سے تو یہ مطلب پایا جاتا ہے کہ لڑکا باپ کے گھر پیدا ہونے سے مالک ورثہ قرار پایا البتہ قابض ترکہ باپ کے مرنے کے بعد ہوگا (اس لیے لڑکے کے مرنے سے پوتا دادا کی جائداد سے محجوب الارث نہیں)۔

(۳) اگر یہ نظریہ غلط ہے تو باپ کے خبطی یا اوباش ہو جانے کی صورت میں لڑکا اپنی جدی جائداد کا تحفظ (یا کورٹ آف وارڈ) کرانے کا حق کس طرح رکھتا ہے؟''

مصنف کا جواب

(۱) مولانا آزاد مرحوم کے مطبوعہ مکتوب سے کسی نئے فکر کی نشان دہی نہیں ہوتی۔ ان کے خط میں پہلے تو یتیم پوتے کے محجوب الارث ہونے کے حق میں فقہا کی ایک دلیل نقل کی گئی ہے اور پھر اس دلیل کا ردّ کیے بغیر محض یہ فرمایا گیا ہے کہ ''فقہا کی نظر صرف ایک علت کی طرف گئی ہے اور تمام علل و اصول جو اس باب میں ثابت و معلوم ہیں، نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔'' لیکن وہ تمام علل و اصول جو مولانا کے نزدیک ''ثابت و معلوم'' تھے ان کی کچھ تفصیل انھوں نے بیان نہیں فرمائی۔ اس لیے نہ تو یہی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ علل و اصول کیا تھے جنھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور نہ یہی پتہ چل سکتا ہے کہ وہ علل و اصول فی الواقع ثابت و معلوم ہیں بھی یا نہیں۔

(۲) آپ نے مولاناؒ کے مکتوب کی کس عبارت سے یہ مطلب اخذ کیا ہے کہ ''لڑکا باپ کے گھر پیدا ہونے سے مالک ورثہ قرار پاتا ہے، البتہ قابض ترکہ باپ کے مرنے کے بعد ہوگا''؟ اس مطلب کا تو کوئی اشارہ تک مجھے اس خط میں نظر نہیں آیا۔ درحقیقت یہ خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ میں اپنے اس مضمون میں بیان کر چکا ہوں جو نوائے وقت میں آپ نے ملاحظہ فرمایا ہے۔ قرآن کی رُو سے کوئی حقِ وراثت مورث کی زندگی میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ مورث کی موت کے ساتھ یہ حق صرف ان رشتہ داروں کے لیے ثابت ہوتا ہے جو اس وقت زندہ موجود ہوں۔ آپ جس نظریے کا ذکر کر رہے ہیں وہ تو دراصل اس ہندوانہ رواجی قانون میں پایا جاتا ہے جو مدتوں تک یہاں مسلمانوں میں بھی رائج رہا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں تصور یہ ہے کہ موروثی جائداد دراصل خاندان یا پوری نسل کی مشترک ملکیت ہے۔ خاندان کے افراد یکے بعد دیگرے جائداد کے محدود مالک بنتے ہیں اور ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ جائداد کو بجنسہٖ ایک سے دوسرے کی جانب منتقل کرتے چلے جائیں۔ ان کے ہاں گویا تمام موجود اور آئندہ نسل بیک وقت شریک ورثہ ہے۔ اسی اصول کے تحت رواجی قانون میں لڑکوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر ان کا باپ جدی جائداد کو تلف کرنے یا کسی اجنبی کی جانب منتقل کرنے کی کوشش کرے تو وہ ''وارثانِ بازگشت'' کی حیثیت سے استقرارِ حق کا دعویٰ دائر کر کے باپ کے خلاف حکم امتناعی حاصل کر سکتے ہیں۔ اسلام میں نہ تو موروثی اور غیر موروثی جائداد کے درمیان کوئی امتیاز قائم کیا گیا ہے اور نہ مالک کے اختیارات مشروط و محدود ہی رکھے گئے ہیں۔ از روئے اسلام ایک مالک اپنی زندگی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں اپنی جائداد کا مالک کامل ہے خواہ اس نے وہ جائداد خود پیدا کی ہو یا آباؤ اجداد سے وراثت میں لی ہو اور وہ حین حیات اس میں بیع، ہبہ، وصیت، وقف ہر طرح کے تصرف کے جملہ اختیارات رکھتا ہے۔

(۲) بے شک اسلامی قانون میں اس کی گنجائش موجود ہے کہ صاحبِ جائداد کے فاتر العقل یا سفیہ ہونے کی صورت میں قاضی جائداد کو اپنی تحویل میں لے لے۔ لیکن اس معاملے میں بھی نہ تو جدی جائداد کی کوئی تمیز روا رکھی گئی ہے اور نہ یہی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ صاحب جائداد کی اولاد یا کوئی دوسرا متوقع وارث ہی عدالت میں استغاثہ دائر کرے۔ بلکہ اس معاملے سے تعلق رکھنے والا ہر شخص عدالت کو متوجہ کرسکتا ہے۔ قانونِ اسلامی میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہو کہ کوئی شخص وراثت میں حقدار ہونے کی وجہ سے زندہ مالک جائداد کے خلاف شکایت کا خصوصی استحقاق رکھتا ہے۔ اسلامی قانون کی اس شق کا مقصد کسی وارث کے ورثے کو محفوظ کرنا نہیں بلکہ اسراف و تبذیر اور ضیاع اموال کو روکنا ہے اور اس کا ماخذ آیت وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ ہے۔ اس قانون کی رو سے ایسے مالک کے تصرف پر بھی پابندی عائد کی جاسکتی ہے جس کا سرے سے کوئی متوقع وارث موجود ہی نہ ہو۔

جو لوگ پوتے کی وراثت کے معاملے میں بہت زیادہ مضطرب ہیں انھیں چاہیے کہ وہ آخر کوئی اصول تو متعین کریں جس کی بنا پر بیٹوں کی موجودگی میں پوتے کو وراثت دی جاسکے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پوتا اولاد ہونے کی حیثیت سے بجائے خود میراث کا حق رکھتا ہے اور وہ اپنے دادا کی اسی معنی میں اولاد ہے جس معنی میں بیٹا باپ کی اولاد ہے تو پھر جس پوتے کا باپ زندہ ہو اسے بھی اپنے باپ سمیت اپنے دادا کے تمام بیٹوں کے ساتھ برابر حق وراثت میں شریک ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر ایک شخص کے چار بیٹے ہیں اور آٹھ پوتے ہیں تو وراثت چار کے بجائے بارہ برابر حصوں میں تقسیم ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہے اور کوئی اس کا قائل نہیں ہے تو پھر محض يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ والی آیت کو پوتے کے حق وراثت میں پیش کرنا یا عربی اشعار کی مدد سے پوتے کو بمنزلہ اولاد قرار دے کر اسے دادا کا وارث بنانا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ پوتا اپنے باپ کی زندگی میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے مرنے کی صورت میں چچاؤں کے ساتھ دادا کی وراثت کا حق دار ہوتا ہے، تو اول تو قرآن میں اس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لیے دلیل کے سوال کو نظر انداز بھی کردیا جائے تب بھی ولدیت کی بنا پر زندہ بیٹوں کے ساتھ یتیم پوتے کو حقدار قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بیٹوں کے ساتھ مساوی حصہ ملے۔ مثلاً ایک شخص کے اگر تین بیٹے زندہ ہیں اور ایک بیٹا چار لڑکے چھوڑ کر مرا ہے تو اس شخص کی جائداد سات برابر حصوں میں تقسیم ہونی چاہیے۔ لیکن اگر اس بات کا بھی کوئی قائل نہیں ہے تو پھر پوتے کی وراثت لامحالہ اس بنیاد پر ہوگی کہ اس کا وفات یافتہ باپ اپنے باپ کی زندگی میں ورثے کا حق دار ہوچکا تھا اور اب یہ یتیم پوتا اپنے دادا کی نہیں بلکہ اپنے باپ کی میراث پا رہا ہے۔ اب اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ باپ کی زندگی میں مر جانے والے لڑکے کا حق باقی رہتا ہے تو پھر یہ صرف صاحبِ اولاد لڑکے کی حد تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ جو بیٹے لاولد مر گئے ہوں یا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کمسنی اور شیر خوارگی کی حالت میں مرگئے ہوں ان کا حق بھی باقی رہنا چاہیے اور ان کے شرعی وارثوں (مثلاً ان کی بیوی، ماں، یا ماں کی عدم موجودگی میں بہن بھائیوں) کو لازماً ملنا چاہیے۔[1] صرف صاحبِ اولاد لڑکے کی اولاد تک اس قاعدے کو محدود رکھنے کے لیے کوئی شرعی یا عقلی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ بعض لوگ مرے ہوئے بیٹے کی محض اولاد تک ورثے کو محدود رکھنے کے لیے نسبی وغیر نسبی یا خونی وغیر خونی رشتہ داروں کی تمیز قائم کرتے ہیں، حالانکہ اول تو اس تمیز کی بنا پر بعض حق داروں کو محروم کرنا خلاف قرآن اور خالص ہندوانہ ذہنیت ہے، اور دوسرے یہ بات قطعی ناقابلِ فہم بلکہ لغو ہے کہ نسبی رشتہ داروں کی صف میں صرف اولاد کو شامل کیا جائے اور والدہ اور بھائی بہنوں کو خارج کر دیا جائے۔ (ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۵۹ء)

❁❁❁❁❁❁❁

[1] جو لوگ پوتے کی وراثت کے معاملے میں یتامیٰ کا نام لے کر جذباتی اپیلیں کرتے ہیں، آخر بیواؤں پر انھیں کیوں رحم نہیں آتا؟ اچھا ہو کہ وہ یتیموں کے ساتھ ساتھ مرے ہوئے شیر خوار بچوں کی ماؤں اور لاولد بیٹوں کی بیویوں کے لیے بھی وراثت کے حصے کا مطالبہ کریں، کیونکہ یہ دونوں بیچاری بیوائیں ہیں اور اسلام تو یتیموں کے ساتھ بیواؤں کا بھی بڑا ہمدرد ہے!

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

انفاق فی سبیل اللہ کے احکام

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

انفاق فی سبیل اللہ کے احکام

انفاق فی سبیل اللہ سے متعلقہ قرآنی آیات

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۲-۳)

یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ان پرہیزگار لوگوں کو زندگی کا سیدھا راستہ بتاتا ہے جو غیب پر [خدا، آخرت اور وحی وغیرہ] ایمان لاتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ (آل عمران ۳:۹۲)

تم نیکی کا مقام پا ہی نہیں سکتے جب تک کہ خدا کی راہ میں وہ چیزیں نہ خرچ کرو جن سے تم کو محبت ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ۔ (البقرہ ۲:۱۹۵)

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو [کہ راہ خدا میں خرچ نہ کرنے کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں]۔

www.kitabosunnat.com

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (الحشر ۵۹:۹)

اور جو تنگ دلی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ۔ (البقرہ ۲:۲۷۲)

تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اس سے اللہ کی رضا کے سوا تمہارا اور کوئی مقصود نہیں ہوتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ۔ (البقرہ ۲:۲۶۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور اذیت دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کرو جو لوگوں کے دکھاوے کو خرچ کرتا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے خرچ کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برسے تو ساری مٹی بہہ جائے اور بس صاف چٹان کی چٹان رہ جائے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ۔ (البقرہ ۲:۲۶۲-۲۶۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر خرچ کر کے احسان نہیں جتاتے اور تکلیف نہیں پہنچاتے، ان کے لیے خدا کے ہاں اجر ہے اور انھیں کسی نقصان کا خوف یا رنج نہیں۔ رہی وہ خیرات جس کے بعد تکلیف پہنچائی جائے، تو اس سے تو یہی بہتر ہے کہ سائل کو نرمی سے ٹال دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ بھائی معاف کرو۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ. (البقرہ ۲:۲۶۷)

اے ایمان لانے والو، جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے اچھا مال خدا کی راہ میں دو۔ یہ نہ کرو کہ خدا کی راہ میں دینے کے لیے برے سے برا تلاش کرنے لگو۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ (البقرہ ۲:۲۷۱)

اگر کھلے طریقے سے خیرات کرو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر غریب لوگوں کو دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اس سے تمھارے گناہ دُھلتے ہیں۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ. (النساء ۴:۵)

اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمھارے لیے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہنے کے لیے دو۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۲۸۰)

اور اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اسے خوش حال ہونے تک مہلت دو۔ اور صدقہ کر دینا تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم اس کا فائدہ جانو۔

وَيَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ (البقرہ ۲:۲۱۹)

پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اے نبیؐ، کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَـقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ (الفرقان ۲۵:۶۷)

اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ بہت تنگی کر جائیں بلکہ ان کا طریقہ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں ہو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

نہ تو اپنا ہاتھ اتنا سکیڑ لو کہ گویا گردن سے بندھا ہوا ہے اور نہ اتنا کھول دو کہ حسرت زدہ بیٹھے رہو اور لوگ بھی تم کو ملامت کریں۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶)

اپنے غریب رشتے دار کو اس کا حق دے اور مسکین اور مسافر کو۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ (البقرہ ۲:۱۷۷)

اور نیک وہ ہے جو خدا کی محبت میں مال دے اپنے غریب رشتے داروں کو اور یتیموں اور مسکینوں کو اور مسافر کو اور ایسے لوگوں کو جن کی گردنیں غلامی اور اسیری میں پھنسی ہوئی ہوں۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَـنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ (النساء ۴:۳۶)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نیک سلوک کیا جائے اپنے ماں باپ اور رشتے داروں سے اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس کے بیٹھنے والوں اور مسافروں اور اپنے لونڈی غلاموں سے۔

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ (الدھر ۷۶: ۸ تا ۱۰)

اور نیک لوگ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو محض اللہ کے لیے کھلا رہے ہیں۔ تم سے کوئی بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے۔ ہم کو تو اپنے خدا سے اس دن کا ڈر لگا ہوا ہے جس کی شدت کی وجہ سے لوگوں کے منہ سکڑ جائیں گے اور تیوریاں چڑھ جائیں گی (یعنی قیامت کا دن)

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ (ذاریات ۵۱: ۱۹)

اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والوں کا اور اس شخص کا جو محروم ہو۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝ (البقرہ ۲: ۲۷۳)

خیرات ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اپنا سارا وقت خدا کے کام میں دے کر ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی روٹی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری کو دیکھ کر ناواقف لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ غنی ہیں مگر ان کی صورت دیکھ کر تم پہچان سکتے ہو کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر مانگتے پھریں۔ جو کچھ بھی تم خیرات دو گے اللہ کو اس کی خبر ہوگی اور وہ اس کا بدلہ دے گا۔ (خطبات اول ص ۲۳۶ تا ۲۴۴ طبع اول)

[متذکرہ بالا آیات میں انفاق کے عام حکم کی تشریح، خدا کی راہ میں خرچ کے طریقے اور امداد کے مستحقین کا ذکر کیا گیا ہے۔ انفاق کے عام حکم کی تشریح کے ضمن میں سیدھے راستے پر چلنے کے سلسلے میں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں سیدھے راستے پر چلنے کے لیے تین چیزیں لازمی طور پر شرط ہیں۔ ایک ایمان بالغیب، دوسرے نماز، تیسرے جو رزق بھی اللہ نے دیا ہوا اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنا۔ پہلی چار آیات میں اسی کا ذکر ہے۔ پانچویں چھٹی اور ساتویں آیت میں ہے کہ خرچ کرنے میں صرف خدا کی رضا اور خوشنودی مطلوب ہو۔ کسی کو احسان مند بنانے یا دنیا سے نام پیدا کرنے کے لیے خرچ نہ کیا جائے۔ آٹھویں میں بہتر مال دینے کی تلقین ہے۔ نویں میں چھپا کر دینے اور دسویں میں نادانوں کو ضرورت سے زائد نہ دینے کا ذکر ہے۔ گیارھویں، بارھویں اور تیرھویں آیات میں خیرات میں اعتدال کا ذکر ہے۔ چودھویں، پندرھویں اور سولھویں سے لے کر انیسویں تک میں امداد کے مستحقین کا ذکر ہے۔ (مرتب)]

انفاق فی سبیل اللہ کے عام احکام

انفاق فی سبیل اللہ کی تعریف

وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

يُنْفِقُوْنَ ۝ (الحج ۲۲:۳۵)

اے نبی ! بشارت دے دے عاجزانہ روش اختیار کرنے والوں کو، جن کا حال یہ ہے کہ اللہ کا ذکر سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، جو مصیبت بھی ان پر آتی ہے اُس پر صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اللہ نے کبھی حرام و ناپاک مال کو اپنا رزق نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے آیت کا مطلب ہے کہ جو پاک رزق ہم نے انھیں بخشا ہے اور جو حلال کمائیاں ان کو عطا کی ہیں ان میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔ پھر خرچ سے مراد بھی ہر طرح کا خرچ نہیں ہے بلکہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جائز ضروریات پوری کرنا، رشتہ داروں اور ہمسایوں اور حاجتمند لوگوں کی مدد کرنا، رفاہ عام کے کاموں میں حصہ لینا اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے مالی ایثار کرنا مراد ہے۔ بے جا خرچ، اور عیش و عشرت کے خرچ اور ریا کارانہ خرچ وہ چیز نہیں ہے جسے قرآن ''انفاق'' قرار دیتا ہے، بلکہ یہ اس کی اصطلاح میں اسراف اور تبذیر ہے۔ اسی طرح کنجوسی اور تنگ دلی کے ساتھ جو خرچ کیا جائے کہ آدمی اپنے اہل و عیال کو بھی تنگ رکھے اور خود بھی اپنی حیثیت کے مطابق اپنی ضرورتیں پوری نہ کرے اور خلق خدا کی مدد بھی اپنی استطاعت کے مطابق کرنے سے جی چرائے، تو اس صورت میں اگرچہ آدمی خرچ تو کچھ نہ کچھ کرتا ہے، مگر قرآن کی زبان میں اس کا نام ''انفاق'' نہیں ہے۔ وہ اس کو بخل اور شحِ نفس کہتا ہے۔ (تفہیم القرآن ج ۳۔ الحج حاشیہ ۶۶)

احکام کی دو قسمیں۔ عام اور خاص

اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کا یہ قاعدہ رکھا ہے کہ پہلے تو نیکی اور بھلائی کے کاموں کا ایک عام حکم دیا جاتا ہے تا کہ لوگ اپنی زندگی میں عموماً بھلائی کا طریقہ اختیار کریں۔ پھر اسی بھلائی کی ایک خاص صورت بھی تجویز کر دی جاتی ہے تا کہ اس کی خاص طور پر پابندی کی جائے۔

اللہ کی یاد کا عام حکم

مثال کے طور پر دیکھیے، اللہ کی یاد ایک بھلائی ہے، سب سے بڑی بھلائی اور تمام بھلائیوں کا سرچشمہ۔ اس کے لیے عام حکم ہے کہ اللہ کو ہمیشہ ہر حال میں ہر وقت یاد رکھو اور کبھی اس سے غافل نہ ہو:

فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ (النساء ۴:۱۰۳)

کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے اللہ کی یاد میں لگے رہو۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الانفال ۸:۴۵)

اور اللہ کو بہت یاد کرو تا کہ تم کو فلاح نصیب ہو۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ (آل عمران ۳:۱۹۰-۱۹۱)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں اُن لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں، جو خدا کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہتے ہیں اور جو آسمانوں اور زمین کی بناوٹ پر غور کر کے بے اختیار بول اٹھتے ہیں کہ پروردگار، تو نے یہ کارخانہ بیکار نہیں بنایا۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف ۱۸:۲۸)

اور اُس شخص کی بات نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل پایا اور جو اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ گیا ہے اور جس کے سارے کام حد سے گزرے ہوئے ہیں۔

یہ اور بہت سی ایسی آیات ہیں جن میں حکم دیا گیا ہے کہ ہمیشہ ہر حال میں خدا کی یاد جاری رکھو، کیونکہ خدا کی یاد ہی وہ چیز ہے جو آدمی کے معاملات کو درست رکھتی ہے اور اس کو سیدھے راستے پر قائم رکھتی ہے۔ جہاں آدمی اس کی یاد سے غافل ہوا، اور بس نفسانی خواہشوں اور شیطانی وسوسوں نے اس پر قابو پالیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ راہِ راست سے بھٹک کر اپنی زندگی کے معاملات میں حد سے گزرنے لگے گا۔

اللہ کی یاد کا خاص حکم

دیکھیے، یہ تو تھا عام حکم۔ اب اسی یادِ الٰہی کی ایک خاص صورت تجویز کی گئی۔ نماز، اور نماز میں بھی پانچ وقت میں چند رکعتیں فرض کر دی گئیں جن میں بیک وقت پانچ دس منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے۔ اس طرح چند منٹ اس وقت اور چند منٹ اس وقت یادِ الٰہی کو فرض کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بس آپ اتنی ہی دیر کے لیے خدا کو یاد کریں اور باقی وقت اس کو بھول جائیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم اتنی دیر کے لیے تو تم کو بالکل خدا کی یاد میں لگ جانا چاہیے۔ اس کے بعد اپنے کام بھی کرتے رہو اور ان کو کرتے ہوئے خدا کو بھی یاد کرو۔

انفاق فی سبیل اللہ کا عام حکم

یہاں بھی ایک حکم عام ہے اور ایک خاص۔ ایک طرف تو یہ ہے کہ بخل اور تنگ دلی سے بچو کہ یہ برائیوں کی جڑ اور بدیوں کی ماں ہے۔ اپنے اخلاق میں اللہ کا رنگ اختیار کرو جو ہر وقت بے حد وحساب مخلوق پر اپنے فیض کے دریا بہا رہا ہے، حالانکہ کسی کا اس پر کوئی حق اور دعویٰ نہیں ہے۔ راہِ خدا میں جو کچھ خرچ کر سکتے ہو کرو۔ اپنی ضرورتوں سے جتنا بچا سکتے ہو بچاؤ اور اس سے خدا کے دوسرے ضرورت مند بندوں کی ضرورتیں پوری کرو۔ دین کی خدمت میں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے میں جان اور مال سے کبھی دریغ نہ کرو۔ اگر خدا سے محبت رکھتے ہو تو مال کی محبت کو خدا کی محبت پر قربان کر دو۔ یہ تو ہے عام حکم۔

انفاق کا خاص حکم

اور اس کے ساتھ ہی خاص حکم یہ ہے کہ اس قدر مال اگر تمھارے پاس جمع ہو تو اس میں سے کم از کم اتنا خدا کی راہ میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضرور صرف کرو، اور اتنی پیداوار تمھاری زمین میں ہو تو اس میں سے کم از کم اتنا حصہ تو ضرور خدا کی نذر کر دو۔ پھر جس طرح چند رکعت نماز فرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس یہ رکعتیں پڑھتے وقت ہی خدا کو یاد کرو اور باقی سارے وقتوں میں اس کو بھول جاؤ، اسی طرح مال کی ایک چھوٹی سی مقدار راہِ خدا میں صرف کرنا جو فرض کیا گیا ہے، اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے پاس اتنا مال ہو بس انھی کو راہِ خدا میں صرف کرنا چاہیے اور جو اس سے کم مال رکھتے ہوں انھیں اپنی مٹھیاں بھینچ لینی چاہییں۔ اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ مالدار لوگوں پر جتنی زکوٰۃ فرض کی گئی ہے بس وہ اتنا ہی خدا کی راہ میں صرف کریں اور اس کے بعد کوئی ضرورت مند آئے تو اسے جھڑک دیں۔ یا دین کی خدمت کا کوئی موقع آئے تو کہہ دیں کہ ہم تو زکوٰۃ دے چکے۔ اب ہم سے ایک پائی کی بھی امید نہ رکھو۔ زکوٰۃ فرض کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ کم از کم اتنا مال تو ہر مال دار کو راہِ خدا میں دینا ہی پڑے گا اور اس سے زیادہ جس شخص سے جو کچھ بن آئے وہ اس کو صرف کرنا چاہیے۔

انفاق کے عام حکم کی مختصر تشریح

قرآن مجید کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ جس چیز کا حکم دیتا ہے اس کی حکمتیں اور مصلحتیں بھی خود ہی بتا دیتا ہے، تاکہ محکوم کو حکم کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے اور اس کا فائدہ کیا ہے۔ قرآن مجید کھولتے ہی سب سے پہلے جس آیت پر آپ کی نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے:

سیدھے راستے پر چلنے کی تین شرطیں

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝
(البقرہ ۲:۲-۳)

یہ قرآن اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں، یہ ان پرہیزگار لوگوں کو زندگی کا سیدھا راستہ بتاتا ہے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہ اصل الاصول بیان کر دیا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں سیدھے راستے پر چلنے کے لیے تین چیزیں لازمی طور پر شرط ہیں:

ایک ایمان بالغیب۔[1]

دوسرے نماز قائم کرنا۔

تیسرے جو رزق بھی اللہ نے دیا ہو اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنا۔

[1] جس میں خدا اور آخرت اور وحی سب ہی امورِ غیب پر ایمان لانا شامل ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔ (آل عمران ۳:۹۲)

تم نیکی کا مقام پا ہی نہیں سکتے جب تک کہ خدا کی راہ میں وہ چیزیں نہ خرچ کرو جن سے تم کو محبت ہے۔

پھر فرمایا:

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۔ (البقرہ ۲:۲۶۸)

شیطان تم کو ڈراتا ہے کہ خرچ کرو گے تو فقیر ہو جاؤ گے وہ تمھیں شرمناک چیز یعنی بخیلی کی تعلیم دیتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا:

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۔ (البقرہ ۲:۱۹۵)

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھ سے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو (کہ راہِ خدا میں خرچ نہ کرنے کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں)۔

آخر میں فرمایا:

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ (الحشر ۵۹:۹)

اور جو تنگ دلی سے بچ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

زندگی بسر کرنے کے دو طریقے

ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی بسر کرنے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو خدا کا ہے جس میں نیکی اور بھلائی اور فلاح اور کامیابی ہے، اور اس راستے کا قاعدہ یہ ہے کہ آدمی کا دل کھلا ہوا ہو، جو رزق بھی تھوڑا یا بہت اللہ نے دیا ہو اس سے خود اپنی ضرورتیں بھی پوری کرے، اپنے بھائیوں کی بھی مدد کرے، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے بھی خرچ کرے۔ دوسرا راستہ شیطان کا ہے، جس میں بظاہر تو آدمی کو فائدہ ہی فائدہ نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں، اور اس راستے کا قاعدہ یہ ہے کہ آدمی دولت سمیٹنے کی کوشش کرے، پیسے پر جان دے اور اس کو دانتوں سے پکڑ پکڑ کر رکھے تاکہ خرچ نہ ہونے پائے اور خرچ ہو بھی تو بس اپنے ذاتی فائدے اور اپنے نفس کی خواہش ہی پر ہو۔

❀❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

خدا کی راہ میں خرچ کے طریقے

اب دیکھیے کہ خدائی راستے پر چلنے والوں کے لیے راہِ خدا میں خرچ کرنے کے کیا طریقے بیان ہوئے ہیں ان سب کو نمبر وار بیان کرتا ہوں:

۱۔ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خرچ کرنے میں صرف خدا کی رضا اور اس کی خوشنودی مطلوب ہو، کسی کو احسان مند بنانے یا دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے خرچ نہ کیا جائے۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ۔ (البقرہ ۲:۲۷۲)

تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اس سے اللہ کی رضا کے سوا تمھارا اور کوئی مقصود نہیں ہوتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ۔ (البقرہ ۲:۲۶۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور اذیت دے کر اس شخص کی طرح ضائع نہ کر دو جو لوگوں کے دکھاوے کو خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے خرچ کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک چٹان پر مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برسے تو ساری مٹی بہہ جائے اور بس صاف چٹان کی چٹان رہ جائے۔

۲۔ احسان نہ جتایا جائے

دوسری بات یہ ہے کہ کسی کو پیسہ دے کر یا روٹی کھلا کر یا کپڑا پہنا کر احسان نہ جتایا جائے اور ایسا برتاؤ نہ کیا جائے جس سے اس کے دل کو تکلیف ہو۔

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًی ؕ۔ (البقرہ ۲:۲۶۲-۲۶۳)

جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر خرچ کر کے احسان نہیں جتاتے اور تکلیف نہیں پہنچاتے، ان کے لیے خدا کے ہاں اجر ہے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور انھیں کسی نقصان کا خوف یا رنج نہیں۔ رہی وہ خیرات جس کے بعد تکلیف پہنچائی جائے، تو اس سے تو یہی بہتر ہے کہ سائل کو نرمی سے ٹال دیا جائے اور اس سے کہہ دیا جائے کہ بھائی معاف کرو۔

۳۔ بہتر مال دیا جائے

تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ خدا کی راہ میں اچھا مال دیا جائے، برا چھانٹ کر نہ دیا جائے۔ جو لوگ کسی غریب کو دینے کے لیے پھٹے پرانے کپڑے تلاش کرتے ہیں، یا کسی فقیر کو کھلانے کے لیے بدتر سے بدتر کھانا نکالتے ہیں، ان کو بس ایسے ہی اجر کی خدا سے بھی توقع رکھنی چاہیے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ۔
(البقرہ ۲:۲۶۷)

اے ایمان لانے والو، جو کچھ تم نے کمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمھارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے اچھا مال خدا کی راہ میں دو۔ یہ نہ کرو کہ خدا کی راہ میں دینے کے لیے برے سے برا تلاش کرنے لگو۔

۴۔ حتی الامکان چھپا کر دیا جائے

چوتھا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو چھپا کر خرچ کیا جائے تاکہ ریا اور نمود کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ اگرچہ کھلے طریقے سے خرچ کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، مگر ڈھانک چھپا کر دینا زیادہ بہتر ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَیُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ ؕ
(البقرہ ۲:۲۷۱)

اگر کھلے طریقے سے خیرات کرو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر غریب لوگوں کو دو تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اس سے تمھارے گناہ دھلتے ہیں۔

۵۔ نادانوں کو ضرورت سے زیادہ نہ دیا جائے

پانچواں قاعدہ یہ ہے کہ کم عقل اور نادان لوگوں کو ان کی ضرورت سے زیادہ نہ دیا جائے کہ بگڑ جائیں اور بری عادتوں میں پڑ جائیں، بلکہ ان کو جو کچھ دیا جائے ان کی حیثیت کے مطابق دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ پیٹ کو روٹی اور پہننے کو کپڑا تو ہر برے سے برے اور بدکار سے بدکار کو بھی ملنا چاہیے، مگر شراب نوشی اور چانڈو اور گانجے اور جوئے بازی کے لیے لفنگے آدمیوں کو پیسہ نہ دینا چاہیے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ۔ (النساء ۴:۵)

اپنے اموال جن کو اللہ نے تمھارے لیے زندگی بسر کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں کے حوالے نہ کرو۔ البتہ ان اموال میں سے ان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو کھانے اور پہننے کے لیے دو۔

۶۔ مقروض کو پریشان نہ کیا جائے

چھٹا قاعدہ یہ بیان ہوا ہے کہ اگر کسی غریب آدمی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کو قرضِ حسن دیا جائے تو تقاضے کر کے اسے پریشان نہ کیا جائے بلکہ اس کو اتنی مہلت دی جائے کہ وہ آسانی سے ادا کر سکے اور اگر واقعی یہ معلوم ہو کہ وہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہے اور تم اتنا مال رکھتے ہو کہ اس کو آسانی کے ساتھ معاف کر سکتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ معاف کر دو۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۲۸۰)

اور اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اسے خوشحال ہونے تک مہلت دو اور صدقہ کر دینا تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے اگر تم اس کا فائدہ جانو۔

۷۔ خیرات میں اعتدال

ساتواں قاعدہ یہ ارشاد ہوا ہے کہ آدمی کو خیرات کرنے میں بھی حد سے نہ گزرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر سب کچھ خیرات میں دے ڈالا جائے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ سیدھے سادھے طریقے سے زندگی بسر کرنے کے لیے جتنی ضرورت انسان کو ہوتی ہے اتنا اپنی ذات پر اور اپنے بال بچوں پر صرف کرے اور جو باقی بچے اسے خدا کی راہ میں دے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ۔ (البقرہ ۲:۲۱۹)

پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں؟ اے نبیؐ، کہہ دو کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۔ (الفرقان ۲۵:۶۷)

اللہ کے نیک بندے وہ ہیں کہ جب خرچ کریں تو نہ فضول خرچی کریں، اور نہ بہت تنگی کر جائیں بلکہ ان کا طریقہ ان دونوں انتہاؤں کے بیچ میں ہو۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۹)

نہ تو اپنا ہاتھ اتنا سکیڑ لو کہ گویا گردن سے بندھا ہوا ہے اور نہ اتنا کھول دو کہ حسرت زدہ بیٹھے رہو اور لوگ بھی تم کو ملامت کریں۔

امداد کے مستحقین

آخر میں یہ بھی سن لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے مستحقین کی پوری فہرست بتا دی ہے جس کو دیکھ کر آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ کون کون لوگ آپ کی مدد کے مستحق ہیں اور کن کا حق اللہ نے آپ کی کمائی میں رکھا ہے:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔ (بنی اسرائیل ۱۷:۲۶)

اپنے غریب رشتہ دار کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ (البقرہ ۲:۱۷۷)

اور نیک وہ ہے جو خدا کی محبت میں مال دے اپنے غریب رشتہ داروں کو اور یتیموں اور مسکینوں کو اور مسافر کو اور ایسے لوگوں کو جن کی گردنیں غلامی اور اسیری میں پھنسی ہوئی ہوں۔

وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (النساء ۴:۳۶)

نیک سلوک کیا جائے اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں سے اور یتیموں اور مسکینوں اور قرابت دار پڑوسیوں اور اجنبی پڑوسیوں اور پاس کے بیٹھنے والوں اور مسافروں اور اپنے لونڈی غلاموں سے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ○ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ○ (الدہر ۷۶:۸ تا ۱۰)

اور نیک لوگ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو محض خدا کے لیے کھلا رہے ہیں۔ تم سے کوئی بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے۔ ہم کو تو اپنے خدا سے اس دن کا ڈر لگا ہوا ہے جس کی شدت کی وجہ سے لوگوں کے منہ سکڑ جائیں گے اور تیوریاں چڑھ جائیں گی (یعنی قیامت)۔

وَفِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (ذاریات ۵۱:۱۹)

اور ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والوں کا اور اس شخص کا جو محروم ہو۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِى الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○ (البقرہ ۲:۲۷۳)

خیرات ان حاجت مندوں کے لیے ہے جو اپنا سارا وقت خدا کے کام میں دے کر ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنی روٹی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری کو دیکھ کر ناواقف لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ غنی ہیں مگر ان کی صورت دیکھ کر تم پہچان سکتے ہو کہ ان پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں سے لپٹ لپٹ کر مانگتے پھریں۔ جو کچھ بھی تم خیرات دو گے اللہ کو اس کی خبر ہوگی، اور وہ اس کا بدلہ دے گا۔

(خطبات، ص ۲۳۳ تا ۲۴۴، اشاعت بائیسویں اپریل ۱۹۷۳ء، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ)

❀❀❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

نیکی کے وہ کام جہاں مال و دولت خرچ کرنا چاہیے

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَا أَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ أَوْ إِطْعٰمٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۝ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ (البلد ۹۰: ۱۱ تا ۱۶)

مگر اس نے دشوار گزار گھاٹی سے گزرنے کی ہمت نہ کی اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا۔

اوپر چونکہ اُس کی فضول خرچیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو وہ اپنی بڑائی کی نمائش اور لوگوں پر اپنا فخر جتانے کے لیے کرتا ہے، اس لیے اب اس کے مقابلے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون سا خرچ اور مال کا کون سا مصرف ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اس میں نفس کی کوئی لذت نہیں ہے بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اس سے چھڑائے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم [یعنی رشتہ دار یا پڑوسی یتیم] اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ ان کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتے ہیں، مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

ان آیات میں نیکی کے جن کاموں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے بڑے فضائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بیان فرمائے ہیں۔ مثلاً فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضورؐ کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اُس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچا لے گا، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بدلے پاؤں، شرم گاہ کے بدلے شرم گاہ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)۔ حضرت علی بن حسین [امام زین العابدین] نے اس حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے اُن کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام شعبی نے اس آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے افضل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضورؐ نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمِلَةِ وَالْمَسَاکِیْنِ کَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَحْسَبُهٗ قَالَ کَالْقَائِمِ لَایَفْتُرُ وَکَالصَّائِمِ لَایُفْطِرُ بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا [اور حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ] مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے درپے روزے رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے۔ (بخاری و مسلم)

یتامیٰ کے بارے میں تو حضورؐ کے بے شمار ارشادات ہیں۔ حضرت سہلؓ بن سعد کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اور وہ شخص جو کسی رشتہ دار یا غیر رشتہ دار یتیم کی کفالت کرے، جنت میں اس طرح ہوں گے۔ یہ فرما کر آپؐ نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو اٹھا کر دکھایا اور دونوں انگلیوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ رکھا۔ (بخاری) حضرت ابو ہریرہؓ حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں میں بہترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے نیک سلوک ہو رہا ہو اور بدترین گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے برا سلوک ہو رہا ہو۔ [ابن ماجہ۔ بخاری فی الادب المفرد] حضرت ابو امامہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس نے کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور محض اللہ کی خاطر پھیرا اس بچے کے ہر بال کے بدلے جس پر اس شخص کا ہاتھ گزرا اس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جس نے کسی یتیم لڑکے یا لڑکی کے ساتھ نیک برتاؤ کیا وہ اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے اور یہ فرما کر حضورؐ نے اپنی دونوں انگلیاں ملا کر بتائیں (مسند احمد۔ ترمذی) ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ سرکار رسالتمآب نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی یتیم کو اپنے کھانے اور پینے میں شامل کیا اللہ نے اس کے لیے جنت واجب کر دی الا یہ کہ وہ کوئی ایسا گناہ کر بیٹھا ہو جو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ (شرح السنۃ) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میرا دل سخت ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیر اور مسکین کو کھانا کھلا۔ (مسند احمد)

(تفہیم القرآن ج۶ ص ۳۴۲-۳۴۳۔ البلد حاشیہ ۱۲)

کفر و اسلام کی کشمکش کے دور میں اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کرنا

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ۝ (الحدید ۵۷:۷)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitabeSunnat.com

اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

اس مقام پر خرچ کرنے سے مراد عام بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا نہیں ہے، بلکہ آیت نمبر ۱۰ [1] کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں اس سے مراد اس جدوجہد کے مصارف میں حصہ لینا ہے جو اُس وقت کفر کے مقابلے میں اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں برپا تھی۔ خاص طور پر دو ضرورتیں اس وقت ایسی تھیں جن کے لیے اسلامی حکومت کو مالی مدد کی سخت حاجت درپیش تھی۔ ایک جنگی ضرورت۔ دوسرے ان مظلوم مسلمانوں کو سہارا دینا جو کفار کے ظلم وستم سے تنگ آکر عرب کے ہر حصے سے ہجرت کر کے مدینے آئے تھے اور آ رہے تھے۔ مخلص اہل ایمان ان مصارف کو پورا کرنے کے لیے اپنی ذات پر اتنا بوجھ برداشت کر رہے تھے جو ان کی طاقت اور وسعت سے بہت زیادہ تھا، اور اسی چیز کی داد اُن کو آگے آیات ۱۰-۱۲، [2] ۱۸ اور ۱۹ میں دی گئی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے گروہ میں بکثرت اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ایسے موجود تھے جو کفر و اسلام کی اس کشمکش کو محض تماشائی بن کر دیکھ رہے تھے اور اس بات کا انھیں کوئی احساس نہ تھا کہ جس چیز پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں اس کے کچھ حقوق بھی ان کی جان و مال پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی دوسری قسم کے لوگ اس آیت کے مخاطب ہیں۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ سچے مومن بنو اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد بھی ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جو مال تمھارے پاس ہے یہ دراصل تمھارا ذاتی مال نہیں بلکہ اللہ کا بخشا ہوا مال ہے۔ تم بذاتِ خود اس کے مالک نہیں ہو، اللہ نے اپنے خلیفہ کی حیثیت سے یہ تمھارے

---

[1] وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ○ (الحدید ۵۷:۱۰) آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔ تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے، اگرچہ اللہ نے دونوں سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

[2] آیت نمبر ۱۰ پچھلے حاشیے میں دی گئی ہے۔ باقی آیات ملاحظہ ہوں [مرتب] يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِم بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ○ (الحدید ۵۷:۱۲) اُس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن کا نور اُن کے آگے آگے اور اُن کے دائیں جانب دوڑ رہا ہوگا۔ (اُن سے کہا جائے گا کہ) ''آج بشارت ہے تمھارے لیے''، جنتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔
إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَأَقْرَضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا يُضَاعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ أَجْرٌ كَرِيمٌ ○ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۖ وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ۖ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ○ (الحدید ۵۷:۱۸-۱۹) مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنھوں نے اللہ کو قرض حسن دیا ہے، اُن کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور اُن کے لیے بہترین اجر ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں وہی اپنے رب کے نزدیک صدیق اور شہید ہیں۔ ان کے لیے اُن کا اجر اور اُن کا نور ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تصرف میں دیا ہے۔ لہٰذا مال کے اصل مالک کی خدمت میں اسے صرف کرنے سے دریغ نہ کرو۔ نائب کا یہ کام نہیں ہے کہ مالک کے مال کو مالک ہی کے کام پر خرچ کرنے سے جی چرائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مال نہ ہمیشہ سے تمھارے پاس تھا نہ ہمیشہ تمھارے پاس رہنے والا ہے۔ کل یہ کچھ دوسرے لوگوں کے پاس تھا، پھر اللہ نے تم کو اُن کا جانشین بنا کر اسے تمھارے حوالے کیا، پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ تمھارے پاس نہ رہے گا اور کچھ دوسرے لوگ اس پر تمھارے جانشین بن جائیں گے۔ اس عارضی جانشینی کی تھوڑی سی مدت میں، جبکہ یہ تمھارے قبض و تصرف میں ہے، اسے اللہ کے کام میں خرچ کرو، تاکہ آخرت میں اس کا مستقبل اور دائمی اجر تمھیں حاصل ہو۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ ترمذی کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ کے ہاں ایک بکری ذبح کر کے اس کا گوشت تقسیم کیا گیا۔ آپ گھر میں تشریف لائے تو پوچھا: بکری میں سے کیا باقی رہا؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: مَابَقِیَ اِلَّا کَتِفُھَا ''ایک شانے کے سوا کچھ نہیں بچا'' فرمایا: بَقِیَ کُلُّھَا غَیْرَ کَتِفِھَا ''ایک شانے کے سوا ساری بکری بچ گئی۔'' یعنی جو کچھ خدا کی راہ میں صرف ہوا وہی دراصل باقی رہ گیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! کس صدقے کا اجر سب سے زیادہ ہے؟ فرمایا: اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَاْمَلُ الْغِنٰی وَلَا تُمْھِلُ حَتّٰی اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ قُلْتَ لِفُلَانٍ کَذَا وَقَدْ کَانَ لِفُلَانٍ یہ کہ تو صدقہ کرے اس حال میں کہ تو صحیح و تندرست ہو، مال کی کمی کے باعث اسے بچا کر رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو اور اسے کسی کام میں لگا کر زیادہ کما لینے کی امید رکھتا ہو۔ اُس وقت کا انتظار نہ کر کہ جب جان نکلنے لگے تو تو کہے کہ یہ فلاں کو دیا جائے اور یہ فلاں کو۔ اُس وقت تو یہ مال فلاں کو جانا ہی ہے۔ [بخاری و مسلم] ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: یَقُوْلُ ابْنُ اٰدَمَ مَالِیْ مَالِیْ، وَھَلْ لَکَ مِنْ مَّالِکَ اِلَّامَا اَکَلْتَ فَاَفْنَیْتَ، اَوْلَبِسْتَ فَاَبْلَیْتَ، اَوْتَصَدَّقْتَ فَاَمْضَیْتَ؟ وَمَا سِوٰی ذٰلِکَ فَذَاھِبٌ وَتَارِکُہٗ لِلنَّاسِ آدمی کہتا ہے میرا مال میرا مال۔ حالانکہ تیرے مال میں سے تیرا حصہ اُس کے سوا کیا ہے جو تو نے کھا کر ختم کر دیا، یا پہن کر پرانا کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا؟ اُس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے اور تو اسے دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے۔ [مسلم]

جہاد میں مال خرچ کرنے کو ایمان کا لازمی تقاضا اور اخلاص فی الایمان کی ضروری علامت قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر، گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ حقیقی اور مخلص مومن وہی ہے جو ایسے موقع پر مال صرف کرنے سے جی نہ چرائے۔

(تفہیم القرآن، ج۵، ص ۳۰۵-۳۰۶۔ الحدید حواشی ۸-۹-۱۰)

اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت فقر اور تنگ دستی کا اندیشہ نہ ہونا چاہیے

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ (الحدید ۵۷:۱۰)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مال تمھارے پاس ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے، ایک دن تمھیں لازماً اسے چھوڑ کر ہی جانا ہے اور اللہ ہی اس کا وارث ہونے والا ہے، پھر کیوں نہ اپنی زندگی میں اسے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو تا کہ اللہ کے ہاں اس کا اجر تمھارے لیے ثابت ہو جائے۔ نہ خرچ کرو گے تب بھی یہ اللہ ہی کے پاس واپس جا کر رہے گا، البتہ فرق یہ ہوگا کہ اُس پر تم کسی اجر کے مستحق نہ ہو گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہوئے تم کو کسی فقر اور تنگ دستی کا اندیشہ لاحق نہ ہونا چاہیے، کیونکہ جس خدا کی خاطر تم اسے خرچ کرو گے وہ زمین و آسمان کے سارے خزانوں کا مالک ہے، اُس کے پاس تمھیں دینے کو بس اتنا ہی کچھ نہ تھا جو اس نے آج تمھیں دے رکھا ہے، بلکہ کل وہ تمھیں اس سے بہت زیادہ دے سکتا ہے۔ یہی بات ایک دوسری جگہ اس طرح فرمائی گئی ہے:

قُلْ اِنَّ رَبِّیْ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَ یَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ ۚ وَ هُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ۝ (سبا ۳۴:۳۹)

اے نبیؐ اُن سے کہو کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اس کی جگہ وہی مزید رزق تمھیں دیتا ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۰۸۔ الحدید حاشیہ ۱۳)

زیادہ سخت حالات میں انفاق کا ثواب زیادہ ہے

لَا یَسْتَوِیْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ (الحدید ۵۷:۱۰)

تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اجر کے مستحق تو دونوں ہی ہیں، لیکن ایک گروہ کا رتبہ دوسرے گروہ سے لازماً بلند تر ہے، کیونکہ اُس نے زیادہ سخت حالات میں اللہ تعالیٰ کی خاطر وہ خطرات مول لیے جو دوسرے گروہ کو درپیش نہ تھے۔ اس نے ایسی حالت میں مال خرچ کیا جب دور دور کہیں یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ کبھی فتوحات سے اس خرچ کی تلافی ہو جائے گی، اور اس نے ایسے نازک دور میں کفار سے جنگ کی جب ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن غالب آ کر اسلام کا نام لینے والوں کو پیس ڈالیں گے۔ مفسرین میں سے مجاہد، قتادہ اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں جس چیز کے لیے لفظ فتح استعمال کیا گیا ہے اس کا اطلاق فتح مکہ پر ہوتا ہے، اور عامر شعبی کہتے ہیں کہ اس سے مراد صلح حدیبیہ ہے۔ پہلے قول کو اکثر مفسرین نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے قول کی تائید میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے صلح حدیبیہ کے زمانے میں فرمایا، عنقریب ایسے لوگ آنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والے ہیں جن کے اعمال کو دیکھ کر تم لوگ اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے، مگر لَوْ کَانَ لِاَحَدِهِمْ جَبَلٌ مِنْ ذَهَبٍ فَاَنْفَقَهٗ مَا اَدْرَکَ مُدَّ اَحَدِکُمْ وَلَا نَصِیْفَهٗ "ان میں سے کسی کے پاس پہاڑ برابر بھی سونا ہو اور سارا کا سارا خدا کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ تمھارے دو رطل بلکہ ایک رطل خرچ کرنے کے برابر نہ پہنچ سکے گا۔" (ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم اصفہانی) نیز اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمد نے حضرت انسؓ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دورانِ نزاع میں حضرت خالدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا "تم لوگ اپنی پچھلی خدمات کی بنا پر ہم سے دوں کی لیتے ہو"۔ یہ بات جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا "اس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم لوگ احد کے برابر، یا پہاڑوں کے برابر سونا بھی خرچ کرو تو ان لوگوں کے اعمال کو نہ پہنچ سکو گے۔" اس سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں فتح سے مراد صلح حدیبیہ ہے، کیونکہ حضرت خالدؓ اسی صلح کے بعد ایمان لائے تھے اور فتح مکہ میں شریک تھے۔ لیکن اس خاص موقع پر فتح سے مراد خواہ صلح حدیبیہ لی جائے یا فتح مکہ، بہر حال اس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درجات کا یہ فرق بس اسی ایک فتح پر ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ اصولاً اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب کبھی اسلام پر ایسا کوئی وقت آ جائے جس میں کفر اور کفار کا پلڑا بہت بھاری ہو اور بظاہر اسلام کے غلبے کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے ہوں، اس وقت جو لوگ اسلام کی حمایت میں جانیں لڑائیں اور مال خرچ کریں ان کے مرتبے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو کفر و اسلام کی کشمکش کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہو جانے کے بعد قربانیاں دیں۔

(تفہیم القرآن جلد ۵، ص ۳۰۸-۳۰۹۔ الحدید حاشیہ ۱۴)

احسان جتا کر صدقات کو ضائع نہ کریں

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَکَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْکٰفِرِیْنَ ○ (البقرہ ۲: ۲۶۴)

اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور دکھ دے کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے، نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ اس پر جب زور کا مینہ برسا، تو ساری مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور کافروں کو سیدھی راہ دکھانا اللہ کا دستور نہیں ہے۔

اس کی ریا کاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔ اس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنی رکھتا ہے کہ خلق ہی اس کی خدا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے، اللہ سے نہ اس کو اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اس نیت اور اس جذبے کی خرابی ہے، جس کے ساتھ خیرات کی گئی ہے۔ مٹی کی ہلکی تہہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری شکل ہے، جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ بارش کا فطری اقتضا تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور کھیتی نشوونما پائے۔ لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اوپر ہی اوپر ہو، اور اس اوپری تہہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو، تو بارش مفید ہونے کے بجائے الٹی مضر ہوگی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشوونما دینے کی قوت رکھتی ہے، مگر اس کے نافع ہونے کے لیے حقیقی نیک نیتی شرط ہے۔ نیت نیک نہ ہو تو ابر کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاع مال ہے اور کچھ نہیں۔

(تفہیم القرآن ج اول ص ۲۰۴-۲۰۵۔ البقرہ حواشی ۳۰۳-۳۰۴)

جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی راہ میں اس کی رضا کے لیے خرچ کرنے کے بجائے خلق خدا کی خوشنودی کے لیے صرف کرتا ہے، یا اگر خدا کی راہ میں کچھ مال دیتا بھی ہے، تو اس کے ساتھ اذیت بھی دیتا ہے، وہ دراصل ناشکرا اور اپنے خدا کا احسان فراموش ہے اور جب کہ وہ خود ہی خدا کی رضا کا طالب نہیں ہے تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے۔ (تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۰۵۔ البقرہ حاشیہ ۳۰۵)

راہِ خدا میں حتی الوسع چھپا کر خرچ کرنا

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ (البقرہ ۲: ۲۷۰-۲۷۱)

تم نے جو کچھ بھی خرچ کیا ہو اور جو نذر بھی مانی ہو، اللہ کو اس کا علم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔ اگر اپنے صدقات علانیہ دو، تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو، تو یہ تمھارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ تمھاری بہت سی برائیاں اس طرزِ عمل سے محو ہو جاتی ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو بہرحال اس کی خبر ہے۔

خرچ خواہ راہِ خدا میں کیا ہو یا راہِ شیطان میں، اور نذر خواہ اللہ کے لیے مانی ہو یا غیر اللہ کے لیے، دونوں صورتوں میں آدمی کی نیت اور اس کے فعل سے اللہ خوب واقف ہے۔ جنھوں نے اس کے لیے خرچ کیا ہوگا اور اس کی خاطر نذر مانی ہوگی، وہ اس کا اجر پائیں گے اور جن ظالموں نے شیطانی راہوں میں خرچ کیا ہوگا اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے نذریں مانی ہوں گی ان کو خدا کی سزا سے بچانے کے لیے کوئی مددگار نہ ملے گا۔

نذر یہ ہے کہ آدمی اپنی کسی مراد کے برآنے پر کسی ایسے خرچ یا کسی ایسی خدمت کو اپنے اوپر لازم کرلے، جو اس کے ذمے فرض نہ ہو۔ اگر یہ مراد کسی حلال و جائز امر کی ہو، اور اللہ سے مانگی گئی ہو، اور اس کے برآنے پر جو عمل کرنے کا عہد آدمی نے کیا ہے، وہ اللہ ہی کے لیے ہو، تو ایسی نذر اللہ کی اطاعت میں ہے اور اس کا پورا کرنا اجر و ثواب کا موجب ہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو، تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایسی نذر کا ماننا معصیت اور اس کا پورا کرنا موجب عذاب ہے۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ......

جو صدقہ فرض ہو، اس کو علانیہ دینا افضل ہے، اور جو صدقہ فرض کے ماسوا ہو، اس کا اخفا زیادہ بہتر ہے۔ یہی اصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا علانیہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چھپا کر کرنا اَولیٰ ہے۔

چھپا کر نیکیاں کرنے سے آدمی کے نفس و اخلاق کی مسلسل اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے اوصاف حمیدہ خوب نشوونما پاتے ہیں، اس کی بری صفات رفتہ رفتہ مٹ جاتی ہیں، اور یہی چیز اس کو اللہ کے ہاں اتنا مقبول بنا دیتی ہے کہ جو تھوڑے بہت گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہوتے بھی ہیں انھیں اس کی خوبیوں پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن، ج اول، ص ۲۰۸-۲۰۹۔ البقرۃ حواشی ۳۱۰-۳۱۲)

غیر مسلم رشتہ داروں پر مال خرچ کرنے کی اجازت

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ۔ (البقرۃ ۲:۲۷۲)

اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمھارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

ابتدا میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتے داروں اور عام غیر مسلم اہل حاجت کی مدد کرنے میں تامل کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجت مندوں ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں ان کی یہ غلط فہمی دور کی گئی۔ ارشادِ الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں ہدایت اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ تم حق بات پہنچا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکے۔ اب یہ اللہ کے اختیار میں ہے کہ ان کو بصیرت کا نور عطا کرے یا نہ کرے۔ رہا دنیوی مال و متاع سے ان کی حاجتیں پوری کرنا، تو اس میں تم محض اس وجہ سے تامل نہ کرو کہ انھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ اللہ کی رضا کے لیے جس حاجت مند انسان کی بھی مدد کرو گے، اس کا اجر اللہ تمھیں دے گا۔

(تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۰۹-۲۱۰۔ البقرۃ حاشیہ ۳۱۳)

ہمہ وقت دین کی خدمت کرنے والوں کا استحقاق

لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ؀ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ؀ (البقرۃ ۲:۲۷۳-۲۷۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

خاص طور پر مدد کے مستحق وہ تنگ دست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے ذاتی کسب معاش کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوش حال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ ان کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔ جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف و رنج کا مقام نہیں۔

اس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی معاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کر سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس قسم کے رضا کاروں کا ایک مستقل گروہ تھا، جو تاریخ میں اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے، جو اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے آ گئے تھے۔ ہمہ وقت حضورؐ کے ساتھ رہتے تھے۔ ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے، حضورؐ جس مہم پر چاہتے انھیں بھیج دیتے تھے، اور جب مدینے سے باہر کوئی کام نہ ہوتا، اس وقت یہ مدینے ہی میں رہ کر دین کا علم حاصل کرتے اور دوسرے بندگانِ خدا کو اس کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے۔

(تفہیم القرآن، ج ۱،ص ۲۱۰۔ البقرۃ حاشیہ ۳۱۴)

دل کی تنگی سے بچنے اور مال خرچ کرنے کا حکم

وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (التغابن ۶۴:۱۶)

اور سنو اور اطاعت کرو، اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمھارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔

اللہ کی توفیق اور اس کی مدد کے بغیر کوئی شخص خود اپنے زور بازو سے دل کی تونگری نہیں پا سکتا۔ یہ خدا کی وہ نعمت ہے جو خدا ہی کے فضل سے کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ شُحّ کا لفظ عربی زبان میں کنجوسی اور بخل کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر جب اس لفظ کو نفس کی طرف منسوب کر کے شح نفس کہا جائے تو یہ تنگ نظری، تنگ دلی، کم حوصلگی اور دل کے چھوٹے پن کا ہم معنی ہو جاتا ہے جو بخل سے وسیع تر چیز ہے، بلکہ خود بخل کی بھی اصل جڑ وہی ہے۔ اس صفت کی وجہ سے آدمی دوسرے کا حق ماننا اور ادا کرنا تو درکنار اس کی خوبی کا اعتراف تک کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں سب کچھ اسی کو مل جائے اور کسی کو کچھ نہ ملے۔ دوسروں کو خود دینا تو کجا، کوئی دوسرا بھی اگر کسی کو کچھ دے تو اس کا دل دکھتا ہے۔ اس کی حرص کبھی اپنے حق پر قانع نہیں ہوتی بلکہ وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے، یا کم از کم دل سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے گردوپیش دنیا میں جو اچھی چیز بھی ہے اسے اپنے لیے سمیٹ لے اور کسی کے لیے کچھ نہ چھوڑے۔ اسی بنا پر قرآن میں اس برائی سے بچ جانے کو فلاح کی ضمانت قرار دیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ان بدترین انسانی اوصاف میں شمار کیا ہے جو فساد کی جڑ ہیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اتَّقُوا الشُّحَّ فَإِنَّ الشُّحَّ اَهْلَکَ مَنْ قَبْلَکُمْ حَمَلَهُمْ عَلٰی اَنْ سَفَکُوْا دِمَآءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ [مسلم، مسند احمد، بیہقی، بخاری فی الادب)۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو کی روایت میں الفاظ یہ ہیں: اَمَرَهُمْ بِالظُّلْمِ فَظَلَمُوْا وَاَمَرَهُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا، وَاَمَرَهُمْ بِالْقَطِیْعَةِ فَقَطَعُوْا (مسند احمد، ابوداوٗد، نسائی)۔ شح سے بچو کیونکہ شح ہی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا۔ اسی نے ان کو ایک دوسرے کے خون بہانے اور دوسروں کی حرمتوں کو اپنے لیے حلال کر لینے پر اکسایا۔ اس نے ان کو ظلم پر آمادہ کیا اور انھوں نے ظلم کیا، فجور کا حکم دیا اور انھوں نے فجور کیا، قطع رحمی کرنے کے لیے کہا اور انھوں نے قطع رحمی کی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا ''ایمان اور شح نفس کسی کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔'' (ابن ابی شیبہ، نسائی، بیہقی فی شعب الایمان، حاکم)۔ حضرت ابو سعید خدری کا بیان ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ''دو خصلتیں ہیں جو کسی مسلمان کے اندر جمع نہیں ہو سکتیں، بخل اور بدخلقی''۔ (ابوداوٗد، ترمذی، بخاری فی الادب)۔ اسلام کی اسی تعلیم کا ثمرہ ہے کہ افراد سے قطع نظر، مسلمان بحیثیتِ قوم دنیا میں آج بھی سب سے بڑھ کر فیاض اور فراخ دل ہیں۔ جو قومیں ساری دنیا میں تنگ دلی اور بخیلی کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتیں، خود انھی میں سے نکلے ہوئے لاکھوں اور کروڑوں مسلمان اپنے ہم نسل غیر مسلموں کے سایہ بسایہ رہتے ہیں۔ دونوں کے درمیان دل کی فراخی و تنگی کے اعتبار سے جو صریح فرق پایا جاتا ہے اس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ یہ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا فیض ہے جس نے مسلمانوں کے دل بڑے کر دیے ہیں۔

(تفہیم القرآن، ج۵، ص۳۹۶-۳۹۷۔ الحشر حاشیہ ۱۹)

اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرنا موجبِ ہلاکت

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ ۚۛ وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○ (البقرۃ ۲:۱۹۵)

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ احسان کا طریقہ اختیار کرو کہ اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مراد اللہ کے دین کو قائم کرنے کی سعی و جہد میں مالی قربانیاں کرنا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا کے دین کو سر بلند کرنے کے لیے اپنا مال خرچ نہ کرو گے اور اس کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے، تو یہ تمھارے لیے دنیا میں بھی موجب ہلاکت ہوگا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تم کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہو گے اور آخرت میں تم سے سخت بازپرس ہوگی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وَ اَحْسِنُوْا۔ احسان کا لفظ حسن سے نکلا ہے، جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو، اسے بس کر دے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے، جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہو جاتا ہے اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

(تفہیم القرآن، ج ا،ص ۱۵۳۔البقرۃ حاشیہ ۲۰۷-۲۰۸)

سورۂ بقرۃ آیت ۲۴۵ میں ارشاد باری ہے:

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ۔ (البقرۃ ۲:۲۴۵)

تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟

''قرضِ حسن'' کا لفظی ترجمہ ''اچھا قرض'' ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا، بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے وہ ہو قرضِ حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ محض اللہ کی خاطر ان کاموں میں صرف کیا جائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ا،ص ۱۸۵۔البقرۃ حاشیہ ۲۶۷)

اللہ تعالیٰ اس ایک ایک پائی کو، جو انسان اس کی راہ میں خرچ کرے، کئی گنے زیادہ انعام کے ساتھ واپس کرنے کا وعدہ فرماتا ہے، اس لیے قرآن میں جگہ جگہ راہِ خدا میں مال خرچ کرنے کو ''قرض'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بشرطیکہ ''اچھا قرض'' ہو۔ یعنی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت خرچ کی جائے، خدا کے قانون کے مطابق خرچ کی جائے اور خلوص و حسن نیت کے ساتھ خرچ کی جائے۔

(تفہیم القرآن ج ا،ص ۴۵۱۔المائدۃ حاشیہ ۳۳)

زائد از ضرورت مال خرچ کرنے کا حکم

وَ یَسْــٴَـلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ۔ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ۔ (البقرۃ ۲:۲۱۹)

پوچھتے ہیں: ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: جو کچھ تمھاری ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس طرح اللہ تمھارے لیے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے، شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو۔

س: بعض لوگ اس سے قومی ملکیت کے حق میں استدلال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ضرورت سے زائد (Surplus) جو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کچھ ہو وہ العفو ہے اور اسے قومی ملکیت میں دے دینا چاہیے۔اس استدلال کی کیا حقیقت ہے؟

ج: بعض لوگ نظریات تو باہر سے لاتے ہیں اور پھر قرآن کو اپنے پیچھے چلاتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ جو نظریات انھیں پسند ہیں قرآن ان کی تصدیق کرے۔اس کی ایک مثال یہ سلوک ہے جو اس آیت سے کیا جا رہا ہے۔سوال یہ ہے کہ اس آیت سے یہ بات کیسے نکل آئی کہ جو کچھ بچ رہے اسے قومی ملکیت میں دے دیا جائے۔یہ آیت تو اس کے بالکل برعکس انفرادی ملکیت کو ثابت کرتی ہے۔کیونکہ اگر انفرادی ملکیت کی نفی کر دی جائے تو پھر "مَاذَا یُنْفِقُوْنَ" (کہ وہ کیا خرچ کریں) کے کیا معنی باقی رہ جاتے ہیں۔لوگوں کی ملکیت میں کوئی مال ہو تو اسی صورت میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ کیا خرچ کریں۔

اس بات کا فیصلہ فرد پر چھوڑا گیا ہے کہ وہ اپنی ضرورت سے زائد کیا خرچ کرے۔ضرورت ایک غیر معین چیز ہے اور اسلامی معاشرے میں یہ فیصلہ ایک شخص خود ہی بہتر کر سکتا ہے کہ اس کی حقیقی ضرورت کیا ہے۔اسلام انسان کو اس دنیا میں اپنا نامۂ اعمال مرتب کرنے کی پوری پوری آزادی دیتا ہے اس لیے وہ کسی ریاست یا کسی اور شخص کو اس کا اختیار نہیں دیتا کہ وہ ایک شخص کی جانب سے خدا کی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کی مقدار کا تعین کرے۔یا یہ فیصلہ کرے کہ اس کی حقیقی ضرورت کیا ہے۔اور کیا کچھ وہ خرچ کر سکتا ہے۔یہ بات بھی نگاہ میں رہے کہ ضرورت سے زائد مال خرچ کرنے کی بھی ترغیب دلائی گئی ہے۔یعنی اس کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ جو لوگ خود خرچ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں انھیں ایک ہدایت دی جا رہی ہے۔

(استفسارات اول ص ۱۹۳-۱۹۴ طبع اول)

اس بارے میں اسلام قانون کی جبریت سے کام نہیں لیتا بلکہ اس کا فیصلہ آدمی کے اپنے اختیار میں چھوڑتا ہے کہ وہ کیا بچائے اور کیا خرچ کرے۔اگر آدمی سے اپنی آزاد مرضی سے نیکی کرنے کے اختیار کو سلب کر لیا جائے تو پھر اعمال کی جواب دہی کا تصور اور یوم حساب کی ضرورت اور اس کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے۔مزید برآں یہی اختیار تو انسان کے لیے اخلاقی اور روحانی ارتقا کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اگر انسان کوئی اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے تو سوال یہ ہے کہ آخر اس کی بقاء اور ارتقاء کو مجروح کرنا کیسے اسلامی تصور ہو سکتا ہے؟

اسلامی معاشرے میں بعض اصولی حد بندیوں کے اندر اکتساب دولت اور انفاق دولت میں آزادی اسی مقصد کے لیے دی گئی ہے کہ وہ اپنے اس ٹھکانے کا انتخاب خود کرے جہاں انھیں ہمیشہ رہنا ہے۔یہی وجہ ہے کہ کسی قانون جبریت کے ذریعے فرد کو اس کی آزادئ عمل سے یکسر محروم کر دینا اسلام کے مزاج اور مقاصد سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔

یہ صرف اسلام ہے جو انسان کے اوپر قانون مسلط کر دینے کے بجائے براہِ راست اس کے نفس سے خطاب کرتا ہے۔اور اس کے دل اور ضمیر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔وہ انسان میں اس احساس اور شعور کی تخلیق کرتا ہے کہ وہ ایک ذمے دار ہستی ہے اور اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(استفسارات اول ص ۱۹۴-۱۹۵ طبع اول)

موت آنے سے پہلے انفاق کا حکم

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (البقرۃ ۲:۲۵۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، جو کچھ مال متاع ہم نے تم کو بخشا ہے، اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے، جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ اور ظالم اصل میں وہی ہیں، جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔

مراد راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی ہے، انھیں اس مقصد کے لیے، جس پر وہ ایمان لائے ہیں، مالی قربانیاں برداشت کرنی چاہییں۔

(تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۱۹۳۔ البقرۃ حاشیہ ۲۷۶)

اچھی اور بہتر چیز خرچ کرنے کا حکم

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ○ (البقرۃ ۲:۲۶۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمھارے لیے نکالا ہے، اس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے، تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے الا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔

ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجے کی صفات سے متصف ہو، وہ برے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش و عطا کے دریا بہا رہا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر، کم حوصلہ اور پست اخلاق لوگوں سے محبت کرے۔

(تفہیم القرآن، ج ۱، ص ۲۰۷۔ البقرۃ حاشیہ ۳۰۸)

فی سبیل اللہ خرچ کرنے والوں کی مثال

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَآ اَذًی ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حَلِيْمٌ۝ (البقرة:۲:۲۶۱-۲۶۳)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے، افزونی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دکھ دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے، جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے۔

کیسے اخلاق کے لوگ مراد ہیں

اہل ایمان کو دعوت دی گئی کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لائے ہو، اس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں برداشت کرو۔ مگر کوئی گروہ جب تک کہ اس کا معاشی نقطۂ نظر بالکل ہی تبدیل نہ ہو جائے، اس بات پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض سے بالاتر ہو کر محض ایک اعلیٰ درجے کے اخلاقی مقصد کی خاطر اپنا مال بے دریغ صرف کرنے لگے۔ مادہ پرست لوگ، جو پیسہ کمانے کے لیے جیتے ہوں اور پیسے پیسے پر جان دیتے ہوں اور جن کی نگاہ ہر وقت نفع و نقصان کی میزان ہی پر جمی رہتی ہو، کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصد عالیہ کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ بظاہر اخلاقی مقاصد کے لیے کچھ خرچ کرتے بھی ہیں، تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اس ذہنیت کے ساتھ اس دین کی راہ پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیوی فائدے اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ ایسے مسلک کی پیروی کے لیے تو دوسری ہی قسم کے اخلاقیات درکار ہیں۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کشادگی اور سب سے بڑھ کر خالص خدا طلبی کی ضرورت ہے۔ اور اجتماعی زندگی کے نظام میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نشوونما پائیں۔

کون سا مالی خرچ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں شمار ہوگا

مال کا خرچ خواہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں ہو، یا اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے میں، یا اپنے اعزہ و اقربا کی خبر گیری میں، یا محتاجوں کی اعانت میں، یا رفاہِ عام کے کاموں میں، یا اشاعتِ دین اور جہاد کے مقاصد میں بہر حال اگر وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہو اور خالص خدا کی رضا کے لیے ہو تو اس کا شمار اللہ ہی کی راہ میں ہوگا۔

جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ انسان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا، اتنا ہی اللہ کی طرف سے اس کا اجر زیادہ ہوگا۔ جو خدا ایک دانے میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اگ سکتے ہیں، اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمھاری خیرات کو بھی اسی طرح نشوونما بخشے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گنا ہو کر تمھاری طرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پلٹے۔اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد اللہ کی دو صفات ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ایک یہ کہ وہ فراخ دست ہے،اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمھارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو،وہ نہ دے سکے۔دوسرے یہ کہ وہ علیم ہے، بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبے سے کرتے ہو،اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمھارا اجر مارا جائے۔

نہ تو ان کے لیے اس بات کا کوئی خطرہ ہے کہ ان کا اجر ضائع ہو جائے گا اور نہ کبھی یہ نوبت آئے گی کہ وہ اپنے اس خرچ پر پشیمان ہوں۔

انفاق کی ترغیب

وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیۡمٌ۔ اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ایک یہ کہ اللہ تمھاری خیرات کا حاجت مند نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بردبار ہے،اس لیے اسے پسند بھی وہی لوگ ہیں، جو چھچھورے اور کم ظرف نہ ہوں، بلکہ فراخ حوصلہ اور بردبار ہوں۔جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمھارے قصوروں کے باوجود تمھیں بار بار بخشتا ہے،وہ ایسے لوگوں کو کیونکر پسند کر سکتا ہے، جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں،تو احسان جتا جتا کر اس کی عزتِ نفس کو خاک میں ملا دیں۔اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہمکلامی اور نظر عنایت سے محروم رکھے گا جو اپنے عطیے پر احسان جتاتا ہو۔

(تفہیم القرآن، ج۱ص۲۰۲-۲۰۴_البقرۃ حواشی ۲۹۸-۳۰۲)

مشترکہ کاروبار اور انفاق فی سبیل اللہ

اگر کوئی شخص اپنے شریک کاروبار کے علم میں لائے بغیر اللہ کی راہ میں خرچ کرے اور اسے یہ علم ہو کہ میرا شریک مشترکہ مال کے خرچ کرنے پر راضی نہ ہوگا تو اسے چاہیے کہ یہ خرچ اپنے حساب میں لکھ لے۔البتہ شرکائے کاروبار کی رضامندی سے مشترکہ مال سے خرچ کیا جاسکتا ہے۔اس صورت میں تمام شریک مستحق اجر قرار پائیں گے۔

(استفسارات اول ص ۲۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

ایمان کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی ذریعۂ نجات

کون سا خرچ ہے جو اخلاق کی پستیوں میں گرانے کے بجائے آدمی کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے، مگر اس میں نفس کی کوئی لذت نہیں ہے بلکہ آدمی کو اس کے لیے اپنے نفس پر جبر کر کے ایثار اور قربانی سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی کسی غلام کو خود آزاد کرے، یا اس کی مالی مدد کرے تاکہ وہ اپنا فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے، یا کسی غریب کی گردن قرض کے جال سے نکالے، یا کوئی بے وسیلہ آدمی اگر کسی تاوان کے بوجھ سے لد گیا ہو تو اس کی جان اس سے چھڑائے۔ اسی طرح وہ خرچ یہ ہے کہ آدمی بھوک کی حالت میں کسی قریبی یتیم [یعنی رشتے دار یا پڑوسی یتیم] اور کسی ایسے بے کس محتاج کو کھانا کھلائے جسے غربت و افلاس کی شدت نے خاک میں ملا دیا ہو اور جس کی دستگیری کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے لوگوں کی مدد سے آدمی کی شہرت کے ڈنکے تو نہیں بجتے اور نہ اس کو کھلا کر آدمی کی دولت مندی اور دریا دلی کے وہ چرچے ہوتے ہیں جو ہزاروں کھاتے پیتے لوگوں کی شاندار دعوتیں کرنے سے ہوا کرتی ہیں، مگر اخلاق کی بلندیوں کی طرف جانے کا راستہ اسی دشوار گزار گھاٹی سے ہو کر گزرتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج۶ ص ۳۴۲۔ البلد حاشیہ ۱۲)

بھوک میں مبتلا شخص کو استطاعت کے باوجود کھانا نہ کھلانا

وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝ (المدثر ۷۴: ۴۴)

اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی انسان کو بھوک میں مبتلا دیکھنا اور قدرت رکھنے کے باوجود اس کو کھانا نہ کھلانا اسلام کی نگاہ میں کتنا بڑا گناہ ہے کہ آدمی کے دوزخی ہونے کے اسباب میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن ج۶ ص ۱۵۴۔ المدثر حاشیہ ۳۴)

مسکین کو کھانا کھلانا مومن جنتیوں کی صفت ہے

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ (الدھر ۷۶: ۸-۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ [ان سے کہتے ہیں] ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

اصل الفاظ ہیں عَلٰی حُبِّهٖ۔ اکثر مفسرین نے حُبِّهٖ کی ضمیر کا مرجع کھانے کو قرار دیا ہے، اور وہ اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ وہ کھانے کے محبوب اور دل پسند ہونے اور خود اس کے حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو کھلا دیتے ہیں۔ ابن عباسؓ اور مجاہد کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے عَلٰی حُبِّ الْاِطْعَامِ یعنی غریبوں کو کھانا کھلانے کے شوق میں وہ ایسا کرتے ہیں۔ اور حضرت فُضَیل بن عیاض اور ابوسلیمان الدارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں وہ یہ کام کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعد کا یہ فقرہ کہ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ [ہم تو اللہ کی خوشنودی کی خاطر تمھیں کھلا رہے ہیں] اسی معنی کی تائید کرتا ہے۔

کیا کھانا کھلانا ہی صرف نیکی کا کام ہے؟

اگرچہ بجائے خود کسی غریب کو کھانا کھلانا بھی ایک بہت بڑی نیکی ہے، لیکن کسی حاجت مند کی دوسری حاجتیں پوری کرنا بھی ویسا ہی نیک کام ہے جیسا بھوکے کو کھانا کھلانا۔ مثلاً کوئی کپڑے کا محتاج ہے، یا کوئی بیمار ہے اور علاج کا محتاج ہے، یا کوئی قرض دار ہے اور قرض خواہ اسے پریشان کر رہا ہے، تو اس کی مدد کرنا کھانا کھلانے سے کم درجے کی نیکی نہیں ہے۔ اس لیے اس آیت میں نیکی کی ایک خاص صورت کو اس کی اہمیت کے لحاظ سے بطور مثال بیان کیا گیا ہے، ورنہ اصل مقصود حاجت مندوں کی مدد کرنا ہے۔

کیا شکریہ زبان سے ادا کرنا ضروری ہے؟

ضروری نہیں ہے کہ غریب کو کھانا کھلاتے ہوئے زبان ہی سے یہ بات کہی جائے۔ دل میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کی بھی وہی حیثیت ہے جو زبان سے کہنے کی ہے۔ لیکن زبان سے یہ بات کہنے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جس کی مدد کی جائے اس کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ ہم اس سے کسی قسم کا شکریہ یا بدلہ نہیں چاہتے، تاکہ وہ بے فکر ہو کر کھائے۔

(تفہیم القرآن، ج ۶ ص ۱۹۷-۱۹۸۔ الدہر حواشی ۱۱-۱۳-۱۴)

مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ (الحاقہ ۶۹: ۳۴) اور (الماعون ۱۰۷: ۳) اور (الفجر ۸۹: ۱۸) اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتا ہے۔ یعنی خود کسی غریب کو کھانا کھلانا تو درکنار، کسی سے یہ کہنا بھی پسند نہ کرتا تھا کہ بھوکے بندوں کو روٹی دے دو۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۸۷ الحاقہ حاشیہ ۲۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ شخص اپنے نفس کو بھی اس کام پر آمادہ نہیں کرتا، اپنے گھر والوں کو بھی یہ نہیں کہتا کہ مسکین کو کھانا دیا کریں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس بات پر نہیں اکساتا کہ معاشرے میں جو غریب و محتاج لوگ بھوکے مر رہے ہیں ان کے حقوق پہچانیں اور ان کی بھوک مٹانے کے لیے کچھ کریں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف دو نمایاں ترین مثالیں دے کر دراصل یہ بتایا ہے کہ انکار آخرت لوگوں میں کس قسم کی اخلاقی برائیاں پیدا کرتا ہے۔ اصل مقصود ان دو ہی باتوں پر گرفت کرنا نہیں ہے کہ آخرت کو نہ ماننے سے بس یہ دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں کہ لوگ یتیموں کو دھتکارتے ہیں اور مسکینوں کو کھانا دینے پر نہیں اُکساتے۔ بلکہ جو بے شمار خرابیاں اس گمراہی کے نتیجے میں رونما ہوتی ہیں۔ ان میں سے دو ایسی چیزیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں جن کو ہر شریف الطبع اور سلیم الفطرت انسان مانے گا کہ وہ نہایت قبیح اخلاقی رذائل ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ اگر یہی شخص خدا کے حضور اپنی حاضری اور جواب دہی کا قائل ہوتا تو اس سے ایسی کمینہ حرکتیں سرزد نہ ہوتیں کہ یتیم کا حق مارے، اس پر ظلم ڈھائے۔ اس کو دھتکارے اور مسکین کو نہ خود کھلائے نہ کسی سے یہ کہے کہ اس کا کھانا اس کو دو۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۴۸۳، الماعون حاشیہ ۷)

تمہارے معاشرے میں غریبوں کو کھانا کھلانے کا کوئی چرچا نہیں ہے۔ نہ کوئی خود کسی بھوکے کو کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا ہے، نہ لوگوں میں یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ بھوکوں کی بھوک مٹانے کے لیے کوئی فکر کریں اور ایک دوسرے کو اس کا انتظام کرنے پر اکسائیں۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۳۱ الفجر حاشیہ ۱۲)

مسکین کی مدد کی فضیلت حدیثِ رسولؐ کی روشنی میں

مساکین کی مدد کے فضائل بھی حضورؐ نے بکثرت احادیث میں ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں سے ایک حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

اَلسَّاعِیْ عَلَی الْاَرْمِلَۃِ وَالْمَسَاکِیْنِ کَالسَّاعِیْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاَحْسَبُہٗ قَالَ کَالْقَائِمِ لَا یَفْتُرُ وَکَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ

بیوہ اور مسکین کی مدد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ میں دوڑ دھوپ کرنے والا [اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ] مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ حضورؐ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو نماز میں کھڑا رہے اور آرام نہ لے اور وہ جو پے در پے روزہ رکھے اور کبھی روزہ نہ چھوڑے۔ [بخاری و مسلم]

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۴۲۔ البلد حاشیہ ۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

غلامی سے چھڑانا

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖ وَ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ (النساء ۴: ۹۲)

کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے، الا یہ کہ اس سے چوک ہو جائے۔ اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے، الا یہ کہ وہ خون بہا معاف کر دیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمھاری دشمنی ہو تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمھارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔ پھر جو غلام نہ پائے وہ پے در پے دو مہینے کے روزے رکھے۔ یہ اس گناہ پر اللہ سے توبہ کرنے کا طریقہ ہے اور اللہ علیم و دانا ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْۤ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗۤ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ (المائدہ ۵: ۸۹)

تم لوگ جو مہمل قسمیں کھا لیتے ہو ان پر اللہ گرفت نہیں کرتا، مگر جو قسمیں تم جان بوجھ کر کھاتے ہو ان پر وہ ضرور تم سے مواخذہ کرے گا۔ (ایسی قسم توڑنے کا) کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا انھیں کپڑے پہناؤ، یا ایک غلام آزاد کرو، اور جو اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔ یہ تمھاری قسموں کا کفارہ ہے جبکہ تم قسم کھا کر توڑ دو۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ .... فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ (المجادلہ ۵۸: ۳-۴)

جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کریں پھر اپنی اس بات سے رجوع کریں جو انھوں نے کہی تھی تو قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں، ایک غلام آزاد کرنا ہوگا .... اور جو شخص غلام نہ پائے وہ دو مہینے کے پے در پے روزے رکھے قبل اس کے کہ دونوں ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں اور جو اس پر بھی قادر نہ ہو وہ ۶۰ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ (البلد ۹۰: ۱۲-۱۳)

اور تم کیا جانو کہ کیا ہے وہ دشوار گزار گھاٹی؟ کسی گردن کو غلامی سے چھڑانا۔

فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ (گردن چھڑانے) کے بارے میں حضورؐ کی بکثرت احادیث روایات میں نقل ہوئی ہیں جن میں سے ایک حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس شخص نے ایک مومن غلام کو آزاد کیا اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے شخص کے ہر عضو کو دوزخ کی آگ سے بچا لے گا، ہاتھ کے بدلے ہاتھ، پاؤں کے بدلے میں پاؤں، شرم گاہ کے بدلے میں شرم گاہ۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)۔ حضرت علی بن حسینؓ (امام زین العابدین) نے اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حدیث کے راوی سعد بن مرجانہ سے پوچھا کیا تم نے ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث خود سنی ہے؟ انھوں نے کہا ہاں۔ اس پر امام زین العابدین نے اپنے سب سے زیادہ قیمتی غلام کو بلایا اور اسی وقت اسے آزاد کر دیا۔ مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اس غلام کے لیے ان کو دس ہزار درہم قیمت مل رہی تھی۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام شعبیؒ نے اسی آیت کی بنا پر کہا ہے کہ غلام آزاد کرنا صدقے سے بہتر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر صدقے پر مقدم رکھا ہے۔

(تفہیم القرآن ج۶ ص ۳۴۲۔ البلد حاشیہ ۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب ششم

سود

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اوّل

سود کی مذمت

سود کے بارے میں قرآن مجید کی پہلی آیت

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِىٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ ۔ (الروم ۳۹:۲۵)

جو سود تم دیتے ہو تا کہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔

قرآن مجید میں یہ پہلی آیت ہے جو سود کی مذمت میں نازل ہوئی۔ اس میں صرف اتنی بات فرمائی گئی ہے کہ تم لوگ تو سود یہ سمجھتے ہوئے دیتے ہو کہ جس کو ہم یہ زائد مال دے رہے ہیں اس کی دولت بڑھے گی، لیکن درحقیقت اللہ کے نزدیک سود سے دولت کی افزائش نہیں ہوتی بلکہ زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ آگے چل کر جب مدینہ طیبہ میں سود کی حرمت کا حکم نازل کیا گیا تو اس پر مزید یہ بات ارشاد فرمائی گئی کہ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ ؕ "اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے۔"

آیت کی تفسیر میں دو اقوال

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کے دو اقوال ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں ربوٰ سے مراد وہ سود نہیں ہے جو شرعاً حرام کیا گیا ہے، بلکہ وہ عطیہ یا ہدیہ و تحفہ ہے جو اس نیت سے دیا جائے کہ لینے والا بعد میں اس سے زیادہ واپس کرے گا، یا معطی کے لیے کوئی مفید خدمت انجام دے گا، یا اس کا خوش حال ہو جانا معطی کی اپنی ذات کے لیے نافع ہوگا۔ یہ ابن عباسؓ، مجاہدؒ، ضحاکؒ، قتادہ، عکرمہ، محمد بن کعب القرظی اور شعبی کا قول ہے۔ اور غالباً یہ تفسیر ان حضرات نے اس بنا پر فرمائی ہے کہ آیت میں اس فعل کا نتیجہ صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں اس دولت کو کوئی افزائش نصیب نہ ہوگی، حالانکہ اگر معاملہ اس سود کا ہوتا جسے شریعت نے حرام کیا ہے تو مثبت طور پر فرمایا جاتا کہ اللہ کے ہاں اس پر سخت عذاب دیا جائے گا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں اس سے مراد وہی معروف ربوٰ ہے جسے شریعت نے حرام کیا ہے۔ یہ رائے حسن بصری اور سُدّی کی ہے اور علامہ آلوسی کا خیال ہے کہ آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے، کیونکہ عربی زبان میں ربوٰ کا لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اسی تاویل کو مفسر نیشا پوری نے بھی اختیار کیا ہے۔

ہمارے خیال میں بھی یہی دوسری تفسیر صحیح ہے، اس لیے کہ معروف معنی کو چھوڑنے کے لیے وہ دلیل کافی نہیں ہے جو اوپر تفسیر اول کے حق میں بیان ہوئی ہے۔ سورۂ روم کا نزول جس زمانے میں ہوا ہے اس وقت قرآن مجید میں سود کی حرمت کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ یہ اعلان اس کے کئی برس بعد ہوا ہے۔ قرآن مجید کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو بعد میں کسی وقت حرام کرنا ہوتا ہے، اس کے لیے وہ پہلے سے ذہنوں کو تیار کرنا شروع کر دیتا ہے، شراب کے معاملے میں بھی پہلے صرف اتنی بات فرمائی گئی تھی کہ وہ پاکیزہ رزق نہیں ہے (النحل آیت ۶۷)، پھر فرمایا کہ اس کا گناہ اس کے فائدے سے زیادہ ہے (البقرۃ ۲۱۹) پھر حکم دیا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ (النساء ۴۳)، پھر اس کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ اسی طرح یہاں سود کے متعلق صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ یہ وہ چیز نہیں ہے جس سے دولت کی افزائش ہوتی ہو، بلکہ حقیقی افزائش زکوٰۃ سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد سود در سود کو منع کیا گیا (آل عمران، آیت ۱۳۰) اور سب سے آخر میں بجائے خود سود ہی کی قطعی حرمت کا فیصلہ کر دیا گیا (البقرۃ، آیت ۲۷۵)

بڑھتا چڑھتا سود کھانے کی ممانعت

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران ۳: ۱۳۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

احد کی شکست کا بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقع پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت لوٹنے میں لگ گئے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سود خواری سے باز آؤ جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی چلی جاتی ہے۔

سود خواری جس سوسائٹی میں موجود ہوتی ہے اس کے اندر سود خواری کی وجہ سے دو قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ سود لینے والوں میں حرص و طمع، بخل اور خود غرضی۔ اور سود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بغض و حسد۔ احد کی شکست میں ان دونوں قسم کی بیماریوں کا کچھ نہ کچھ حصہ شامل تھا۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو بتاتا ہے کہ سود خواری سے فریقین میں جو اخلاقی اوصاف پیدا ہوتے ہیں ان کے بالکل برعکس انفاق فی سبیل اللہ سے یہ دوسری قسم کے اوصاف پیدا ہوا کرتے ہیں، اور اللہ کی بخشش اور اس کی جنت اسی دوسری قسم کے اوصاف سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ پہلی قسم کے اوصاف سے۔

(تفہیم القرآن ج ۱، ص ۲۸۸۔ آل عمران حاشیہ ۹۸-۹۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حرمتِ سود کی آخری آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ ۲:۲۷۸-۲۷۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اب بھی توبہ کر لو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حق دار ہو نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اس سلسلۂ کلام میں داخل کر دی گئی۔ اس سے پہلے اگرچہ سود ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سود کھاتے تھے، ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمال کے ذریعے سے آگاہ فرما دیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے، تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اسلامی حکومت کے تحت اندرونی خود مختاری دی گئی، تو معاہدے میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے، تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا اور ہمارے اور تمھارے درمیان حالت جنگ قائم ہو جائے گی۔ آیت کے آخری الفاظ کی بنا پر ابن عباس، حسن بصری، ابن سیرین اور ربیع بن انس کی رائے یہ ہے کہ جو شخص دارالسلام میں سود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے اور اگر باز نہ آئے، تو اسے قتل کر دیا جائے۔ دوسرے فقہا کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا کافی ہے۔ جب تک وہ سود خواری چھوڑ دینے کا عہد نہ کرے، اسے نہ چھوڑا جائے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۱۸۔ البقرۃ حاشیہ ۳۲۳)

ربٰو کا مفہوم

قرآن مجید میں سود کے لیے ربٰو کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مادہ "ر ب و" ہے جس کے معنی میں زیادت، نمو، بڑھوتری اور چڑھنے کا اعتبار ہے۔ رَبَا: بڑھا اور زیادہ ہوا۔ ربا فلان الرابیة وہ ٹیلے پر چڑھ گیا۔ رَبَا فلان السویق: اس نے ستو پر پانی ڈالا اور ستو پھول گیا۔ رَبَا فی حجرہ: اس نے فلاں کی آغوش میں نشوونما پایا۔ اربی الشیٔ چیز کو بڑھایا۔ ربوۃ بلندی۔ رابیہ وہ زمین جو عام سطح ارض سے بلند ہو۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں اس مادے کے مشتقات آئے ہیں، سب جگہ زیادت اور علو اور نمو کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مثلاً:

فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ. (الحج ۲۲:۵)

جب ہم نے اس پر پانی برسایا تو وہ لہلہا اٹھی اور برگ و بار لانے لگی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۔ (البقرہ ۲:۲۷۶)

اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔

فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ۔ (الرعد ۱۳:۱۷)

جھاگ جو اوپر اٹھ آیا تھا اس کو سیلاب بہا لے گیا۔

فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۔ (الحاقۃ ۶۹:۱۰)

اس نے ان کو پھر زیادہ سختی کے ساتھ پکڑا۔

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۔ (النحل ۱۶:۹۲)

تاکہ ایک قوم دوسری قوم سے بڑھ جائے۔

وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ۔ (المومنون ۲۳:۵۰)

ہم نے مریم اور مسیح کو ایک اونچی جگہ پر پناہ دی۔

اسی مادے سے ''ربٰو'' ہے اور اس سے مراد مال کی زیادتی اور راس کا اصل سے بڑھ جانا ہے۔ چنانچہ اس معنی کی تصریح بھی خود قرآن میں کر دی گئی ہے:

وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا .... وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۔ (البقرۃ ۲:۲۷۸-۲۷۹)

اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو......... اور اگر تم توبہ کرلو تو تمھیں اپنے راس المال (یعنی اصل رقم) لینے کا حق ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۔ (الروم ۳۰:۳۹)

اور جو سود تم نے دیا ہے تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک اس سے مال نہیں بڑھتا۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اصل رقم پر جو زیادتی بھی ہوگی وہ ربو' کہلائے گی۔ لیکن قرآن مجید نے مطلق ہر زیادتی کو حرام نہیں کیا ہے۔ زیادتی تو تجارت میں بھی ہوتی ہے۔ قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے، اسی لیے وہ اس کو الرِّبٰو کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اہل عرب کی زبان میں اسلام سے پہلے بھی معاملے کی اس خاص نوعیت کو اسی اصطلاحی نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ مگر وہ الرِّبٰو کو بیع کی طرح جائز سمجھتے تھے جس طرح موجودہ جاہلیت میں سمجھا جاتا ہے۔ اسلام نے آکر بتایا کہ راس المال میں جو زیادتی بیع سے ہوتی ہے وہ اس زیادتی سے مختلف ہے جو الربو' سے ہوا کرتی ہے۔ پہلی قسم کی زیادتی حلال ہے اور دوسری قسم کی زیادتی حرام۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ (البقرۃ ۲:۲۷۵)

سود خواروں کا یہ حشر اس لیے ہوگا کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی الربو' کے مانند ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور الربو کو حرام کیا۔

چونکہ الربو' ایک خاص قسم کی زیادتی کا نام تھا، اور وہ معلوم و مشہور تھی، اس لیے قرآن مجید میں اس کی کوئی تشریح نہیں کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گئی، اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا کہ اللہ نے اس کو حرام کیا ہے، اسے چھوڑ دو۔

جاہلیت کا ربو

زمانہ جاہلیت میں الربو' کا اطلاق جس طرز معاملہ پر ہوتا تھا، اس کی متعدد صورتیں روایات میں آئی ہیں۔

قتادہ کہتے ہیں جاہلیت کا ربو یہ تھا کہ ایک شخص، دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک وقت مقررہ تک مہلت دیتا۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا۔

مجاہد کہتے ہیں جاہلیت کا ربو یہ تھا کہ ایک شخص کسی سے قرض لیتا اور کہتا کہ اگر تو مجھے اتنی مہلت دے تو میں اتنا زیادہ دوں گا۔ (ابن جریر جلد سوم صفحہ ٦٢)

ابو بکر جصاص کی تحقیق یہ ہے کہ اہل جاہلیت ایک دوسرے سے قرض لیتے تو باہم یہ طے ہو جاتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل راس المال سے زیادہ ادا کی جائے گی۔ (احکام القرآن جلد اول)

امام رازی کی تحقیق میں اہل جاہلیت کا یہ دستور تھا کہ وہ ایک شخص کو ایک معین مدت کے لیے روپیہ دیتے اور اس سے ماہ بماہ ایک مقررہ رقم سود کے طور پر وصول کرتے رہتے۔ جب وہ مدت ختم ہو جاتی تو مدیون سے راس المال کا مطالبہ کیا جاتا۔ اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو پھر ایک مزید مدت کے لیے مہلت دی جاتی اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ (تفسیر کبیر جلد دوم صفحہ ۳۵۱)

کاروبار کی یہ صورتیں عرب میں رائج تھیں، انھی کو اہل عرب اپنی زبان میں الربو' کہتے تھے اور یہی وہ چیز تھی جس کی تحریم کا حکم قرآن مجید میں نازل ہوا۔

سود خوار کی حالت

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ (البقرۃ ۲:۲۷۵-۲۷٦)

جو لوگ سود کھاتے ہیں، اُن کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے۔'' حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لیے وہ سود خواری سے باز آ جائے، تو جو کچھ وہ پہلے کھا چکا سو کھا چکا، اس کا معاملہ اللہ کے حوالے۔ اور جو اس حکم کے بعد پھر اسی حرکت کا اعادہ کرے، وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو ونما دیتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سود خوار کی مخبوط الحواس شخص سے تشبیہ

یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ۔

جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔

اہل عرب دیوانے آدمی کو ''مجنون'' (یعنی آسیب زدہ) کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے، تو یوں کہتے کہ اسے جن لگ گیا ہے۔ اسی محاورے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سود خوار کو اس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو۔ یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے، اسی طرح سود خوار بھی روپے کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سود خواری سے کس کس طرح انسانی محبت، اخوت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں، اجتماعی فلاح و بہبود پر کس قدر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے، اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوشحالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اس دنیا میں ہے اور چونکہ آخرت میں انسان اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس حالت پر اس نے دنیا میں جان دی ہے، اس لیے سود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باؤلے، مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اٹھے گا۔

نظریے کی خرابی

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ۔

حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

ان کے نظریے کی خرابی یہ ہے کہ تجارت میں اصل لاگت پر جو منافع لیا جاتا ہے، اس کی نوعیت اور سود کی نوعیت کا فرق وہ نہیں سمجھتے، اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے روپے کا منافع جائز ہے، تو قرض پر دیے ہوئے روپے کا منافع کیوں ناجائز ہو۔ اسی طرح کے دلائل موجودہ زمانے کے سود خوار بھی سود کے حق میں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا تھا، اسے وہ قرض پر دوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے۔ وہ دوسرا شخص بھی بہرحال اس سے فائدہ ہی اٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اٹھا رہا ہے، اس میں سے ایک حصہ وہ قرض دینے والے کو نہ ادا کرے؟ مگر یہ لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ دنیا میں جتنے کاروبار ہیں، خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت و حرفت کے یا زراعت کے اور خواہ انھیں آدمی صرف اپنی محنت سے کرتا ہو یا اپنے سرمایے اور محنت ہر دو سے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس میں آدمی نقصان کا خطرہ (Risk) مول نہ لیتا ہو اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقرر منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہو جو نقصان کے خطرے سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حق دار قرار پائے؟ غیر نفع بخش اغراض کے لیے قرض لینے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والے کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے چھوڑ دیجیے اور شرح کی کمی بیشی کے مسئلے سے بھی قطع نظر کر لیجیے۔ معاملہ اسی قرض کا سہی جو نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے لیا جائے اور شرح بھی تھوڑی ہی سہی۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنی قابلیت اور اپنا سرمایہ رات دن کھپا رہے ہیں، اور جن کی سعی و کوشش کے بل پر ہی اس کاروبار کا بارآور ہونا موقوف ہے، ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو، بلکہ نقصان کا سارا خطرہ بالکل انھی کے سر ہو، مگر جس نے صرف اپنا روپیہ انھیں قرض دے دیا ہو وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وصول کرتا چلا جائے! یہ آخر کس عقل، کس منطق، کس اصولِ انصاف اور کس اصولِ معاشیات کی رو سے درست ہے؟ اور یہ کس بنا پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانے کو بیس سال کے لیے ایک رقم قرض دے اور آج ہی یہ طے کر لے کہ آئندہ ۲۰ سال تک وہ برابر ۵ فی صدی سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حق دار ہوگا، حالانکہ وہ کارخانہ جو مال تیار کرتا ہے اس کے متعلق کسی کو بھی نہیں معلوم کہ مارکیٹ میں اس کی قیمتوں کے اندر آئندہ بیس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہوگا؟ اور یہ کس طرح درست ہے کہ ایک قوم کے سارے ہی طبقے ایک لڑائی میں خطرات اور نقصانات اور قربانیاں برداشت کریں، مگر ساری قوم کے اندر سے صرف ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو جو اپنے دیے ہوئے جنگی قرض پر اپنی ہی قوم سے لڑائی کے ایک ایک صدی بعد تک سود وصول کرتا رہے۔

تجارت اور سود میں اصولی فرق

تجارت اور سود کا اصولی فرق، جس کی بنا پر دونوں کی معاشی اور اخلاقی حیثیت ایک نہیں ہو سکتی یہ ہے:

(۱) تجارت میں بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے، کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اس محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے، جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے، جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے، لیکن اس کے مقابلے میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لیے قطعی نافع نہیں ہے اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے، یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت سے بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے، بہر حال وہ جو کچھ لیتا ہے، ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو، بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے، اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی، اس کے تمام وسائل معیشت، حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کر لے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے، اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرایے میں اصل شے، جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے، صرف نہیں ہوتی، بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہٖ کرایہ دار کو واپس دے دی جاتی ہے لیکن سود کے معاملے میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت وحرفت اور زراعت میں انسان محنت، ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت ومشقت کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی ''شریک'' کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے، بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع ونقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔

ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے، اور ہمدردی وامداد باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوعِ انسانی کے لیے تباہ کن ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۱۰ تا ۲۱۲۔ البقرہ حواشی ۳۱۵ تا ۳۱۸)

علتِ تحریم

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ ان وجوہ کے علاوہ حرمت سود کی دوسری وجوہ بھی ہیں جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ وہ بخل، خود غرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے۔ وہ قوم اور قوم میں عداوت ڈالتا ہے۔ وہ افراد قوم کے درمیان ہمدردی اور امدادِ باہمی کے تعلقات کو قطع کرتا ہے۔ وہ لوگوں میں روپیہ جمع کرنے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کی ترقی پر لگانے کا میلان پیدا کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی میں دولت کی آزادانہ گردش کو روکتا ہے،

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بلکہ دولت کی گردش کا رخ الٹ کر ناداروں سے مال داروں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے جمہور کی دولت سمٹ کر ایک طبقے کے پاس اکٹھی ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ چیز آخر کار پوری سوسائٹی کے لیے بربادی کی موجب ہوتی ہے، جیسا کہ معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں۔ سود کے یہ تمام اثرات ناقابلِ انکار ہیں، اور جب یہ ناقابل انکار ہیں تو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام جس نقشے پر انسان کی اخلاقی تربیت، تمدنی شیرازہ بندی اور معاشی تنظیم کرنا چاہتا ہے اس کے ہر ہر جز سے سود کلی منافات رکھتا ہے، اور سودی کاروبار کی ادنیٰ سے ادنیٰ اور بظاہر معصوم سے معصوم صورت بھی اس پورے نقشے کو خراب کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ نے اس قدر سخت الفاظ کے ساتھ سود کو بند کرنے کا حکم دیا کہ:

اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ. فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۔ (البقرۃ ۲: ۲۷۸-۲۷۹)

اللہ سے ڈرو اور جو سود تمھارا لوگوں پر باقی ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کا اعلان قبول کرو۔

حرمت سود کی شدت

قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کی ممانعت کا حکم آیا ہے، اور ان پر سخت وعیدیں بھی ہیں، لیکن اتنے سخت الفاظ کسی دوسرے گناہ کے بارے میں وارد نہیں ہوئے۔[1] اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قلمرو میں سود کو روکنے کے لیے سخت کوشش فرمائی۔ آپؐ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ کالعدم ہو جائے گا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔ بنو مغیرہ کے سود خوار عرب میں مشہور تھے، فتح مکہ کے بعد حضورؐ نے ان کی تمام سودی رقمیں باطل کر دیں اور اپنے عامل مکہ کو لکھا کہ اگر وہ باز نہ آئیں تو ان سے جنگ کرو۔ خود حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ ایک بڑے مہاجن تھے۔ حجۃ الوداع میں آپؐ نے اعلان فرمایا کہ جاہلیت کے تمام سود ساقط کیے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود اپنے چچا عباس کا سود ساقط کرتا ہوں۔ آپؐ نے یہاں تک فرما دیا کہ سود لینے والے اور دینے والے اور اس کی دستاویز کے کاتب اور اس پر گواہی دینے والے، سب پر اللہ کی لعنت! (سود ص ۱۵۵ تا ۱۵۷)

سود کے نقصانات

يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ۔[2]

اس آیت میں ایک ایسی صداقت بیان کی گئی ہے، جو اخلاقی و روحانی حیثیت سے بھی سراسر حق ہے اور معاشی و تمدنی حیثیت سے بھی۔ اگرچہ بظاہر سود سے دولت بڑھتی نظر آتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، لیکن درحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہے۔ خدا کا قانونِ فطرت یہی ہے کہ سود اخلاقی و روحانی اور معاشی و تمدنی ترقی میں نہ صرف مانع ہوتا ہے بلکہ تنزل

ا۔ ایک حدیث میں ہے کہ سود کا گناہ اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے ستر درجے زیادہ ہے۔ (ابن ماجہ)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور اس کے برعکس صدقات سے (جن میں قرض حسن بھی شامل ہے) اخلاق و روحانیت اور تمدن و معیشت ہر چیز کو نشو و نما نصیب ہوتا ہے۔

اخلاقی و روحانی حیثیت سے

اخلاقی و روحانی حیثیت سے دیکھیے، تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سود دراصل خود غرضی، بخل، تنگ دلی اور سنگ دلی، جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ انھی صفات کو انسان میں نشو و نما بھی دیتا ہے۔ اس کے برعکس صدقات نتیجہ ہیں فیاضی، ہمدردی، فراخ دلی اور عالی ظرفی جیسی صفات کا اور صدقات پر عمل کرتے رہنے سے یہی صفات انسان کے اندر پرورش پاتی ہیں۔ کون ہے جو اخلاقی صفات کے ان دونوں مجموعوں میں سے پہلے مجموعے کو بدترین اور دوسرے کو بہترین نہ مانتا ہو؟

تمدنی حیثیت سے

تمدنی حیثیت سے دیکھیے، تو بادنیٰ تامل یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آجائے گی کہ جس سوسائٹی میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجت مندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے اور مالدار طبقوں کا مفاد عامۃ الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائٹی کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی محبت کے بجائے باہمی بغض و حسد اور بے دردی و بے تعلقی نشو و نما پائے گی۔ اس کے اجزا ہمیشہ انتشار و پراگندگی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورتِ حال کے لیے مددگار ہو جائیں، تو ایسی سوسائٹی کے اجزا کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس سوسائٹی کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کریں، جس میں ہر شخص دوسرے کی حاجت کے موقع پر فراخ دلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے، اور جس میں باوسیلہ لوگ بے وسیلہ لوگوں سے ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں، ایسی سوسائٹی میں آپس کی محبت، خیر خواہی اور دلچسپی نشو و نما پائے گی۔ اس کے اجزا ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع و تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلی قسم کی سوسائٹی کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہوگی۔

معاشی حیثیت سے

اب معاشی حیثیت سے دیکھیے۔ معاشیات کے نقطۂ نظر سے سودی قرض کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ قرض جو اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے مجبور اور حاجت مند لوگ لیتے ہیں۔ دوسرا وہ قرض جو تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وغیرہ کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے قرض کو تو ایک دنیا جانتی ہے کہ اس پر سود وصول کرنے کا طریقہ نہایت تباہ کن ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں مہاجن افراد اور مہاجنی ادارے اس ذریعے سے غریب مزدوروں، کاشتکاروں اور قلیل المعاش عوام کا خون نہ چوس رہے ہوں۔ سود کی وجہ سے اس قسم کا قرض ادا کرنا ان لوگوں کے لیے سخت مشکل، بلکہ بسا اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ پھر ایک قرض کو ادا کرنے کے لیے وہ دوسرا اور تیسرا قرض لیتے چلے جاتے ہیں۔ اصل رقم سے کئی کئی گنا سود دے چکنے پر بھی اصل رقم جوں کی توں باقی رہتی ہے۔ محنت پیشہ آدمی کی آمدنی کا بیشتر حصہ مہاجن لے جاتا ہے اور اس غریب کی اپنی کمائی میں سے اس کے پاس اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے بھی کافی روپیہ نہیں بچتا۔ یہ چیز رفتہ رفتہ اپنے کام سے کارکنوں کی دلچسپی ختم کر دیتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی محنت کا پھل دوسرا لے اڑے تو وہ کبھی دل لگا کر محنت نہیں کر سکتے۔ پھر سودی قرض کے جال میں پھنسے ہوئے لوگوں کو ہر وقت کی فکر اور پریشانی اس قدر گھلا دیتی ہے، اور تنگ دستی کی وجہ سے ان کے لیے صحیح غذا اور علاج اس قدر مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی صحتیں کبھی درست نہیں رہ سکتیں۔ اس طرح سودی قرض کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ چند افراد تو لاکھوں آدمیوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے رہتے ہیں، مگر بحیثیت مجموعی پوری قوم کی پیدائش دولت اپنے امکانی معیار کی بہ نسبت بہت گھٹ جاتی ہے، اور مآلِ کار میں خود وہ خون چوسنے والے افراد بھی اس کے نقصانات سے نہیں بچ سکتے کیونکہ ان کی اس خود غرضی سے غریب عوام کو جو تکلیفیں پہنچتی ہیں ان کی بدولت مال دار لوگوں کے خلاف غصے اور نفرت کا ایک طوفان دلوں میں اٹھتا اور گھٹتا رہتا ہے اور کسی انقلابی ہیجان کے موقع پر جب یہ آتش فشاں پھٹتا ہے تو ان ظالم مالداروں کو اپنے مال کے ساتھ اپنی جان اور آبرو تک سے ہاتھ دھونا پڑ جاتا ہے۔

رہا دوسری قسم کا قرض جو کاروبار میں لگانے کے لیے لیا جاتا ہے، تو اس پر ایک مقرر شرحِ سود کے عائد ہونے سے جو بے شمار نقصانات پہنچتے ہیں ان میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

(۱) جو کام رائج الوقت شرحِ سود کے برابر نفع نہ لا سکتے ہوں، چاہے ملک اور قوم کے لیے کتنے ہی ضروری اور مفید ہوں، ان پر لگانے کے لیے روپیہ نہیں ملتا اور ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے، جو بازار کی شرحِ سود کے برابر یا اس سے زیادہ نفع لا سکتے ہوں، چاہے اجتماعی حیثیت سے ان کی ضرورت اور ان کا فائدہ بہت کم ہو یا کچھ بھی نہ ہو۔

(۲) جن کاموں کے لیے سود پر سرمایہ ملتا ہو ہے، خواہ وہ تجارتی کام ہوں یا صنعتی یا زراعتی، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں اس امر کی ضمانت موجود ہو کہ ہمیشہ تمام حالات میں اس کا منافع ایک مقرر میعاد مثلاً پانچ، چھ یا دس فی صدی تک یا اس سے اوپر اوپر ہی رہے گا اور کبھی اس سے نیچے نہیں گرے گا۔ اس کی ضمانت ہونا تو درکنار، کسی کاروبار میں سرے سے اس بات کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے کہ اس میں ضرور منافع ہی ہوگا، نقصان کبھی نہ ہوگا۔ لہٰذا کسی کاروبار میں ایسے سرمایہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا لگنا جس پر سرمایہ دار کو ایک مقرر شرح کے مطابق منافع دینے کی ضمانت دی گئی ہو، نقصان اور خطرے کے پہلوؤں سے کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔

(۳) چونکہ سرمایہ دینے والا کاروبار کے نفع و نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع اور وہ بھی ایک مقرر شرحِ منافع کی ضمانت پر روپیہ دیتا ہے، اس وجہ سے کاروبار کی بھلائی اور برائی سے اس کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ انتہائی خود غرضی کے ساتھ صرف اپنے منافع پر نگاہ رکھتا ہے، اور جب کبھی اسے ذرا سا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ منڈی پر کساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے، تو وہ سب سے پہلے اپنا روپیہ کھینچنے کی فکر کرتا ہے۔ اس طرح کبھی تو محض اس کے خود غرضانہ اندیشوں ہی کی بدولت دنیا پر کساد بازاری کا واقعی حملہ ہو جاتا ہے اور کبھی اگر دوسرے اسباب سے کساد بازاری آ گئی ہو تو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر انتہائی تباہ کن حد تک پہنچا دیتی ہے۔

سود کے یہ تین نقصانات تو ایسے صریح ہیں کہ کوئی شخص جو علم المعیشت سے تھوڑا سا مس بھی رکھتا ہو ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ مانے بغیر کیا چارہ ہے کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت کی رو سے سود معاشی دولت کو بڑھاتا نہیں بلکہ گھٹاتا ہے۔[۱]

(تفہیم القرآن ج ا ص ۲۱۴ تا ۲۱۶۔ البقرہ حاشیہ ۳۲۰)

❀❀❀❀❀❀❀

۱۔ مزید معلومات کے لیے مصنف کی کتاب سود کا صفحہ ۸۲ تا ۹۳ ملاحظہ ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

سود کے متعلقات

ربو [جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے] دراصل اس زائد رقم یا فائدے کو کہتے ہیں جو قرض کے معاملے میں ایک دائن راس المال کے علاوہ شرط کے طور پر اپنے مدیون سے وصول کرتا ہے۔ اصطلاح شرح میں اس کو ''ربا النسیۂ'' کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ ربو جو قرض کے معاملے میں لیا اور دیا جائے۔ قرآن مجید میں اسی کو حرام کیا گیا ہے۔ اس کی حرمت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ اس میں کبھی کسی شک وشبہ نے راہ نہیں پائی۔

لیکن شریعتِ اسلامی کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جس چیز کو حرام کیا جاتا ہے اس کی طرف جانے کے جتنے رستے ممکن ہیں ان سب کو بند کر دیا جاتا ہے، بلکہ اس کی طرف پیش قدمی کی ابتدا جس مقام سے ہوتی ہے وہیں روک لگا دی جاتی ہے تاکہ انسان اس کے قریب بھی نہ جانے پائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قاعدے کو ایک لطیف مثال میں بیان فرمایا ہے۔ عرب کی اصطلاح میں حمیٰ اس چراگاہ کو کہتے ہیں جو کسی شخص نے اپنے جانوروں کے لیے مخصوص کر لی ہو اور جس میں دوسروں کے لیے اپنے جانور چرانا ممنوع ہو۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ '' ہر بادشاہ کی ایک حمیٰ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمیٰ اس کے وہ حدود ہیں جن سے باہر قدم نکالنے کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو جانور حمیٰ کے اردگرد چرتا پھرتا ہے، بعید نہیں کہ کسی وقت چرتے چرتے وہ حمیٰ کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی حمیٰ یعنی اس کے حدود کے اطراف میں چکر لگاتا رہتا ہے اس کے لیے ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ کب اس کا پاؤں پھسل جائے اور وہ حرام میں مبتلا ہو جائے۔ لہٰذا جو امور حلال وحرام کے درمیان واسطہ ہیں ان سے بھی پرہیز لازم ہے تاکہ تمھارا دین محفوظ رہے۔

یہی مصلحت ہے جس کو مدنظر رکھ کر شارع حکیم نے ہر ممنوع چیز کے اطراف میں حرمت اور کراہیت کی ایک مضبوط باڑھ لگا دی ہے اور ارتکاب ممنوعات کے ذرائع پر بھی ان کے قرب وبعد کے لحاظ سے سخت یا نرم پابندیاں عائد کر دی ہیں۔

سود کے مسئلے میں ابتدائی حکم صرف یہ تھا کہ قرض کے معاملات میں جو سودی لین دین ہوتا ہے، وہ قطعاً حرام ہے۔ چنانچہ اسامہ بن زید سے جو حدیث مروی ہے اس میں حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ انما الربا فی النسیئة اوفی بعض الالفاظ

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

لا ربا الافي النسيئة یعنی سود صرف قرض کے معاملات میں ہے۔[۱] لیکن بعد میں آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کی اس حمیٰ کے اردگرد بندشیں لگانا ضروری سمجھا، تاکہ لوگ اس کے قریب بھی نہ پھٹک سکیں۔ اسی قبیل سے وہ فرمانِ نبوی ہے جس میں سود کھانے اور کھلانے کے ساتھ سود کی دستاویز لکھنے اور اس پر گواہی دینے کو بھی حرام کیا گیا ہے اور اسی قبیل سے وہ احادیث ہیں جن میں ربوٰ الفضل کی تحریم کا حکم دیا گیا ہے۔

(تفہیم الاحادیث ج ۷ ص ۱۴۶-۱۴۸ اشاعت دوم)

ربوٰ الفضل کا مفہوم

ربوٰ الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کی دست بدست لین دین میں ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا۔ کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے خود ہی اس مصلحت کو اس حدیث میں بیان فرما دیا ہے جس کو ابو سعیدؓ خدری نے بدیں الفاظ نقل کیا ہے کہ لا تبيعو الدرهم بدرهمين فاني اخاف عليكم الرما (والرما هو الربا) یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خواری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

ربا الفضل کے احکام

سود کی اس قسم کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام منقول ہیں۔ ان کو یہاں لفظ بلفظ نقل کیا جاتا ہے:

عن عبادة بن الصامت قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل سواء بسواء يداً بيدٍ، فاذا اختلفت هذه الاصناف فبيعوا كيف شئتم اذا كان يداً بيدٍ.

عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جو کا جو سے اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ جیسے کا تیسا اور برابر برابر اور دست بدست ہو۔ البتہ اگر مختلف اصناف کی چیزوں کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو جائے۔

(احمد و مسلم و للنسائی و ابن ماجه و ابی داوٗد نحوه وفی اخره) وامرنا ان نبيع البر بالشعير والشعير بالبر

۱۔ حضرت عبداللہؓ بن عباس نے ابتدا میں اسی حدیث کی بناء پر یہ فتویٰ دیا تھا کہ سود صرف قرض کے معاملات میں ہے دست بدست لین دین میں نہیں ہے۔ لیکن جب بعد میں ان کو متواتر روایات سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے نقد معاملات میں بھی تفاضل کو منع فرمایا ہے تو انھوں نے اپنے پہلے قول سے رجوع کر لیا۔ چنانچہ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رجع ابن عباس عن قوله في الصرف و عن قوله في المتعة۔ اسی طرح حاکم نے حیان العدوی کے طریق سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے بعد میں اپنے سابق فتوے پر توبہ و استغفار کی اور نہایت سختی کے ساتھ ربوٰ الفضل سے منع کرنے لگے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یداً بید کیف شئنا۔

(مسند احمد و صحیح مسلم۔ یہی حدیث نسائی اور ابن ماجہ اور ابوداؤد میں بھی آئی ہے اور اس کے آخر میں اتنا اضافہ اور ہے) اور آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم گیہوں کا مبادلہ جو سے اور جو کا گیہوں سے دست بدست جس طرح چاہیں کریں۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ والبر بالبر والشعیر بالشعیر والتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثل یداً بید فمن زاد اواستزاد فقد اربی، الآخذ والمعطی فیہ سواء (البخاری واحمد و مسلم وفی لفظ) لاتبیعوا الذھب بالذھب ولا الورق بالورق الا وزنا بوزنٍ مثلا بمثل سواء بسواء۔ (احمد و مسلم)

ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا چاندی سے گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے، کھجور کا کھجور سے، نمک کا نمک سے جیسے کا تیسا، اور دست بدست ہونا چاہیے۔ جس نے زیادہ دیا یا لیا اس نے سودی معاملہ کیا، لینے والا اور دینے والا دونوں گناہ میں برابر ہیں۔ (بخاری، احمد، مسلم۔ اور ایک دوسری روایت میں ہے) سونے کو سونے کے عوض اور چاندی کو چاندی کے عوض فروخت نہ کرو مگر وزن میں مساوی، جوں کا توں اور برابر سرابر۔ (احمد و مسلم)

وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاتبیعوا الذھب بالذھب الا مثلا بمثل ولاتشفوا بعضھا علی بعض ولا تبیعوا الورق بالورق الا مثلا بمثل ولاتشفوا بعضھا علی بعض ولاتبیعوا منھا غائبا بحاضر (البخاری و مسلم)

ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سونے کو سونے کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے۔ اور چاندی کو چاندی کے عوض نہ بیچو مگر جوں کا توں۔ کوئی کسی کو زیادہ نہ دے اور نہ غائب کا تبادلہ حاضر سے کرو۔ (بخاری و مسلم)

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال التمر بالتمر والحنطۃ بالحنطۃ والشعیر بالشعیر والملح مثلا بمثل یداً بید فمن زاد او استزاد فقد اربی الاما اختلفت الوانہ (مسلم)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھجور کا مبادلہ کھجور سے، گیہوں کا گیہوں سے، جو کا جو سے اور نمک کا نمک سے جوں کا توں اور دست بدست ہونا چاہیے جس نے زیادہ دیا یا زیادہ لیا اس نے سودی معاملہ کیا۔ سوائے اس صورت کے جب کہ ان اشیا کے رنگ مختلف ہوں۔ (مسلم)

عن سعد بن ابی وقاص قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن شراء التمر بالرطب فقال اینقص الرطب اذاییس فقال نعم فنھاہ عن ذالک (مالک و الترمذی و ابوداوٗد والنسائی و ابن ماجہ)

سعدؓ بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اور میں سن رہا تھا کہ خشک کھجور کا تر کھجور کے ساتھ مبادلہ کس طریقے پر کیا جائے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کیا تر کھجور سوکھنے کے بعد کم ہو جاتی ہے؟ سائل نے عرض کیا ہاں۔ تب آپؐ نے سرے سے اس مبادلہ ہی کو منع فرما دیا۔ (مالک، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

عن ابی سعید قال کنا نرزق تمر الجمع وھو الخلط من التمر و کنا نبیع صاعین بصاع فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاصاعین بصاع ولا درھمین بدرھم (البخاری)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ ہم لوگوں کو بالعموم اجرتوں اور تنخواہوں میں مخلوط قسم کی کھجوریں ملا کرتی تھیں اور ہم دو دو صاع مخلوط کھجوریں دے کر ایک صاع اچھی قسم کی کھجوریں لے لیا کرتے تھے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہ دو صاع کا مبادلہ ایک صاع سے کرو اور نہ دو درہم کا ایک درہم سے۔ (بخاری)

عن ابی سعید و ابی هریره ان رسول الله صلی الله علیه وسلم استعمل رجلا علی خیبر فجاء بتمر جنیب فقال اکل تمر خیبر هکذا؟ قال لا والله یارسول الله انا لناخذ الصاع من هذا بالصاعین و الصاعین بالثلاث فقال لا تفعل بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبا وقال فی المیزان مثل ذالک۔ (البخاری و مسلم)

ابوسعیدؓ خدری اور ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خیبر کا تحصیل دار مقرر کر کے بھیجا وہ وہاں سے (مال گزاری میں) عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آیا۔ آنحضرتؐ نے پوچھا کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں یا رسول اللہ، ہم جو ملی جلی کھجوریں وصول کرتے ہیں انھیں کبھی دو صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے اور کبھی ۳ صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے ان اچھی کھجوروں سے بدل لیا کرتے ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ پہلے ان مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض فروخت کر دو، پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض خرید لو۔ یہی بات آپؐ نے وزن کے حساب سے مبادلہ کرنے کی صورت میں بھی ارشاد فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

عن ابی سعید قال جاء بلال الی النبی صلی الله علیه وسلم بتمر برنی فقال له النبی صلی الله علیه وسلم من این هذا قال کان عندنا تمره ردی فبعت منه صاعین بصاع۔ قال آوه، عین الربا، عین الربالاتفعل ولکن اذا اردت ان تشتری فبع التمر ببیع آخر ثم اشتربه۔ (البخاری و مسلم)

ابوسعیدؓ خدری کہتے ہیں کہ ایک دفعہ بلال نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں برنی کھجوریں لے کر آئے (جو کھجور کی ایک بہترین قسم ہوتی ہے) آپؐ نے پوچھا یہ کہاں سے لے آئے؟ انھوں نے عرض کیا ہمارے پاس گھٹیا قسم کی کھجور تھی۔ میں نے وہ دو صاع دے کر ایک صاع خرید لی۔ فرمایا ہائیں! قطعی سود! قطعی سود! ایسا ہرگز نہ کیا کرو۔ جب تمھیں اچھی کھجوریں خریدنی ہوں تو اپنی کھجوریں درہم یا کسی اور چیز کے عوض بیچ دو۔ پھر اس قیمت سے اچھی کھجوریں خرید لو۔ (بخاری و مسلم)

عن فضاله بن عبید قال اشتریت قلادة یوم خیبر باثنی عشر دیناراً فیها ذهب وخرز ففصلتها فوجدت فیها اکثر من اثنی عشر دینارا فذکرت ذالک للنبی صلی الله علیه وسلم فقال لاتباع حتی تفصل (مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی)

فضالہؓ بن عبید کہتے ہیں کہ میں نے جنگ خیبر کے موقع پر ایک جڑاؤ ہار ۱۲ دینار میں خریدا۔ پھر جو میں نے اس ہار کو توڑ کر نگ اور سونا الگ الگ کیا تو اس کے اندر ۱۲ دینار سے زیادہ کا سونا نکلا۔[1] میں نے اس کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا آئندہ سے سونے کا جڑاؤ زیور سونے کے عوض نہ بیچا جائے جب تک کہ نگ اور سونے کو الگ الگ نہ کر دیا جائے۔ (مسلم، نسائی، ابوداؤد، ترمذی)

عن ابی بکرة قال نهی النبی صلی الله علیه وسلم عن الفضة بالفضة والذهب بالذهب الاسواء بسواء وامرنا ان

۱۔ یہ خیال رہے کہ اس زمانے میں درہم اور دینار خالص چاندی اور سونے کے ہوتے تھے اور ان کی قیمت ان کی چاندی اور سونے ہی کے وزن کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ لہٰذا اس زمانے میں دینار کے عوض سونا اور درہم کے عوض چاندی خریدنا بالکل یہ معنی رکھتا تھا کہ آدمی نے سونے کے عوض سونا خریدا اور چاندی کے عوض چاندی حاصل کی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نشتری الفضة بالذھب کیف شئنا ونشتری الذھب بالفضة کیف شئنا۔ (بخاری و مسلم)

ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے مبادلہ نہ کیا جائے مگر برابری کے ساتھ۔ نیز آپؐ نے فرمایا کہ چاندی کو سونے سے اور سونے کو چاندی سے جس طرح چاہو بدل سکتے ہو۔ (بخاری و مسلم)

احکام بالا کا ماحصل

مذکورہ بالا احادیث کے الفاظ اور معانی پر اور اُن حالات پر جن میں یہ احادیث ارشاد ہوئی ہیں، غور کرنے سے حسب ذیل اصول اور احکام حاصل ہوتے ہیں:

(۱) یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے کی ضرورت صرف اسی صورت میں پیش آتی ہے جب کہ اتحادِ جنس کے باوجود اُن کی نوعیتیں مختلف ہوں۔ مثلاً چاول اور گیہوں کی ایک قسم اور دوسری قسم، عمدہ سونا اور گھٹیا سونا، یا معدنی نمک اور سمندری نمک وغیرہ۔ ان مختلف اقسام کی ہم جنس چیزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بدلنا، اگرچہ بازار کے نرخ ہی کو ملحوظ رکھ کر ہو، بہرحال ان میں کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خواری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے۔ اس لیے شریعت نے قاعدہ مقرر کر دیا کہ ہم جنس اشیا کے مبادلہ کی اگر ضرورت پیش آئے تو لازماً حسب ذیل دو شکلوں میں سے ہی کوئی ایک شکل اختیار کرنی ہوگی۔ ایک یہ کہ ان کے درمیان قدر و قیمت کا جو تھوڑا سا فرق ہو اسے نظر انداز کر کے برابر سرابر مبادلہ کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چیز کا چیز سے براہِ راست مبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ بیچ دے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز روپے کے عوض بازار کے بھاؤ خرید لے۔

(۲) جیسا کہ ابھی ہم بیان کر چکے ہیں، قدیم زمانے میں تمام سکے خالص چاندی سونے کے ہوتے تھے اور ان کی قیمت دراصل ان کی چاندی اور ان کے سونے کی قیمت ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں درہم کو درہم سے اور دینار کو دینار سے بدلنے کی ضرورت ایسے مواقع پر پیش آتی تھی جب کہ مثلاً کسی شخص کو عراقی درہم کے عوض رومی درہم درکار ہوتے یا رومی دینار کے بدلے ایرانی دینار کی حاجت ہوتی۔ ایسی ضرورتوں کے مواقع پر یہودی ساہوکار اور دوسرے ناجائز نفع کمانے والے لوگ کچھ اسی طرح کا ناجائز منافع وصول کرتے تھے جیسا موجودہ زمانے میں بیرونی سکوں کے مبادلہ پر بٹاون لی جاتی ہے، یا اندرونِ ملک میں روپیہ کی ریزگاری مانگنے والوں، یا دس اور پانچ روپے کے نوٹ بھنانے والوں سے کچھ پیسے یا آنے وصول کر لیے جاتے ہیں۔ یہ چیز بھی چونکہ سود خوارانہ ذہنیت ہی کی طرف لے جانے والی ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ نہ تو چاندی کا مبادلہ چاندی سے اور سونے کا تبادلہ سونے سے کمی بیشی کے ساتھ کرنا جائز ہے اور نہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض بیچنا درست ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۳) ہم جنس اشیا کے درمیان مبادلہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک چیز خام شکل میں ہو اور دوسرے کے پاس اسی جنس سے بنی ہوئی کوئی شے ہو اور دونوں آپس میں ان کا مبادلہ کرنا چاہیں۔ اس صورت میں دیکھا جائے گا کہ آیا صنعت نے اس شے کی ماہیت بالکل ہی تبدیل کر دی ہے۔ یا اس کے اندر صنعت کے تصرف کے باوجود ابتدائی خام صورت کی بہ نسبت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا ہے۔ پہلی صورت میں تو کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے، لیکن دوسری صورت میں شریعت کا منشا یہ ہے کہ یا تو سرے سے مبادلہ ہی نہ ہو، یا اگر ہو تو برابری کے ساتھ ہو تا کہ زیادہ ستانی کے مرض کو غذا نہ مل سکے۔ مثال کے طور پر ایک تو وہ عظیم الشان تغیرات ہیں جو روئی سے کپڑا اور لوہے سے انجن بننے کی صورت میں رونما ہوتے ہیں، اور دوسرے وہ خفیف تغیرات ہیں جو سونے سے ایک چوڑی یا ایک کنگن بنائے جانے کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان میں سے پہلی صورت میں تو کوئی مضائقہ نہیں اگر ہم زیادہ مقدار میں روئی دے کر کم مقدار میں کپڑا اور بہت سے وزن کا خام لوہا دے کر تھوڑے سے وزن کا ایک انجن خرید لیں۔ لیکن دوسری صورت میں یا تو سونے کے کنگن کا مبادلہ ہم وزن سونے ہی سے کرنا ہوگا،[1] یا پھر سونے کو بازار میں بیچ کر اس کی قیمت کے کنگن خریدنے پڑیں گے۔

(۴) مختلف اجناس کی چیزوں کا باہم مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ ہو سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ دست بدست جو لین دین ہوگا وہ لامحالہ بازار کے نرخوں ہی پر ہوگا۔ مثلاً جو شخص چاندی دے کر سونا لے گا وہ نقد سودے کی صورت میں سونے کے بالمقابل اتنی ہی چاندی دے گا جتنی اسے بازار کے بھاؤ کے لحاظ سے دینی چاہیے۔ لیکن قرض کی صورت میں کمی بیشی کا معاملہ اس اندیشہ سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر سود کا غبار شامل ہو جائے۔ مثال کے طور پر جو شخص آج ۸۰ تولہ چاندی دے کر یہ طے کرتا ہے کہ ایک مہینہ بعد وہ ۸۰ تولہ چاندی کے بجائے ۲ تولہ سونا لے گا، اس کے پاس درحقیقت یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک مہینہ بعد ۴۰ تولہ چاندی ایک تولہ سونے کے برابر ہوگی۔ لہٰذا اس نے چاندی اور سونے کے درمیان مبادلے کی اس نسبت کا جو پیشگی تعین کر لیا یہ بہرحال ایک طرح کی سود خوارانہ اور قمار بازانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے اور قرض لینے والے نے جو اسے قبول کیا تو اس نے بھی گویا جوا کھیلا کہ شاید ایک مہینہ بعد سونے اور چاندی کی باہمی نسبت ۴۰:۱ کے بجائے ۳۵:۱ ہو۔ اسی بنا پر شارع نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ مختلف اجناس کا مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کرنا ہو تو وہ صرف دست بدست ہی ہو سکتا ہے۔ رہا قرض تو وہ لازماً دو طریقوں میں سے کسی ایک طریقے پر ہونا چاہیے یا تو جو چیز جتنی مقدار میں قرض دی گئی ہے وہی چیز اسی مقدار میں واپس

۱۔ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ”اس طرح تو پھر سنار کا سارا کاروبار بند ہو جائے گا کیونکہ اسے سونے کی بنی ہوئی چیزیں ہم وزن سونے کے عوض فروخت کرنی ہوں گی اور وہ اپنی صنعت کی کوئی اجرت نہ لے سکے گا۔“ یہ شبہ اس لیے غلط ہے کہ سنار سے دراصل ہم مبادلہ کا معاملہ نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنا سونا دے کر اس سے اپنے مطلب کی کوئی چیز بنواتے ہیں۔ لہٰذا وہ اسی طرح اپنے عمل کی اجرت لینے کا حق دار ہے جس طرح ایک درزی یا ایک نان بائی۔ البتہ اگر ہم کسی زیور فروش سے سونے کا بنا ہوا کوئی زیور خریدیں تو یقیناً اسے قیمت میں زیادہ سونا دینا جائز نہ ہوگا، بلکہ ہمیں لازماً اسے چاندی یا کاغذ کے سکے ہی میں قیمت دینی ہوگی۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

قبول کی جائے۔ یا پھر معاملہ اجناس اور اشیا کی شکل میں طے کرنے کے بجائے روپے کی شکل میں طے کیا جائے۔ مثلاً یہ کہ آج زید نے بکر سے ۸۰ روپے یا ۸۰ روپے کے گیہوں قرض لیے اور ایک مہینہ بعد وہ بکر کو ۸۰ روپے یا ۸۰ روپے کے جو واپس دے گا۔ اس قانون کو ابوداؤد کی اس روایت میں بالکل واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ولاباس ببیع الذھب بالفضۃ والفضۃ اکثرھما یدا بید واما النسیئۃ فلا۔ ولاباس ببیع البر بالشعیر والشعیر اکثرھما یدا بید واما النسیئۃ فلا۔

اور کوئی مضائقہ نہیں اگر سونے کو چاندی کے عوض بیچا جائے اور چاندی زیادہ ہو بشرطیکہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں ہے اور کوئی مضائقہ نہیں اگر گیہوں کو جو کے عوض بیچا جائے اور جو زیادہ ہوں بشرطیکہ معاملہ دست بدست ہو جائے۔ رہا قرض تو وہ جائز نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا قول

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ احکام مجمل ہیں اور معاملات کی تمام جزئی صورتوں کی ان میں تصریح نہیں ہے۔ اس لیے بہت سے جزئیات ایسے پائے جاتے ہیں جن میں شک کیا جا سکتا ہے کہ آیا وہ ربوٰ کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں۔ یہی بات ہے جس کی طرف حضرت عمرؓ نے اشارہ کیا ہے کہ:

ان ایۃ الربا من اخر ما نزل من القرآن و ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قبض قبل ان بینہ لنا فدعوا الربا والریبۃ

آیت ربوٰ قرآن کی اُن آیات میں سے ہے جو آخر زمانے میں نازل ہوئی ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا قبل اس کے کہ آپ اس کے تمام احکام ہم پر واضح فرماتے لہٰذا تم اس چیز کو بھی چھوڑ دو جو یقیناً سود ہے اور اس چیز کو بھی جس میں سود کا شبہ ہو۔

فقہا کے اختلافات

احکام کا یہ اجمال ہی ان اختلافات کا مبنیٰ ہے جو سودی اجناس کے تعین اور ان میں تحریم کی علت اور حکم تحریم کے اجزا میں فقہائے امت کے درمیان ہوئے ہیں۔

ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ ربوٰ صرف اُن چھ اجناس میں ہے جن کا ذکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا ہے، یعنی سونا، چاندی، گیہوں، جو، خرما اور نمک۔ ان کے سوا دوسری تمام چیزوں میں تفاضل کے ساتھ بلاکسی قید کے ہم جنس اشیا کا لین دین ہو سکتا ہے۔ یہ مذہب قتادہ اور طاؤس اور عثمان البتی اور ابن عقیل حنبلی اور ظاہریہ کا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم اُن تمام چیزوں میں جاری ہوگا جن کا لین دین وزن اور پیمانے کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ یہ عمار اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور ایک روایت کی رو سے امام احمد بن حنبل کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم سونے چاندی اور کھانے کی اُن چیزوں کے لیے ہے جن کا لین دین پیمانے اور وزن کے لحاظ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے ہوتا ہے۔ یہ سعید بن المسیب کا مذہب ہے اور ایک روایت اس باب میں امام شافعیؒ اور امام احمدؒ سے بھی منقول ہے۔

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ یہ حکم مخصوص ہے اُن چیزوں کے ساتھ جو غذا کے کام آتی ہیں اور ذخیرہ کر کے رکھی جاتی ہیں۔ یہ امام مالکؒ کا مذہب ہے۔

درہم و دینار کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ اور امام احمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ ان میں علت تحریم ان کا وزن ہے اور شافعیؒ و مالکؒ اور ایک روایت کے مطابق امام احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ قیمت اس کی علت ہے۔

مذاہب کے اس اختلاف سے جزئی معاملات میں حکم تحریم کا اجرا بھی مختلف ہوگیا ہے۔ ایک چیز ایک مذہب میں سرے سے سودی جنس ہی نہیں ہے اور دوسرے مذہب میں اس کا شمار سودی اجناس میں ہوتا ہے۔ ایک مذہب کے نزدیک ایک شے میں علت تحریم کچھ ہے اور دوسرے مذہب کے نزدیک کچھ اور۔ اس لیے بعض معاملات ایک مذہب کے لحاظ سے سود کی زد میں آ جاتے ہیں اور دوسرے مذہب کے لحاظ سے نہیں آتے۔ لیکن یہ تمام اختلافات ان امور میں نہیں ہیں جو کتاب وسنت کے صریح احکام کی رو سے ربوٰ کے حکم میں داخل ہیں، بلکہ ان کا تعلق صرف مشتبہات سے ہے اور ایسے امور سے ہے جو حلال و حرام کی درمیانی سرحد پر واقع ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان اختلافی مسائل کو حجت بنا کر ان معاملات میں شریعت کے احکام کو مشتبہ ٹھہرانے کی کوشش کرے جن کے سود ہونے پر نصوص صریحہ وارد ہو چکی ہیں، اور اس طریق استدلال سے رخصتوں اور حیلوں کا دروازہ کھولے اور پھر ان دروازوں سے بھی گزر کر امت کو سرمایہ داری کے راستوں پر چلنے کی ترغیب دے وہ خواہ اپنی جگہ نیک نیت اور خیر خواہ ہی کیوں نہ ہو، حقیقت میں اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جنھوں نے کتاب وسنت کو چھوڑ کر ظن وتخمین کی پیروی کی، خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

جانوروں کے مبادلے میں تفاضل

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہم جنس اشیا کے مبادلے میں تفاضل کی ممانعت کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے جانور مستثنیٰ ہیں۔ ایک ہی جنس کے جانوروں کا مبادلہ ایک دوسرے کے ساتھ تفاضل کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کیا ہے اور آپؐ کے بعد صحابہؓ نے بھی کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جانور اور جانور میں قدر و قیمت کے اعتبار سے بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک معمولی قسم کا گھوڑا اور ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا جو ریس میں دوڑایا جاتا ہے ان کی قیمتوں میں اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک جانور کا تبادلہ اسی جنس کے سو جانوروں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

سوال وجواب

بنک میں رقم رکھوانے کی جائز صورت

سوال: بینک میں رقم جمع کرنے کے معاملے میں میرا سوال یہ ہے کہ اگر میں سیونگ اکاؤنٹ میں رقم جمع کراتا ہوں تو بینک اس پر سود دے گا۔ لیکن اگر کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرائی جائے تو اگر چہ اس پر مجھے سود نہیں ملے گا مگر بینک اس رقم کو سودی کاروبار میں استعمال کرے گا۔ گویا میری رقم پر بینک تو سود لے گا۔ اس کے بجائے میں یوں کیوں نہ کروں کہ سیونگ اکاؤنٹ میں رقم جمع کراؤں اور اس پر جو سود مجھے ملے اسے حاجت مندوں کی ضروریات پر صرف کروں؟ وہ سود بینک کیوں کھائے؟ کسی ضرورت مند کی ضرورت کیوں نہ پوری کردی جائے؟ اس معاملے میں میری رہنمائی فرمائی جائے۔

جواب: روپیہ اگر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھا جائے تو اس پر کوئی سود نہیں لگتا اور بینک کے لیے کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم اپنے کاروبار میں استعمال کرنا خلاف قاعدہ ہے۔ اب اگر وہ اسے سودی کاروبار میں استعمال کرتا ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے کیونکہ ہم تو اس کے پاس حفاظت کے لیے اپنا روپیہ رکھتے ہیں نہ کہ سودی کاروبار کے لیے۔ اس کے برعکس اگر آپ اپنا روپیہ کسی ایسی مد میں جمع کراتے ہیں جس پر آپ کو سود ملتا ہے اور مقصد آپ کا یہ ہوتا ہے کہ اس سود کو غریبوں کی مدد کے لیے استعمال کریں تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک شخص لوگوں کی جیبیں اس غرض کے لیے کاٹے کہ اس سے جو روپیہ ملے گا اس کو وہ غریبوں کے لیے استعمال کرے گا۔

(رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۲۳۸-۲۳۹۔ اشاعت چہارم اپریل ۹۸۸)

(بحوالہ ترجمان القرآن، اگست ۱۹۷۶ء)

کیا سود کے بغیر معاشی تعمیر ممکن ہے؟

سوال: موجودہ زمانے میں جبکہ تجارتی کاروبار، بلکہ پوری معاشی زندگی سود کے بل پر چل رہی ہے اور اس کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں سود رچ بس نہ گیا ہو۔ کیا سود کا استیصال عملاً ممکن ہے؟ کیا سود کو ختم کر کے غیر سودی بنیادوں پر معاشی تعمیر ہو سکتی ہے؟

جواب: اگر کوئی مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ سود ایک ناگزیر شے ہے اور موجودہ زمانے میں اس کے بغیر کوئی کام ہی نہیں چل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سکتا، تو میرے نزدیک اس کا یہ خیال بالکل باطل ہے۔ یہ خیال نہ صرف اصولاً غلط ہے بلکہ یہ اس خدا کے بارے میں سوئے ظن ہے جس کے بارے میں ہمارا ایمان ہے کہ اس نے کسی ایسی چیز سے ہمیں نہیں روکا ہے جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہو اور جس کے بغیر دنیوی کاروبار چل ہی نہ سکتا ہو۔ لیکن میں صرف اتنا ہی جواب دینے پر اکتفا نہیں کروں گا بلکہ یہ عرض کروں گا کہ خود موجودہ دور میں معاشی اصول ونظریات بھی اس طرف جارہے ہیں کہ سود کی شرح کو کم سے کم حتیٰ کہ صفر کی حد تک پہنچا کر اسے ختم کردیا جائے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اکثر ممالک میں شرح سود تیز رفتاری سے گر رہی ہے اور دنیا اس مقام کے قریب تر پہنچنے کی کوشش کررہی ہے جہاں سود سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ مجھے یہاں اس بارے میں تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اپنی کتاب ''سود'' میں اس موضوع پر مفصل بحث کر چکا ہوں۔

اسلامی حکومت اسے کیسے حل کرسکتی ہے

البتہ میں یہاں مختصراً یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ایک اسلامی حکومت اس مسئلے کو عملاً کیسے حل کرسکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ملک کے اندر سود کو بند کردیا جائے۔ اس کے بعد دوسرے قدم کے طور پر بیرونی تجارت میں سود ختم کرنے کے لیے جدوجہد کی جائے۔ ملک کے اندر حکومت سودی لین دین کو قانوناً ناجائز قرار دے اور خود بھی سود کا لینا اور دینا ترک کردے۔ کوئی عدالت سود کی ڈگری نہ دے۔ کوئی شخص اگر سودی کاروبار کرے تو اسے فوجداری جرم کا مجرم گردانا جائے۔ جب تک آغاز ہی میں ایسے فیصلہ کن اقدامات نہیں کیے جائیں گے، اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں پیدا ہوسکے گا کہ کوئی ایسا مالیاتی نظام قائم ہو جو سود سے خالی ہو۔ اس حقیقت کو مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک حکومت اگر ایک طرف ریل کے سفر کے لیے ٹکٹ کو ضروری قرار دے دے اور دوسری طرف بغیر ٹکٹ کے سفر کے لیے بھی گنجائش باقی رہنے دے تو ٹکٹ لینے والے مسافر تھوڑے ہی نکلیں گے۔ لیکن اگر بلاٹکٹ کا سفر فوجداری جرم ہو تو کوئی آدمی جو ٹکٹ نہیں لیتا ریل میں جانے کی جرأت نہیں کرسکے گا۔ اسی طرح جب تک ہمارے ملک میں سود قانوناً حلال ہے، جب تک سودی لین دین کی اجازت ہے، جب تک ہماری حکومت خود سود لیتی اور دیتی ہے، جب تک ہماری عدالتیں سود کی ڈگریاں نافذ کرتی ہیں، اس وقت تک اس بات کا کوئی قطعی امکان نہیں ہے کہ حکومت یا کوئی دوسرا ادارہ کوئی ایسا بینکنگ سسٹم چلانے میں کامیاب ہو جو سود خواری کے بجائے حصہ داری کے اصولوں پر قائم کیا گیا ہو۔ البتہ اگر سودی بنک کاری کو پہلے قانوناً حرام کردیا جائے تو ہمیں پوری توقع ہے کہ حصہ داری کے اصول پر ایسا سسٹم نشوونما پاسکتا ہے۔ حصہ داری سے ہماری مراد یہ ہے کہ نفع ونقصان میں تمام حصہ دار برابر کے شریک ہوں۔ داخلی طور پر سودی بندش کے بعد خارجی لین دین میں بھی اس سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے ان شاء اللہ کسی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آئے گی بلکہ دوستانہ طریق پر تجارتی تعلقات قائم رکھتے ہوئے بھی دوسرے ممالک کو اس پر رضامند کیا جاسکتا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ چہارم ص ۱۴۷ تا ۱۴۹۔ اشاعت اول)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دارالکفر میں سود خواری

سوال: ایک متدین بزرگ جو ایک یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر بھی ہیں اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

''جو تاجر یا زمیندار گورنمنٹ کو ٹیکس یا لگان دے رہے ہیں، اگر وہ ڈاک خانے یا امپیریل بنک میں روپیہ جمع کر کے گورنمنٹ سے سود وصول کریں تو ان کو بقدر اپنے ادا کردہ ٹیکس ولگان کے گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے۔''

ایک دوسرے مشہور و معروف عالم دین اس سے آگے قدم رکھ کے فرماتے ہیں:

''قرآن، حدیث، اجماع، قیاس، الغرض کسی بھی شرعی دلیل سے حربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت کوئی صاحب پیش کر سکتے ہوں تو کریں۔'' ...... افسوس کہ علمائے اسلام نے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، ورنہ ادھر ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے، غالباً یہ صورت حال نہ ہوتی۔ ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ سود لیتا رہا اور دوسرا طبقہ سود دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں، بلکہ زیادہ تر علما پر اس لیے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت کا علاج موجود تھا لیکن انھوں نے ایک جز پر عمل کیا اور دوسرے کو ترک کر دیا۔

علمائے کرام کی ان بحثوں نے ہم کو اس تذبذب میں ڈال دیا ہے کہ سود سے اجتناب کی جس روش پر ہم اب تک قائم ہیں کہیں وہ غلط تو نہیں ہے۔ یہ تو عجیب معاملہ ہوگا کہ ایک طرف تو ہم آخرت ہی کے اجر کی امید پر دنیا میں نقصان اٹھائیں اور دوسری طرف آخرت میں جا کر ہم کو یہ جواب مل جائے کہ تمھارا سود سے اجتناب کسی شرعی حکم کے مطابق نہ تھا، لہٰذا تم کسی اجر کے مستحق نہیں ہو۔

جواب: سود کی حرمت قرآن اور حدیث کی قطعی نصوص سے بالتصریح ثابت ہے، فقہ کی کوئی اصطلاحی بحث ان نصوص کی ناسخ نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا آپ اطمینان رکھیں کہ علما کے ان ارشادات کے باوجود آخرت میں آپ کا اجر محفوظ ہے۔

قانون کی پیچیدہ بحثوں سے قطع نظر کر کے اگر ہم ایک سیدھے سادے مسلمان کے نقطۂ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیں تو بداہتہً یہ بات ہماری سمجھ میں آتی ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام دین و اخلاق اور تمدن و تہذیب کے اُن اصولوں کی علمبرداری کرنا ہے جنھیں خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں حق کہا گیا ہے اور دنیا سے ان خیالات اور طریقوں کو مٹانے کی کوشش کرنا ہے جنھیں قرآن اور سنت نے باطل ٹھیرایا ہے۔ جس سرزمین میں باطل کا غلبہ ہو اور احکام کفر جاری ہو رہے ہوں وہاں ہمارا کام باطل کے طریقوں کو اختیار کر لینا نہیں ہے بلکہ ہمارا اصلی منصب یہ ہے کہ ہم وہاں رہ کر قرآن کے قانونِ حیات کی تبلیغ کریں اور نظامِ کفر کی جگہ نظامِ اسلامی قائم کرنے کے لیے ساعی ہوں۔ اب غور کیجیے کہ اگر ہم خود سود کھائیں گے تو کفار کی سود خواری کے خلاف آواز کس منہ سے اٹھائیں گے؟ کفار اگر ناجائز طریقوں سے ہمارے اموال لے رہے ہیں یا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

حکومتِ کفر ہمارے اموال سے اگر بلا استحقاق [یعنی خدا کی سند پر مبنی حق کے بغیر] کوئی حصہ لے اڑتی ہے تو ہمارے لیے یہ کیسے روا ہوسکتا ہے کہ ہم ان اموال کو واپس لینے کے لیے ویسی ہی ناجائز کارروائیاں کرنے لگیں اور کسب حرام کو اپنا حق واپس لینے کا ذریعہ بنائیں؟ اس طرح تو سود خواری کے ساتھ شراب فروشی، مزامیر سازی، فحش فلم بنانا، عصمت فروشی، کاروبار رقص و سرود، بت تراشی، فحش نگاری، سٹہ بازی، جوئے بازی اور سارے ہی حرام کاموں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ پھر یہ فرمایئے کہ ہم میں اور کفار میں وہ کون سا اخلاقی فرق باقی رہ جاتا ہے جس کے بل پر ہم دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرسکیں؟

اصل میں مسئلے کی صورت یہ ہے کہ حکومتِ کفر کے آئین کی رو سے تو یقیناً آپ یہ سارے ڈھنگ اختیار کرنے میں حق بجانب ہیں، لیکن شریعت اسلام کی رو سے آپ پر یہ سب حرام ہیں۔ اگر آپ شریعتِ اسلام کے پیرو ہیں تو آپ حکومتِ کفر کے آئین کی ڈھیل سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں رکھتے اور اگر آپ ایک طرف دنیا کو شریعتِ اسلامی کی دعوت دیتے ہیں اور دوسری طرف کچھ فائدوں کے لیے یا کچھ نقصانات سے بچنے کے لیے حرام خوری کی ان گنجائشوں سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں جو آئین کفر نے دی ہیں مگر آئین اسلام نے جن کی سخت مذمت کی ہے تو چاہے فقیہ شہر آپ کے اس طرزِ عمل کے جواز کا فتویٰ دے دے۔ لیکن عام انسانی رائے اتنی بیوقوف نہیں ہے کہ پھر بھی وہ آپ کی تبلیغ کا کوئی اخلاقی اثر قبول کرے گی۔

حقیقتاً اس طرزِ فکر کو فقہِ اسلامی میں استعمال کرنا ہی غلط ہے کہ مسلمانوں کو فلاں تکلیف اور فلاں نقصان جو حکومتِ کفر کے تحت رہتے ہوئے پہنچ رہا ہے اسے روکنے کے لیے نظامِ باطل ہی کے اندر کچھ شرعی وسائل پیدا کیے جائیں۔ یہ طریق فکر مسلمانوں کو بدلنے کے بجائے اسلام کو بدلتا ہے، یعنی تجدید دین کی جگہ تجدد کا دروازہ کھولتا ہے جو نظامِ دینی کے لیے حد درجہ تباہ کن ہے اور افسوس یہ ہے کہ غلبۂ کفر کے زمانے میں فتویٰ نویسی کچھ اسی راہ پر چلتی رہی ہے۔ اس طریقے نے مسلمانوں کو نظامِ باطل کے اندر راضی اور مطمئن زندگی بسر کرنے کا خوگر بنا دیا ہے، حالانکہ یہ دین حق کے عین منشا ہی کے خلاف ہے۔ ہم اس طرزِ فکر کو ہرگز گوارا نہیں کرسکتے، خواہ کیسے ہی بڑے بڑے علما اس کے حامی ہوں۔ نظامِ باطل کے تحت مسلمانوں کے لیے تکلیف اور نقصان کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ اس تکلیف اور نقصان کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اس نظام کو بدلنے کے لیے جدوجہد کریں، نہ یہ کہ کفر کے زیر سایہ کسی قدر سہولت سے جینے کے لیے شریعت کو موافقِ حال بنائیں۔[1]

[رسائل و مسائل حصہ اول ص ۱۵۰ تا ۱۵۵۔ اشاعت اول ستمبر ۵۱ء

(بحوالہ ترجمان القرآن رمضان ۶۵ھ اگست ۴۶ء]

حرام کو حلال کرنے کے لیے حیلہ سازی

س: زید پر حکومت کی طرف سے ناجائز ٹیکس واجب الادا ہیں۔ وہ انھیں مجبوراً ادا کرتا ہے۔ زید نے اس نقصان کی تلافی

۱۔ اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ کتاب سود از مصنف۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کا یہ حیلہ سوچا ہے کہ اس کا جو روپیہ بینک یا ڈاک خانے میں ہے اس پر وہ سود وصول کر لے۔ کیا ایسا کرنا صحیح ہے؟

ج: اس طرح کے بہانوں سے سود لینا جائز نہیں ہے، بلکہ دوہرا گناہ ہے۔ اگر بالفرض حکومت کا کوئی ٹیکس ناجائز نوعیت کا ہے اور آپ اسے بکراہت دیتے ہیں تو یہ ایک ظلم ہے جو حکومت آپ پر کر رہی ہے لیکن جو سود آپ حکومت کے بینک یا ڈاک خانے سے وصول کریں گے وہ حکومت اپنی جیب سے نہیں لاتی بلکہ لوگوں سے ٹیکس یا سود کی شکل میں حاصل کرتی ہے اور کچھ اپنے پاس رکھ کر بقیہ اُن لوگوں کو دیتی ہے جو اس کے پاس اپنا سرمایہ جمع کراتے ہیں۔ یہ سود اس سے وصول کر کے آپ نے حکومت کو کیا سزا دی؟ یہ سزا تو آپ نے دوسرے شہریوں کو دی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک شخص نے اگر آپ کا مال چرایا، آپ سزا دینے کے لیے نکلے اور اس کے گھر میں دوسروں کا جو مال رکھا ہے اُس میں سے کچھ نکال لائے۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۶۱-۲۶۲۔ اشاعت تیرھویں ۱۹۸۲ھ)

(بحوالہ ترجمان القرآن، شعبان، رمضان ۱۳۷۲ھ، مئی، جون ۱۹۵۳ء)

سود اور زمین کے کرائے میں فرق

س: روپے کے سود اور زمین کے کرائے میں کیا فرق ہے؟ خاص کر اس صورت میں جب کہ دونوں سرمائے کے عناصر ترکیبی (Units of Capital) ہیں۔ مثال کے طور پر ایک صد روپیہ پانچ روپے سالانہ کی شرح سود پر لگایا جائے یا ایک بیگھہ زمین پانچ روپے سالانہ لگان پر، آخر ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ دونوں حالتوں میں یہ معاملہ مشتبہ ہے کہ فریق ثانی کو نفع ہوگا یا نقصان۔ سرمایہ کار (Lender) کو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ صاحب زر صاحب زمین نفع و نقصان سے بالکل بے نیاز رہتا ہے۔

ج: زمین کے کرائے کی جو شکل میرے نزدیک جائز ہے اس کی تشریح میں مسئلہ ملکیت زمین[1] میں کر چکا ہوں۔ اسے نگاہ میں رکھ کر سوچیے کہ اس میں اور سود میں کیا فرق ہے۔ کرایہ جن چیزوں کا لیا جاتا ہے وہ ایسی چیزیں ہیں جو کرایہ دار کے استعمال سے کچھ نہ کچھ ٹوٹتی پھوٹتی یا خراب ہوتی ہیں اور جن کا اپنی اصلی حالت میں مالک کو واپس ملنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس کلیہ کا اطلاق جس طرح فرنیچر، مکان، موٹر وغیرہ پر ہوتا ہے اسی طرح زمین پر بھی ہوتا ہے خواہ اسے لے کر کوئی شخص بھٹہ لگائے، کوئی اسٹال لگائے یا کسی اور طریقے سے استعمال کرے۔ لیکن روپیہ تو محض ایک قوتِ خرید کا نام ہے، اسے اگر کوئی شخص مستعار لے تو اس کے ٹوٹنے پھوٹنے یا گھسنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسے قرض لینے والا جوں کا توں لوٹا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غلہ قرض لے تو جتنا غلہ لیا ہے اتنا ہی وہ واپس دے سکتا ہے۔ غلے کی مقدار جو دراصل قرض لی گئی ہے کوئی گھسنے یا خراب ہونے والی چیز نہیں ہے۔

۱۔ مصنف کی کتاب مسئلہ ملکیت زمین ملاحظہ کر لی جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۹۸-۲۹۹۔ اشاعت تیرھویں مارچ ۱۹۸۲)

(بحوالہ ترجمان القرآن۔ ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۳۷۰ھ۔ جنوری، فروری ۱۹۵۱ء)

غیر سودی معیشت میں حکومت کو قرض کی فراہمی کا مسئلہ

سوال: آج کل حکومت کو متعدد وجوہ سے جس وسیع پیمانے پر قرض کی ضرورت ہوتی ہے اس کے پیش نظر صرف اخلاقی اپیل پر انحصار نہ کر کے اصحاب سرمایہ کو قرض دینے کے لیے کچھ محرکات فراہم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ غیر سودی معیشت میں جو لوگ حکومت کو قرض کے طور پر سرمایہ فراہم کریں ان کو قرض دیئے ہوئے سرمایہ پر بعض محاصل میں تخفیف یا بعض محاصل سے استثناء کی رعایت دی جائے۔ مثلاً آمدنی کا جو حصہ بطور قرض حکومت کو دیا جائے اس پر انکم ٹیکس کی شرح رعایتی طور پر کم کر دی جائے۔ یہ رعایت حکومت کے لیے قرض کی فراہمی میں مددگار ہوگی۔ نیز کیا یہ بھی ممکن ہے کہ جو سرمایہ جتنی مدت کے لیے حکومت کو قرض دیا گیا ہو اس سرمایہ پر اتنی مدت تک قرض دینے والے سے زکوٰۃ نہ وصول کی جائے؟

جواب: حکومت کو جو لوگ غیر سودی قرض دیں ان کو ٹیکسوں میں رعایت دینا تو میرے نزدیک جائز ہے، بشرطیکہ رعایت میں قرض کی مقدار کے لحاظ سے اضافہ نہ ہو، کیونکہ وہ اسے سود سے مشابہ بنا دے گا۔ رہی زکوٰۃ کی معافی، تو اس کے لیے کوئی دلیل جواز مجھے نظر نہیں آتی۔ اگر رضا کارانہ فوجی یا غیر فوجی خدمات کے بدلے میں نماز معاف ہو سکتی ہو تو غیر سودی قرض دینے کے بدلے میں زکوٰۃ بھی معاف ہو سکے گی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو دونوں دینی فریضوں کے معاملے میں نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بارہا جنگی اور دوسری ضروریات کے لیے لوگوں سے مالی امداد کی اپیل کی گئی، مگر کبھی کسی مدد کے بدلے میں بھی کوئی فریضہ ساقط نہیں کیا گیا، نہ کسی فریضہ میں تخفیف کی گئی۔ علاوہ بریں منافع بخش (Productive) اغراض کے لیے جو قرضے حکومتیں لیں ان سے حاصل ہونے والے منافع کو وہ ایک تناسب کے ساتھ ان لوگوں میں تقسیم کر سکتی ہے جنھوں نے ان کاموں کے لیے سرمایہ دیا ہو۔ یہ صورت اکثر حالات میں اس منافع سے زیادہ نفع آور ہوگی جس کے لالچ میں لوگ حکومت کو سودی قرض دیتے ہیں۔ اگر کسی خاص منصوبے کے لیے حکومت کوئی مالی مدد لوگوں سے لے تو جب تک یہ روپیہ اس کام میں لگا رہے۔ اس وقت تک اس منصوبے کی آمدنی کا ایک حصہ روپیہ دینے والوں کو ادا کیا جا سکتا ہے اور اگر عام قرض ہو جسے بہت سے منصوبوں میں استعمال کیا جانا ہو تو اسے بھی قرض کے بجائے مضاربت کے اصول پر لیا جائے اور جن کاموں میں یہ روپیہ استعمال ہو ان کی مجموعی آمدنی سے ایک متناسب منافع ان سب لوگوں کو دیا جائے جنھوں نے سرمایہ فراہم کیا ہے۔

[رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۲۰۰ تا ۲۰۲، اشاعت چہارم۔ بحوالہ ترجمان القرآن۔ جولائی ۱۹۶۷ء]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کیا قرض لی ہوئی رقم کی واپسی میں کمی وبیشی کی جاسکتی ہے

جناب میں نے دس سال پہلے ایک صاحب سے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے۔اب واپس کرنا چاہتا ہوں۔لیکن اس عرصے میں روپے کی قیمت میں بہت فرق پیدا ہوگیا ہے۔چونکہ روپے کی قیمت گر گئی ہے،اس لیے میں انھیں کچھ زیادہ رقم دینا چاہتا ہوں۔کیا میں ایسا کرسکتا ہوں۔

مولانا نے فرمایا'' اور اگر اس دوران میں روپے کی قیمت بڑھ جاتی تو کیا آپ انھیں کم رقم دیتے۔ان صاحب نے فوراً کہا'' نہیں جی، میں انھیں پوری رقم ہی دیتا۔'' مولانا نے فرمایا'' موجودہ صورت میں بھی آپ وہی رقم دیں جو آپ نے ان سے قرض لی تھی۔روپے کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کے سوال میں الجھیں گے تو سود کی حدود شروع ہوجائیں گی۔اس سے بچنا چاہیے۔

[۵ اے ذیلدار پارک جلد اول مرتبہ مظفر بیگ مطبوعہ البدر پبلی کیشنز طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۶۷]

کیا اللہ تعالیٰ سود دیتا ہے؟

س:قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے قرض کا مطالبہ کیا ہے اور اس کی واپسی کی تعداد کو معین نہیں کیا۔البتہ اسے زیادہ کر کے دینے کا وعدہ کیا ہے۔کیا قرض کے بدلے میں یہ زیادہ دینے کی نوعیت سود کی نہیں جب کہ سود لینا اور دینا حرام ہے؟

ج:اس کا جواب یہ ہے کہ'' سود'' تو معمولی چیز ہے۔اللہ تعالیٰ تو اس سے بھی زیادہ سخت کام کرتا ہے۔مثلاً وہ معصوم بچوں کو ماردیتا ہے یا ایسے لوگوں کو ماردیتا ہے جن کے پیچھے چھوٹے چھوٹے یتیم بچے رہ جاتے ہیں۔یہ سب کام اس بنا پر آپ کے لیے بھی حلال ہوجائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ایسا کرتا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے کچھ لے کر اس کے بدلے میں انھیں بہت زیادہ عطا کرتا ہے تو اسے ہی تو اس کا حق پہنچتا ہے۔یہ اگر'' سود'' ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔دوسرے لوگوں کے لیے سود اس بنا پر حلال نہیں ہوجاتا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے قرض لے کر اس سے کہیں زیادہ لوٹانے کا وعدہ کیا ہے اس لیے یہ دوسروں کے لیے بھی حلال ہونا چاہیے۔اگر یہی دلیل کافی سمجھی جائے تو پھر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اس کے کیا نتائج رونما ہوتے ہیں۔کیا آپ کسی کو قتل کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔کیونکہ اللہ بھی تو لوگوں کو مارتا ہے۔معلوم ہوا کہ یہ استدلال ہی غلط ہے۔اللہ تعالیٰ تو پوری پوری بستیوں کو مٹا دیتا ہے۔جہاز کے جہاز ڈبو دیتا ہے۔ہوائی جہاز پورے کے پورے اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔کیا یہ سب چیزیں بھی آپ کے لیے حلال ہوجائیں گی؟ کیا آپ بھی ان کاموں کی غائت سے اس طرح آگاہ ہیں جس طرح یہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔

(استفسارات اول ص ۱۰۵۔طبع اول)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب ہفتم

تجارت

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

تجارت

جائز طریقوں سے حلال روزی کمانے کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے پاک رزق کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر جس طرح (سورۃ مزمل ۷۳ : ۲۰) ایک ساتھ کیا ہے اور بیماری کی مجبوری کے علاوہ ان دونوں کاموں کو نماز تہجد سے معافی یا اس میں تخفیف کا سبب قرار دیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں جائز طریقوں سے روزی کمانے کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مامن جالب یجلب طعاما الی بلدمن بلدان المسلمین فیبیعه لسعر یومه الاکانت منزلته عنداللہ ثم قرأ رسول اللہ صلی اللہ علیه و اخرون یضربون فی الارض...... ’’جو شخص مسلمانوں کے کسی شہر میں غلہ لے کر آیا اور اس روز کے بھاؤ اسے بیچ دیا اس کو اللہ کا قرب نصیب ہوگا، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت پڑھی‘‘ (ابن مردویہ)۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا مامن حال یاتینی علیه الموت بعد الجهاد فی سبیل اللہ احب الی من ان یاتینی و انا بین شعبتی جبل التمس من فضل اللہ و قرأ هذه الآیة۔ ’’جہاد فی سبیل اللہ کے بعد اگر کسی حالت میں جان دینا مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے تو وہ یہ حالت ہے کہ میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہوئے کسی پہاڑی درے سے گزر رہا ہوں اور وہاں مجھ کو موت آ جائے، پھر انھوں نے یہی آیت پڑھی۔‘‘ (بیهقی فی شعب الایمان)۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۱۳۳-۱۳۴۔ المزمل حاشیہ ۲۳)

تسعیر (نرخ بندی) کے بارے میں اسلام کی پالیسی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں قیمتیں چڑھ گئیں۔ لوگوں نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپؐ قیمتیں مقرر فرما دیں۔ آپ نے جواب دیا:

ان السعر غلاؤہ ورخصه بیداللہ وانی اریدان القی اللہ ولیس لاحدعندی مظلمة یطلبنی بها

قیمتوں کا چڑھنا اور گرنا اللہ کے ہاتھ میں ہے [یعنی قدرتی قوانین کے تحت ہے] اور میں چاہتا ہوں کہ اپنے خدا سے ملوں تو اس حال میں ملوں کہ کوئی شخص میرے خلاف ظلم و بے انصافی کی شکایت کرنے والا نہ ہو۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد آپؐ نے مسلسل اپنے خطبوں میں، بات چیت میں، اور لوگوں سے ملاقاتوں میں یہ فرمانا شروع کیا کہ:

الجالب مرزوق والمحتكر ملعون

ضروریاتِ زندگی کو بازار میں لانے والا خدا سے رزق اور رحمت پاتا ہے اور ان کو روک رکھنے والا خدا کی لعنت کا مستحق ہوتا ہے۔

من احتكر طعاما اربعين يوما يريد به الغلاء فقد برئ من الله و برئ الله منه

جس نے چالیس دن تک غلہ روک کر رکھا تاکہ قیمتیں چڑھیں تو اللہ کا اس سے اور اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔

بئس العبد المحتكر ان ارخص الله الاسعار حزن وان اغلاها فرح

کتنا برا ہے وہ شخص جو اشیائے ضرورت کو روک کر رکھتا ہے۔ ارزانی ہوتی ہے تو اس کا دل دکھتا ہے۔ گرانی بڑھتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔

من احتكر طعاما اربعين يوما ثم تصدق به لم يكن له كفارة

جس نے چالیس دن تک غلے کو روک رکھا پھر اگر وہ اس غلے کو خیرات بھی کر دے تو اس گناہ کی تلافی نہیں کرے گا جو ان چالیس دنوں کے دوران میں وہ کر چکا ہے۔

یہ شان ہے اُس حکمران کی جس کی حکومت اخلاقِ فاضلہ کی بنیادوں پر قائم ہو۔ اُس کی اصل قوت پولیس اور عدالت اور کنٹرول اور آرڈی نینس نہیں ہوتے بلکہ وہ انسانوں کے قلب و روح کی تہوں میں برائی کی جڑوں کا استیصال کرتا ہے، نیتوں کی اصلاح کرتا ہے، خیالات اور ذہنیتیں بدلتا ہے، معیارِ قدر بدلتا ہے اور لوگوں سے رضاکارانہ اپنے ان احکام کی پابندی کراتا ہے جو بجائے خود صحیح اخلاقی بنیادوں پر مبنی ہوتے ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۳۶۸ تا ۳۷۰۔ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن۔ رجب شوال ۶۳ھ۔ جولائی اکتوبر ۴۴ء)

(تخریج: تفہیم الاحادیث ج ۷ ص ۴۵-۴۶)

سیپ اور دلالی کی شرعی حیثیت

سوال: ہر گاؤں میں عموماً ایک لوہار اور ایک بڑھئی ضرور ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے زمیندار کام لیتے ہیں اور معاوضہ نقد ادا نہیں کرتے، نہ تنخواہ دیتے ہیں، بلکہ فصل کے فصل ایک مقررہ مقدار غلہ کی انھیں دے دی جاتی ہے۔ اس صورت معاملہ کو "سیپ" کہا جاتا ہے۔ زمیندار لوگ جب کبھی لوہے یا لکڑی کا کوئی سامان خریدنا چاہتے ہیں تو اپنے لوہار یا بڑھئی کو اپنے ساتھ شہر لے جاتے ہیں تاکہ وہ اچھا مال خرید وا دے۔ یہ لوہار یا بڑھئی بعض کارخانوں اور دکانوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں اور وہاں سے سامان خریدواتے ہیں اور ہوتا یوں ہے کہ یہ لوگ دکان پر جاتے ہی آنکھوں کے اشاروں سے دلالی کی فیس دکاندار سے طے کر لیتے ہیں جس سے زمیندار بے خبر رہتا ہے۔ اگر دکاندار لوہار یا بڑھئی کی دلالی کا کمیشن ادا نہ کرے تو پھر وہ کبھی بھی اپنے زمینداروں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو اس کی دکان پر نہ لائے گا بلکہ کسی دوسری جگہ ساز باز کرے گا اور جو دکانداران کا کمیشن دینے پر راضی ہو وہ خراب مال بھی اگر دکھائے تو یہ خاص قسم کے دلال اس کی تعریف کریں گے اور اسے بکوانے کی کوشش کریں گے۔ یہ سازش اگر زمیندار پر آشکارا ہو جائے تو وہ اپنے بڑھئی یا لوہار کو ایک دن بھی گاؤں میں نہ رہنے دے۔ یہ صورتِ معاملہ کیسی ہے؟

جواب: ''سیپ'' معاملہ کی ایک ایسی شکل ہے جو دیہاتی زندگی میں ''معروف'' کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، اس لیے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس میں بیگار کا عنصر شامل نہ ہونے پائے۔ یعنی فی الواقع جن لوگوں سے جتنی خدمت لی جائے ان کو اس کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے۔ مقررہ خدمات سے زائد کوئی کام لینا ہو تو اس کا حق الگ اسے دینا چاہیے۔ محض زمینداری کی دھونس میں لوگوں سے بے جا خدمت لینا ظلم ہے۔

دلالی کی جو شکل آپ نے لکھی ہے اس کے ناجائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہو سکتا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دراصل زمینداروں کی زیادتی کا نتیجہ ہے۔ پیشہ ور لوگ محض ان کے دباؤ سے مجبوراً اپنے کام کاج کا ہرج کر کے ان کے ساتھ مال خریدوانے جاتے ہیں اور اس کا معاوضہ دکانداروں سے گویا اس قرارداد پر وصول کرتے ہیں کہ اگر تم ہمیں کمیشن دیتے رہو گے تو ہم تمھارا برا مال بھی ان زمینداروں کے ہاتھ بکوا دیں گے۔ اس طرح یہ مال فروخت کرنے والا اور دکاندار اور ان کے ساتھ زمیندار بھی، تینوں ایک ایک قسم کے اخلاقی جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر زمیندار ان لوگوں سے مفت کی خدمت لینا چھوڑ دیں اور انصاف کے ساتھ ان کا حق المحنت انھیں دیا کریں تو یہ بداخلاقی رونما نہ ہو۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۴۰۵ تا ۴۰۷۔ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

آڑھت

سوال: آڑھت کی شرعی پوزیشن کیا ہے؟ آڑھتی کے پاس دو قسم کے بیوپاری آتے ہیں۔ پہلی قسم کے بیوپاری اپنے سرمایہ سے کوئی جنس خرید کر لاتے ہیں اور آڑھتی کی وساطت سے فروخت کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے بیوپاری وہ ہوتے ہیں جو کچھ معمولی سا سرمایہ اپنا لگاتے ہیں اور بقیہ آڑھتی سے اس شرط پر قرض لیتے ہیں کہ اپنا خریدا ہوا مال اسی آڑھتی کے ہاتھ فروخت کریں گے اور بوقت فروخت مال آڑھتی کا روپیہ بھی ادا کریں گے۔ آڑھتی پہلی قسم کے بیوپاریوں سے اگر ایک پیسہ فی روپیہ کمیشن لیتا ہے تو اس دوسری قسم کے بیوپاریوں سے دو پیسہ فی روپیہ لے گا۔ یہ صورت حرام ہے یا جائز؟

جواب: یہ فرق جو آڑھتی اپنے کمیشن میں رکھتا ہے، غلط ہے۔ قرض لینے والے سے دو پیسہ اور قرض نہ لینے والے سے ایک پیسہ فی روپیہ آڑھت لینا تو سود کی تعریف میں آ جاتا ہے۔ چاہیے یہ کہ قرض کا معاملہ الگ رہے اور مال کی فروخت کے لیے ایجنٹ کی حیثیت سے کمیشن لینا بالکل الگ رہے۔ البتہ یہ پابندی جائز ہو سکتی ہے کہ مارکیٹ ریٹ پر بیوپاری اپنا مال خاص اسی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آڑھتی کے ہاتھ لاکر فروخت کیا کرے جس کے روپے سے وہ کاروبار چلا رہا ہے۔

سوال: آڑھتی بائع اور خریدار سے کمیشن لینے کے علاوہ ایک حرکت یہ بھی کرتا ہے کہ مال کا سودا ہو جانے کے بعد اس میں سے کچھ ''مقدار'' چونگی کے نام سے لے لیتا ہے، مثلاً پھل ہوں تو ان میں سے چند دانے لے لے گا اور سبزی ہو تو اس میں اپنا حصہ لگائے گا۔ اس چونگی کی حیثیت کیا ہے؟

جواب: یہ چونگی لینا آڑھتی کی زیادتی ہے۔ وہ جب اپنا طے شدہ کمیشن لے چکا تو اب اسے اور کچھ لینے کا حق نہیں۔ حقیقت میں یہ ''دست درازی'' ہے جس کا ایک معصوم نام ''چنگی'' رکھ لیا گیا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۳۹۹ تا ۴۰۱۔ اشاعت اول ستمبر ۵۱ء)

تجارت میں ''عرف'' کی شرعی حیثیت اور اس کا حکم

سوال: چمڑے کے کاروبار میں کروم ایک ایسی چیز ہے جس پر فٹ کی پیمائش کا اندراج بہت غلط ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مال کلکتہ میں تیار ہوتا ہے۔ مال تیار کرنے والے تھان پر اصل پیمائش سے زائد فٹ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً دس فٹ کے تھان کو بارہ فٹ ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد کلکتہ کے تاجر یہ مال خریدتے ہیں اور کچھ اور فٹ بڑھا دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب باہر کے تاجر اُن سے مال خرید لے جاتے ہیں تو پھر وہ مزید فٹ بڑھاتے ہیں۔ یہاں آ کر تھان پر فٹوں کا پکا اندراج ہو جاتا ہے اور پھر آخر تک یہی اندراج قائم رہتا ہے۔ صحیح فٹ والا مال مارکیٹ میں نہیں ملتا۔ تقریباً سبھی کارخانے اور تاجر یہی کچا فٹ استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر گاہک اس صورت حال سے آگاہ ہوتے ہیں اور اس وجہ سے ہم پیمائش کی اس گڑبڑ کے متعلق کوئی توضیح نہیں کرتے۔ لیکن اگر کوئی گاہک پوچھے تو اسے صاف بتا دیتے ہیں کہ اس مال پر کچے (یعنی غلط) فٹوں کا نمبر لگا ہوا ہے۔ ہم اسی کچے فٹ کے حساب سے خریدتے ہیں اور اسی کے حساب سے منافع لگا کر فروخت کرتے ہیں۔ مثلاً ایک کچا فٹ اگر ۱۲/ میں آتا ہے تو ہم ایک کچے فٹ کے ۱۲/ لگائیں گے۔ شرعاً ایسے کاروبار کی کیا حیثیت ہے۔

جواب: تجارت میں جب یہ چیز معروف ہے، یعنی دکاندار اور خریدار سب اس بات سے واقف ہیں کہ کچے اور پکے اوزان یا پیمانوں میں کیا فرق ہے اور کون سی چیز پکے پیمانوں کے حساب سے ملتی ہے اور کون سی کچے پیمانوں کے حساب سے تو اس صورت میں یہ معاملہ جائز شمار ہوگا۔ لیکن یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے کہ گوناگوں اوزان اور پیمانے رائج رہیں۔ اس سے ناواقف لوگ نقصان اٹھاتے ہیں۔ ایک اچھے نظام حکومت کا فرض ہے کہ وہ تجارت کو ان ''اسرار نہاں'' سے پاک کرے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۴۰۷-۴۰۸۔ اشاعت اول ستمبر ۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن۔ رمضان ۶۵ھ۔ اگست ۴۶ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کاروباری مسائل

س: ایک درآمد کنندہ (Importer) غیر ممالک سے مال منگوانے کے لیے ۱۰ فی صدی پر بنک میں لیٹر آف کریڈٹ کھولتا ہے اور بعد میں اپنے اس بک کرائے ہوئے مال کو انھی شرائط کے مطابق جن شرائط پر اس نے خود مال بک کیا ہے، فروخت کر دیتا ہے یعنی دس فی صدی بیعانہ کے ساتھ۔

مذکورہ بالا شرائط میں سے ایک اہم اور واضح شرط یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر مال مذکور تحریر کردہ مدت کے اندر شپ (Ship) نہ ہوسکا، یا کسی ہنگامی حالت کی وجہ سے سرے سے سودا ہی منسوخ ہوگیا تو خریدار کو بیعانہ واپس لے کر معاملہ ختم کرنا ہوگا۔ [عملاً اسی طرح ہوتا ہے]

گویا مال شپ نہ ہونے کی صورت میں خریدار اس مال کے نفع ونقصان کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اگر مال بک ہوگیا تو مال کا بھگتان ہوتا ہے ورنہ دوسری صورت میں بیعانہ واپس اور سودا منسوخ۔ چاہے یہ سودا کئی جگہ پر فروخت ہو چکا ہو۔

اس طریق کار میں وہ کون سے نقائص اور خرابیاں ہیں جن کی بنا پر اسے شرعاً نادرست کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا لاکھوں روپے کا کاروبار قریباً ہر مہینے ہم کرتے ہیں اور اس الجھن میں پڑ گئے ہیں کہ یہ طریقہ درست بھی ہے یا نہیں۔ ایک ''صاحب علم'' کی رائے اس کے حق میں بھی ہے۔

ج: جس صورتِ معاملہ کو آپ دریافت کر رہے ہیں اس کی دو الگ الگ شکلیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ آپ نے ایک مال بنک کی معرفت بک کرایا اور بعد میں آپ کی اور ایک دوسرے تاجر کی باہمی قرارداد سے وہ بکنگ اس کے نام منتقل ہوگیا۔ یہ شکل اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ یہ بکنگ خواہ منافع کے ساتھ بیچی جائے یا محض ایک شخص سے دوسرے شخص کے نام منتقل ہو، بہر حال وہ ایک شخص کی طرف سے دوسرے شخص کی طرف پوری طرح منتقل ہو جائے۔ یعنی بنک میں لیٹر آف کریڈٹ شخص اول کے بجائے شخص ثانی کے نام پر کھل جائے اور شخص اول کا اس مال کے سودے سے کوئی تعلق باقی نہ رہے، اس کی ہر چیز کا ضامن شخص ثانی ہو، شخص اول کی کوئی ذمہ داری اس معاملہ کے ساتھ لگی نہ رہے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ اس مال کو بک کرانے کے بعد قبل اس کے کہ وہ یہاں پہنچے اور آپ کے قبضے میں آئے، آپ اسے اپنے مال کی حیثیت سے منافع پر دوسرے شخص کے ہاتھ بیچیں اور بیعانہ لے لیں۔ پھر دوسرا تیسرے کے ہاتھ، تیسرا چوتھے کے ہاتھ اسی غائب مال کو اپنا اپنا منافع لگا کر بیچتا اور بیعانہ لیتا چلا جائے۔ اس شکل میں خواہ شپ منٹ نہ ہوسکنے یا سودا منسوخ ہو جانے پر ایک شخص بیعانہ واپس کر دینے کا کفیل ہی کیوں نہ ہو اور خواہ ہر ایک نے یہ وعدہ ہی کیوں نہ کر لیا ہو کہ سودے کی منسوخی کی صورت میں کوئی بھی نفع ونقصان کا مطالبہ نہ کرے گا، بہر حال یہ خرید وفروخت شرعاً ممنوع ہے۔ اس کے ممنوع ہونے کی نقلی دلیل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لاتبع مالیس عندک (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)

کوئی ایسی چیز نہ بیچو جو فی الواقع تمھارے پاس موجود نہ ہو۔

اذا اشترت شیئا فلا تبعہ حتی تقبضہ (احمد)

جب تم کوئی چیز خریدو تو اسے اپنے قبضہ میں لینے سے پہلے آگے فروخت نہ کرو۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یشتری الطعام ثم یباع حتی یستوفی (احمد، مسلم)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع فرمایا کہ ایک شخص غلہ خریدے اور پورا پورا ناپ تول کر لینے سے پہلے اسے آگے کو فروخت کردے۔

کانوا یتبایعون الطعام جزافا باعلی السوق فنھا ھم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یبیعوہ حتی ینقلوہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

لوگ غلے کے ڈھیر منڈی میں کھڑے کھڑے خریدتے اور وہیں بیچ دیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ جب تک غلہ اس جگہ سے منتقل نہ کر دیا جائے آگے نہ بیچا جائے۔

ان احادیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک چیز کو خرید کر قبضے میں لیے بغیر بیچنا ممنوع ہے۔

اس کے ممنوع ہونے کی عقلی دلیل یہ ہے کہ اول تو اس طرح کی خرید و فروخت میں جھگڑے کے امکانات زیادہ ہیں۔ دوسرے اس میں بغیر کسی حقیقی تمدنی خدمت کے ایک شخص سے دوسرا شخص ایک غائب چیز کو اپنا منافع لگا لگا کر بیچتا اور خریدتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ صارفین (Consumers) تک پہنچتے پہنچتے اس چیز کی قیمت چڑھ کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ یہ بہت سے بچولیوں کی منافع خوری، بغیر اس کے کہ وہ واقعی کوئی خدمت اس مال کے پیدا کرنے یا فراہم کرنے میں انجام دیں خواہ مخواہ اشیا کی قیمتیں چڑھنے کی موجب بنتی ہے۔

س: میری دکان بساط خانہ (General Merchant) کی ہے۔ جنرل مرچنٹ کے ہاں ہر قسم کے سودے فروخت ہوتے ہیں خاص کر پوڈر، کریم، لپ اسٹک، نیل پالش، سینٹ، عطر، ریشمی بنیان، ٹوتھ برش، ٹوتھ پیسٹ، شیونگ سیٹ، سنگار دان، بچوں کے کھلونے، زیورات وغیرہ۔ کیا متذکرہ بالا چیزیں ناجائز ہیں، یا ان کو فروخت کرنا از روئے شریعت ممنوع ہے؟ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ تمام چیزیں تعیش میں مدد دیتی ہیں۔ لہٰذا یہ مسرفانہ فعل ہے۔ اس کو فروخت کرنے اور استعمال کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کیا یہ درست ہے؟

ج: بساط خانے میں جو چیزیں آپ فروخت کرتے ہیں [جن کی کچھ فہرست بھی آپ نے دی ہے] ان میں سے کوئی چیز فی نفسہ حرام نہیں ہے۔ ان کا استعمال جائز بھی ہوسکتا ہے اور ناجائز بھی۔ دکاندار کی حیثیت سے آپ پر یہ دیکھنا فرض نہیں ہے کہ کون ان چیزوں کو کس طرح استعمال کرے گا۔ آپ کے لیے صرف یہ بات کافی ہے کہ آپ کوئی حرام چیز فروخت نہ کریں۔ نہ بیع

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وشری میں حرام طریقے استعمال کریں۔

س: کیا شریعت نے نفع کی مقدار مقرر کی ہے؟ اگر ہے تو کیا؟ اور اگر نہیں ہے تو کہاں تک نفع لیا جا سکتا ہے؟ کیا دکاندار کو اس چیز کا اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز مارکیٹ کے لحاظ سے یا کسی دام پر فروخت کر سکے؟ [واضح رہے کہ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں بہت کم نفع ہوتا ہے، یا خرید کی قیمت یا کچھ کم پر فروخت کرنی پڑتی ہیں۔]

ج: شریعت نے نفع کے لیے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے۔ یہ تو عرف اور انصاف کے معروف تصور پر مبنی ہے کہ کس تجارت میں کتنا منافع واجبی ہے اور کتنا ناواجب۔

قابلِ فروخت اشیا پر عورت کی تصویر

س: موجودہ دور میں ہر کاروبار کو عورت کے اشتہار کے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔ الحمدللہ کہ میں اس لعنت سے بچا ہوا ہوں، لیکن جو چیزیں ولایت سے آتی ہیں یا ملک و قوم کے لوگ تیار کرتے ہیں ان پر عورت کی تصویر مختلف ہیئتوں (Poses) میں نمایاں رہتی ہے۔ لیبل کو پھاڑ دینے سے چیز کو فروخت کرنا مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ بعض دوست شکایت کرتے ہیں کہ تم تصویروں کی خرید و فروخت کرتے ہو اور یہ حرام ہے۔

ج: جو چیزیں دکاندار کی حیثیت سے آپ باہر سے منگواتے ہیں یا ملک کے صناعوں سے خریدتے ہیں ان پر اگر عورتوں کی تصادیر ہوں تو یہ چیز اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ آپ پر ان چیزوں کی خرید و فروخت حرام ہو جائے۔ آپ قصداً یہ تصویریں ان اشیا پر خود نہیں لگاتے ہیں اور نہ آپ کی فرمائش پر یہ کارخانوں میں لگائی جاتی ہیں۔ یہ تو ایک بلوائے عام ہے جس میں ہم سب مجبوراً مبتلا ہو رہے ہیں۔ معترضین کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ اس طرح آپ تصویروں کی خرید و فروخت کرتے ہیں۔ دراصل آپ تصویریں خریدتے اور بیچتے نہیں ہیں بلکہ وہ چیزیں خریدتے اور بیچتے ہیں جن پر کارخانہ داروں نے دنیا کی بگڑی ہوئی ریت کی بنا پر تصویریں چپکا رکھی ہیں۔

س: کیا شریعت نے سودے کو ایک دام پر فروخت کرنے کی قید لگائی ہے؟ اگر نہیں تو مول بھاؤ چکانا درست ہے؟

ج: سودے کو ایک دام پر بیچنا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ خریدار سے بات چیت کر کے آپ کم و بیش پر بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ مگر جھوٹ بولنا اور جھوٹی قسمیں کھانا جائز نہیں۔ خریدار کو یہ یقین دلانے کی کوشش نہ کیجیے کہ یہ مال اتنے کو خریدا ہے، درآنحالیکہ وہ اس سے کم میں آپ کو پڑا ہو، یا یہ کہ اس میں آپ کو کوئی نفع نہیں بچتا، درآنحالیکہ اس میں نفع بچتا ہو۔

بے پردہ عورتوں کا دکان پر آنا

س: دکان پر بے پردہ عورتیں آتی ہیں اور نیم نقاب پوش بھی۔ اسلام کا حکم ہے کہ عورت پر دوسری نظر پڑے تو انسان گناہ کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مرتکب ہوتا ہے۔ یہاں ان سے گفتگو تک کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں کو دکان پر نہ آنے دیا جائے تو یہ بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ اس ماحول میں تو اکثریت ایسی عورتوں کی ہے جو مردوں کے بدلے شاپنگ کرتی ہیں۔

ج: عورتیں اگر بے پردہ آپ کی دکان پر آئیں تو انھیں آنے سے روکنا یا ان کے ہاتھ مال بیچنے سے انکار کرنا آپ پر فرض نہیں ہے البتہ آپ کا فرض یہ ہے کہ غض بصر سے کام لیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کریں۔ ان کے حسن و آرائش سے یا ان کی گفتگو سے لذت لینے کی کوشش نہ کریں۔ تقویٰ کی اسی ایک ذرا سی شق پر آپ عامل ہو جائیں تو ان شاء اللہ اپنی دکان پر بیٹھے بیٹھے آپ کو درجۂ ولایت حاصل ہو جائے گا۔ تنہا یہی مجاہدہ بہت سے خانقاہی مجاہدوں پر بھاری ہے۔ (رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۳۰۴ تا ۳۱۰۔ اشاعت تیرھویں مارچ ۱۹۸۲۔ بحوالہ ترجمان القرآن رمضان ۱۳۷۰ھ جولائی ۱۹۵۱ء)

مزید کاروباری مسائل

س: ہمیں کاروباری معاملات میں چند ایسی صورتوں سے سابقہ پڑتا ہے کہ جن کے بارے میں پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ براہِ کرم کتاب و سنت کے علم کی روشنی میں ان معاملات کی حقیقت واضح فرمائیں۔

(۱) زمیندار یا دیہات کے بیوپاری کپاس کا وزن، نوعیت (Quality) جس مدت میں وہ مال پہنچا دیں گے، اور نرخ طے کر کے سودا کر جاتے ہیں۔ کچھ پیشگی بھی دے دی جاتی ہے۔ زبانی یا تحریری یہ سب کچھ طے ہو جاتا ہے۔ مال نہیں دیکھا جاتا اور نہ یہ ممکن ہے۔ انھی شرائط پر ہم کارخانہ دار کو جتنا مال کپاس ہم نے خریدا ہوتا ہے مقررہ مدت کے اندر ہم دینا طے کر لیتے ہیں مگر عموماً کارخانہ دار پیشگی نہیں دیتے۔

(۲) بعض اوقات جبکہ ہم نے کوئی مال خریدا ہوا (یعنی کسی مال کا سودا ابھی نہیں کیا ہوتا) نہیں ہوتا پیشگی ہی کارخانہ دار کے ساتھ مال کی کوالٹی، وزن، نرخ وغیرہ لکھ کر اور مدت طے کر کے سودا کر لیتے ہیں، بعد میں مال خرید کر بھگتان کر دیتے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں نرخ پہلے مقرر کر لیا جاتا ہے۔

(۳) کارخانہ دار کو مال بغیر نرخ مقرر کرنے کے سپلائی کر جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ طے کر لیتے ہیں کہ ہم دو صد یا ہزار من مال دیں گے اور ایک مدت مقرر کر لیتے ہیں کہ اس کے اندر اندر ہم نرخ مقرر کر لیں گے۔ جس دن ہمیں نرخ اچھا معلوم دے ہم اسی دن فکس کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات مال پہنچانے کے بعد ہم دو ماہ تک کا وقفہ بھی نرخ مقرر کرنے کے لیے لے لیتے ہیں۔ کارخانہ دار مال کے پہنچنے پر ہمیں کچھ پیشگی یعنی حاضر نرخ کا ۶۰ یا ۶۵ فی صدی ادا کرتا رہتا ہے۔ نرخ مقرر کرنے پر کل رقم ادا ہو جاتی ہے۔

(۴) اس طرح کے سودے کپاس اترنے پر ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو کپاس اترنے سے دو چار ماہ پیشتر ہی ایسے سودے کرنے شروع کر دیتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ج: آپ نے کپاس کے سودے کی جو صورتیں بیان کی ہیں ان کے احکام الگ الگ نمبروار بیان کیے جاتے ہیں:

صورت اول و دوم میں بیع سلم کی شرائط میں سے ایک شرط نہیں پائی جاتی۔ یعنی یہ کہ سودا طے کر کے ساتھ ہی قیمت پوری کی پوری پیشگی ادا ہو۔ یہ بیع سلم کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ چونکہ یہ شرط ان دونوں صورتوں میں مفقود ہے، اس لیے یہ معاملات بیع سلم کے حدود سے خارج ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ معاملات اس بنا پر درست ہیں کہ دراصل ''بیع'' کے معاملات نہیں ہیں بلکہ معاہدے کے معاملات ہیں۔ یعنی فریقین آپس میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک فریق ایک وقت مقررہ پر، یا ایک مدت مقررہ کے اندر اس قسم کا اتنا مال اس نرخ پر دوسرے فریق کو مہیا کرے گا اور دوسرا فریق یہ عہد کرتا ہے کہ وہ ان شرائط پر اسے خریدے گا۔ اس قسم کا معاہدہ کرنا جائز ہے، اور شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی بشرطیکہ معاہدہ کرنے والے معاہدے ہی کی نیت کریں، یہ نہ سمجھیں کہ ایک فریق نے مال بیچا اور دوسرے نے خرید لیا۔

تیسری صورت میرے نزدیک صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں نرخ کے معاملے کو معلق رکھا جاتا ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ معاہدے کی صحت میں مانع ہے، بلکہ اس میں جھگڑے کے اسباب بھی موجود ہیں۔ اس میں اس امر کا امکان ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک نرخ مقرر کرنے کے معاملے کو ایسے وقت پر ٹالنے کی کوشش کرے جبکہ بازار کا بھاؤ اس کے مفاد کے لیے موزوں تر ہو۔ اس طرح ان کی کشمکش بآسانی نزاع کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

کپاس اترنے پر جو سودے کیے جاتے ہیں، ان کے معاملے میں تو صحیح صورت یہ ہے کہ سیدھی طرح بیع کا معاملہ کر لیا جائے۔ یعنی بائع کے پاس جتنا مال موجود ہو وہ اسے دکھا کر مقرر نرخ پر فروخت کر دے اور مشتری مال کو دیکھ کر طے شدہ نرخ پر اسے خریدے اور اپنے قبضے میں لے لے۔

(رسائل و مسائل دوم ص ۳۱۱ تا ۳۱۳۔ اشاعت تیرھویں مارچ ۱۹۸۲)

(بحوالہ ترجمان القرآن ذی القعدہ ذی الحجہ ۷۰ ۱۳ھ ستمبر ۱۹۵۱)

کمیشن اور نیلام

س: حسب ذیل سوالات کا جواب مطلوب ہے۔

(۱) بعض ایجنٹ مال سپلائی کرتے وقت دکاندار سے کہتے ہیں کہ اگر مال فروخت کر کے ہمیں رقم دو گے تو ۲۰ فی صدی کمیشن ہم آپ کو دیں گے اور اگر نقد قیمت مال کی ابھی دو گے تو ۲۵ فی صدی کمیشن ملے گا۔ کیا اس طور پر کمیشن کا لین دین جائز ہے؟

ج: نقد خریداری کی صورت میں زیادہ اور ادھار کی صورت میں کم کمیشن دینا میرے علم میں ناجائز نہیں ہے۔ ایجنٹ [یا مالک] دکانداروں کو مال فراہم کرتے وقت جو کمیشن دیتا ہے وہ دراصل اپنے منافع میں سے ایک حصہ اس کو ادا کرتا ہے۔ اس

www.KitaboSunnat.com

جسے کو سودے کی نوعیت کے لحاظ سے کم وبیش کرنے کا اسے حق ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس میں کوئی چیز سود سے مشابہ ہے۔ البتہ اگر ادھار کی مدت کے لحاظ سے کمیشن کی کمی کے درجے قائم کیے جائیں تو اس میں سود سے مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) مسلمان نیلام کنندہ کے لیے کیا یہ جائز ہے کہ جب کوئی شخص بولی نہ چڑھائے اور وہ دیکھے کہ اس میں مجھے نقصان ہو گا تو وہ خود بولی دے کر مال کو اپنے قبضے میں یہ کہہ کر رکھ لے کہ یہ مال پھر دوسرے وقت میں نیلام ہو گا؟ نیز کیا وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے آدمی مقرر کر دے کہ وہ قیمت بڑھانے کے لیے بولتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے حسبِ منشا مال کی قیمت موصول ہو سکے؟

ج: نیلام کرنے والے کے لیے یہ تو درست ہے کہ اگر کسی مال پر اتنی بولی نہیں آتی جس پر اپنا مال بیچنے کے لیے صاحب مال راضی ہو، تو وہ فروخت نہ کرے۔ لیکن اس کے لیے دھوکے اور فریب سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔ اس کو کھلے بندوں یہ بات ظاہر کر دینی چاہیے کہ دوسرے لوگوں کا جو مال وہ نیلام کے ذریعے سے فروخت کر رہا ہے، یا خود اپنا خرید کیا ہوا جو مال وہ اس طریقے سے نکال رہا ہے، اس پر اگر کم سے کم مطلوبہ قیمت کی حد تک بولی نہ آئی تو وہ اس چیز کو فروخت نہ کرے گا۔ خریداروں میں اپنے آدمی بٹھا کر ان سے بولی دلوانا یا خود خریدار بن کر بولی دینا فریب کاری ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۳۱۴-۳۱۵۔ اشاعت تیرھویں مارچ ۱۹۸۲ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن ربیع الاول ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ۔ جنوری، فروری ۱۹۵۱ء)

پیشگی سودے بازی [بیع سلم] کی شرعی حیثیت

سوال: کیا اسلام کی رو سے پیشگی سودے بازی (Forward Transaction) ناجائز ہے؟

جواب: یہ ایک لمبی بحث ہے لیکن اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام میں پیشگی سودے کی صرف ایک شکل جائز ہے اور اس کا نام بیع سلم ہے۔ بیع سلم میں چند شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔

(۱) جس چیز کی خرید و فروخت ہو رہی ہو اس کا نام اور اس کی جنس کی نوعیت بالکل متعین ہونی چاہیے اور اس کا نمونہ بازار میں دستیاب ہونا چاہیے۔

(۲) لینے اور دینے والے کا تعین ہونا چاہیے۔

(۳) شے کی مقدار، قیمت اور شرح متعین ہونی چاہیے۔

(۴) اس وقت کا بھی تعین ہونا ضروری ہے جس وقت بائع مشتری کے سپرد مال کرے گا۔

(۵) پیشگی سودا کرتے وقت ساری قیمت کا ادا ہو جانا بھی لازمی ہے۔

اگر ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی پوری نہ ہو گی تو یہ بیع فاسد قرار پائے گا۔

(رسائل و مسائل حصہ چہارم ص ۱۵۳ اشاعت اول۔ تفہیم الاحادیث ۷: ۹۴)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مسجد میں نیلام کی شرعی حیثیت

س: حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک آدمی کو گداگری ترک کر کے محنت مزدوری کرنے کی تلقین فرمائی اور اس ضمن میں اس کا پیالہ اور کمبل مسجد نبوی میں نیلام کرایا۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس حدیث کی رو سے مسجد میں نیلام یا ایسے ہی دوسرے کاروباری لین دین کا کوئی جواز ہو سکتا ہے؟

ج: ایک نیلام تو وہ ہے جو آدمی اپنے کاروبار کے لیے کرے اور اس کے متعلق ظاہر ہے کہ یہ مسجد میں جائز نہیں کیونکہ اللہ نے اپنی مسجد کو نیلام گھر نہیں بنایا ہے۔ دوسرا نیلام وہ ہے جو ایک بندۂ خدا کو ایک برائی سے بچانے اور ایک بھلا راستہ دکھانے کے لیے کیا جائے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی میں کرایا۔ ظاہر بات ہے کہ حضورؐ کا یہ فعلِ مبارک اسی تذکیر اور تزکیۂ نفس ہی کا کام تھا جو آپؐ سرانجام دے رہے تھے کیونکہ تزکیۂ نفس بس اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی کو اللہ اللہ کرنا سکھایا جائے بلکہ تزکیۂ نفس اس چیز کا نام ہے کہ آدمی کے اندر سے برے اخلاق اور بری سیرت کو نکالا جائے اور اس کی جگہ تربیت کے ذریعے اچھے اخلاق اور اچھی سیرت پیدا کی جائے۔ تزکیۂ نفس کا یہ کام بیسیوں طریقوں سے ہوتا ہے۔ یہ اللہ اللہ سکھانے سے بھی ہوتا ہے۔ نماز اور روزے کی تعلیم سے بھی ہوتا ہے۔ کسب حلال کی ترغیب دینے اور اکل حرام سے اجتناب کی تعلیم دینے سے بھی ہوتا ہے۔ وعلی ھذ القیاس۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دراصل یہ کوئی تجارتی نیلام نہیں کیا تھا بلکہ تزکیۂ نفس ہی کا کام تھا۔

(استفسارات حصہ اول ص ۹۸-۹۹ بحوالہ ایشیا لاہور ۱۶ دسمبر ۱۹۶۸ء)

نقد کی قیمت اور ادھار کی اور

س: اگر کوئی دکاندار اس اصول پر عمل پیرا ہو کہ وہ نقد خریدنے والے گاہک سے اشیا کی کم قیمت لے اور ادھار لینے والے سے زیادہ تو کیا وہ سود خواری کا مرتکب ہوگا؟

ایک دوسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ فروخت پر کچھ معمولی سا کمیشن رکھا جاتا ہے، مثلاً ایک پیسہ فی روپیہ اور یہ صرف نقد خریداری کی صورت میں گاہک کو ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے؟

ج: پہلی صورت تو صریحاً سود کی ہے۔ رہی دوسری شکل تو اگرچہ اصطلاحاً یہ سود کی تعریف میں نہیں آتی، لیکن اس کے اندر روح تو سود ہی کی موجود ہے۔ فقہ کی زبان میں یہ "ربٰو" نہیں مگر "ریبہ" ضرور ہے اور ریبہ بھی پرہیز کے لائق چیز ہے۔ دعوا الربوٰ والریبۃ (الحدیث)[1]

(رسائل و مسائل اول ص ۱۵۱ اشاعت ۲۳ ستمبر ۲۰۰۲ء)

۱۔ یہ حدیث نبوی نہیں حضرت عمرؓ کا قول ہے جسے ابن ماجہ نے کتاب التجارات اور مسند احمد نے ج ۱ ص ۳۶ اور ۵۰ پر نقل کیا ہے۔ (مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انشورنس

ایک نوجوان نے کہا" مولانا! کیا بینکنگ کی طرح انشورنس کے نظام کو بھی سود کے بغیر چلایا جا سکتا ہے؟

مولانا نے فرمایا" انشورنس تو ابتدا ہی سے سود کے بغیر چلتا رہا ہے۔ انشورنس بہت قدیم (Institution) ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایک ہی Trade سے وابستہ افراد اپنی آمدنی میں سے کچھ رقم علیحدہ کر کے اس مقصد کے لیے جمع کرتے رہتے تھے کہ اگر ان میں سے کسی کو نقصان اٹھانا پڑے یا کسی وجہ سے ان میں سے کوئی ضرورت مند ہو جائے تو اس کی مدد کی جا سکے یا اس کے نقصان کی تلافی ہو سکے۔ یہ انشورنس کی اصل صورت تھی۔ اس میں سود کا کوئی دخل نہ تھا۔ لیکن بعد میں یہودیوں نے اس انشورنس کو بھی بزنس بنا لیا اور اس پر سود مسلط کر دیا۔ اب جس انشورنس کو آپ دیکھتے ہیں وہ یہودیوں کے اسی بزنس کی شکل ہے۔

(۵ اے ذیلدار پارک مرتبہ مظفر بیگ مطبوعہ البدر پبلی کیشنز طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۹۱)

بیمے کا جواز و عدم جواز

سوال: انشورنس کے مسئلے میں مجھے تردد لاحق ہے اور صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکا کہ آیا بیمہ کرانا اسلامی نقطۂ نظر سے جائز ہے یا ناجائز؟ اگر بیمے کا موجودہ کاروبار ناجائز ہو تو پھر اسے جائز بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اگر موجودہ حالات میں ہم اسے ترک کر دیں تو اس کے نتیجے میں معاشرے کے افراد بہت سے فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ دنیا بھر میں یہ کاروبار جاری ہے۔ ہر قوم وسیع پیمانے پر انشورنس کی تنظیم کر چکی ہے اور اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے ہاں ابھی تک اس بارے میں تامل اور تذبذب پایا جاتا ہے۔ آپ اگر اس معاملے میں صحیح صورت تک رہنمائی کریں تو ممنون ہوں گا۔

جواب: انشورنس کے بارے میں شرع اسلامی کی رو سے تین اصولی اعتراضات ہیں جن کی بنا پر اسے جائز نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔

اول یہ کہ انشورنس کمپنیاں جو روپیہ پریمیم (Premium) کی شکل میں وصول کرتی ہیں اس کے بہت بڑے حصے کو سودی کاموں میں لگا کر فائدہ حاصل کرتی ہیں اور اس ناجائز کاروبار میں وہ لوگ آپ سے آپ حصہ دار بن جاتے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں اپنے آپ کو یا اپنی کسی چیز کو ان کے پاس انشور کراتے ہیں۔

دوم یہ کہ موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں جو رقم دینے کی ذمہ داری کمپنیاں اپنے ذمہ لیتی ہیں اس کے اندر قمار کا اصول پایا جاتا ہے۔

سوم یہ کہ ایک آدمی کے مر جانے کی صورت میں جو رقم ادا کی جاتی ہے، اسلامی شریعت کی رو سے اس کی حیثیت مرنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

والے کے ترکے کی ہے جسے شرعی وارثوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ مگر یہ رقم ترکے کی حیثیت میں تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ اس شخص یا ان اشخاص کو مل جاتی ہے جن کے لیے پالیسی ہولڈر نے وصیت کی ہو۔ حالانکہ وارث کے حق میں شرعاً وصیت ہی نہیں کی جا سکتی۔

رہا یہ سوال کہ انشورنس کے کاروبار کو اسلامی اصول پر کس طرح چلایا جا سکتا ہے تو اس کا جواب اتنا آسان نہیں جتنا یہ سوال آسان ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ ماہرین کی ایک مجلس جو اسلامی اصول کو بھی جانتی ہو اور انشورنس کے معاملات کو بھی سمجھتی ہو، اس پورے مسئلے کا جائزہ لے اور انشورنس کے کاروبار میں ایسی اصلاحات تجویز کرے جن سے کاروبار چل بھی سکتا ہو اور شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی بھی نہ ہو۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہمیں کم از کم یہ تسلیم تو کرنا چاہیے کہ ہم ایک غلط کام کر رہے ہیں۔ غلطی کا احساس بھی اگر ہم میں باقی نہ رہے تو پھر اصلاح کی کوشش کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔

بے شک موجودہ زمانے میں انشورنس کی بڑی اہمیت ہے اور ساری دنیا میں اس کا چلن ہے۔ مگر نہ اس دلیل سے کوئی حرام چیز حلال ہو سکتی ہے اور نہ کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب حلال ہے یا اسے اس بنا پر حلال ہونا چاہیے کہ دنیا میں اس کا چلن ہو گیا ہے۔ ایک مسلمان قوم ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم جائز و ناجائز میں فرق کریں اور اپنے معاملات کو جائز طریقوں سے چلانے پر اصرار کریں۔

(رسائل و مسائل سوم ص ۲۲۲-۲۲۳۔ طبع ۲۸۔ جنوری ۲۰۰۴ء بحوالہ ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۲)

انشورنس کو حرمت سے پاک کرنے کی تدابیر

سوال: انشورنس کے بارے میں آپ کا یہ خیال درست ہے کہ اس میں بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کے لیے طویل اور مسلسل کام کی ضرورت ہے۔ میں نے اب تک اپنی انشورنس کمپنی میں لائف انشورنس کے کاروبار سے احتراز کیا ہے۔ لیکن اب غور کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی کے بیمے کی قباحتوں کو درج ذیل تدابیر سے رفع کیا جا سکتا ہے۔

(۱) زرِ ضمانت حکومت کے پاس جمع کراتے وقت یہ ہدایت دی جا سکتی ہے کہ اس روپیہ کو سودی کاروباری میں لگانے کے بجائے کسی سرکاری کارخانے یا پی-آئی-ڈی-سی میں حصص خریدے جائیں۔ کوشش کی جائے تو امید ہے کہ حکومت اس بات کو مان لے گی۔ اس طرح سودی کام میں اشتراک سے نجات ہو سکتی ہے۔

(۲) کمپنی کو اختیار ہے کہ جس فرد کا چاہے بیمہ منسوخ کر دے یا پہلے ہی قبول نہ کرے۔ ہم قواعد میں یہ گنجائش رکھ سکتے ہیں کہ جو صاحب چاہیں اپنی رقم وارثوں میں شریعت کے مطابق تقسیم کرنے کی ہدایت کر سکتے ہیں۔ خدا اور رسول کے احکام کی شدت سے پابندی یہ شرط لگا کر بھی کی جا سکتی ہے کہ جو حضرات شرعی تقسیم پر رضامند نہ ہوں ان کا بیمہ قبول نہ کیا جائے تاکہ ہمارے ہاں وہی لوگ بیمہ کرا سکیں جو ہمارے مطلوبہ شرعی اصولوں پر چلیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۳) قمار کی آمیزش سے بچنے کے لیے بیمہ کرانے والے لوگوں کو یہ ہدایت کرنے پر آمادہ کیا جائے کہ ان کی موت کی صورت میں صرف اتنا روپیہ ورثا کو دیا جائے گا جو وہ فی الحقیقت بذریعہ اقساط جمع کروا چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اگرچہ بحالات موجودہ اس کاروبار میں شر کا پہلو بہت غالب ہے لیکن خیر کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ کچھ عرصہ قبل قباحتوں کی شدت محسوس کرتے ہوئے میں نے اپنی کمپنی کو فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مگر بعد میں محسوس کیا کہ کوئی ایسی راہ نکالی جائے جس سے دوسروں کے لیے مثال قائم ہو سکے اور اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے انشورنس کا کاروبار چلایا جا سکے۔ آپ تکلیف فرما کر میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: آپ نے اب جو صورت انشورنس کے کاروبار کو درست کرنے کے متعلق لکھی ہے اس سے مجھے توقع ہے کہ اس کی حرمت کے اسباب ختم ہو سکیں گے۔ میرے نزدیک اس کو جواز کے دائرے میں لانے کے لیے کم از کم جو کچھ کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے۔

(۱) حکومت کو اس امر پر راضی کیا جائے کہ وہ کمپنی کا زر ضمانت اپنے کسی سرکاری یا نیم سرکاری صنعتی یا تجارتی کام میں حصہ داری کے اصول پر لگا دے اور کمپنی کو اس کا ایک متعین نہیں بلکہ متناسب منافع دے۔

(۲) کمپنی اپنے دوسرے سرمائے کو بھی ایسے منافع بخش کاموں میں لگائے جن میں سود کے بجائے منافع اس کو حاصل ہو۔ کسی قسم کے سودی کاروبار میں اس کے سرمائے کا کوئی حصہ نہ لگایا جائے۔

(۳) زندگی کا بیمہ صرف انہی لوگوں کا قبول کیا جائے جو دو باتوں کو تسلیم کریں۔ ایک یہ کہ ان کی موت کے بعد صرف ان کی جمع شدہ رقم ہی وارثوں کو دی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ شرعی قاعدے کے مطابق یہ رقم تمام وارثوں میں تقسیم ہوگی۔

(۴) بیمہ کرانے والوں میں سے جو لوگ اپنی رقوم پر منافع چاہتے ہوں ان کا روپیہ ان کی اجازت سے اسی قسم کے تجارتی کاموں میں حصہ داری کے اصول پر لگا دیا جائے جن کا ذکر اوپر میں نے نمبر ۲ میں کیا ہے۔

یہ چار اصلاحات اگر آپ نافذ کر سکیں تو اس سے صرف یہی فائدہ نہ ہوگا کہ آپ کی کمپنی کا کاروبار پاک ہو جائے گا بلکہ اس سے ملک میں انشورنس کی اصلاح چاہنے والوں کو عام طور پر بڑی مفید رہنمائی ملے گی۔

(رسائل و مسائل حصہ پنجم ص ۱۹۵ تا ۱۹۸۔ اشاعت چہارم بحوالہ ترجمان القرآن فروری ۱۹۶۶ء)

انعامی بانڈز کی شرعی حیثیت

سوال: آج کل حکومت کی طرف سے امدادی قرضوں کے تمسکات جو انعامی بانڈز کی شکل میں جاری کیے گئے ہیں، ان میں شرکت کرنا اور ان پر متوقع انعام حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ قمار نہیں۔ کیونکہ ہر شخص کی قرض

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی اصل رقم بہرحال محفوظ ہے جو بعد میں ملے گی۔ اس پر کوئی متعین شرح سے اضافہ بھی بانڈز ہولڈر کو نہیں ملتا جسے سود قرار دیا جائے۔ براہ کرم اس کاروبار کی شرعی حیثیت کو واضح کیا جائے۔ کیونکہ بہت سے لوگ اس معاملے میں خلجان کا شکار ہیں۔

جواب: انعامی بانڈز کے معاملے میں صحیح صورت واقعہ یہ ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بانڈز بھی اسی نوعیت کے قرضے ہیں جو حکومت اپنے مختلف کاموں میں لگانے کے لیے لوگوں سے لیتی ہے اور ان پر سود ادا کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ہر وثیقہ دار کو اس کی دی ہوئی رقم پر فرداً فرداً سود دیا جاتا تھا، مگر اب جملہ رقم کا سود جمع کر کے اسے چند وثیقہ داروں کو بڑے بڑے ''انعامات'' کی شکل میں دیا جاتا ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ یہ ''انعامات'' کن کو دیئے جائیں، قرعہ اندازی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ پہلے ہر وثیقہ دار کو سود کا لالچ دے کر اس سے قرض لیا جاتا تھا۔ اب اس کے بجائے ہر ایک کو یہ لالچ دیا جاتا ہے کہ شاید ہزاروں روپے کا ''انعام'' تیرے ہی نام نکل آئے، اس لیے قسمت آزمائی کر لے۔

یہ صورتِ واقعہ صاف بتاتی ہے کہ اس میں سود بھی ہے، اور روحِ قمار بھی۔ جو شخص یہ وثائق خریدتا ہے وہ اولاً اپنا روپیہ جان بوجھ کر ایسے کام میں قرضے کے طور پر دیتا ہے جس میں سود لگایا جاتا ہے۔ ثانیاً جس کے نام پر ''انعام'' نکلتا ہے اسے دراصل وہ سود اکٹھا ہو کر ملتا ہے جو عام سودی معاملات میں فرداً فرداً ایک ایک وثیقہ دار کو دیا جاتا تھا۔ ثالثاً جو شخص بھی یہ وثیقے خریدتا ہے وہ مجرد قرض نہیں دیتا بلکہ اس لالچ میں قرض دیتا ہے کہ اسے اصل سے زائد ''انعام'' ملے گا اور یہی لالچ دے کر قرض لینے والا اس کو قرض دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لیے اس میں نیت سودی لین دین ہی کی ہوتی ہے۔ رابعاً جمع شدہ سود کی وہ رقم جو بصورت ''انعام'' دی جاتی ہے اس کا کسی وثیقے دار کو ملنا اسی طریقے پر ہوتا ہے جس پر لاٹری میں لوگوں کے نام ''انعامات'' نکالا کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ لاٹری میں انعام پانے والے کے سوا تمام باقی لوگوں کے ٹکٹوں کی رقم ماری جاتی ہے اور سب کے ٹکٹوں کا روپیہ ایک انعام دار کو مل جاتا ہے۔ لیکن یہاں انعام پانے والے کے سوا باقی سب وثیقہ داروں کی اصل رقم نہیں ماری جاتی بلکہ صرف وہ سود، جو سودی کاروبار کے عام قاعدے کے مطابق ہر دائن کو اس کی دی ہوئی رقم قرض پر ملا کرتا ہے، انھیں نہیں ملتا، بلکہ قرعہ کے ذریعے سے نام نکل آنے کا اتفاقی حادثہ ان سب کے حصوں کا سود ایک یا چند آدمیوں تک اس کے پہنچنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ بعینہٖ قمار تو نہیں ہے مگر اس میں روحِ قمار ضرور موجود ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۳۴ تا ۳۳۶ اشاعت ششم جولائی ۱۹۷۶ء، بحوالہ ترجمان القرآن جنوری ۱۹۶۳ء)

قرض کو تحریر میں لانے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْــــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ (البقرہ ۲:۲۸۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (قرض لینے والا) اور اسے اللہ، اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو، یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔

اس سے یہ حکم نکلتا ہے کہ قرض کے معاملے میں مدت کی تعیین ہونی چاہیے۔

عموماً دوستوں اور عزیزوں کے درمیان قرض کے معاملات میں دستاویز لکھنے اور گواہیاں لینے کو معیوب اور بے اعتمادی کی دلیل خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اللہ کا ارشاد یہ ہے کہ قرض اور تجارتی قراردادوں کو تحریر میں لانا چاہیے اور اس پر شہادت ثبت کرا لینی چاہیے تا کہ لوگوں کے درمیان معاملات صاف رہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین قسم کے آدمی ایسے ہیں، جو اللہ سے فریاد کرتے ہیں، مگر ان کی فریاد سنی نہیں جاتی۔ ایک وہ شخص جس کی بیوی بد خلق ہو اور وہ اس کو طلاق نہ دے۔ دوسرا وہ شخص جو یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا مال اس کے حوالے کر دے۔ تیسرا وہ شخص جو کسی کو اپنا مال قرض دے اور اس پر گواہ نہ بنائے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۱۹۔ البقرہ حواشی ۳۲۵-۳۲۶)

اخلاق و دیانت کے لحاظ سے قابل اعتماد لوگوں کو گواہ بنانے کا حکم

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ (البقرہ ۲: ۲۸۲)

پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بھول جائے، تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہییں، جن کی گواہی تمھارے درمیان مقبول ہو۔

یعنی مسلمان مردوں میں سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاں گواہ بنانا اختیاری فعل ہو وہاں مسلمان صرف مسلمانوں ہی کو اپنا گواہ بنائیں۔ البتہ ذمیوں کے گواہ ذمی بھی ہو سکتے ہیں۔

ہر کس و ناکس گواہ ہونے کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابل اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۲۰۔ البقرہ حواشی ۳۲۷-۳۲۸)

ہر معاملہ بیع ضبط تحریر میں لانے کا حکم

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْئَمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰۤى اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ (البقرہ ۲: ۲۸۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے، تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے۔ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، معیاد کی تعیین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوا لینے میں تساہل نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک یہ طریقہ تمھارے لیے زیادہ مبنی بر انصاف ہے، اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، اور تمھارے شکوک و شبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم رہ جاتا ہے۔ ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو، اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روزمرہ کی خرید و فروخت میں بھی معاملہ بیع کا تحریر میں آجانا بہتر ہے، جیسا کہ آج کل کیش میمو لکھنے کا طریقہ رائج ہے، تاہم ایسا کرنا لازم نہیں ہے۔ اسی طرح ہمسایہ تاجر ایک دوسرے سے رات دن جو لین دین کرتے رہتے ہیں، اس کو بھی اگر تحریر میں نہ لایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۲۱۔ البقرہ حاشیہ ۳۲۹)

کاتب (منشی) کو دستاویز تحریر کرنے اور گواہ کو گواہی پر مجبور نہ کرنے کا حکم

وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ ۲: ۲۸۲)

تجارتی معاملے طے کرتے وقت گواہ کر لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو ستایا نہ جائے۔ ایسا کرو گے، تو گناہ کا ارتکاب کرو گے۔ اللہ کے غضب سے بچو۔ وہ تم کو صحیح طریق عمل کی تعلیم دیتا ہے اور اسے ہر چیز کا علم ہے۔

اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو دستاویز لکھنے یا اس پر گواہ بننے کے لیے مجبور نہ کیا جائے، اور یہ بھی کہ کوئی فریق کاتب یا گواہ کو اس بنا پر نہ ستائے کہ وہ اس کے مفاد کے خلاف صحیح شہادت دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۲۱۔ البقرہ حاشیہ ۳۳۰)

رہن بالقبض کے متعلق مسائل

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۝ (البقرہ ۲: ۲۸۳)

اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی کاتب نہ ملے، تو رہن بالقبض پر معاملہ کرو۔ اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے، تو جس پر بھروسہ کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اللہ اپنے رب سے ڈرے۔ اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ۔ جو شہادت چھپاتا ہے، اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے اور اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

یہ مطلب نہیں ہے کہ رہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت چونکہ زیادہ تر سفر میں پیش آتی ہے، اس لیے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملہ رہن کے لیے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو، صرف اسی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔اس کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جب محض دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے لے۔لیکن قرآن مجید چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے، اس لیے قرآن نے قصداً اس دوسری صورت کا ذکر نہیں کیا۔

اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہوجائے۔اسے اپنے دیے ہوئے مال کے معاوضے میں شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔اگر کوئی شخص رہن لیے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے، تو دراصل سود کھاتا ہے۔قرض پر براہِ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے۔البتہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اس سے سواری و بار برداری کی خدمت لی جاسکتی ہے، کیونکہ یہ دراصل اس چارے کا معاوضہ ہے جو مرتہن اس جانور کو کھلاتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۲۱-۲۲۲۔البقرہ حاشیہ ۳۳۱)

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۭ الخ اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ۔

شہادت دینے سے گریز کرنا، یا شہادت میں صحیح واقعات کے اظہار سے پرہیز کرنا، دونوں پر ''شہادت چھپانے'' کا اطلاق ہوتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۲۲۲۔البقرہ حاشیہ ۳۳۲)

ادائے قرض سے عاجز شخص اور اسلامی عدالت (دیوالیہ کا قانون)

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۼ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ ۲: ۲۸۰-۲۸۱)

تمہارا قرض دار تنگ دست ہو، تو ہاتھ کھلنے تک اسے مہلت دو، اور جو صدقہ کردو، تو یہ تمھارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔اس دن کی رسوائی و مصیبت سے بچو، جبکہ تم اللہ کی طرف واپس ہوگے، وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی یا بدی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم ہرگز نہ ہوگا۔

اسی آیت سے شریعت میں یہ حکم نکالا گیا ہے کہ جو شخص ادائے قرض سے عاجز ہوگیا ہو، اسلامی عدالت اس کے قرض خواہوں کو مجبور کرے گی کہ اسے مہلت دیں، اور بعض حالات میں وہ پورا قرض یا قرض کا ایک حصہ معاف بھی کرانے کی مجاز ہوگی۔حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے کاروبار میں گھاٹا آگیا اور اس پر قرضوں کا بار بہت چڑھ گیا۔معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔آپ نے لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے اس بھائی کی مدد کرو۔چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کو مالی امداد دی۔مگر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قرضے پھر بھی صاف نہ ہوسکے۔ تب آپؐ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو کچھ حاضر ہے، بس وہی لے کر اسے چھوڑ دو، اس سے زیادہ تمھیں نہیں دلوایا جاسکتا۔ فقہا نے تصریح کی ہے کہ ایک شخص کے رہنے کا مکان، کھانے کے برتن، پہننے کے کپڑے اور وہ آلات جن سے وہ اپنی روزی کماتا ہو، کسی حالت میں قرق نہیں کیے جاسکتے۔

(تفہیم القرآن ج ا ص ۲۱۸-۲۱۹۔ البقرہ حاشیہ ۳۲۴)

مسلمانوں کے معاملات میں گواہ مسلمان ہی ہونا چاہیے

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا شَھَادَۃُ بَیْنِکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ حِیْنَ الْوَصِیَّۃِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْکُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَیْرِکُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَاَصَابَتْکُمْ مُّصِیْبَۃُ الْمَوْتِ ط تَحْبِسُوْنَھُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوۃِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰہِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِیْ بِہٖ ثَمَنًا وَّلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی وَلَا نَکْتُمُ شَھَادَۃَ اللّٰہِ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِیْنَ o فَاِنْ عُثِرَ عَلٰٓی اَنَّھُمَا اسْتَحَقَّآ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ یَقُوْمٰنِ مَقَامَھُمَا مِنَ الَّذِیْنَ اسْتَحَقَّ عَلَیْھِمُ الْاَوْلَیٰنِ فَیُقْسِمٰنِ بِاللّٰہِ لَشَھَادَتُنَآ اَحَقُّ مِنْ شَھَادَتِھِمَا وَمَا اعْتَدَیْنَآ اِنَّآ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ o ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّھَادَۃِ عَلٰی وَجْھِھَآ اَوْ یَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَیْمَانٌ بَعْدَ اَیْمَانِھِمْ ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسْمَعُوْا ط وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ o (المائدہ ۵:۱۰۶تا۱۰۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور وہ وصیت کر رہا ہو تو اس کے لیے شہادت کا نصاب یہ ہے کہ تمھاری جماعت میں سے دو صاحب عدل آدمی گواہ بنائے جائیں، یا اگر تم سفر کی حالت میں ہو اور وہاں موت کی مصیبت پیش آجائے تو غیر مسلموں ہی میں سے دو گواہ لے لیے جائیں۔ پھر اگر کوئی شک پڑ جائے تو نماز کے بعد دونوں گواہوں کو (مسجد میں) روک لیا جائے اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہم کسی ذاتی فائدے کے عوض شہادت بیچنے والے نہیں ہیں، اور خواہ کوئی ہمارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (ہم اس کی رعایت کرنے والے نہیں) اور نہ خدا واسطے کی گواہی کو ہم چھپانے والے ہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو گناہ گاروں میں شمار ہوں گے۔“ لیکن اگر پتہ چل جائے کہ ان دونوں نے اپنے آپ کو گناہ میں مبتلا کیا ہے تو پھر ان کی جگہ دو اور شخص جو ان کی بہ نسبت شہادت دینے کے لیے اہل تر ہوں ان لوگوں میں سے کھڑے ہوں جن کی حق تلفی ہوئی ہو، اور وہ خدا کی قسم کھا کر کہیں کہ ”ہماری شہادت ان کی شہادت سے زیادہ برحق ہے اور ہم نے اپنی گواہی میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے، اگر ہم ایسا کریں تو ظالموں میں سے ہوں گے“ اس طریقے سے زیادہ توقع کی جاسکتی ہے کہ لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت دیں گے، یا کم از کم اس بات ہی کا خوف کریں گے کہ ان کی قسموں کے بعد دوسری قسموں سے کہیں ان کی تردید نہ ہوجائے۔ اللہ سے ڈرو اور سنو، اللہ نافرمانی کرنے والوں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معاملات میں غیر مسلم کو شاہد بنانا صرف اس حالت میں درست ہے جبکہ کوئی مسلمان گواہ بننے کے لیے میسر نہ آسکے۔

(تفہیم القرآن ج ا ص ۵۱۱۔ المائدہ حاشیہ ۱۲۱)

قرض حسنہ کا مفہوم

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً ط (البقرہ ۲:۲۴۵)

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے۔

سورہ المائدہ ۵: ۱۲ میں ارشاد ربانی ہے:

وَاٰمَنۡتُمۡ بِرُسُلِیۡ وَعَزَّرۡتُمُوۡهُمۡ وَاَقۡرَضۡتُمُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا۔

اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے۔

سوہ الحدید ۵۷: ۱۸ میں ارشاد ربانی ہے:

اِنَّ الۡمُصَّدِّقِيۡنَ وَالۡمُصَّدِّقٰتِ وَاَقۡرَضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمۡ۔

مردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات دینے والے ہیں اور جنھوں نے اللہ کو قرض حسنہ دیا ہے، ان کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا۔

سورہ التغابن ۶۴: ۱۷ میں ارشاد ہے:

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَـكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ‌ؕ۔

اگر تم اللہ کو قرض حسن دو تو وہ تمھیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمھارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔

سورہ الحدید ۵۷: ۱۱ میں ارشاد ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ۔

کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے۔

سورہ المزمل ۷۳: ۲۰ میں ارشاد ہے:

وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا‌ ؕ۔

نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔

''قرضِ حسن'' کا لفظی ترجمہ ''اچھا قرض'' ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے، جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے۔ اس طرح جو مال راہِ خدا میں خرچ کیا جائے، اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل ادا کروں گا، بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ وہ ہو قرض حسن، یعنی اپنی کسی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے، بلکہ محض اللہ کی خاطر ان کاموں میں صرف کیا جائے، جن کو وہ پسند کرتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۸۵۔ البقرہ حاشیہ ۲۶۷)

اللہ کو قرض حسنہ دینے والے کا مقام و مرتبہ

مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجۡرٌ كَرِيۡمٌ‌ۚ ○ (الحدید ۵۷: ۱۱)

کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ جس کو جو اجر اور مرتبہ بھی دیتا ہے یہ دیکھ کر دیتا ہے کہ کس نے کن حالات میں کس جذبے کے ساتھ کیا عمل کیا ہے۔ اس کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کا درجہ اور اس کے عمل کا اجر پوری باخبری کے ساتھ متعین کرتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے کہ آدمی اگر اس کے بخشے ہوئے مال کو اسی کی راہ میں صرف کرے تو اسے وہ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے، بشرطیکہ وہ قرضِ حسن [اچھا قرض] ہو، یعنی خالص نیت کے ساتھ کسی ذاتی غرض کے بغیر دیا جائے، کسی قسم کی ریا کاری اور شہرت و ناموری کی طلب اس میں شامل نہ ہو، اسے دے کر کسی پر احسان نہ جتایا جائے، اس کا دینے والا صرف اللہ کی رضا کے لیے دے اور اس کے سوا کسی کے اجر اور کسی کی خوشنودی پر نگاہ نہ رکھے۔ اس قرض کے متعلق اللہ کے دو وعدے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا، دوسرے یہ کہ وہ اس پر اپنی طرف سے بہترین اجر بھی عطا فرمائے گا۔

حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضورؐ کی زبان مبارک سے لوگوں نے اس کو سنا تو حضرت ابوالدحداح انصاری نے عرض کیا یا رسول اللہ، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا، ہاں، اے ابوالدحداح۔ انھوں نے کہا، ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھائیے۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ''میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس باغ میں کھجور کے چھ سو درخت تھے، اسی میں ان کا گھر تھا، وہیں ان کے بال بچے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا ''دحداح کی ماں، نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔'' وہ بولیں، تم نے نفع کا سودا کیا دحداح کے باپ'' اور اسی وقت اپنا سامان اور اپنے بچے لے کر باغ سے نکل گئیں [ابن ابی حاتم]۔ اس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص اہل ایمان کا طرزِ عمل اس وقت کیا تھا، اور اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کیسا قرضِ حسن ہے جسے کئی گنا بڑھا کر واپس دینے اور پھر اوپر سے اجرِ کریم عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۱۰ الحدید حاشیہ ۱۶)

اللہ کی شان کریمی

قرآن مجید میں زکوٰۃ اور صدقات کے لیے جگہ جگہ انفاق فی سبیل اللہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یعنی'' خدا کی راہ میں خرچ کرنا''، بعض بعض مقامات پر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ تم راہِ خدا میں صرف کرتے ہو یہ اللہ کے ذمے قرضِ حسنہ ہے، گویا تم اللہ کو قرض دیتے ہو اور اللہ تعالیٰ تمھارا قرض دار ہوتا ہے۔ بکثرت مقامات پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ تم دو گے اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے اور وہ صرف اتنا ہی تم کو واپس نہ کرے گا بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ دے گا۔ اس مضمون پر غور کیجیے۔ کیا زمین و آسمان کا مالک، نعوذ باللہ آپ کا محتاج ہے؟ کیا اس ذاتِ پاک کو آپ سے قرض لینے کی ضرورت ہے؟ کیا وہ بادشاہوں کا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بادشاہ، وہ بے حد وحساب خزانوں کا مالک، اپنے لیے آپ سے کچھ مانگتا ہے؟ معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ اسی کی بخشش پر تو آپ پل رہے ہیں۔ اسی کا دیا ہوا رزق تو آپ کھاتے ہیں۔ آپ میں سے ہر امیر اور غریب کے پاس جو کچھ ہے سب اسی کا تو عطیہ ہے۔ آپ کے ایک فقیر سے لے کر ایک کروڑ پتی اور ارب پتی تک ہر شخص اس کے کرم کا محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس کو کیا ضرورت کہ آپ سے قرض مانگے اور اپنی ذات کے لیے آپ کے آگے ہاتھ پھیلائے؟ دراصل یہ بھی اس کی شانِ کریمی ہے کہ وہ آپ سے خود آپ ہی کے فائدے کے لیے آپ ہی کی بھلائی کے لیے، آپ ہی کے کام میں خرچ کرنے کو فرماتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ خرچ میری راہ میں ہے، مجھ پر قرض ہے۔ میرے ذمے اس کا بدلہ ہے اور میں تمھارا احسان مانتا ہوں۔ تم اپنی قوم کے محتاجوں اور مسکینوں کو دو۔ اس کا بدلہ وہ غریب کہاں سے دیں گے، ان کی طرف سے میں دوں گا۔ تم اپنے غریب رشتے داروں کی مدد کرو۔ اس کا احسان ان پر نہیں مجھ پر ہے، میں تمھارے اس احسان کو اتار دوں گا۔ تم اپنے یتیموں، اپنی بیواؤں، اپنے معذوروں، اپنے مسافروں، اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کو جو کچھ دو اسے میرے حساب میں لکھ لو۔ تمھارا مطالبہ ان کے ذمے نہیں، میرے ذمے ہے اور میں اس کو ادا کر دوں گا۔ تم اپنے پریشان حال بھائیوں کو قرض دو اور ان سے سود نہ مانگو، ان کو تنگ نہ کرو، اگر وہ ادا کرنے کے قابل نہ ہوں تو ان کو سول جیل نہ بھجواؤ، ان کے کپڑے اور گھر کے برتن فروخت نہ کراؤ، ان کے بال بچوں کو گھر سے بے گھر نہ کر دو۔ تمھارا قرض ان کے ذمے نہیں، میرے ذمے ہے۔ یہ ہے اس کریموں کے کریم، اس بادشاہوں کے بادشاہ کی شان۔ تمھارے پاس جو کچھ ہے اسی کا بخشا ہوا ہے۔ تم کہیں اور سے نہیں لاتے۔ اسی کے خزانوں سے لیتے ہو، اور پھر جو کچھ دیتے ہو، اس کو نہیں دیتے، اپنے ہی رشتے داروں، اپنے ہی بھائی بندوں، اپنی ہی قوم کے لوگوں کو دیتے ہو، یا اپنی اجتماعی فلاح پر صرف کرتے ہو جس کا فائدہ آخر کار تم ہی کو پہنچتا ہے۔ مگر اس فیاض حقیقی کو دیکھو کہ جو کچھ تم اس سے لے لے کر اپنوں کو دیتے ہو، اسے وہ فرماتا ہے کہ تم نے مجھے دیا، میری راہ میں دیا، مجھے قرض دیا، میں اس کا اجر تمھیں دوں گا۔ اللہ اکبر! خداوند عالم ہی کو یہ شان کریمی زیب دیتی ہے۔ اسی بے نیاز بادشاہ کا یہ مقام ہے کہ فیاضی اور جود و کرم کے اس بلند ترین کمال کا اظہار کرے۔

(خطبات اول ص ۲۲۵ تا ۲۲۷ طبع اول)

چند سوالات اور ان کے جوابات

سوال: قرض حسنہ دینے اور لینے میں کن امور کا لحاظ ضروری ہے؟

جواب: قرض دینے اور لینے میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ حتی الامکان فریقین کے درمیان شرائط قرض صاف صاف طے ہوں، مدت کا تعین ہو جائے، تحریر اور شہادت ہو، جو شخص قرض دے وہ اس قرض کے دباؤ سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔ مقروض کو احسان رکھ کر نہ ذلیل کرے اور نہ اذیت پہنچانے کی کوشش کرے اور اگر مدت گزر جائے اور فی الواقع مقروض شخص قرضہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو تو اس کو جہاں تک ممکن ہو مہلت دے اور اپنے قرض کی وصولی میں زیادہ سختی نہ

www.KitaboSunnat.com

کرے۔ دوسری طرف قرض لینے والے کو لازم ہے کہ جس وقت وہ قرض ادا کرنے کے قابل ہو اسی وقت ادا کر دے اور جان بوجھ کر ادائے قرض میں تساہل یا ٹال مٹول نہ کرے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۱۴۵-۱۴۶۔اشاعت اول ستمبر ۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن جمادی الاول ۶۵ھ۔اپریل ۴۶ء)

س: اگر ایک غریب آدمی عقیدت کی بنا پر دعوت دیتا ہے مگر اس کے لیے قرض لیتا ہے یا اپنی استطاعت سے تجاوز کرتا ہے۔ کیا اس صورت میں اس کی دعوت قبول کرنی چاہیے؟

ج: اگر پہلے معلوم ہو جائے کہ وہ ایسا کر رہا ہے تو اسے سمجھانا چاہیے اور نہ مانے تو مجبوراً انکار کر دینا چاہیے۔ لیکن اگر بعد میں معلوم ہو تو اسے نصیحت کرنی چاہیے کہ اس طرح کی عقیدت درست نہیں ہے۔

(استفسارات اول ص ۱۰۹-۱۱۰۔طبع اول)

س: اگر کوئی شخص کسی کو مال زکوۃ، زکوۃ ہی کی نیت سے دے مگر اسے قرض کہہ کر دے تاکہ لینے والا اس کا جائز اور سوچ سمجھ کر تصرف کرے، کیا اس صورت میں اس شخص کی زکوۃ ادا ہو جائے گی؟

ج: آپ زکوۃ دے رہے ہیں اور خواہ مخواہ غلط بیانی کر رہے ہیں کہ تمھیں زکوۃ نہیں قرض دے رہا ہوں۔ یعنی ایک نیکی کرتے ہوئے اس میں ایک بدی بھی شامل کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں یہ مصلحت ہے۔ غور کریں کہ وہ آدمی جسے آپ نے زکوۃ دی ہے وہ بے چارہ اطمینان سے اسے خرچ بھی نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ وہ غریب آدمی تھا۔ آپ سے زکوۃ اس نے لی۔ لیکن آپ نے اسے قرض کہہ کر دی۔ گویا اس پر قرض چڑھ گیا اور وہ مزید پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ یعنی زکوۃ دے کر آپ نے اسے اطمینان نصیب نہ ہونے دیا اب اس میں کوئی مصلحت ہو تو اسے آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(استفسارات اول ص ۱۱۳-۱۱۴۔طبع اول)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب ہشتم

بنیادی حقوق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

انسانیت کو اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق ①

بنیادی حقوق کوئی نیا تصور نہیں

جہاں تک ہم مسلمانوں کا تعلق ہے، انسان کے بنیادی حقوق کا تصور ہمارے لیے کوئی نیا تصور نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دوسرے لوگوں کی نگاہ میں ان حقوق کی تاریخ یو، این، او کے چارٹر سے شروع ہوتی ہو، یا انگلستان کے میگنا کارٹا (Magna Carta) سے اس کا آغاز ہوا ہو۔ لیکن ہمارے لیے اس تصور کا آغاز بہت پہلے سے ہے۔ اس موقع پر میں انسان کے بنیادی حقوق پر روشنی ڈالنے سے پہلے مختصر طور پر یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انسانی حقوق کے تصور کا آغاز کیوں کر ہوا ہے۔

بنیادی حقوق کا سوال کیوں؟

درحقیقت یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ دنیا میں ایک انسان ہی ایسا ہے جس کے بارے میں خود انسانوں ہی کے درمیان بار بار یہ سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ اس کے بنیادی حقوق کیا ہیں۔ انسان کے سوا دوسری مخلوقات جو اس کائنات میں بس رہی ہیں، ان کے حقوق خود فطرت نے دیئے ہیں اور آپ سے آپ انھیں مل رہے ہیں، بغیر اس کے کہ وہ اس کے لیے سوچ بچار کریں۔ لیکن صرف انسان وہ مخلوق ہے جس کے بارے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ اس کے حقوق متعین کیے جائیں۔

اتنی ہی عجیب بات یہ بھی ہے کہ اس کائنات کی کوئی جنس ایسی نہیں ہے جو اپنی جنس کے افراد سے وہ معاملہ کررہی ہو جو انسان اپنے ہم جنس افراد سے کررہا ہے۔ بلکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ حیوانات کی کوئی نوع ایسی نہیں جو کسی دوسری نوع کے حیوانات پر بھی محض لطف ولذت کے لیے یا ان پر حکمران بننے کے لیے حملہ آور ہوتی ہو۔

① انسان کے بنیادی حقوق (یہ تقریر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے روٹری کلب لاہور میں کی تھی۔ جس کو جناب خلیل حامدی صاحب نے قلم بند کیا۔ مرتب)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قانونِ فطرت نے ایک حیوان کو دوسرے حیوان کے لیے اگر غذا بنایا ہے تو وہ صرف غذا کی حد تک ہی اس پر دست درازی کرتا ہے۔ کوئی درندہ ایسا نہیں ہے جو غذائی ضرورت کے بغیر یا اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد بلا وجہ جانوروں کو مارتا چلا جاتا ہو۔ خود اپنے ہم جنسوں کے ساتھ نوعِ حیوانی کا وہ سلوک نہیں ہے جو انسان کا اپنے افراد کے ساتھ ہے۔ یہ غالباً اس فضل و شرف کا نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا کیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ذہانت اور قوتِ ایجاد کا کرشمہ ہے کہ انسان نے دنیا میں یہ غیر معمولی روش اختیار کر رکھی ہے۔

شیروں نے آج تک کوئی فوج تیار نہیں کی۔ کسی کتے نے آج تک دوسرے کتوں کو غلام نہیں بنایا۔ کسی مینڈک نے دوسرے مینڈکوں کی زبان بندی نہ کی۔ یہ انسان ہی ہے جس نے اللہ تعالیٰ کی ہدایات سے بے نیاز ہو کر جب اس کی دی ہوئی قوتوں سے کام لینا شروع کیا تو اپنی ہی جنس پر ظلم ڈھانے شروع کر دیئے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اس وقت سے آج تک تمام حیوانات نے اتنے انسانوں کی جان نہیں لی ہے جتنی انسانوں نے صرف دوسری جنگ عظیم میں انسان کی جان لی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو فی الواقع دوسرے انسانوں کے بنیادی حقوق کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ صرف اللہ ہی ہے جس نے انسان کی رہنمائی اس باب میں کی ہے اور اپنے پیغمبروں کی وساطت سے انسانی حقوق کی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔ درحقیقت انسانی حقوق متعین کرنے والا انسان کا خالق ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس خالق نے انسان کے حقوق نہایت تفصیل سے بتائے ہیں۔

دورِ حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کا ارتقا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقوق انسانی کے اسلامی منشور کے نکات پر گفتگو کرنے سے قبل دورِ حاضر میں انسانی حقوق کے شعور کی ارتقائی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال لی جائے۔

(۱) انگلستان میں کنگ جان نے ۱۲۱۵ء میں جو میگنا کارٹا جاری کیا تھا، وہ دراصل اس کے امرا (Barons) کے دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اس کی حیثیت بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد کی سی تھی اور زیادہ تر امرا ہی کے مفاد میں وہ مرتب کیا گیا تھا۔ عوام الناس کے حقوق کا اس میں کوئی سوال نہ تھا۔ بعد کے لوگوں نے اس کے اندر وہ معنی پڑھے جو اس کے اصل لکھنے والوں کے سامنے بیان ہوتے تو وہ حیران رہ جاتے۔ سترھویں صدی کے قانون پیشہ لوگوں نے اس میں یہ پڑھا کر تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا (Trial By Jury) حبس بے جا کے خلاف دادرسی (Right of Habeas Corpus) اور ٹیکس لگانے کے اختیارات پر کنٹرول کے حقوق انگلینڈ کے باشندوں کو اس میں دیئے گئے ہیں۔

(۲) ٹام پین (Tom Paine) ۱۷۳۷ء تا ۱۸۰۹ء کے پمفلٹ "حقوق انسانی" (Rights of Man) نے اہل مغرب کے خیالات پر بہت بڑا انقلابی اثر ڈالا۔ اور اسی کے پمفلٹ (۱۷۹۱ء) نے مغربی ممالک میں حقوق انسانی کے تصور کی

www.KitaboSunnat.com

عام اشاعت کی۔ یہ شخص الہامی مذہب کا قائل نہ تھا اور ویسے بھی وہ دور الہامی مذہب سے بغاوت کا دور تھا۔ اس لیے مغربی عوام نے یہ سمجھا کہ الہامی مذہب حقوق انسانی کے تصور سے خالی ہے۔

(۳) انقلاب فرانس کی داستان کا اہم ترین ورق ''منشور حقوقِ انسانی'' (Declaration of the Rights of Man) ہے جو ۱۷۸۹ء میں نمودار ہوا۔ یہ اٹھارہویں صدی کے اجتماعی فلسفے اور خصوصاً رُوسو کے نظریۂ معاہدۂ عمرانی (Social Contract Theory) کا ثمرہ تھا۔ اس میں قوم کی حاکمیت، آزادی، مساوات اور ملکیت کے فطری حقوق کا اثبات کیا گیا تھا۔ اس میں ووٹ کے حق، قانون سازی اور ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات پر رائے عام کے کنٹرول، تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا (Trial By Jury) وغیرہ کا اثبات کیا گیا۔

اس منشورِ حقوق انسانی کو فرانس کی دستور ساز اسمبلی نے انقلاب فرانس کے عہد میں اس غرض کے لیے مرتب کیا تھا کہ جب دستور بنایا جائے تو اس وقت اسے اس کے آغاز میں درج کیا جائے اور دستور میں اس کی سپرٹ کو ملحوظ رکھا جائے۔

(۴) امریکہ (U.S.A) کی دس ترامیم میں بڑی حد تک وہ تمام حقوق گنوائے گئے ہیں جو برطانوی فلسفہ جمہوریت پر مبنی ہو سکتے تھے۔

(۵) انسانی حقوق و فرائض کا وہ منشور بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے جسے بگوٹا کانفرنس میں امریکی ریاستوں نے ۱۹۴۸ء میں منظور کیا۔

(۶) پھر جمہوری فلسفے کے تحت یو، این، او نے تدریجاً بہت سے مثبت اور بہت سے تحفظاتی حقوق کے متعلق قرار دادیں پاس کیں اور بالآخر ''عالمی منشور حقوق انسانی'' منظرِ عام پر آیا۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک ریزولوشن پاس کیا جس میں انسانوں کی نسل کُشی (Genocide) کو بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک جرم قرار دیا گیا۔

پھر دسمبر ۱۹۴۸ء میں نسل کُشی کے انسداد اور سزا دہی کے لیے ایک قرار داد پاس کی گئی اور ۱۲ر جنوری ۱۹۵۱ء کو اس کا نفاذ ہوا۔ اس میں نسل کُشی کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا کہ حسب ذیل افعال میں سے کوئی فعل اس غرض سے کرنا کہ کسی قومی، نسلی یا اخلاقی (Ethical) گروہ (Group) یا اس کے ایک حصے کو فنا کر دیا جائے۔

(۱) ایسے کسی گروہ کے افراد کو قتل کرنا۔

(۲) ان کو شدید نوعیت کا جسمانی یا ذہنی ضرر پہنچانا۔

(۳) اس گروہ پر بالارادہ زندگی کے ایسے احوال کو مسلط کرنا جو اس کی جسمانی بقا کے لیے کلاً یا جزاً تباہ کن ہوں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۴) اس گروہ میں سلسلہ تولید کو روکنے کے لیے جبری اقدامات کرنا۔

(۵) جبری طور پر اس گروہ کی اولادوں کو کسی دوسرے گروہ کی طرف منتقل کرنا۔

۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو جو ’عالمی منشور حقوقِ انسانی‘‘ پاس کیا گیا تھا، اس کے دیباچے میں من جملہ دوسرے عزائم کے ایک یہ بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ:

’’بنیادی انسانی حقوق میں، فرد انسانی کی عزت و اہمیت میں مردوں اور عورتوں کے مساویانہ حقوق میں اعتقاد کو موثق بنانے کے لیے۔‘‘

نیز اس میں اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ:

’’انسانی حقوق کا احترام قائم کرنے اور نسل و صنف یا زبان و مذہب کا امتیاز کیے بغیر تمام انسانوں کو بنیادی آزادیاں دلوانے کے کام میں بین الاقوامی تعاون کا حصول۔‘‘

اسی طرح دفعہ ۵۵ میں اقوام متحدہ کا یہ منشور کہتا ہے:

’’مجلس اقوامِ متحدہ انسانی حقوق اور سب کے لیے اساسی آزادیوں کے عالمگیر احترام اور ان کی نگہداشت میں اضافہ کرے گی۔‘‘

اس پورے منشور کے کسی جز سے کوئی اختلاف کسی بھی قوم کے نمائندوں نے نہیں کیا۔ اختلاف نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ صرف عام اصولوں کا اعلان و اظہار تھا۔ کسی نوعیت کی پابندی کسی پر بھی عائد نہ ہوتی تھی۔ یہ کوئی معاہدہ نہیں ہے جس کی بنا پر دستخط کرنے والی تمام حکومتیں اس کی پابندی پر مجبور ہوں اور بین الاقوامی قانون کے مطابق ان پر قانونی وجوب عائد ہوتا ہو۔ اس میں واضح طور پر یہ بتا دیا گیا ہے کہ یہ ایک معیار ہے جس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی بعض ملکوں نے اس کے حق میں یا اس کے خلاف ووٹ دینے سے اجتناب کیا۔

اب دیکھ لیجیے کہ اس منشور کے عین سائے میں انسانیت کے بالکل ابتدائی حقوق کا قتل عام دنیا میں ہو رہا ہے اور خود مہذب ترین اور سرکردہ ممالک کے اپنے ہاں ہو رہا ہے جو اسے پاس کرنے والے تھے۔

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اوّل تو مغربی دنیا میں انسانی حقوق کا تصور ہی دو تین صدیوں سے پہلے اپنی کوئی تاریخ نہیں رکھتا۔ دوسرے اگر آج ان حقوق کا ذکر کیا بھی جا رہا ہے تو ان کے پیچھے کوئی سند (Authority) اور کوئی قوت نافذہ (Sanction) نہیں ہے، بلکہ یہ صرف خوشنما خواہشات ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے حقوق انسانی کا جو منشور قرآن میں دیا اور جس کا خلاصہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر نشر فرمایا وہ اس سے قدیم تر بھی ہے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ملت اسلام کے لیے اعتقاد، اخلاق اور مذہب کی حیثیت سے واجب الاتباع بھی۔ پھر ان حقوق کو عملاً قائم کرنے کی بے مثل نظیریں بھی حضور پاکؐ اور خلفائے راشدین نے چھوڑی ہیں۔

اب میں ان حقوق کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں جو اسلام نے انسان کو دیئے ہیں۔

حرمتِ جان یا جینے کا حق

قرآن مجید میں دنیا کے سب سے پہلے واقعہ قتل کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ انسانی تاریخ کا اولین سانحہ تھا جس میں ایک انسان نے دوسرے انسان کی جان لی۔ اس وقت پہلی مرتبہ یہ ضرورت پیش آئی کہ انسان کو انسانی جان کا احترام سکھایا جائے اور اسے بتایا جائے کہ ہر انسان جینے کا حق رکھتا ہے۔ اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا ۖ وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا ۚ (المائدہ ۵: ۳۲)

جس نے کسی متنفس کو، بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو، یا زمین میں فساد انگیزی کی ہو قتل کر دیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اسے زندہ رکھا، تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔

اس آیت میں قرآن کریم نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانی دنیا کا قتل بتایا ہے اور اس کے مقابلے میں ایک انسان کی جان بچانے کو پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ٹھہرایا ہے۔ ''احیا'' کے معنی ہیں زندہ کرنا۔ دوسرے الفاظ میں اگر کسی شخص نے انسانی زندگی کو بچانے کے لیے کوشش کی اس نے انسان کو زندہ کرنے کا کام کیا۔ یہ کوشش اتنی بڑی نیکی ہے کہ اسے ساری انسانیت کے زندہ کرنے کے برابر ٹھہرایا گیا ہے۔ اس اصول سے صرف دو حالتیں مستثنیٰ ہیں۔

ایک یہ کہ کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو اور اسے قصاص کے طور پر قتل کیا جائے۔

دوسری یہ کہ کوئی شخص زمین میں فساد برپا کرے تو اسے قتل کیا جائے۔

ان دو حالتوں کے ماسوا انسانی جان کو ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ ①

انسانی جان کے تحفظ کا یہ اصول اللہ تعالیٰ نے تاریخ انسانی کے ابتدائی دور میں واضح کر دیا تھا۔ انسان کے بارے میں یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ تاریکی میں پیدا ہوا ہے اور اپنے ہم جنسوں کو قتل کرتے کرتے کسی مرحلے پر اس نے یہ سوچا کہ انسان کو قتل نہیں کرنا چاہیے۔ یہ خیال سراسر غلط ہے اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بدگمانی پر مبنی ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع سے انسان کی رہنمائی کی ہے اور اسی رہنمائی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ اس نے انسان کو انسان کے حقوق سے آشنا کیا۔

① مزید ملاحظہ ہو آیت وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ۔ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۳)
قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ

دوسری بات جو قرآن سے معلوم ہوتی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح ہے، یہ ہے کہ عورت، بچے، بوڑھے، زخمی اور بیمار کے اوپر کسی حال میں بھی دست اندازی جائز نہیں ہے............خواہ وہ اپنی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا دشمن قوم سے............الا یہ کہ جنگ کی صورت میں یہ افراد خود برسرپیکار ہوں۔ ورنہ دوسری ہر صورت میں ان پر دست اندازی کی ممانعت ہے۔ یہ اصول اپنی قوم کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ یہی اصول برتا جائے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملہ میں بڑی واضح ہدایات دی ہیں۔ خلفائے راشدین کا یہ حال تھا کہ وہ جب دشمنوں سے مقابلے کے لیے فوجیں روانہ کرتے تھے تو وہ پوری فوج کو یہ صاف ہدایات دیتے تھے کہ دشمن پر حملے کی صورت میں کسی عورت، بچے، بوڑھے، زخمی اور بیمار پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

تحفظِ ناموس خواتین

ایک اور اصولی حق جو ہمیں قرآن سے معلوم ہوتا ہے اور حدیث میں بھی اس کی تفصیلات موجود ہیں، یہ ہے کہ عورت کی عصمت ہر حال میں واجب الاحترام ہے، یعنی جنگ کے اندر دشمنوں کی عورتوں سے بھی اگر سابقہ پیش آئے تو کسی مسلمان سپاہی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالے۔ قرآن کی رُو سے بدکاری مطلقاً حرام ہے خواہ وہ کسی عورت سے کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ عورت مسلمان ہو یا غیر مسلم، اپنی قوم کی ہو یا غیر قوم کی، دوست ملک کی ہو یا دشمن ملک کی۔

معاشی تحفظ

ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ بھوکا آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے روٹی دی جائے، ننگا ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے کپڑا دیا جائے، زخمی اور بیمار آدمی ہر حالت میں اس کا مستحق ہے کہ اسے علاج کی سہولت فراہم کی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ بھوکا، ننگا، زخمی یا مریض شخص دشمن ہو یا دوست۔ یہ عمومی (Universal) حقوق میں سے ہے، دشمن کے ساتھ بھی ہم یہی سلوک کریں گے۔ اگر دشمن قوم کا کوئی فرد ہمارے پاس آجائے گا تو ہمارا فرض ہوگا کہ اسے بھوکا ننگا نہ رہنے دیں اور زخمی یا بیمار ہو تو اس کا علاج کرائیں۔ ①

① وَفِىٓ أَمْوَٰلِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَٱلْمَحْرُومِ ۝ (الذاریات ۵۱:۱۹)
اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محروم دونوں کا حق ہے۔
نیز آیت: وَيُطْعِمُونَ ٱلطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ (الدھر ۷۶:۸)
اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عادلانہ طرزِ معاملہ

قرآن کریم کا یہ اٹل اصول ہے کہ انسان کے ساتھ عدل وانصاف کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۗ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (المائدہ ۸:۵)

کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے۔

اس آیت میں اسلام نے یہ اصول متعین کردیا کہ انسان کے ساتھ، ایک فرد کے ساتھ بھی اور ایک قوم کے ساتھ بھی، بہر حال انصاف کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ اسلام کے نزدیک یہ قطعاً درست نہیں ہے کہ دوستوں کے ساتھ تو ہم عدل وانصاف برتیں اور دشمنوں کے ساتھ اس اصول کو نظر انداز کردیں۔

نیکی میں تعاون اور بدی میں عدمِ تعاون

ایک اور اصول جو قرآن معین کرتا ہے، یہ ہے کہ نیکی اور حق رسانی کے معاملے میں ہر ایک کے ساتھ تعاون کیا جائے اور برائی اور ظلم کے معاملے میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ برائی خواہ بھائی کررہا ہو تو بھی ہم اس کے ساتھ تعاون نہ کریں اور نیکی اگر دشمن بھی کررہا ہو تو اس کی جانب دستِ تعاون بڑھائیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ (المائدہ ۲:۵)

جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں، ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

بِرّ کے معنی صرف نیکی ہی نہیں، بلکہ عربی زبان میں یہ لفظ حق رسانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی دوسروں کو حقوق دلوانے میں اور تقویٰ اور پرہیزگاری میں ہم ہر ایک کی مدد کریں۔ قرآن کا یہ مستقل اور دائمی اصول ہے۔

مساوات کا حق

ایک اور اصول جسے قرآن کریم نے بڑے زور شور کے ساتھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان یکساں ہیں۔ اگر کسی کو فضیلت حاصل ہے تو وہ اخلاق کے اعتبار سے ہے۔ اس معاملے میں قرآن کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (الحجرات ۱۳:۴۹)

اے لوگو، ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

اس میں پہلی بات یہ بتائی گئی کہ تمام انسان ایک ہی اصل سے ہیں۔ یہ مختلف نسلیں، مختلف رنگ، مختلف زبانیں درحقیقت انسانی دنیا کے لیے کوئی معقول وجہ تقسیم نہیں ہیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری بات یہ بتائی کہ ہم نے قوموں کی یہ تقسیم صرف تعارف کے لیے کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک برادری، ایک قوم اور ایک قبیلے کو دوسرے پر کوئی فخر وفضیلت نہیں ہے کہ وہ اپنے حقوق تو بڑھا چڑھا کر رکھے اور دوسروں کے کم۔ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی یہ تفریقیں کی ہیں، شکلیں ایک دوسرے سے مختلف بنائی ہیں یا زبانیں ایک دوسرے سے الگ رکھی ہیں، تو یہ سب چیزیں فخر کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اس لیے ہیں کہ باہم تمیز پیدا کر سکیں۔ اگر تمام انسان یکساں ہوتے تو تمیز نہ کی جا سکتی۔ اس لحاظ سے یہ تقسیم فطری ہے۔ لیکن دوسروں کے حقوق مارنے اور بے جا امتیاز برتنے کے لیے نہیں ہے۔ عزت وافتخار کی بنیاد اخلاقی حالت پر ہے۔ اس بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے طریقے سے بیان فرمایا ہے۔ آپ نے فتح مکہ کے بعد جو تقریر ارشاد فرمائی، اس میں فرمایا:

لافضل لعربی علی اعجمی ولا لا عجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوی ولا فضل للانساب

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر۔ ماسواء تقویٰ کے اور نسبی بنیادوں پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

یعنی فضیلت دیانت اور تقویٰ پر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی شخص چاندی سے پیدا کیا گیا ہو اور کوئی پتھر سے اور کوئی مٹی سے بلکہ سب انسان یکساں ہیں۔[1]

معصیت سے اجتناب کا حق

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی شخص کو معصیت کا حکم نہیں دیا جا سکتا اور نہ کسی پر یہ واجب ہے یا اس کے لیے یہ جائز ہے کہ اس کو اگر معصیت کا حکم دیا جائے تو وہ اطاعت کرے۔ قانونِ قرآن کی رُو سے اگر کوئی افسر اپنے ماتحت کو ناجائز کارروائیوں کا حکم دیتا ہے یا کسی پر بے جا دست درازی کا حکم دیتا ہے تو ماتحت کے لیے اس معاملے میں اپنے افسر کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ جن چیزوں کو خالق نے ناجائز ٹھہرایا ہے اور معصیت بتایا ہے کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ ان کے ارتکاب کا کسی کو حکم دے۔ نہ حکم دینے والے کے لیے معصیت کا حکم دینا جائز ہے اور نہ کسی دوسرے شخص کے لیے ایسے حکم کی تعمیل جائز ہے۔

---

① نظامِ فرعونی کو قرآن نے جن وجوہ سے باطل قرار دیا ہے ان میں سے ایک یہ تھی کہ:
اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا یَّسْتَضْعِفُ طَآىِٕفَةً مِّنْهُمْ۔ (القصص ۲۸:۴)
بیشک فرعون ملک میں بڑا مغرور ہو گیا تھا اور وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا۔ اور اُن میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل کو) اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ .... الخ
یعنی اسلام اس کا روادار نہیں کہ کسی معاشرے میں انسانوں کو فوقانی اور تحتانی یا حکمران اور محکوم طبقوں میں بانٹا جائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق

اسلام کا ایک عظیم الشان اصول یہ ہے کہ کسی ظالم کو اطاعت کا حق نہیں ہے۔ قرآن کریم میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو امام مقرر کیا اور فرمایا کہ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا، تو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے سوال کیا کہ و من ذریتی (کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے؟) تو اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ① (میرا وعدہ ظالموں کے متعلق نہیں ہے)۔ عہد کا لفظ یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ انگریزی زبان میں "لیٹر آف اپوائنٹمنٹ" (Letter of Appointment) کا مفہوم ہے۔ اردو میں پروانہ امر کہیں گے۔

اس آیت میں اللہ نے صاف بتا دیا کہ ظالموں کو اللہ کی طرف سے کوئی ایسا پروانہ امر نہیں کہ وہ دوسرے سے اطاعت کا مطالبہ کریں۔ ② چنانچہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ کوئی ظالم اس امر کا مستحق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کا امام ہو۔ اگر ایسا شخص امام بن جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ اسے صرف برداشت کیا جائے گا۔

سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق

انسان کے بنیادی حقوق میں سے ایک بڑا حق اسلام نے یہ مقرر کیا ہے کہ معاشرے کے تمام افراد حکومت میں حصہ دار ہیں۔ تمام افراد کے مشورے سے حکومت ہونی چاہیے۔ قرآن نے فرمایا لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ ③ (اللہ تعالیٰ ان کو یعنی اہل ایمان کو، زمین میں خلافت دے گا)۔ یہاں جمع کا لفظ استعمال کیا اور فرمایا کہ ہم بعض افراد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو خلافت دیں گے۔ حکومت ایک فرد کی یا ایک خاندان کی یا ایک طبقے کی نہیں، بلکہ پوری ملّت کی ہوگی اور تمام افراد کے مشورے سے وجود میں آئے گی۔ قرآن کا ارشاد ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ④ یعنی یہ حکومت آپس کے مشورے سے چلے گی۔ اس معاملے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاف الفاظ موجود ہیں کہ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر ان پر حکومت کرے۔ مسلمان راضی ہوں تو ان پر حکومت کی جاسکتی ہے اور راضی نہ ہوں تو نہیں کی جاسکتی۔ اس حکم کی رُو سے اسلام ایک جمہوری و شورائی حکومت کا اصول قائم کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہماری بدقسمتی سے تاریخ کے ادوار میں ہمارے اوپر

---

① القرآن (۲:۱۲۴)

② مزید یہ صریح آیات سامنے رہیں: ۱۔ وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ (الشعراء ۲۶:۱۵۱) ۲۔ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا۔ (الکہف ۱۸:۲۸) ۳۔ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ (النحل ۱۶:۳۶) ۴۔ وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ (ہود ۱۱:۵۹)

③ القرآن (۲۴:۵۵)

④ القرآن (۴۲:۳۸) نیز آیت وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (۳:۱۵۹) اور اپنے کاموں میں ان (لوگوں) سے مشورہ لیا کرو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بادشاہیاں مسلط رہی ہیں۔ اسلام نے ہمیں ایسی بادشاہیوں کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ ہماری اپنی حماقتوں کا نتیجہ ہیں۔

آزادی کا تحفظ

ایک اور اصول یہ ہے کہ کسی انسان کی آزادی عدل کے بغیر سلب نہیں کی جاسکتی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ: لا یوسر رجل فی الاسلام الابحق۔[۱] اس کی رو سے عدل کا وہ تصور قائم ہوتا ہے جسے موجودہ اصطلاح میں باضابطہ عدالتی کارروائی (Judicial Process of Law) کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی آزادی سلب کرنے کے لیے اس پر متعین الزام لگانا، کھلی عدالت میں اس پر مقدمہ چلانا اور اسے دفاع کا پورا پورا موقع دینا۔ اس کے بغیر کسی کارروائی پر عدل کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ یہ بالکل معمولی عقل (Common sense) کا تقاضا ہے کہ ملزم کو صفائی کا موقع دیئے بغیر انصاف نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایک شخص کو پکڑا جائے اور اسے صفائی کا موقع دیئے بغیر بند کر دیا جائے۔ اسلامی حکومت اور عدلیہ کے لیے انصاف کے تقاضے پورے کرنا قرآن نے واجب ٹھہرایا ہے۔[۲]

تحفظِ ملکیت

ایک بنیادی حق یہ ہے کہ قرآن واضح طور پر انفرادی ملکیت کا تصور دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (البقرۃ ۲:۱۸۸)

تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کے مال نہ کھاؤ۔

اگر قرآن و حدیث اور فقہ کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کے مال کو کھانے کے کون کون سے طریقے باطل ہیں۔ اسلام نے ان طریقوں کو مبہم نہیں رکھا۔ اس اصول کی رُو سے کسی آدمی سے ناجائز طریقے سے کوئی مال حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ کسی شخص کو یا کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ قانون توڑ کر اور ان متعین شکلوں کے علاوہ جو خود اسلام نے واضح کر دی ہیں، کسی کی ملکیت پر دست درازی کرے۔

عزّت کا تحفظ

انسان کا یہ بھی بنیادی حق ہے کہ اس کی عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے۔ سورۂ حجرات میں اس حق کی پوری تفصیل موجود ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے کہ:

---

① اسلام میں کسی آدمی کو سوائے حق کے نہیں پکڑا جائے گا۔

② آیت وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ۔ (النساء ۴:۵۸)

اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

۱۔لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ۔

تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے۔

۲۔وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ۔

اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو۔

۳۔وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا۔ (الحجرات ۴۹:۱۲)

اور تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو۔

یعنی جتنی شکلیں بھی انسان کی عزّت وآبرو پر حملہ کرنے کی ہوسکتی ہیں ان سے منع کر دیا گیا۔وضاحت سے کہہ دیا کہ انسان خواہ موجود ہو خواہ موجود نہ ہو اس کا نہ مذاق اڑایا جاسکتا ہے، نہ برے القاب دیئے جاسکتے ہیں اور نہ اس کی برائی کی جاسکتی ہے۔ہر شخص کا یہ قانونی حق ہے کہ کوئی اس کی عزّت پر ہاتھ نہ ڈالے اور ہاتھ سے یا زبان سے اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔

نجی زندگی کا تحفظ

اسلام کے بنیادی حقوق کی رُو سے ہر آدمی کو (Privacy) یعنی نجی زندگی کو محفوظ رکھنے کا حق حاصل ہے۔اس معاملے میں سورۂ نور میں وضاحت کر دی گئی کہ لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا [۱] اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو، جب تک کہ ان سے اجازت نہ لے لو۔سورہ حجرات میں فرما دیا گیا لَا تَجَسَّسُوْا [۲] (تجسس نہ کرو)۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ایک آدمی کو یہ حق نہیں ہے کہ اپنے گھر سے دوسرے آدمی کے گھر میں جھانکے۔ایک شخص کو پورا پورا آئینی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسروں کے شور وشغب سے، دوسروں کی تاک جھانک سے اور دوسروں کی مداخلت سے محفوظ و مامون رہے۔اس کی گھریلو بے تکلفی اور پردہ داری برقرار رہنی چاہیے۔مزید برآں یہ کہ کسی شخص کو دوسرے کا خط اوپر سے نگاہ ڈال کر دیکھنے کا حق بھی نہیں ہے۔کجا کہ اسے پڑھا جائے۔اسلام انسان کی پرائیویسی کا پورا پورا تحفظ کرتا ہے اور صاف ممانعت کرتا ہے کہ گھروں میں تاک جھانک نہ کی جائے اور کسی کی ڈاک نہ دیکھی جائے۔الّا یہ کہ کسی شخص کے متعلق معتبر ذریعہ سے یہ اطلاع مل جائے کہ وہ کوئی خطرناک کام کر رہا ہے۔ورنہ خواہ مخواہ کسی کے حالات کا تجسس کرنا شریعت اسلامی میں جائز نہیں ہے۔

ظلم کے خلاف احتجاج کا حق

اسلام کے بنیادی حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

① القرآن (۲۴:۲۷)

② القرآن (۴۹:۱۲)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۔ (النساء ۴:۱۴۸)

اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو۔

یعنی مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ظالم کے خلاف آواز اٹھائے۔

آزادیٔ اظہار رائے

ایک اور اہم چیز جسے آج کے زمانے میں آزادیٔ اظہار (Freedom of Expression) کہا جاتا ہے قرآن اسے دوسری زبان میں بیان کرتا ہے۔ مگر دیکھیے مقابلتاً قرآن کا کتنا بلند تصور ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ ''امر بالمعروف''① اور ''نہی عن المنکر'' نہ صرف انسان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے۔ قرآن کی رُو سے بھی اور حدیث کی ہدایات کے مطابق بھی۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لیے لوگوں سے کہے اور بُرائی سے روکے۔ اگر کوئی برائی ہو رہی ہو تو صرف یہی نہیں کہ بس اس کے خلاف آواز اٹھائے بلکہ اس کے انسداد کی کوشش بھی فرض ہے اور اگر اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جاتی اور اس کے انسداد کی فکر نہیں کی جاتی تو الٹا گناہ ہوگا مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔ اگر اس معاملے میں مسلمان کی آواز بند کی جائے تو اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے بھلائی کے فروغ سے روکا تو اس نے نہ صرف ایک بنیادی حق سلب کیا بلکہ ایک فرض کی ادائیگی سے روکا۔ معاشرے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو ہر حالت میں یہ حق حاصل رہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کے تنزل کے اسباب بیان کیے ہیں۔ ان میں سے ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ② (وہ برائیوں سے ایک دوسرے کو باز نہ رکھتے تھے) یعنی کسی قوم میں اگر یہ حالات پیدا ہو جائیں کہ برائی کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہ ہو تو آخر کار رفتہ رفتہ بُرائی پوری قوم میں پھیل جاتی ہے اور وہ پھلوں کے سڑے ہوئے ٹوکرے کے مانند ہو جاتی ہے جس کو اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس قوم کے عذاب الٰہی کے مستحق ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔

ضمیر و اعتقاد کی آزادی کا حق

اسلام نے ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' (۲:۲۵۶) کا اصول انسانیت کو دیا اور اس کے تحت ہر شخص کو آزادی عطا کی کہ وہ کفر و ایمان میں سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ قوت کا استعمال اسلام میں اگر ہے تو دو ضروریات کے لیے ہے۔ ایک یہ کہ اسلامی ریاست کے وجود اور اس کے استقلال کی سلامتی کے لیے میدان جہاد میں دشمنوں کا مقابلہ کیا جائے اور دوسرے یہ کہ نظم و نسق اور امن و امان کے تحفظ کے لیے جرائم اور فتنوں کا سدباب کرنے کے لیے عدالتی اور انتظامی اقدامات کیے جائیں۔

① ملاحظہ ہو آیت: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۳:۱۱۰)
② القرآن (۵:۷۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ضمیر و اعتقاد کی آزادی ہی کا قیمتی حق تھا جسے حاصل کرنے کے لیے مکہ کے سیزدہ سالہ دورِ ابتلا میں مسلمانوں نے ماریں کھا کھا کر کلمۂ حق کہا اور بالآخر یہ حق ثابت ہو کے رہا۔ مسلمانوں نے یہ حق جس طرح اپنے لیے حاصل کیا تھا، اسی طرح دوسروں کے لیے بھی اس کا پورا پورا اعتراف کیا۔ اسلامی تاریخ اس بات سے خالی ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو، یا کسی قوم کو مار مار کر کلمہ پڑھوایا ہو۔

مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق

اسلام اس امر کا روادار نہیں کہ مختلف مذہبی گروہ ایک دوسرے کے خلاف دریدہ دہنی سے کام لیں اور ایک دوسرے کے پیشواؤں پر کیچڑ اچھالا کریں۔ قرآن میں ہر شخص کے مذہبی معتقدات اور اس کے پیشوایانِ مذہب کا احترام کرنا سکھایا گیا ہے۔ ہدایت یہ ہے کہ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ [1] (ان کو برا بھلا نہ کہو جنھیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا معبود بنا کر پکارتے ہیں) یعنی مختلف مذاہب اور معتقدات پر دلیل سے گفتگو کرنا اور معقول طریق سے تنقید کرنا یا اظہار اختلاف کرنا تو آزادی اظہار کے حق میں شامل ہے، مگر دل آزاری کے لیے بدگوئی کرنا روا نہیں۔

آزادیٔ اجتماع کا حق

آزادیٔ اظہار کے عین منطقی نتیجے کے طور پر آزادی اجتماع کا حق نمودار ہوتا ہے۔ جب اختلاف آرا کو انسانی زندگی کی ایک اٹل حقیقت کے طور پر قرآن نے بار بار پیش کیا ہے تو پھر اس امر کی روک تھام کہاں ممکن ہے کہ ایک طرح کی رائے رکھنے والے لوگ آپس میں مربوط ہوں۔ ایک اصول اور نظریے پر مجتمع ہونے والی ملت کے اندر بھی مختلف مدارس فکر ہو سکتے ہیں اور ان کے متوسلین بہر حال باہم دگر قریب تر ہوں گے۔ قرآن کہتا ہے:

> وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۔ (آل عمران ۳:۱۰۴)
>
> اور تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ضرور ہونا چاہیے جو بھلائی کی طرف بلائیں، معروف کا حکم دیں اور منکر سے روکیں۔

عملی زندگی میں جب "خیر" "معروف" اور "منکر" کے تفصیلی تصورات میں فرق واقع ہوتا ہے تو ملّت کی اصولی وحدت کے قائم رہتے ہوئے بھی اس کے اندر مختلف مدارسِ فکر تشکیل پاتے ہیں اور...... یہ بات معیار مطلوب سے کتنی بھی فروتر ہو، گروہوں اور پارٹیوں کا ظہور ہوتا ہی ہے۔ چنانچہ ہمارے ہاں کلام میں بھی، فقہ و قانون میں بھی اور سیاسی نظریات میں بھی اختلافِ آرا ہوا اور اس کے ساتھ مختلف گروہ وجود میں آئے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی دستور اور منشورِ حقوق کے لحاظ سے کیا مختلف اختلافی آراء رکھنے والوں کے لیے آزادی اجتماع کا حق ہے؟ یہ سوال سب سے پہلے حضرت علیؓ کے سامنے خوارج کے ظہور پر پیش آیا اور آنجنابؓ نے ان کے لیے آزادی اجتماع کے حق کو تسلیم کر لیا۔ انھوں نے خارجیوں سے فرمایا: جب تک تم تلوار اٹھا کر

---

[1] القرآن (۶:۱۰۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے، تمھیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔

عملِ غیر کی ذمہ داری سے بریت

اسلام میں آدمی صرف اپنے اعمال اور اپنے جرائم کے لیے جواب دہ ہے۔ دوسروں کے اعمال اور دوسروں کے جرائم میں اسے پکڑا نہیں جاسکتا۔ قرآن نے اصول یہ قرار دیا ہے کہ:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۚ۔ (الانعام ۶:۱۶۴)

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر مکلف نہیں ہے۔

اسلامی قانون میں اس کی گنجائش نہیں کہ کرے ڈاڑھی والا اور پکڑا جائے مونچھوں والا۔

شبہات پر کارروائی نہیں کی جائے گی

اسلام میں ہر شخص کو یہ تحفظ حاصل ہے کہ تحقیق کے بغیر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ اس سلسلے میں قرآن کی واضح ہدایت ہے کہ کسی کے خلاف اطلاع ملنے پر تحقیقات کرلو تاکہ ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کے خلاف لاعلمی میں کوئی کارروائی کر بیٹھو۔ ①

علاوہ بریں قرآن نے یہ ہدایت بھی دی ہے: اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ۔ (۱۲:۴۹)

اجمالاً یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جو اسلام نے انسان کو عطا کیے ہیں۔ ان کا تصور بالکل واضح اور مکمل ہے جو انسانی زندگی کے آغاز ہی سے انسان کو بتا دیا گیا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس وقت بھی دنیا میں انسانی حقوق کا جو اعلان (Declaration of Human Rights) ہوا ہے اسے کسی قسم کی سند اور قوت نافذہ حاصل نہیں ہے۔ بس ایک بلند معیار پیش کر دیا گیا ہے۔ اس معیار پر عمل درآمد کی کوئی قوم پابند نہیں ہے۔ نہ اور کوئی ایسا مؤثر معاہدہ ہے جو ان حقوق کو ساری قوموں سے منوا سکے۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی ہدایت کے پابند ہیں۔ خدا اور رسولؐ نے بنیادی حقوق کی پوری وضاحت کردی ہے۔ جو مملکت اسلامی ریاست بننا چاہے گی اسے یہ حقوق لازماً دینے ہوں گے۔ مسلمانوں کو بھی یہ حقوق دیئے جائیں گے اور دوسری اقوام کو بھی۔ اس معاملے میں کسی ایسے معاہدے کی حاجت نہیں ہوگی کہ فلاں قوم اگر ہمیں یہ حق دے گی تو ہم اسے دیں گے۔ بلکہ مسلمانوں کو بہرحال یہ حقوق دینے ہوں گے۔ دوستوں کو بھی اور دشمنوں کو بھی۔

(تفہیمات سوم، جنوری ۱۹۸۲ء ص ۲۴۸-۲۶۸)

① ملاحظہ ہو آیت: اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ۔ (۶:۴۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

اسلامی معاشرے کی تنظیمِ نو

اسلامی سوسائٹی کی تنظیم کے لیے سورۂ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں، اب یہ سوسائٹی ان سے زائد ہدایات کی طالب تھی، اس لیے سورۂ نساء کے ان خطبوں میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا گیا کہ مسلمان اپنی اجتماعی زندگی کو اسلام کے طریق پر کس طرح درست کریں۔ خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے۔ نکاح پر پابندیاں عائد کی گئیں۔ معاشرے میں عورت اور مرد کے تعلقات کی حد بندی کی گئی۔ یتیموں کے حقوق معین کیے گئے۔ وارثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر کیا گیا۔ معاشی معاملات کی درستی کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ سکھایا گیا۔ تعزیری قانون کی بنا ڈالی گئی۔ شراب نوشی پر پابندی عائد کی گئی۔ طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ مسلمانوں کو بتایا گیا کہ ایک صالح انسان کا طرزِ عمل خدا اور بندوں کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر جماعتی نظم و ضبط (ڈسپلن) قائم کرنے کے متعلق ہدایات دی گئیں۔ اہلِ کتاب کے اخلاقی و مذہبی رویے پر تبصرہ کر کے مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا کہ اپنی ان پیش رَو امتوں کے نقشِ قدم پر چلنے سے پرہیز کریں۔ منافقین کے طرزِ عمل پر تنقید کر کے سچی ایمانداری کے مقتضیات واضح کیے گئے اور ایمان و نفاق کے امتیازی اوصاف کو بالکل نمایاں کر کے رکھ دیا گیا۔

مخالفِ اصلاح طاقتوں سے جو کشمکش برپا تھی اُس نے جنگِ اُحد کے بعد زیادہ نازک صورت اختیار کر لی تھی۔ اُحد کی شکست نے اطراف و نواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں اور گھر کے منافقوں کی ہمتیں بہت بڑھا دی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ایک طرف پُر جوش خطبوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو مقابلے کے لیے ابھارا اور دوسری طرف جنگی حالات میں کام کرنے کے لیے انھیں مختلف ضروری ہدایات دیں۔ مدینہ میں منافق اور ضعیف الایمان لوگ ہر قسم کی خوفناک خبریں اُڑا کر بدحواسی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حکم دیا گیا کہ ہر ایسی خبر ذمہ دار لوگوں تک پہنچائی جائے اور جب تک وہ کسی خبر کی تحقیق نہ کر لیں اس کی اشاعت کو روکا جائے۔ مسلمانوں کو بار بار غزوات اور سریّوں میں جانا پڑتا تھا اور اکثر ایسے راستوں سے گزرنا ہوتا تھا جہاں پانی فراہم نہ ہو سکتا تھا۔ اجازت دی گئی کہ پانی نہ ملے تو غسل اور وضو دونوں کے بجائے تیمم کر لیا جائے۔ نیز ایسے حالات میں نماز مختصر کرنے کی بھی اجازت دے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دی گئی اور جہاں خطرہ سر پر ہو وہاں صلوۃ خوف ادا کرنے کا طریقہ بتایا گیا۔عرب کے مختلف علاقوں میں جو مسلمان کافر قبیلوں کے درمیان منتشر تھے اور بسا اوقات جنگ کی لپیٹ میں بھی آجاتے تھے ان کا معاملہ مسلمانوں کے لیے سخت پریشان کن تھا۔ اس مسئلے میں ایک طرف اسلامی جماعت کو تفصیلی ہدایات دی گئیں اور دوسری طرف اُن مسلمانوں کو بھی ہجرت پر اُبھارا گیا تا کہ وہ ہر طرف سے سمٹ کر دارالاسلام میں آجائیں۔

کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کردیں تو تاوان عائد ہوگا یا نہیں؟

وَ دَاوٗدَ وَ سُلَیْمٰنَ اِذْ یَحْكُمٰنِ فِی الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِیْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِیْنَ ۝ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَیْمٰنَ ۚ وَ كُلًّا اٰتَیْنَا حُكْمًا وَّ عِلْمًا ۔ (الانبیاء:۷۸-۷۹)

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤدؑ و سلیمانؑ کو سرفراز کیا۔یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے۔اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمانؑ کو سمجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔

مسلمان مفسرین نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں رات کے وقت گھس گئی تھیں۔اُس نے حضرت داؤدؑ کے ہاں استغاثہ کیا۔انھوں نے فیصلہ کیا کہ اُس کی بکریاں چھین کر اسے دے دی جائیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس سے اختلاف کیا اور یہ رائے دی کہ بکریاں اس وقت تک کھیت والے کے پاس رہیں جب تک بکری والا اس کے کھیت کو پھر سے تیار نہ کر دے۔اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرمارہا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے سلیمانؑ کو سمجھایا تھا مگر چونکہ مقدمے کی یہ تفصیل قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح نقل ہوئی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کے مقدمے میں یہی ثابت شدہ اسلامی قانون ہے۔یہی وجہ ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے فقہائے اسلام کے درمیان اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اگر کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کر دیں تو کوئی تاوان عائد ہوگا یا نہیں اور عائد ہوگا تو کس صورت میں ہوگا اور کس صورت میں نہیں، نیز یہ کہ تاوان کی شکل کیا ہوگی۔

ضمناً اس آیت سے عدالت کا یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ اگر دو جج ایک مقدمے کا فیصلہ کریں اور دونوں کے فیصلے مختلف ہوں، تو اگرچہ صحیح فیصلہ ایک ہی کا ہوگا، لیکن دونوں برحق ہوں گے، بشرطیکہ عدالت کرنے کی ضروری استعداد دونوں میں موجود ہو، ان میں سے کوئی جہالت اور ناتجربہ کاری کے ساتھ عدالت کرنے نہ بیٹھ جائے۔نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس بات کو اور زیادہ کھول کر بیان فرما دیا ہے۔بخاری میں عمروؓ بن العاص کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا اذا اجتهد الحاكم فاصاب فله اجران و اذا اجتهد فاخطأ فله اجر ”اگر حاکم اپنی حد تک فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے تو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں اس کے لیے دوہرا اجر ہے اور غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں اکہرا اجر“۔ابوداوٗد اور ابنِ ماجہ میں بُریدہ کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قاضی تین قسم کے ہیں، ایک ان میں سے جنتی ہے اور دو جہنمی۔ جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے تو اس کے مطابق فیصلہ دے مگر جو شخص حق کو پہچاننے کے باوجود خلافِ حق فیصلہ دے تو وہ جہنمی ہے اور اسی طرح وہ بھی جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے بیٹھ جائے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۷۳-۱۷۴ الانبیاء حاشیہ ۷۰)

ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھنے کا حکم

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ وَ اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ○ (الاعراف: ۲۸-۲۹)

ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم کبھی نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے (وہ اللہ کی طرف سے ہیں)؟ اے محمدؐ، ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اُسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔ جس طرح اُس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔

(قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ) بظاہر یہ ایک بہت ہی مختصر سا جملہ ہے مگر درحقیقت اس میں قرآن مجید نے ان لوگوں کے جاہلانہ عقائد کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل پیش کی ہے۔ اس طرزِ استدلال کو سمجھنے کے لیے دو باتیں بطور مقدمہ کے پہلے سمجھ لینی چاہییں۔

www.kitabosunnat.com

ایک یہ کہ اہلِ عرب اگرچہ اپنی بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے، لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرمناک فعل ہونا خود ان کے نزدیک بھی مسلم تھا، چنانچہ کوئی شریف اور ذی عزت عرب اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ کسی مہذب مجلس میں، یا بازار میں، یا اپنے اعزہ اور اقربا کے درمیان برہنہ ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ برہنگی کو شرمناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقع پر اختیار کرتے تھے اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا ہی کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ اس پر قرآن مجید یہ استدلال کرتا ہے کہ جو کام فحش ہے اور جسے تم خود بھی جانتے اور مانتے ہو کہ فحش ہے اس کے متعلق تم کیسے باور کر لیتے ہو کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ کسی فحش کام کا حکم خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتا اور اگر تمھارے مذہب میں ایسا حکم پایا جاتا ہے تو یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ تمھارا مذہب خدا کی طرف سے نہیں ہے۔

قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ ۗ مطلب یہ ہے کہ خدا کے دین کو تمھاری ان بیہودہ رسموں سے کیا تعلق۔ اس نے جس دین کی تعلیم دی ہے اس کے بنیادی اصول تو یہ ہیں کہ:

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۱) انسان اپنی زندگی کو عدل وراستی کی بنیاد پر قائم کرے۔

(۲) عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھے، یعنی خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کا شائبہ تک اس کی عبادت میں نہ ہو، معبودِ حقیقی کے سوا کسی دوسرے کی طرف اطاعت وغلامی اور عجز و نیاز کا رخ ذرا نہ پھرنے پائے۔

(۳) رہنمائی اور تائید ونصرت اور نگہبانی وحفاظت کے لیے خدا ہی سے دعا مانگے، مگر شرط یہ ہے کہ اس چیز کی دعا مانگنے والا آدمی پہلے اپنے دین کو خدا کے لیے خالص کر چکا ہو۔ یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر وشرک اور معصیت اور بندگی اغیار پر چلایا جا رہا ہو اور مدد خدا سے مانگی جائے کہ اے خدا، یہ بغاوت جو ہم تجھ سے کر رہے ہیں اس میں ہماری مدد فرما۔

(۴) اور اس بات پر یقین رکھے کہ جس طرح اس دنیا میں وہ پیدا ہوا ہے اسی طرح ایک دوسرے عالم میں بھی اس کو پیدا کیا جائے گا اور اسے اپنے اعمال کا حساب خدا کو دینا ہوگا۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۱-۲۲ الاعراف حواشی ۱۸-۱۹)

پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى۔ (النحل ۱۶:۹۰)

اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔

اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستی کا انحصار ہے۔

پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ اردو زبان میں اس مفہوم کو لفظ ''انصاف'' سے ادا کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس سے خواہ مخواہ یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہو اور پھر اسی سے عدل کے معنی مساویانہ تقسیم حقوق کے سمجھ لیے گئے ہیں جو سراسر فطرت کے خلاف ہے۔ دراصل عدل جس چیز کا تقاضا کرتا ہے وہ توازن اور تناسب ہے نہ کہ برابری۔ بعض حیثیتوں سے تو عدل بے شک افراد معاشرہ میں مساوات چاہتا ہے، مثلاً حقوق شہریت میں۔ مگر بعض دوسری حیثیتوں سے مساوات بالکل خلاف عدل ہے، مثلاً والدین اور اولاد کے درمیان، معاشرتی واخلاقی مساوات اور اعلیٰ درجے کی خدمات انجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنے والوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات۔ پس اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے وہ حقوق میں مساوات نہیں بلکہ توازن وتناسب ہے، اور اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی وتمدنی حقوق پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس ولحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔ عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوش گواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ ایسے ایک ٹھنڈے اور کھرّے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو در اصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشو ونما دینے والی قدریں ہیں۔

تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے، صلۂ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی وغمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے شریعتِ الٰہی ہر خاندان کے خوش حال افراد کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لوگوں کو بھوکا ننگا نہ چھوڑیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک معاشرے کی اس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہے کہ اس کے اندر ایک شخص عیش کر رہا ہو اور اسی کے خاندان میں اس کے اپنے بھائی بند روٹی کپڑے تک کو محتاج ہوں۔ وہ خاندان کو معاشرے کا ایک اہم عنصر ترکیبی قرار دیتی ہے اور یہ اصول پیش کرتی ہے کہ ہر خاندان کے غریب افراد کا پہلا حق اپنے خاندان کے خوش حال افراد پر ہے، پھر دوسروں پر ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں اور ہر خاندان کے خوش حال افراد پر پہلا حق ان کے غریب رشتہ داروں کا ہے، پھر دوسروں کے حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مختلف ارشادات میں وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے کہ آدمی کے اولین حقدار اس کے والدین، اس کے بیوی بچے اور اس کے بھائی بہن ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں اور پھر وہ جو ان کے بعد قریب تر ہوں اور یہی اصول ہے جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچا زاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمے دار ہوں اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے کا ہر واحدہ (Unit) اس طرح اپنے اپنے افراد کو سنبھال لے اس میں معاشی حیثیت سے کتنی خوش حالی، معاشرتی حیثیت سے کتنی حلاوت اور اخلاقی حیثیت سے کتنی پاکیزگی و بلندی پیدا ہو جائے گی۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۶۵-۵۶۶ النحل حاشیہ ۸۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

پورے معاشرے کو خراب کرنے والی برائیاں

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ (النحل ۱۶:۹۰)

اور بدی و بے حیائی اور ظلم و زیادتی سے منع کرتا ہے۔

تین بھلائیوں [عدل، احسان اور صلہ رحمی] کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ تین برائیوں سے روکتا ہے جو انفرادی حیثیت سے افراد کو اور اجتماعی حیثیت سے پورے معاشرے کو خراب کرنے والی ہیں۔

پہلی چیز فحشا ہے جس کا اطلاق تمام بے ہودہ اور شرم ناک افعال پر ہوتا ہے۔ ہر وہ برائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو، فحش ہے۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی و عریانی، عمل قوم لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان بُرے کام کرنا اور برائیوں کو پھیلانا بھی فحش ہے، مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم، عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظر عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور اسٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور ناز و ادا کی نمائش کرنا وغیرہ۔

دوسری چیز منکر ہے جس سے مراد ہر وہ برائی ہے جسے انسان بالعموم برا جانتے ہیں، ہمیشہ سے بُرا کہتے رہے ہیں اور تمام شرائع الٰہیہ نے جس سے منع کیا ہے۔

تیسری چیز بغی ہے جس کے معنی ہیں اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا، خواہ وہ حقوق خالق کے ہوں یا مخلوق کے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۶۶ النحل حاشیہ ۸۹)

عملِ صالح کی اہمیت

ایمان کے بعد دوسری صفت جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات (نیک کاموں) پر عمل کرنا ہے۔ صالحات کا لفظ تمام نیکیوں کا جامع ہے جس سے نیکی اور بھلائی کی کوئی قسم چھوٹی نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کی رو سے کوئی عمل بھی اس وقت تک عمل صالح نہیں ہو سکتا جب تک اس کی جڑ میں ایمان موجود نہ ہو اور وہ اس ہدایت کی پیروی میں نہ کی جائے جو اللہ اور اس کے رسول نے دی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ہر جگہ عمل صالح سے پہلے ایمان کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سورہ میں بھی اس کا ذکر ایمان کے بعد ہی آیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی قرآن میں ایمان کے بغیر کسی عمل کو صالح نہیں کہا گیا ہے اور نہ عمل بلا ایمان پر کسی اجر کی امید دلائی گئی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایمان وہی معتبر اور مفید ہے جس کے صادق ہونے کا ثبوت انسان اپنے عمل سے پیش کرے۔ ورنہ ایمان بلا عمل صالح محض ایک دعویٰ ہے جس کی تردید آدمی خود ہی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کر دیتا ہے جب وہ اس دعوے کے باوجود اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے سے ہٹ کر چلتا ہے۔ ایمان اور عمل صالح کا تعلق بیج اور درخت کا سا ہے۔ جب تک بیج زمین میں نہ ہو، کوئی درخت پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر بیج زمین میں ہو اور کوئی درخت پیدا نہ ہو رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بیج زمین میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اسی بنا پر قرآن پاک میں جنتی بشارتیں بھی دی گئی ہیں انھی لوگوں کو دی گئی ہیں جو ایمان لا کر عمل صالح کریں اور یہی بات اس سورہ میں بھی کہی گئی ہے کہ انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے جو دوسری صفت ضروری ہے وہ ایمان کے بعد صالحات پر عمل کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر عمل صالح کے بغیر محض ایمان آدمی کو خسارے سے نہیں بچا سکتا۔

حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین

مذکورہ بالا دو صفتیں تو وہ ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہییں۔ اس کے بعد یہ سورہ دو مزید صفتیں بیان کرتی ہے جو خسارے سے بچنے کے لیے ضروری ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والے لوگ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کریں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے بلکہ اُن کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے، اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے، اُس لیے اس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔

حق کا مفہوم

حق کا لفظ باطل کی ضد ہے اور بالعموم یہ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک، صحیح اور سچی اور مطابق عدل و انصاف اور مطابق حقیقت بات، خواہ وہ عقیدہ و ایمان سے تعلق رکھتی ہو یا دنیا کے معاملات سے۔ دوسرے، وہ حق جس کا ادا کرنا انسان پر واجب ہو، خواہ وہ خدا کا حق ہو یا بندوں کا حق یا خود اپنے نفس کا حق۔

حق کی نصیحت کرنے کا مطلب

پس ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا یہ معاشرہ ایسا بے حس نہ ہو کہ اس میں باطل سر اٹھا رہا ہو اور حق کے خلاف کام کیے جا رہے ہوں، مگر لوگ خاموشی کے ساتھ اس کا تماشا دیکھتے رہیں، بلکہ اس معاشرے میں یہ روح جاری و ساری رہے کہ جب اور جہاں بھی باطل سر اٹھائے کلمۂ حق کہنے والے اس کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور معاشرے کا ہر فرد صرف خود ہی حق پرستی اور راستبازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حق داروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اس طرزِ عمل کی نصیحت کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال و انحطاط

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے بچانے کی ضامن ہے۔

غفلت کا نتیجہ

اگر یہ روح کسی معاشرے میں موجود نہ رہے تو وہ خسران سے بچ نہیں سکتا اور اس خسران میں وہ لوگ بھی آخر کار مبتلا ہو کر رہتے ہیں جو اپنی جگہ حق پر قائم ہوں مگر اپنے معاشرے میں حق کو پامال ہوتے دیکھتے رہیں۔ یہی بات ہے جو سورۂ مائدہ میں فرمائی گئی ہے کہ بنی اسرائیل پر حضرت داؤدؑ اور حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی اور اس لعنت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے معاشرے میں گناہوں اور زیادتیوں کا ارتکاب عام ہو رہا تھا اور لوگوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال سے روکنا چھوڑ دیا تھا [آیات ۷۸-۷۹]۔ پھر اسی بات کو سورۂ اعراف میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب کھلم کھلا سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر کے مچھلیاں پکڑنی شروع کر دیں تو ان پر عذاب نازل کر دیا گیا اور اس عذاب سے صرف وہی لوگ بچائے گئے جو اس گناہ سے روکنے کی کوشش کرتے تھے [آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶]۔ اور اسی بات کو سورۂ انفال میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو [آیت ۲۵]۔ اسی لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو امتِ مسلمہ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے [آل عمران ۱۰۴] اور اُس امت کو بہترین امت کہا گیا ہے جو یہ فریضہ انجام دے [آل عمران ۱۱۰]

صبر کی تلقین سے مراد

حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہلِ ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں اُن کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔

(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد ششم، الدھر حاشیہ ۱۶، البلد حاشیہ ۱۴)

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۴۵۱ تا ۴۵۴ العصر حاشیہ ۱)

صبر کی عملی صورتیں

ہوش سنبھالنے یا ایمان لانے کے بعد سے مرتے دم تک کسی شخص کا اپنی ناجائز خواہشوں کو دبانا، اللہ کی باندھی ہوئی حدود

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی پابندی کرنا، اللہ کے عائد کیے ہوئے فرائض کو بجالانا، اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنا وقت، اپنا مال، اپنی محنتیں، اپنی قوتیں اور قابلیتیں، حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی جان تک قربان کر دینا، ہر اس لالچ اور ترغیب کو ٹھکرا دینا جو اللہ کی راہ سے ہٹانے کے لیے سامنے آئے، ہر اُس خطرے اور تکلیف کو برداشت کر لینا جو راہِ راست پر چلنے میں پیش آئے، ہر اُس فائدے اور لذت سے دست بردار ہو جانا جو حرام طریقوں سے حاصل ہو، ہر اُس نقصان اور رنج اور اذیت کو انگیز کر جانا جو حق پرستی کی وجہ سے پہنچے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اِس وعدے پر اعتماد کرتے ہوئے کرنا کہ اس نیک رویے کے ثمرات اس دنیا میں نہیں بلکہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں ملیں گے، ایک ایسا طرزِ عمل ہے جو مومن کی پوری زندگی کو صبر کی زندگی بنا دیتا ہے۔ یہ ہر وقت کا صبر ہے، دائمی صبر ہے، ہمہ گیر صبر ہے اور عمر بھر کا صبر ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۱۹۸ الدھر حاشیہ ۱۶)

ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن وانس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہِ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آجاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہوگا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اس معاشرے کے قدم چومیں گی۔ بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی۔ انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۴۴ البلد حاشیہ ۱۴)

نبی ؐ کا کام قیامِ عدل

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ (الشوریٰ ۴۲:۱۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اوران سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اُس پر ایمان لایا، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔

بالفاظ دیگر، میں اُن تفرقہ پرداز لوگوں کی طرح نہیں ہوں جو خدا کی بھیجی ہوئی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جسے خدا نے بھیجا ہے۔

[اور] مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اس جامع فقرے کے کئی مطلب ہیں:

ایک مطلب یہ ہے کہ میں ان ساری گروہ بندیوں سے الگ رہ کر بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا کام یہ نہیں ہے کہ کسی گروہ کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے اور وہ ہے سراسر عدل وانصاف کا تعلق۔ جس کی جو بات حق ہے، میں اس کا ساتھی ہوں، خواہ وہ غیروں کا غیر ہی کیوں نہ ہو اور جس کی جو بات حق کے خلاف ہے میں اس کا مخالف ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ میں جس حق کو تمھارے سامنے پیش کرنے پر مامور ہوں اس میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے بلکہ وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ اس میں اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، غریب اور امیر، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حقوق نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ ہے وہ سب کے لیے حق ہے، جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے، جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے، اور جو جرم ہے وہ سب کے لیے جرم ہے۔ اس بے لاگ ضابطے میں میری اپنی ذات کے لیے بھی کوئی استثناء نہیں۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ میں دنیا میں عدل قائم کرنے پر مامور ہوں۔ میرے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے درمیان انصاف کروں اور اُن بے اعتدالیوں اور بے انصافیوں کا خاتمہ کردوں جو تمھاری زندگیوں میں اور معاشرے میں پائی جاتی ہیں۔

ان تین مطالب کے علاوہ اس فقرے کا ایک چوتھا مطلب بھی ہے جو مکہ معظمہ میں نہ کھلا تھا مگر ہجرت کے بعد کھل گیا اور وہ یہ ہے کہ میں خدا کا مقرر کیا ہوا قاضی اور جج ہوں، تمھارے درمیان انصاف کرنا میری ذمہ داری ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۴۹۵-۴۹۶ الشوریٰ حاشیہ ۲۷-۲۸)

بقدرِ استطاعت اللہ سے ڈرنے کا حکم

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (التغابن ۶۴:۱۶)

لہٰذا جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔

قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ ''اللہ سے ایسا ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے۔'' [آل عمران ۱۰۲]۔ دوسری جگہ فرمایا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ''اللہ کسی متنفس کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف قرار نہیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دیتا۔‘‘ [البقرہ ۲۸۶] اور یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ’’جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو۔‘‘ ان تینوں آیتوں کو ملا کر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ پہلی آیت وہ معیار ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے جس تک پہنچنے کے ہر مومن کو کوشش کرنی چاہیے۔ دوسری آیت یہ اصولی بات ہمیں بتاتی ہے کہ کسی شخص سے بھی اس کی استطاعت سے زیادہ کام کرنے کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اللہ کے دین میں آدمی بس اتنے ہی کا مکلف ہے جس کی وہ مقدرت رکھتا ہو اور یہ آیت ہر مومن کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ اپنی حد تک تقویٰ کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے۔ جہاں تک بھی اس کے لیے ممکن ہو، اسے اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانے چاہییں اور اس کی نافرمانی سے بچنا چاہیے۔ اس معاملے میں اگر وہ خود تساہل سے کام لے گا تو مواخذے سے نہ بچ سکے گا۔ البتہ جو چیز اس کی مقدرت سے باہر ہو گی [اور اس کا فیصلہ اللہ ہی بہتر کر سکتا ہے کہ کیا چیز کس کی مقدرت سے واقعی باہر تھی] اس کے معاملے میں اُس سے باز پرس نہ کی جائے گی۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۵۴۶ التغابن حاشیہ ۳۱)

مومنین کی صفات

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذاریات ۵۱:۱۵تا۱۹)

البتہ متقی لوگ اس روز باغوں اور چشموں میں ہوں گے، جو کچھ ان کا رب انھیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے۔ وہ اُس دن کے آنے سے پہلے نیکوکار تھے۔ راتوں کو کم ہی سوتے تھے۔ پھر وہی رات کے پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے، اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے۔

متقین سے مراد

اس سیاق وسباق میں لفظ متقی صاف طور پر یہ معنی دے رہا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی دی ہوئی خبر پر یقین لا کر آخرت کو مان لیا اور وہ رویہ اختیار کر لیا جو حیاتِ اخروی کی کامیابی کے لیے انھیں بتایا گیا تھا اور اس روش سے اجتناب کیا جس کے متعلق انھیں بتایا گیا تھا کہ یہ خدا کے عذاب میں مبتلا کرنے والی ہے۔

راتوں کی عبادت

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ مفسرین کے ایک گروہ نے اس آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ کم ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات بھر سو کر گزار دیں اور اس کا کچھ نہ کچھ حصہ، کم یا زیادہ، ابتدائے شب میں یا وسط شب میں یا آخر شب میں، جاگ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں صرف نہ کریں۔ یہ تفسیر تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرات ابن عباسؓ، انسؓ بن مالک، محمد الباقر،

’’محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ‘‘

www.KitaboSunnat.com

مطرف بن عبداللہ، ابو العالیہ، مجاھد، قتادہ، ربیع، ابن انس وغیرھم سے منقول ہے۔ دوسرے گروہ نے اس کے معنی یہ بیان کیے ہیں کہ وہ اپنی راتوں کا زیادہ حصہ اللہ جل شانہ کی عبادت میں گزارتے تھے اور کم سوتے تھے۔ یہ قول حضرات حسن بصری، احنف بن قیس اور ابنِ شہاب زھری کا ہے اور بعد کے مفسرین ومترجمین نے اسی کو ترجیح دی ہے، کیونکہ آیت کے الفاظ اور موقع ومحل کے لحاظ سے یہی تفسیر زیادہ مناسبت رکھتی نظر آتی ہے۔ اسی لیے ہم نے ترجمے میں یہی معنی اختیار کیے ہیں۔

وہ اُن لوگوں میں سے نہ تھے جو اپنی راتیں فسق وفجور اور فواحش میں گزارتے رہے اور پھر بھی کسی استغفار کا خیال تک انھیں نہ آیا۔ اس کے برعکس ان کا حال یہ تھا کہ رات کا اچھا خاصہ حصہ عبادتِ الٰہی میں صرف کر دیتے تھے اور پھر بھی پچھلے پہروں میں اپنے رب کے حضور معافی مانگتے تھے کہ آپ کی بندگی کا جو حق ہم پر تھا، اس کے ادا کرنے میں ہم سے تقصیر ہوئی۔ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ کے الفاظ میں ایک اشارہ اس بات کی طرف بھی نکلتا ہے کہ یہ روش انھی کو زیبا تھی۔ وہی اس شانِ عبودیت کے اہل تھے کہ اپنے رب کی بندگی میں جان بھی لڑائیں اور پھر اس پر پھولنے اور اپنی نیکی پر فخر کرنے کے بجائے گڑگڑا کر اپنی کوتاہیوں کی معافی بھی مانگیں۔ یہ ان بے شرم گناہ گاروں کا رویہ نہ ہو سکتا تھا جو گناہ بھی کرتے تھے اور راو پر سے اکڑتے بھی تھے۔

حقوق العباد کی پاسداری

ایک طرف اپنے رب کا حق وہ اس طرح پہچانتے اور ادا کرتے تھے، دوسری طرف بندوں کے ساتھ ان کا معاملہ یہ تھا کہ جو کچھ بھی اللہ نے ان کو دیا تھا، خواہ تھوڑا یا بہت، اس میں وہ صرف اپنا اور اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کا یہ احساس تھا کہ ہمارے اس مال میں ہر اس بندۂ خدا کا حق ہے جو ہماری مدد کا محتاج ہو۔ وہ بندوں کی مدد خیرات کے طور پر نہیں کرتے تھے کہ اس پر اُن سے شکریے کے طالب ہوتے اور اُن کو اپنا زیر بار احسان ٹھیراتے، بلکہ وہ اسے اُن کا حق سمجھتے تھے اور اپنا فرض سمجھ کر ادا کرتے تھے، پھر ان کی یہ خدمت خلق صرف انھی لوگوں تک محدود نہ تھی جو خود سائل بن کر ان کے پاس مدد مانگنے کے لیے آتے، بلکہ جس کے متعلق بھی ان کے علم میں یہ بات آجاتی تھی کہ وہ اپنی روزی پانے سے محروم رہ گیا ہے اس کی مدد کے لیے وہ خود بے چین ہو جاتے تھے۔ کوئی یتیم بچہ جو بے سہارا رہ گیا ہو، کوئی بیوہ جس کا کوئی سر دھرا نہ ہو، کوئی معذور جو اپنی روزی کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مار سکتا ہو، کوئی شخص جس کا روزگار چھوٹ گیا ہو یا جس کی کمائی اس کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو رہی ہو، کوئی شخص جو کسی آفت کا شکار ہو گیا ہو اور اپنے نقصان کی تلافی خود نہ کر سکتا ہو، غرض کوئی حاجت مند ایسا نہ تھا جس کی حالت ان کے علم میں آئی ہو اور وہ اس کی دستگیری کر سکتے ہوں اور پھر بھی انھوں نے اس کا حق مان کر اس کی مدد کرنے سے دریغ کیا ہو۔

یہ تین صفات ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان کو متقی اور محسن قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے کہ انھی صفات نے ان کو جنت کا مستحق بنایا ہے۔ ایک یہ کہ آخرت پر ایمان لا کر انھوں نے اس روش سے پرہیز کیا جسے اللہ اور اس کے رسول نے اخروی زندگی کے لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تباہ کن بتایا تھا۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اللہ کی بندگی کا حق اپنی جان لڑا کر ادا کیا اور اُس پر فخر کرنے کے بجائے استغفار ہی کرتے رہے۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے اللہ کے بندوں کی خدمت ان پر احسان سمجھ کر نہیں بلکہ اپنا فرض اور اُن کا حق سمجھ کر کی۔

زکوٰۃ کے علاوہ مال میں حق

اس مقام پر یہ بات اور جان لینی چاہیے کہ اہلِ ایمان کے اموال میں سائل اور محروم کے جس حق کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد زکوٰۃ نہیں ہے جسے شرعاً ان پر فرض کر دیا گیا ہے، بلکہ یہ وہ حق ہے جو زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی ایک صاحب استطاعت مومن اپنے مال میں خود محسوس کرتا ہے اور اپنے دل کی رغبت سے اس کو ادا کرتا ہے بغیر اس کے کہ شریعت نے اسے لازم کیا ہو۔ ابنِ عباسؓ، مجاہد اور زید بن اسلم وغیرہ بزرگوں نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ درحقیقت اس ارشادِ الٰہی کی اصل روح یہ ہے کہ ایک متقی و محسن انسان کبھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا کہ خدا اور اس کے بندے کا جو حق میرے مال میں تھا، زکوٰۃ ادا کر کے میں اس سے بالکل سبکدوش ہو چکا ہوں، اب میں نے اس بات کا کوئی ٹھیکہ نہیں لے لیا ہے کہ ہر ننگے، بھوکے، مصیبت زدہ آدمی کی مدد کرتا پھروں۔ اس کے برعکس جو اللہ کا بندہ واقعی متقی و محسن ہوتا ہے وہ ہر وقت ہر اُس بھلائی کے لیے جو اس کے بس میں ہو، دل و جان سے تیار رہتا ہے اور جو موقع بھی اسے دنیا میں کوئی نیک کام کرنے کے لیے ملے اسے ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اس کے سوچنے کا یہ انداز ہی نہیں ہوتا کہ جو نیکی مجھ پر فرض کی گئی تھی وہ میں کر چکا ہوں، اب مزید نیکی کیوں کروں؟ نیکی کی قدر جو شخص پہچان چکا ہو وہ اسے بار سمجھ کر برداشت نہیں کرتا بلکہ اپنے ہی نفع کا سودا سمجھ کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا حریص ہو جاتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۱۳۸ تا ۱۴۰ الذاریات حواشی ۱۳ اور ۱۵ تا ۱۷)

سوالات اور ان کے جوابات

کیا موجودہ مروّج تزکیۂ نفس قرآن و حدیث کی تعلیم کے مطابق ہے؟

سوال: یہاں کی مقامی فضا تصوف کے چرچے سے معمور ہے۔ اس وجہ سے اکثر طرح طرح کے پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس وقت دو باتیں دریافت طلب ہیں۔

(الف) تزکیۂ نفس کی صحیح تعریف کیا ہے؟ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کیا تھی؟ متصوفین کا اس سلسلے میں صحیح عمل کیا رہا ہے؟ نیز ایک مسلمان کو اپنی زندگی کے اس شعبے میں کیا صورت اختیار کرنی چاہیے؟

(ب) کیا صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آج کل کے صوفیا کی طرح تزکیۂ نفس کیا کرتے تھے اور عالم بالا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے مشاہدات ہوتے رہتے تھے؟

جواب: سوال کے پہلے جزو کے جواب میں یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ عربی زبان میں تزکیہ کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک پاک صاف کرنا۔ دوسرے بڑھانا اور نشوونما دینا۔ اس لفظ کو قرآن مجید میں بھی انھی دونوں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پس تزکیے کا عمل دو اجزا سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ نفس انسانی کو انفرادی طور پر اور سوسائٹی کو اجتماعی طور پر ناپسندیدہ صفات اور بری رسوم وعادات سے پاک صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ پسندیدہ صفات کے ذریعے سے اس کو نشوونما دیا جائے۔

اگر آپ قرآن مجید کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں اور حدیث میں اور کچھ نہیں تو صرف مشکوٰۃ ہی پر اس خیال سے نظر ڈال لیں تو آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ کون سی ناپسندیدہ صفات ہیں جن کو اللہ اور اس کا رسول دور کرنا چاہتے ہیں اور وہ کون سی پسندیدہ صفات ہیں جن کو وہ افراد اور سوسائٹی میں ترقی دینا چاہتے ہیں۔ نیز قرآن وحدیث کے مطالعہ ہی سے آپ کو اُن تدابیر کی بھی پوری تفصیل معلوم ہو جائے گی جو اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں اور اس کے رسول نے استعمال کی ہیں۔

اہلِ تصوف میں ایک مدت سے تزکیۂ نفس کا جو مفہوم رائج ہو گیا ہے اور اس کے جو طریقے عام طور پر ان میں چل پڑے ہیں وہ قرآن وسنت کی تعلیم سے بہت ہٹے ہوئے ہیں۔

دوسرے جزو کا جواب یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے تو عالم بالا کے معاملے میں صرف رسول کے اعتماد پر غیب کی ساری حقیقتوں کو مان لیا تھا اس لیے مشاہدے کی نہ ان کو طلب تھی اور نہ اس کے لیے انھوں نے کوئی سعی کی۔ وہ بجائے اس کے کہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانکنے کی کوشش کرتے، اپنی ساری قوتیں اس جدوجہد میں صرف کرتے تھے کہ پہلے اپنے آپ کو اور پھر ساری دنیا کو خدائے واحد کا مطیع بنائیں اور دنیا میں عملاً وہ نظامِ حق قائم کر دیں جو برائیوں کو دبانے اور بھلائیوں کو نشوونما دینے والا ہو۔

(رسائل و مسائل حصہ اوّل ص ۲۲۱ تا ۲۲۳ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن رجب شعبان ۱۳۶۴ھ جولائی اگست ۱۹۴۵ء)

کیا صحابہ کرامؓ پر تنقید جائز ہے؟

سوال: کیا صحابہ کرام پر تنقید جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو حدیث الله الله فی اصحابی اور اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم کا کیا جواب ہوگا؟ [رسائل ومسائل حصہ سوم ص ۷۶-۷۷]

جواب: تنقید کا لفظ جس معنی میں آپ نے اپنے اعتراض میں استعمال فرمایا ہے اس معنی میں تو صحابہ کرام کجا، کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کے انسان پر بھی تنقید کرنا میرے نزدیک سخت گناہ ہے۔ البتہ تنقید کے جو معنی اہلِ علم میں معلوم ومعروف ہیں ان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

میں اللہ تعالیٰ اور انبیائے کرام کے سوا کسی انسان کو بھی میں تنقید سے بالاتر نہیں مانتا۔ کسی صحابی کا قول یا فعل بھی محض اپنے قائل و فاعل کی شخصیت کی بنا پر حجت نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل دیکھ کر رائے قائم کی جائے گی کہ آیا اسے قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ دلیل کے لحاظ سے کسی بات کو جانچنے کا نام ہی تنقید ہے اور یہ تنقید مجھے نہیں معلوم کہ کس زمانے میں ناجائز رہی ہے۔ فقہ کے بکثرت مسائل میں مختلف صحابہ کے مختلف قولی اور عملی آثار پائے جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تابعین اور تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین نے دلیل کی بنا پر ان میں سے کسی کو قبول اور کسی کو رد کیا ہے۔ آپ فقہ کی مبسوط کتابوں میں سے جس کو چاہیں اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو اس تنقید کی ہزاروں مثالیں مل جائیں گی۔ کیا وہ سب لوگ آپ کے نزدیک گناہ گار تھے جنھوں نے صحابہ کے مختلف اقوال و افعال میں اس طرح تنقیدی محاکمہ کیا؟

اصحابی کالنجوم[1] والی حدیث کا اگر آپ نے یہ مطلب لیا ہے کہ ہر صحابی کا ہر قول و فعل واجب الاتباع ہے تو سلف وخلف میں کوئی صاحب علم بھی مجھ کو اس کا قائل نہیں ملا۔ آپ کو ملا ہو تو اس کا نام مجھے بھی بتائیں۔ البتہ ساری امت اپنے دین کے ہر مسئلے میں بہر حال کسی نہ کسی صحابی کے ذریعے ہی سے رہنمائی حاصل کرتی رہی ہے اور یہی اس حدیث کا منشا ہو سکتا ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۱۰۱-۱۰۲ بحوالہ ترجمان القرآن رمضان ۱۳۷۵ھ مئی ۱۹۵۶ء)

گھریلو زندگی کی خصوصیات

سوال: نمونے کی اسلامی گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ کیا موجودہ گھریلو زندگی اسلامی ہے؟ کیا شہر اور گاؤں میں ایک طرز کی گھریلو زندگی ہوگی؟ موجودہ گھریلو زندگی میں پرانی ہندستانی روایات کا کتنا عمل دخل ہے؟

جواب: ہماری گھریلو زندگی کی بنیادی خصوصیات اسلام کی رو سے چار ہیں۔ ایک تحفظ نسب، جس کی خاطر زنا کو حرام اور جرم قابل تعزیر قرار دیا گیا ہے۔ پردے کے حدود قائم کیے گئے ہیں اور زن و مرد کے تعلق کو صرف جائز قانونی صورتوں تک محدود کر دیا گیا ہے جن سے تجاوز کا اسلام کسی حال میں بھی روادار نہیں ہے۔ دوسرے تحفظِ نظام عائلہ جس کے لیے مرد کو گھر کا قوام بنایا گیا ہے، بیوی اور اولاد کو اس کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور اولاد پر خدا کے بعد والدین کا حق سب سے زیادہ رکھا گیا ہے۔ تیسرے حسن معاشرت جس کی خاطر زن و مرد کے حقوق معین کر دیے گئے ہیں، مرد کو طلاق کے اور عورت کو خلع کے اور عدالتوں کو تفریق کے اختیارات دیئے گئے ہیں اور الگ ہونے والے مرد و زن کے نکاح ثانی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی ہے تاکہ زوجین یا تو حسن سلوک کے ساتھ رہیں، یا اگر باہم نہ نباہ سکتے ہوں تو بغیر کسی خرابی کے الگ ہو کر دوسرا بہتر خاندان بنا سکیں۔ چوتھے صلۂ رحمی جس سے مقصود رشتہ داروں کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنانا ہے اور اس غرض کے لیے ہر انسان پر اجنبیوں کی بہ نسبت

[1] واضح رہے کہ اس حدیث کی سند نہایت کمزور ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے رشتہ داروں کے حقوق مقدم رکھے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس بہترین نظام عائلہ کی قدر نہ پہچانی اور اس کی خصوصیات سے بہت کچھ دور ہٹ گئے ہیں۔ اس نظام عائلہ کے اصولوں میں شہری اور دیہاتی کے لیے کوئی فرق نہیں ہے۔ رہے طرز زندگی کے مظاہر تو وہ ظاہر ہے کہ شہروں میں بھی یکساں نہیں ہو سکتے، کجا کہ شہریوں اور دیہاتیوں کے درمیان کوئی یکسانیت ہو سکے۔ فطری اسباب سے ان میں جو فرق بھی ہو وہ اسلام کے خلاف نہیں بشرطیکہ بنیادی اصولوں میں ردوبدل نہ ہو۔

(رسائل و مسائل حصہ چہارم ص ۵۳-۱۵۴ اشاعت اول بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۵۱ عدد ۶ مارچ ۱۹۵۹ء)

مہاجر مومن خواتین سے حضورؐ کا بیعت لینے کا طریقہ

يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى أَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ أَيْدِيْهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (الممتحنہ ۶۰:۱۲)

اے نبیؐ، جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

یہ آیت فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو قریش کے لوگ جُوق درجُوق حضورؐ سے بیعت کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ آپؐ نے مردوں سے کوہِ صفا پر خود بیعت لی اور حضرت عمرؓ کو اپنی طرف سے مامور فرمایا کہ وہ عورتوں سے بیعت لیں اور ان باتوں کا اقرار کرائیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں [ابن جریر بروایت ابن عباسؓ، ابن ابی حاتم بروایت قتادة) پھر مدینہ واپس تشریف لے کر آپؐ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمرؓ کو ان سے بیعت لینے کے لیے بھیجا [ابن جریر، ابن مردویہ، بزار، ابن حبان، بروایت ام عطیہ انصاریہ]۔ عید کے روز بھی مردوں کے درمیان خطبہ دینے کے بعد آپ عورتوں کے مجمع کی طرف تشریف لے گئے اور وہاں اپنے خطبے کے دوران میں آپؐ نے یہ آیت تلاوت کر کے ان باتوں کا عہد لیا جو اس آیت میں مذکور ہوئی ہیں [بخاری، بروایت ابنِ عباس] ان مواقع کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں عورتیں فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتی رہیں جن کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۴۴۵ الممتحنہ حاشیہ ۱۸)

شوہر کے مال سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرنا

وَلَا يَسْرِقْنَ چوری نہ کریں گی۔ مکہ معظمہ میں جب عورتوں سے بیعت لی جا رہی تھی اُس وقت حضرت ابوسُفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے اس حکم کی تشریح دریافت کرتے ہوئے حضورؐ سے عرض کیا، یارسول اللہ، ابوسفیان ذرا بخیل آدمی ہیں، کیا میرے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اوپر اس میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنی اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ان سے پوچھے بغیر ان کے مال میں سے کچھ لے لیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا نہیں، مگر بس معروف کی حد تک۔ یعنی بس اتنا مال لے لو جو فی الواقع جائز ضروریات کے لیے کافی ہو۔ [احکام القرآن، ابنِ عربی]

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۴۴۵ الممتحنہ حاشیہ ۱۹)

قطع رحمی [سے متعلق اسلامی احکام]

وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ۔ (محمد ۴۷: ۲۲)

اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔

یہ آیت اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ اسلام میں قطع رحمی حرام ہے۔ دوسری طرف مثبت طریقے سے بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات[1] پر رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کو بڑی نیکیوں میں شمار کیا گیا ہے اور صلۂ رحمی کا حکم دیا گیا ہے۔ رحم کا لفظ عربی زبان میں قرابت اور رشتہ داری کے لیے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ ایک شخص کے تمام رشتے دار، خواہ وہ دور کے ہوں یا قریب کے، اس کے ذوی الارحام ہیں جس سے جتنا زیادہ قریب کا رشتہ ہو اس کا حق آدمی پر اتنا ہی زیادہ ہے اور اس سے قطع رحمی کرنا اتنا ہی بڑا گناہ ہے۔ صلۂ رحمی یہ ہے کہ اپنے رشتے دار کے ساتھ جو نیکی کرنا بھی آدمی کی استطاعت میں ہو اس سے دریغ نہ کرے اور قطع رحمی یہ ہے کہ آدمی اس کے ساتھ بُرا سلوک کرے، یا جو بھلائی کرنا اس کے لیے ممکن ہو اس سے قصداً پہلوتہی کرے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی آیت سے استدلال کر کے ام ولد کی بیع کو حرام قرار دیا تھا اور صحابہ کرام نے اس سے اتفاق فرمایا تھا۔ حاکم نے مُستدرک میں حضرت بُرَیدہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک روز میں حضرت عمرؓ کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ یکایک محلے میں شور مچ گیا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ لونڈی فروخت کی جارہی ہے اور اس کی لڑکی رو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسی وقت انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ جو دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں کیا اس میں آپ حضرات کو قطع رحمی کا بھی کوئی جواز ملتا ہے؟ سب نے کہا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ کے ہاں ماں کو بیٹی سے جدا کیا جارہا ہے؟ اس سے بڑی قطع

---

① وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ [البقرۃ ۲: ۸۳]

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ۔ [البقرہ ۲: ۱۷۷]

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ [النساء ۴: ۸]

بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ۔ [النساء ۴: ۳۶]

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ الآیۃ [النحل ۱۶: ۹۰]

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ۔ الآیۃ [بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶]

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِى الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ [النور ۲۴: ۲۲]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

رحمی اور کیا ہوسکتی ہے؟ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ لوگوں نے کہا آپ کی رائے میں اس کو روکنے کے لیے جو صورت مناسب ہو وہ اختیار فرمائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے تمام بلاد اسلامیہ کے لیے یہ فرمان عام جاری کر دیا کہ کسی ایسی لونڈی کو فروخت نہ کیا جائے جس سے اس کے مالک کے ہاں اولاد پیدا ہو چکی ہو، کیونکہ یہ قطع رحمی ہے اور یہ حلال نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۲۷-۲۸ محمد حاشیہ ۳۴)

باغی کے لیے دعائے استغفار کی ممانعت

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَ لَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ۝ (التوبہ ۹:۱۱۳)

نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، زیبا نہیں ہے کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا کریں، چاہے وہ ان کے رشتے دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ ان پر یہ بات کھل چکی ہے کہ وہ جہنم کے مستحق ہیں۔

کسی شخص کے لیے معافی کی درخواست لازماً یہ معنی رکھتی ہے کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابلِ معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملے میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گناہ گار ہو۔ لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو اس کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری اپنی وفاداری مشتبہ ہو جاتی ہے اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتے دار ہے، یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتے داری کا تعلق خدا کی وفاداری کے مقتضیات کی بہ نسبت زیادہ قیمتی ہے، اور یہ کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے، اور یہ کہ جو لاگ ہم نے خدا کے باغیوں کے ساتھ لگا رکھی ہے ہم چاہتے ہیں کہ خدا خود بھی اسی لاگ کو قبول کرلے اور ہمارے رشتے دار کو تو ضرور بخش دے خواہ اسی جرم کا ارتکاب کرنے والے دوسرے مجرموں کو جہنم میں جھونک دے۔ یہ تمام باتیں غلط ہیں، اخلاص اور وفاداری کے خلاف ہیں اور اُس ایمان کے منافی ہیں جس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا اور اس کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو، خدا کا دوست ہمارا دوست ہو اور اس کا دشمن ہمارا دشمن۔ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دعا نہ کرو، بلکہ یوں فرمایا ہے کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے زیبا محسوس نہ ہو۔

یہاں اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کے باغیوں کے ساتھ جو ہمدردی ممنوع ہے وہ صرف وہ ہمدردی ہے جو دین کے معاملے میں دخل انداز ہوتی ہو۔ رہی انسانی ہمدردی اور دنیوی تعلقات میں صلۂ رحمی، مُواساۃ اور رحمت و شفقت کا برتاؤ تو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ممنوع نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ رشتے دار خواہ کافر ہو یا مومن، اس کے دنیوی حقوق ضرور ادا کیے جائیں گے۔ مصیبت زدہ انسان کی بہر حال مدد کی جائے گی۔ حاجت مند آدمی کو بہر صورت سہارا دیا جائے گا۔ بیمار اور زخمی کے ساتھ ہمدردی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی جائے گی۔ یتیم کے سر پر یقیناً شفقت کا ہاتھ رکھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں ہرگز یہ امتیاز نہ کیا جائے گا کہ کون مسلم ہے اور کون غیر مسلم۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۴۱-۲۴۲ التوبہ حاشیہ ۱۱۱)

قرعہ اندازی [جواز]

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ۔ (المائدہ ۵:۳)

نیز یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔

اس آیت میں جس چیز کو حرام کیا گیا ہے اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے:

(۱) مشرکانہ فال گیری، جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے، یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے، یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکینِ مکہ نے اس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہُبَل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو، یا خون کے مقدمے کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو، اس کے لیے ہُبَل کے پانسہ دار [صاحب القداح] کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ داران تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا، اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہُبَل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

(۲) توہم پرستانہ فال گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی و خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلۂ غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جفر، مختلف قسم کے شگون اور نچھتر اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(۳) جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیا کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمہ کے بہت سے حل صحیح ہیں، مگر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بناپرنہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحب معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلے کا مدار رکھا جا سکتا ہے یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آجاتی تھی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۴۲-۴۴۳ المائدہ حاشیہ ۱۴)

راجہ کی غائبانہ سلامی کا شرعی حکم

سوال: سکول میں ڈرل کے بعد مہاراجہ صاحب کی سلامی بینڈ پر اتاری جاتی ہے۔ یہ غائبانہ سلامی ہے اور اسے وفاداری کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ میں نے ایک بندے کو خدا کی معبودیت میں شریک ماننے سے قولاً و عملاً انکار کیا ہے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے غور کے لیے مہلت دی ہے۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں۔

جواب: آپ سلامی تو بہر حال نہ دیں، خواہ انجام کچھ بھی ہو، لیکن اپنی حد تک اس معاملے کو بخیر و خوبی ٹالنے کی کوشش کریں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر کو بہت ٹھنڈے طریقے سے یہ سمجھانے کی کوشش کیجیے کہ وہ اس معاملے کو طول دینے سے خود احتراز کرے۔ اگر آپ سلامی کے موقع پر ٹل جایا کریں اور ہیڈ ماسٹر اس کو خاموشی کے ساتھ نظر انداز کرتا رہے تو بات چھوٹی رہے گی۔ لیکن اگر وہ مجبور کرے گا اور آپ کے انکار پر باز پرس کرے گا تو کیا عجب کہ بات طول کھینچ جائے اور نہ صرف آپ کے مدرسہ میں بلکہ ساری ریاست میں اس کا اثر پھیل جائے۔ یہی پہلو آپ ہیڈ ماسٹر کو سمجھا دیجیے گا۔ اگر عقلمند ہوگا تو وہ خود خاموشی اختیار کرلے گا، ورنہ اس کو آخری مرحلے تک پہنچ جانے دیجیے اور سمجھیے کہ شاید آپ ہی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اس ریاست میں اس پیغام کو پھیلانے کا ایک موقع پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت پیش آجانے کے بعد اپنے آپ کو اچھی طرح تول لیجیے کہ پھر ذرا برابر کمزوری کا اظہار نہ ہونے پائے خواہ ملازمت سے برطرفی کی نوبت آئے یا ریاست سے اخراج کی۔ میں بھی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آپ کے لیے استقامت کی دعا کرتا ہوں۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۲۷-۲۲۸ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن رجب شعبان ۱۳۶۲ھ جولائی اگست ۱۹۴۴ء)

گری پڑی چیز کو اٹھانا

اگر کوئی ایسی چیز ہو جس کے جلد خراب ہو جانے کا خطرہ ہو مثلاً کوئی سبزی یا فروٹ یا کھانے پینے کی کوئی چیز جس کے سڑنے گلنے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

مولانا نے فرمایا اگر ایسی کوئی چیز ہو تو خود امانت کی ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ اسے سرنے گلنے نہ دیا جائے۔ اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ اس کے ضائع ہونے سے پہلے اسے فروخت کر دیا جائے اور اس کی قیمت کا حساب لگا کر اسے استعمال کر لیا جائے اور جب اصل مالک آ جائے تو اسے وہ رقم دے دی جائے۔

ایک صاحب نے کہا: اور اگر راستے میں کوئی چیز مثلاً نقدی، روپیہ وغیرہ پڑا مل جائے تو کیا اسے اٹھایا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے مالک کو تلاش کرنا تو ممکن نہیں۔

مولانا نے فرمایا: آخر آپ اسے اٹھائیں ہی کیوں؟ جب اسے اٹھانے کے بعد آپ اسے حق دار تک نہیں پہنچا سکتے تو صحیح صورت یہ ہے کہ اسے وہیں رہنے دیں۔ اس صورت میں تو اس کا امکان ہو سکتا ہے کہ اس کا مالک اسے تلاش کرتا ہوا وہاں آ پہنچے۔ لیکن اٹھا لے جانے کے بعد یہ گنجائش بھی ختم ہو جاتی ہے۔

(۵-اے ذیلدار پارک، مرتبہ مظفر بیگ، مطبوعہ البدر پبلی کیشنز، طبع اول ۱۹۷۸ء، ص ۵۴)

❁❁❁❁❁❁❁

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

حقوقِ یتامیٰ

یتیموں کے بارے میں قرآن مجید کے احکامات

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (الانعام ۶:۱۵۲)

اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہترین ہو، یہاں تک کہ وہ اپنے رُشد کو پہنچ جائے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (الاسراء ۱۷:۳۴)

مال یتیم کے پاس نہ پھٹکو مگر احسن طریقے سے یہاں تک کہ وہ اپنے شباب کو پہنچ جائے۔[1]

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ○ (الفجر ۸۹:۱۷)

ہرگز نہیں بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ (الضحیٰ ۹۳:۹)

لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو۔

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ○ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ○ (الماعون ۱۰۷:۱-۲)

تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ (الدھر ۷۶:۸)

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ ○ يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ○ (البلد ۹۰:۱۵)

۱۔ یہ بھی محض ایک اخلاقی ہدایت نہ تھی، بلکہ آگے چل کر جب اسلامی حکومت قائم ہوئی تو یتامیٰ کے حقوق کی حفاظت کے لیے انتظامی اور قانونی، دونوں طرح کی تدابیر اختیار کی گئیں، جن کی تفصیل ہم کو حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اسی سے یہ وسیع اصول اخذ کیا گیا کہ اسلامی ریاست اپنے اُن تمام شہریوں کے مفاد کی محافظ ہے جو اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنے کے قابل نہ ہوں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: اَنَا وَلِيُّ مَنْ لَّا وَلِيَّ لَهٗ، میں ہر اس شخص کا سرپرست ہوں جس کا کوئی سرپرست نہ ہو۔ اسی طرف اشارہ کرتا ہے اور یہ اسلامی قانون کے ایک وسیع باب کی بنیاد ہے۔ (تفہیم القرآن، دوم، ص ۶۱۵، بنی اسرائیل حاشیہ ۳۸)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یا فاقے کے دن کسی قریبی یتیم کو کھانا کھلانا۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ۝ (الضحیٰ ۹۳:۶)

کیا اس نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا۔

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی۔ (البقرہ ۲:۸۳)

اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ، رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ۔ (البقرہ ۲:۱۷۷)

اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر اور مسکینوں پر خرچ کرے۔

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ۔ (البقرہ ۲:۲۱۵)

جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرو۔

وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ (البقرہ ۲:۲۲۰)

پوچھتے ہیں: یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہو: جس طرزِ عمل میں ان کے لیے بھلائی ہو وہی اختیار کرنا بہتر ہے۔

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰۤی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۪ (النساء ۴:۲)

یتیموں کے مال ان کو واپس دو، اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ۔ (النساء ۴:۳)

اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان سے نکاح کر لو۔

وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ۔ (النساء ۴:۶)

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کے قابل عمر کو پہنچ جائیں۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ۔ (النساء ۴:۸)

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبے کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ۔ (النساء ۴:۱۰)

جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں۔

وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ۔ (النساء ۴:۳۶)

ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔

قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِیْهِنَّ ۙ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ۔ (النساء ۴:۱۲۷)

کہو اللہ تمھیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے۔

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی۔ (الانفال ۸:۴۱)

اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتے داروں اور یتیموں کے لیے ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ (الحشر ۵۹:۷)

وہ اللہ اور رسولؐ اور رشتے داروں اور یتامیٰ اور مساکین کے لیے ہے۔

حقوق یتامیٰ اور تعدد ازواج

وَاٰتُوا الْیَتٰمٰٓی اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِیْثَ بِالطَّیِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓی اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِیْرًا ۝ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (النساء ۴:۲-۳)

یتیموں کے مال اُن کو واپس دو، اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو، اور اُن کے مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھا جاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کرلو۔ لیکن اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ ان کے ساتھ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی کرو۔

[یتیموں کے مال اُن کو واپس دو] یعنی جب تک وہ بچے ہیں اُن کے مال انھی کے مفاد پر خرچ کرو اور جب بڑے ہو جائیں تو جو ان کا حق ہے وہ انھیں واپس کردو۔

[اچھے مال کو بُرے مال سے نہ بدل لو] جامع فقرہ ہے جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ حلال کی کمائی کی بجائے حرام خوری نہ کرنے لگو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یتیموں کے اچھے مال کو اپنے بُرے مال سے نہ بدل لو۔

[اور اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو............] اس کے تین مفہوم اہل تفسیر نے بیان کیے ہیں۔

(۱) حضرت عائشہؓ اس کی تفسیر میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں ہوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سر دھرا تو ہے نہیں، جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے، وہ ان کے ساتھ خود نکاح کرلیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کرسکو گے تو دوسری عورتیں دنیا میں موجود ہیں، ان میں سے جو تمھیں پسند آئیں ان کے ساتھ نکاح کرلو۔ اسی سورہ میں انیسویں رکوع کی پہلی آیت اس تفسیر کی تائید کرتی ہے۔

وَیَسْتَفْتُوْنَكَ فِی النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْكُمْ فِیْهِنَّ ۙ وَمَا یُتْلٰی عَلَیْكُمْ فِی الْكِتٰبِ فِیْ یَتٰمَی النِّسَآءِ الّٰتِیْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْیَتٰمٰی بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِیْمًا ۝ (النساء ۴:۱۲۷)

لوگ تم سے عورتوں کے معاملے میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمھیں ان کے معاملے میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جارہے ہیں۔ یعنی وہ احکام جو ان یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو [یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کرلینا چاہتے ہو]، اور وہ احکام جو ان بچوں کے متعلق ہیں جو بے چارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمھیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف پر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کرو گے وہ اللہ کے علم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

یتامیٰ کے بارے میں انصاف کی تلقین

یہ اصل استفتاء کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو اسی سورہ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچوں کے متعلق بالعموم ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دور کوعوں میں ان کے حقوق کے تحفظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی ہے مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطور خود چھیڑ دیا گیا۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۰۱ النسآء حاشیہ ۱۵۳)

(۲) ابنِ عباسؓ اور ان کے شاگرد عکرمہ اس کی تفسیر یہ بیان کرتے ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا اور جب اس کثرت ازدواج سے مصارف بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے یتیم بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے بے بس عزیزوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نکاح کے لیے چار کی حد مقرر کر دی اور فرمایا کہ ظلم و بے انصافی سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ ایک سے لے کر چار تک اتنی بیویاں کرو جن کے ساتھ تم عدل پر قائم رہ سکو۔

(۳) سعید بن جبیر اور قتادہ اور بعض دوسرے مفسرین کہتے ہیں کہ جہاں تک یتیموں کا معاملہ ہے اہل جاہلیت بھی ان کے ساتھ بے انصافی کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن عورتوں کے معاملے میں ان کے ذہن عدل و انصاف کے تصور سے خالی تھے۔ جتنی چاہتے تھے شادیاں کر لیتے تھے اور پھر ان کے ساتھ ظلم و جور سے پیش آتے تھے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو عورتوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے سے ڈرو۔ اول تو چار سے زیادہ نکاح ہی نہ کرو اور اس چار کی حد میں بھی بس اتنی بیویاں رکھو جن کے ساتھ انصاف کر سکو۔

آیت کے الفاظ ان تینوں تفسیروں کے متحمل ہیں اور عجب نہیں کہ تینوں مفہوم مراد ہوں۔ نیز اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہوں۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۲۰-۳۲۱ النساء حاشیہ ۲-۳-۴)

جاہلیت کے دور میں اہلِ عرب کا یتیم کے ساتھ سلوک

أَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ (الماعون ۱۰۷: ۱-۲)

تم نے دیکھا اُس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اصل میں یَدُعُّ الْیَتِیْمَ کا فقرہ استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ یتیم کا حق مار کھاتا ہے اور اس کے باپ کی چھوڑی ہوئی میراث سے بے دخل کر کے اسے دھکے مار کر نکال دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یتیم اگر اس سے مدد مانگنے آتا ہے تو رحم کھانے کے بجائے اسے دھتکار دیتا ہے اور پھر بھی اگر وہ اپنی پریشان حالی کی بنا پر رحم کی امید لیے ہوئے کھڑا رہے تو اسے دھکے دے کر دفع کر دیتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ یتیم پر ظلم ڈھاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں اگر اس کا اپنا ہی کوئی رشتے دار یتیم ہو تو اس کے نصیب میں سارے گھر کی خدمت گاری کرنے اور بات بات پر جھڑکیاں اور ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ بریں اس فقرے میں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ اُس شخص سے کبھی کبھار یہ ظالمانہ حرکت سرزد نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کی عادت اور اس کا مستقل رویہ یہی ہے۔ اُسے یہ احساس ہی نہیں ہے کہ یہ کوئی بُرا کام ہے جو وہ کر رہا ہے بلکہ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ یہ روش اختیار کیے رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یتیم ایک بے بس اور بے یار و مددگار مخلوق ہے، اس لیے کوئی حرج نہیں اگر اس کا حق مار کھایا جائے، یا اسے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنا کر رکھا جائے، یا وہ مدد مانگنے کے لیے آئے تو اسے دھتکار دیا جائے۔

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اَعْلَامُ النُّبُوَّۃ میں لکھا ہے۔ ابوجہل ایک یتیم کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے مگر اس ظالم نے اس کی طرف توجہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پلٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہِ شرارت اس سے کہا کہ محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابوجہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ ناواقف تھا کہ ابوجہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بدبخت اُسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپؐ سے بیان کیا۔ آپؐ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابوجہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کر اس نے آپ کا استقبال کیا اور جب آپؐ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو، تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لا کر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاک میں لگے ہوئے تھے کہ دیکھیں، ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی مزے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے مگر جب انھوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابوجہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم، میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دائیں اور بائیں ایک حربہ ہے جو میرے اندر گھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور معزز قبیلے تک کے بڑے بڑے سرداروں کا یتیموں اور دوسرے بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپؐ کے اس اخلاق کا آپؐ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا رُعب تھا۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۴۸۲-۴۸۳ الماعون حاشیہ ۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سورہ الفجر میں ارشاد ہے:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ ○ (الفجر ۸۹:۱۷)

ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے۔

یعنی جب تک اس کا باپ زندہ رہتا ہے، اس کے ساتھ تمھارا برتاؤ کچھ اور ہوتا ہے اور جب اُس کا باپ مر جاتا ہے تو ہمسایے اور دور کے رشتہ دار تو درکنار چچا اور ماموں اور بڑے بھائی تک اُس سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۳۱ الفجر حاشیہ ۱۱)

یتیم پر ظلم اور زیادتی کی ممانعت

فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ ○ (الضحیٰ ۹۳:۹)

لہٰذا یتیم پر سختی نہ کرو۔

یعنی تم چونکہ خود یتیم رہ چکے ہو اور اللہ نے تم پر یہ فضل فرمایا کہ یتیمی کی حالت میں بہترین طریقے سے تمھاری دست گیری کی، اس لیے اس کا شکرانہ یہ ہے کہ تمھارے ہاتھ سے کبھی کسی یتیم پر ظلم اور زیادتی نہ ہونے پائے۔[1]

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۷۴ الضحیٰ حاشیہ ۹)

۱۔ یتامیٰ کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور دوسرے احکامات تفہیم احکام القرآن جلد سوم، ص ۵۱۴، ۵۱۵ پر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باب نہم

متفرق احکام ومسائل

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل اول

اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ضمناً ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے ''اے نبیؐ اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو۔'' یہ الفاظ ان لوگوں کے قول کی قطعی تردید کر دیتے ہیں جو خدا سے بے خوف ہو کر بے تکلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضورؐ کی اپنی صلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیلڑ تھیں۔ یہ لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسول کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کی کیسی سخت جواب دہی انھیں آخرت میں کرنی ہوگی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضورؐ کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہ ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں۔ حضورؐ کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق حضرت خدیجہؓ سے حضورؐ کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: ابراہیم کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انھی کے بطن سے پیدا ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں۔ قاسم اور طاہر و طیب اور زینب اور ام کلثوم اور فاطمہ۔ [سیرت ابن ہشام، جلد اول ص ۲۰۲] مشہور ماہر علم انساب ہشام بن محمد بن السائب کلبی کا بیان ہے کہ: مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے، پھر زینبؓ، پھر رقیہؓ، پھر ام کلثوم [طبقات ابن سعد، جلد اول ص ۱۳۳] ابن حزم نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے حضورؐ کی چار لڑکیاں تھیں، سب سے بڑی حضرت زینبؓ، ان سے چھوٹی رقیہؓ، ان سے چھوٹی فاطمہؓ اور ان سے چھوٹی ام کلثومؓ [ص ۳۸-۳۹] طبری، ابن سعد، ابو جعفر محمد بن حبیب صاحب کتاب المحبر اور ابن عبدالبر صاحب کتاب الاستیعاب، مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہؓ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ ایک ابو ہالہ تمیمی جس سے ان کے ہاں ہند بن ابو ہالہ پیدا ہوئے۔ دوسرے عتیق بن عائذ مخزومی جس سے ان کے ہاں ایک لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضورؐ سے ہوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپ کی صلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ [ملاحظہ ہو طبری، جلد ۲، ص ۴۱۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸، ص ۱۴ تا ۱۶۔ کتاب المحبر ص ۷۸-۷۹، ۴۵۲۔ الاستیعاب جلد ۲ ص ۷۱۸۔ ان تمام بیانات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو قرآن مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضورؐ کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں]۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۳۰-۱۳۱ الاحزاب حاشیہ ۱۱۰)

کیا اہلِ بیت میں بیویاں شامل ہیں

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ (الاحزاب ۳۳:۳۳)

اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔

جس سیاق و سباق میں یہ آیت وارد ہوئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں اہل البیت سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔ کیونکہ خطاب کا آغاز ہی یا نساء النبی کے الفاظ سے کیا گیا ہے اور ماقبل و مابعد کی پوری تقریر میں وہی مخاطب ہیں۔ علاوہ بریں ''اہل البیت'' کا لفظ عربی زبان میں ٹھیک انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم ''گھر والوں'' کا لفظ بولتے ہیں اور اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے دونوں شامل ہوتے ہیں۔ بیوی کو مستثنیٰ کر کے ''اہل خانہ'' کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ خود قرآن میں بھی اس مقام کے سوا دو مزید مقامات پر یہ لفظ آیا ہے اور دونوں جگہ اس کے مفہوم میں بیوی شامل بلکہ مقدم ہے۔ سورۂ ہود میں جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے سن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ۔ ''کیا تم اللہ کے امر پر تعجب کرتی ہو؟ اس گھر کے لوگو، تم پر تو اللہ کی رحمت ہے اور اس کی برکتیں ہیں۔'' سورۂ قصص میں جب حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچتے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی انا کی تلاش ہوتی ہے جس کا دودھ بچہ پی لے تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جا کر کہتی ہیں هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ ''کیا میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتہ دوں جو تمھارے لیے اس بچے کی پرورش کا ذمہ لیں؟'' پس محاورہ اور قرآن کے استعمالات اور خود اس آیت کا سیاق و سباق، ہر چیز اس بات پر قطعی دلالت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت میں آپ کی ازواج مطہرات بھی داخل ہیں اور آپ کی اولاد بھی۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ آیت کا اصل خطاب ازواج سے ہے اور اولاد مفہوم لفظ کے اعتبار سے اس میں شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بنا پر ابن عباسؓ اور عروہؓ بن زبیر اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں اہل البیت سے مراد ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ''اہل البیت'' کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوا ہے اور اس میں دوسرا کوئی داخل نہیں ہوسکتا، تو یہ بات بھی غلط ہوگی۔ صرف یہی نہیں کہ ''گھر والوں'' کے لفظ میں آدمی کے سب اہل و عیال شامل ہوتے ہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔ ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا تسالنی عن رجل کان من احب الناس الی رسول اللہ صلی اللہ

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

علیه وسلم و کانت تحته ابنته و احب الناس الیه ''تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضور کی وہ بیٹی تھی جو آپ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔'' اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضور نے حضرت علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَآءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَطَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا '' خدایا، یہ میرے اہل بیت ہیں، ان سے گندگی کو دور کر دے اور انھیں پاک کر دے۔'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا میں بھی تو آپ کے اہل بیت میں سے ہوں (مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کر کے میرے حق میں دعا فرمائیں)۔ حضورؐ نے فرمایا: ''تم الگ رہو، تم تو خیر ہی ہو۔'' اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث مسلم، ترمذی، احمد، ابن جریر، حاکم، بیہقی وغیرہ محدثین نے ابوسعید خدریؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت واثلہ بن اسقع اور بعض دوسرے صحابہؓ سے نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحبزادوں کو اپنا اہل البیت قرار دیا۔ لہٰذا ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو ان حضرات کو اس سے خارج ٹھیراتے ہیں۔

اسی طرح اُن لوگوں کی رائے بھی غلط ہے جو مذکورۂ بالا احادیث کی بنیاد پر ازواجِ مطہرات کو اہل البیت سے خارج ٹھیراتے ہیں۔ اول تو جو چیز صراحۃً قرآن سے ثابت ہو اس کو کسی حدیث کے بل پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے، خود ان احادیث کا مطلب بھی وہ نہیں ہے جو ان سے نکالا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چادر کے نیچے نہیں لیا جس میں حضورؐ نے ان چاروں اصحاب کو لیا تھا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضورؐ نے ان کو اپنے'' گھر والوں'' سے خارج قرار دیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیویاں تو اہل بیت میں شامل تھیں ہی، کیونکہ قرآن نے انھی کو مخاطب کیا تھا، لیکن حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ ان دوسرے اصحاب کے متعلق ظاہر قرآن کے لحاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ یہ اہل بیت سے خارج ہیں، اس لیے آپ نے تصریح کی ضرورت ان کے حق میں محسوس فرمائی نہ کہ ازواج مطہرات کے حق میں۔

ایک گروہ نے اس آیت کی تفسیر میں صرف اتنا ہی ستم نہیں کیا ہے کہ ازواج مطہرات کو ''اہل البیت'' سے خارج کر کے صرف حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد کے لیے اس لفظ کو خاص کر دیا، بلکہ اس پر مزید ستم یہ بھی کیا ہے کہ اس کے الفاظ ''اللہ تو چاہتا ہے کہ تم سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے'' سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ حضرت علیؓ و فاطمہؓ اور ان کی اولاد انبیاء علیہم السلام کی طرح معصوم ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ''گندگی'' سے مراد خطا اور گناہ ہے اور ارشاد الٰہی کی رو سے یہ اہل البیت اس سے پاک کر دیے گئے ہیں۔ حالانکہ آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ تم سے گندگی دور کر دی گئی اور تم بالکل پاک کر دیے گئے۔ بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ اللہ تم سے گندگی کو دور کرنا اور تمھیں پاک کر دینا چاہتا ہے۔ سیاق وسباق بھی یہ نہیں بتاتا کہ یہاں مناقب اہل

'' محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ''

www.KitaboSunnat.com

بیت بیان کرنے مقصود ہیں، بلکہ یہاں تو اہل البیت کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم فلاں کام کرو اور فلاں کام نہ کرو، اس لیے کہ اللہ تمھیں پاک کرنا چاہتا ہے۔ بالفاظ دیگر مطلب یہ ہے کہ تم فلاں رویہ اختیار کرو گے تو پاکیزگی کی نعمت تمھیں نصیب ہوگی ورنہ نہیں۔ تاہم اگر اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ .... وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا کا مطلب یہ لیا جائے کہ اللہ نے ان کو معصوم کر دیا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وضو اور غسل اور تیمم کرنے والے سب مسلمانوں کو معصوم نہ مان لیا جائے کیونکہ ان کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ ”مگر اللہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دے۔“ (المائدہ آیت ۶)

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۹۲ تا ۹۴ الاحزاب حاشیہ ۵۰)

ازواجِ مطہرات کی معاشرتی ذمہ داری

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ○ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ (الاحزاب: ۳۰-۳۱)

نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی صریح فحش حرکت کا ارتکاب کرے گی اسے دوہرا عذاب دیا جائے گا۔ اللہ کے لیے یہ بہت آسان کام ہے اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گی اور نیک عمل کرے گی اس کو ہم دوہرا اجر دیں گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نعوذ باللہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کسی فحش حرکت کا اندیشہ تھا۔ بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کی ازواج کو یہ احساس دلانا تھا کہ اسلامی معاشرے میں ان کا مقام جس قدر بلند ہے اسی کے لحاظ سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت سخت ہیں۔ اس لیے ان کا اخلاقی رویہ انتہائی پاکیزہ ہونا چاہیے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ۔ ”اگر تم نے شرک کیا تو تمھارا سب کیا کرایا برباد ہو جائے گا۔“ (الزمر آیت ۶۵) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معاذ اللہ حضورؐ سے شرک کا کوئی اندیشہ تھا، بلکہ اس سے مقصود حضورؐ کو اور آپ کے واسطے سے عام انسانوں کو یہ احساس دلانا تھا کہ شرک کتنا خطرناک جرم ہے جس سے سخت احتراز لازم ہے۔

گناہ پر دوہرے عذاب اور نیکی پر دوہرے اجر کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ انسانی معاشرے میں کسی بلند مرتبے پر سرفراز فرماتا ہے وہ بالعموم لوگوں کے رہنما بن جاتے ہیں اور بندگانِ خدا کی بڑی تعداد بھلائی اور برائی میں اسی کی پیروی کرتی ہے۔ ان کی برائی تنہا انھی کی برائی نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم کے بگاڑ کی موجب بھی ہوتی ہے اور ان کی بھلائی صرف انھی کی انفرادی بھلائی نہیں ہوتی بلکہ بہت سے انسانوں کی فلاح کا سبب بھی بنتی ہے۔ اس لیے جب وہ برے کام کرتے ہیں تو اپنے بگاڑ کے ساتھ دوسروں کے بگاڑ کی بھی سزا پاتے ہیں اور جب وہ نیک کام کرتے ہیں تو انھیں اپنی نیکی کے ساتھ اس بات کی جزا بھی ملتی ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھلائی کی راہ دکھائی۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

اس آیت سے یہ اصول بھی نکلتا ہے کہ جہاں جتنی زیادہ حرمت ہوگی اور جس قدر زیادہ امانت کی توقع ہوگی، وہاں اسی قدر زیادہ ہتکِ حرمت اور ارتکابِ خیانت کا جرم شدید ہوگا اور اسی قدر زیادہ اس کا عذاب سخت ہوگا۔ مثلاً مسجد میں شراب پینا اپنے گھر میں شراب پینے سے شدید تر جرم ہے اس کی سزا زیادہ سخت ہے۔ محرمات سے زنا کرنا غیر عورت سے زنا کی بہ نسبت اشد ہے اور اس پر زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۸۸ الاحزاب حاشیہ ۴۳-۴۵)

ازواجِ مطہرات کو اپنے گھروں میں تلاوتِ قرآن کا حکم

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۔ (الاحزاب ۳۳:۳۴)

یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمھارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔

اصل میں لفظ وَاذْكُرْنَ استعمال ہوا ہے، جس کے دو معنی ہیں: ''یاد رکھو'' اور ''بیان کرو''۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اے نبی کی بیویو، تم کبھی اس بات کو فراموش نہ کرنا کہ تمھارا گھر وہ ہے جہاں سے دنیا بھر کو آیاتِ الٰہی اور حکمت ودانائی کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے تمھاری ذمہ داری بڑی سخت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی گھر میں لوگ جاہلیت کے نمونے دیکھنے لگیں۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ نبی کی بیویو، جو کچھ تم سنو اور دیکھو اسے لوگوں کے سامنے بیان کرتی رہو، کیونکہ رسول کے ساتھ ہر وقت کی معاشرت سے بہت سی ہدایات تمھارے علم میں ایسی آئیں گی جو تمھارے سوا کسی اور ذریعہ سے لوگوں کو معلوم نہ ہو سکیں گی۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک آیات اللہ دوسرے حکمت۔ آیات اللہ سے مراد تو کتاب اللہ کی آیات ہی ہیں۔ مگر حکمت کا لفظ وسیع ہے جس میں وہ تمام دانائی کی باتیں آجاتی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو سکھاتے تھے۔ اس لفظ کا اطلاق کتاب اللہ کی تعلیمات پر بھی ہو سکتا ہے، مگر صرف انھی کے ساتھ اس کو خاص کر دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآن کی آیات سنانے کے علاوہ جس حکمت کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سیرت پاک سے اور اپنے ارشادات سے دیتے تھے وہ بھی لامحالہ اس میں شامل ہے۔ بعض لوگ محض اس بنیاد پر کہ آیت میں مایتلی [جو تلاوت کی جاتی ہیں] کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آیات اللہ اور حکمت سے مراد صرف قرآن ہے، کیونکہ ''تلاوت'' کا لفظ اصطلاحاً قرآن یا کتاب اللہ کی تلاوت کے لیے مخصوص ہے لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ تلاوت کے لفظ کو اصطلاح کے طور پر قرآن پاک یا کتاب اللہ کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دینا بعد کے لوگوں کا فعل ہے۔ قرآن میں اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۰۲ میں یہی لفظ جادو کے ان منتروں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو شیاطین حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر کے لوگوں کو سناتے تھے۔ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۔ ''انھوں نے پیروی کی اس چیز کی جس کی تلاوت کرتے تھے [یعنی جسے سناتے تھے] شیاطین سلیمان کی بادشاہی کی طرف منسوب کر کے۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن اس لفظ کو اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے لغوی معنی میں استعمال کرتا ہے، کتاب اللہ کی آیات سنانے کے لیے اصطلاحاً مخصوص نہیں کرتا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۹۴ الاحزاب حاشیہ ۵۱)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی بیویوں سے علیحدگی کا مسئلہ

عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ۔ الآیۃ (التحریم ۶۶:۵)

بعید نہیں کہ اگر نبی تم سب بیویوں کو طلاق دے دے تو اللہ اسے ایسی بیویاں تمھارے بدلے میں عطا فرما دے جو تم سے بہتر ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قصور صرف حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ ہی کا نہ تھا، بلکہ دوسری ازواج مطہرات بھی کچھ نہ کچھ قصوروار تھیں، اسی لیے ان دونوں کے بعد اس آیت میں باقی سب ازواج کو بھی تنبیہ فرمائی گئی۔ قرآن مجید میں اس قصور کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے، البتہ احادیث میں اس کے متعلق کچھ تفصیلات آئی ہیں۔ ان کو ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

بخاری میں حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں نے آپس کے رشک و رقابت میں مل جل کر حضورؐ کو تنگ کر دیا تھا [اصل الفاظ ہیں اجتمع نساء النبی صلی الله علیه وسلم فی الغیرة علیه]۔ اس پر میں نے ان سے کہا کہ بعید نہیں اگر حضورؐ تم کو طلاق دے دیں تو اللہ تم سے بہتر بیویاں آپؐ کو عطا فرما دے۔ ابن ابی حاتم نے حضرت انسؓ کے حوالے سے حضرت عمرؓ کا بیان ان الفاظ میں نقل کیا ہے: مجھے خبر پہنچی کہ امہات المومنین اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کچھ ناچاقی ہو گئی ہے۔ اس پر میں ان میں سے ایک ایک کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرنے سے باز آجاؤ ورنہ اللہ تمھارے بدلے تم سے بہتر بیویاں حضورؐ کو عطا فرما دے گا۔ یہاں تک کہ جب میں امہات المومنین میں سے آخری کے پاس گیا [اور یہ بخاری کی ایک روایت کے بموجب حضرت ام سلمہؓ تھیں] تو انھوں نے مجھے جواب دیا: اے عمرؓ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی نصیحت کے لیے کافی نہیں ہیں کہ تم انھیں نصیحت کرنے چلے ہو؟ اس پر میں خاموش ہو گیا اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

مسلم میں حضرت عبداللہؓ بن عباس کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان سے بیان کیا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں سے علیحدگی اختیار فرمائی تو میں مسجد نبوی میں پہنچا۔ دیکھا کہ لوگ متفکر بیٹھے ہوئے کنکریاں اٹھا اٹھا کر گرا رہے ہیں اور آپس میں کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے ہاں اپنے جانے اور ان کو نصیحت کرنے کا ذکر کیا، پھر فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا: بیویوں کے معاملے میں آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ اگر آپ ان کو طلاق دے دیں تو اللہ آپ کے ساتھ ہے، سارے ملائکہ اور جبریل و میکائیل آپ کے ساتھ ہیں اور میں اور ابوبکر اور سب اہل ایمان آپؐ کے ساتھ ہیں۔ میں اللہ کا شکر بجا لاتا ہوں کہ کم ہی ایسا ہوا ہے کہ میں نے کوئی بات کہی ہو اور اللہ سے یہ امید نہ رکھی ہو کہ وہ میرے قول کی تصدیق

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فرمادے گا، چنانچہ اس کے بعد سورۂ تحریم کی یہ آیات نازل ہوگئیں۔ پھر میں نے حضورؐ سے پوچھا کہ آپ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس پر میں نے مسجد نبوی کے دروازے پر کھڑے ہو کر باآواز بلند اعلان کیا حضورؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق نہیں دی ہے۔

بخاری میں حضرت انسؓ سے اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عائشہؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایات منقول ہوئی ہیں کہ حضورؐ نے ایک مہینے تک کے لیے اپنی بیویوں سے علیحدہ رہنے کا عہد فرمالیا تھا اور اپنے بالا خانے میں بیٹھ گئے تھے۔ ۲۹ دن گزر جانے پر جبریل علیہ السلام نے آکر کہا آپ کی قسم پوری ہوگئی ہے، مہینہ مکمل ہوگیا۔

حافظ بدر الدین عینی نے عمدۃ القاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ ازواجِ مطہرات کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک میں خود حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہ تھیں اور دوسری میں حضرت زینبؓ، حضرت ام سلمہ اور باقی ازواج شامل تھیں۔

ان تمام روایات سے کچھ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی میں کیا حالات پیدا ہوگئے تھے جن کی بنا پر یہ ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ مداخلت کر کے ازواج مطہرات کے طرزِ عمل کی اصلاح فرمائے۔ یہ ازواج اگرچہ معاشرے کی بہترین خواتین تھیں، مگر بہر حال تھیں انسان ہی اور بشریت کے تقاضوں سے مبرا نہ تھیں۔ کبھی ان کے لیے مسلسل عسرت کی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا تھا اور وہ بے صبر ہو کر حضورؐ سے نفقے کا مطالبہ کرنے لگتیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ احزاب کی آیات ۲۸-۲۹ نازل فرما کر ان کو تلقین کی کہ اگر تمھیں دنیا کی خوشحالی مطلوب ہے تو ہمارا رسول تم کو بخیر و خوبی رخصت کردے گا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہو تو پھر صبر و شکر کے ساتھ ان تکلیفوں کو برداشت کرو جو رسول کی رفاقت میں پیش آئیں [تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب حاشیہ ۴۱، اور دیباچہ سورۂ احزاب، صفحہ ۶۵] پھر کبھی نسائی فطرت کی بنا پر ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہو جاتا تھا جو عام انسانی زندگی میں معمول کے خلاف نہ تھیں، مگر جس گھر میں ہونے کا شرف اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا، اس کی شان اور اس کی عظیم ذمہ داریوں سے وہ مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ ان باتوں سے جب یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی کہیں تلخ نہ ہو جائے اور اس کا اثر اس کارِ عظیم پر مترتب نہ ہو جو اللہ تعالیٰ حضورؐ سے لے رہا تھا، قرآن مجید میں یہ آیت نازل کر کے ان کی اصلاح فرمائی گئی تاکہ ازواج مطہرات کے اندر اپنے اس مقام اور مرتبے کی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو جو اللہ کے آخری رسول کی رفیق زندگی ہونے کی حیثیت سے ان کو نصیب ہوا تھا اور وہ اپنے آپ کو عام عورتوں کی طرح اور اپنے گھر کو عام گھروں کی طرح نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس آیت کا پہلا ہی فقرہ ایسا تھا کہ اس کو سن کر ازواجِ مطہرات کے دل لرز اٹھے ہوں گے۔ اس ارشاد سے بڑھ کر ان کے لیے تنبیہ اور کیا ہوسکتی تھی کہ "اگر نبی تم کو طلاق دے دے تو بعید نہیں کہ اللہ اس کو تمھاری جگہ تم سے بہتر بیویاں عطا کردے۔" اول تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے طلاق مل جانے کا تصور ہی ان کے لیے نا قابل برداشت تھا، اس پر یہ بات مزید کہ تم سے امہات المومنین ہونے کا شرف چھن جائے گا اور دوسری عورتیں جو اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں لائے گا وہ تم سے بہتر ہوں گی۔ اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ازواجِ مطہرات سے پھر کبھی کسی ایسی بات کا صدور ہوتا جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت کی نوبت آتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بس دو ہی مقامات ہم کو ایسے ملتے ہیں جہاں ان برگزیدہ خواتین کو تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ ایک سورۂ احزاب اور دوسرے یہ سورۂ تحریم۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۲۶ تا ۲۸ التحریم حاشیہ ۱۰)

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ بن عبداللہ اس زمانے کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپؐ کی ازواج آپؐ کے گرد بیٹھی ہیں اور آپؐ خاموش ہیں۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا: هُنَّ كَمَا تَرٰى يَسْأَلْنَنِي النَّفَقَةَ ''یہ میرے گرد بیٹھی ہیں، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ یہ مجھ سے خرچ کے لیے روپیہ مانگ رہی ہیں۔'' اس پر دونوں صاحبوں نے اپنی اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنگ کرتی ہو اور وہ چیز مانگتی ہو جو آپؐ کے پاس نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴، ص ۸۴ الاحزاب حاشیہ ۴۱)

❀❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل دوم

علم کی اہمیت اور متفرق مباحث

تحصیل علم کا حکم بصورت ترغیب

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۝ (التوبہ ۹:۱۲۲)

اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہلِ ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔

دیہاتی عوام کی تعلیم وتربیت

اس آیت کا منشا سمجھنے کے لیے اسی سورۃ کی آیت ۹۷ پیش نظر رکھنی چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

بدوی عرب کفر ونفاق میں زیادہ سخت ہیں اور ان کے معاملے میں اس امر کے امکانات زیادہ ہیں کہ اس دین کی حدود سے ناواقف رہیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا ہے۔

وہاں صرف اتنی بات بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا تھا کہ دارالاسلام کی دیہاتی آبادی کا بیشتر حصہ مرضِ نفاق میں اس وجہ سے مبتلا ہے کہ یہ سارے کے سارے لوگ جہالت میں پڑے ہوئے ہیں، علم کے مرکز سے وابستہ نہ ہونے اور اہلِ علم کی صحبت میسر نہ آنے کی وجہ سے اللہ کے دین کی حدود ان کو معلوم نہیں ہیں۔ اب یہ فرمایا جارہا ہے کہ دیہاتی آبادیوں کو اس حالت میں پڑا نہ رہنے دیا جائے بلکہ ان کی جہالت کو دور کرنے اور ان کے اندر شعور اسلامی پیدا کرنے کا اب باقاعدہ انتظام ہونا چاہیے۔ اس غرض کے لیے یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ تمام دیہاتی عرب اپنے اپنے گھروں سے نکل نکل کر مدینے آجائیں اور یہاں علم حاصل کریں۔ اس کے بجائے ہونا یہ چاہیے کہ ہر دیہاتی علاقے اور ہر بستی اور قبیلے سے چند آدمی نکل کر علم کے مرکزوں، مثلاً مدینے اور مکے اور ایسے ہی دوسرے مقامات میں آئیں اور یہاں دین کی سمجھ پیدا کریں۔ پھر اپنی اپنی بستیوں میں واپس جائیں اور عامۃ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الناس کے اندر بیداری پھیلانے کی کوشش کریں۔

قومی استحکام کے لیے باشعور عوام کی ضرورت

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو تحریک اسلامی کو مستحکم کرنے کے لیے ٹھیک موقع پر دی گئی۔ ابتدا میں جبکہ اسلام عرب میں بالکل نیا نیا تھا اور انتہائی شدید مخالفت کے ماحول میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا، اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ اس وقت تو اسلام قبول کرتا ہی وہ شخص تھا جو پوری طرح اسے سمجھ لیتا تھا اور ہر پہلو سے اس کو جانچ پرکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ مگر جب یہ تحریک کامیابی کے مرحلوں میں داخل ہوئی اور زمین میں اس کا اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں کی آبادیاں فوج در فوج اس میں شامل ہونے لگیں جن کے اندر کم لوگ ایسے تھے جو اسلام کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ سمجھ بوجھ کر اس پر ایمان لاتے تھے، ورنہ بیشتر لوگ محض وقت کے سیلاب میں غیر شعوری طور پر بہے چلے آرہے تھے۔ نو مسلم آبادی کا یہ تیز رفتار پھیلاؤ بظاہر تو اسلام کے لیے سبب قوت تھا کیونکہ پیروانِ اسلام کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ لیکن فی الحقیقت اسلامی نظام کے لیے ایسی آبادی کسی کام کی نہ تھی بلکہ الٹی نقصان دہ تھی جو شعورِ اسلامی سے خالی ہو اور اس نظام کے اخلاقی مطالبات پورے کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ چنانچہ یہ نقصان غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقع پر کھل کر سامنے آگیا تھا۔ اس لیے عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ تحریک اسلامی کی یہ توسیع جس رفتار کے ساتھ ہو رہی ہے اسی کے مطابق اس کے استحکام کی تدبیر بھی ہونی چاہیے اور وہ ہے کہ ہر حصۂ آبادی میں سے چند لوگوں کو لے کر تعلیم و تربیت دی جائے، پھر وہ اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر عوام کی تعلیم و تربیت کا فرض انجام دیں یہاں تک کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شعور اور حدود اللہ کا علم پھیل جائے۔

تعلیم کا اصل مقصد

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ تعلیم عمومی کے جس انتظام کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے اس کا مقصد عامۃ الناس کو محض خواندہ بنانا اور ان میں کتاب خوانی کی نوعیت کا علم پھیلانا نہ تھا بلکہ واضح طور پر اس کا مقصد حقیقی یہ متعین کیا گیا تھا کہ لوگوں میں دین کی سمجھ پیدا ہو اور ان کو اس حد تک ہوشیار و خبردار کر دیا جائے کہ وہ غیر مسلمانہ رویہ زندگی سے بچنے لگیں۔ یہ مسلمانوں کی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے خود مقرر فرما دیا ہے اور ہر تعلیمی نظام کو اسی لحاظ سے جانچا جائے گا کہ وہ اس مقصد کو کہاں تک پورا کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام لوگوں میں نوشت و خواند اور کتاب خوانی اور دنیوی علوم کی واقفیت پھیلانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام لوگوں میں ایسی تعلیم پھیلانا چاہتا ہے جو اوپر کے خط کشیدہ مقصد تک پہنچاتی ہو۔ ورنہ ایک ایک شخص اگر اپنے وقت کا آئن سٹائن اور فرائڈ ہو جائے لیکن دین کے فہم سے عاری اور غیر مسلمانہ رویہ زندگی میں بھٹکا ہوا ہو تو اسلام ایسی تعلیم پر لعنت بھیجتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایک غلط فہمی

اس آیت میں لفظ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ جو استعمال ہوا ہے اس سے بعد کے لوگوں میں ایک عجیب غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کے زہریلے اثرات ایک مدت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم بلکہ ان کی مذہبی زندگی پر بھی بُری طرح چھائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو تفقه فی الدين کو تعلیم کا مقصود بتایا تھا جس کے معنی ہیں دین کو سمجھنا، اس کے نظام میں بصیرت حاصل کرنا، اس کے مزاج اور اس کی روح سے آشنا ہونا اور اس قابل ہو جانا کہ فکر و عمل کے ہر گوشے اور زندگی کے ہر شعبے میں انسان یہ جان سکے کہ کون سا طریق فکر اور کونسا طرزِ عمل روح دین کے مطابق ہے۔ لیکن آگے چل کر جو قانونی علم اصطلاحاً فقہ کے نام سے موسوم ہوا اور جو رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کی محض صورت (بمقابلہ روح) کا تفصیلی علم بن کر رہ گیا، لوگوں نے اشتراک لفظی کی بنا پر سمجھ لیا کہ بس یہی وہ چیز ہے جس کا حاصل کرنا حکم الٰہی کے مطابق تعلیم کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ وہ کل مقصود نہیں بلکہ محض ایک جزو مقصود تھا۔ اس عظیم الشان غلط فہمی سے جو نقصانات دین اور پیروانِ دین کو پہنچے ان کا جائزہ لینے کے لیے تو ایک کتاب کی وسعت درکار ہے۔ مگر یہاں ہم اس پر متنبہ کرنے کے لیے مختصراً اتنا اشارہ کیے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو جس چیز نے روح دین سے خالی کر کے محض جسم دین اور شکل دین کی تشریح پر مرتکز کر دیا اور بالآخر جس چیز کی بدولت مسلمانوں کی زندگی میں ایک نری بے جان ظاہر داری، دین داری کی آخری منزل بن کر رہ گئی، وہ بڑی حد تک یہی غلط فہمی ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ التوبہ حاشیہ ۱۲۰)

اہلِ علم سے رہنمائی کی اہمیت

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (النحل ۱۶:۴۳)

اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے۔

یعنی علمائے اہلِ کتاب اور وہ دوسرے لوگ جو چاہے سکہ بند علما نہ ہوں مگر بہرحال کتبِ آسمانی کی تعلیمات سے واقف اور انبیائے سابقین کی سرگزشت سے آگاہ ہوں۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۴۳، النحل حاشیہ ۳۹)

علم کے بغیر شہادت اللہ کے ہاں معتبر نہیں

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (الزخرف ۸۶:۴۳)

اس کو چھوڑ کر یہ لوگ جنھیں پکارتے ہیں وہ کسی شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، الا یہ کہ کوئی علم کی بنا پر حق کی شہادت دے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایمان اور علم

اس آیت سے ضمناً دو بڑے اہم اصول بھی مستنبط ہوتے ہیں۔ اولاً اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے بغیر حق کی شہادت دینا چاہے دنیا میں معتبر ہو، مگر اللہ کے ہاں معتبر نہیں ہے۔ دنیا میں تو جو شخص کلمۂ شہادت زبان سے ادا کرے گا، ہم اس کو مسلمان مان لیں گے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرتے رہیں گے جب تک وہ کھلم کھلا کفر صریح کا ارتکاب نہ کرے۔ لیکن اللہ کے ہاں صرف وہی شخص اہلِ ایمان میں شمار ہوگا جس نے اپنی بساط علم وعقل کی حد تک یہ جانتے اور سمجھتے ہوئے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہا ہو کہ وہ کس چیز کا انکار اور کس چیز کا اقرار کر رہا ہے۔

گواہی اور علم

ثانیاً اس سے قانونِ شہادت کا یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ گواہی کے لیے علم شرط ہے۔ گواہ جس واقعہ کی گواہی دے رہا ہو اس کا اگر اُسے علم نہیں ہے تو اس کی گواہی بے معنی ہے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک فیصلے سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے ایک گواہ سے فرمایا کہ اِذَا رَاَیْتَ مِثْلَ الشَّمْسِ فَاشْهَدْ وَاِلَّا فَدَعْ [احکام القرآن للجصاص] ''اگر تو نے واقعہ کو خود اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھا ہے جیسے تو سورج کو دیکھ رہا ہے تو گواہی دے ورنہ رہنے دے۔''

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۵۵۳ الزخرف حاشیہ ۶۸)

وہم وگمان کے بجائے علم کی پیروی کا حکم

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۶)
کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔ یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی باز پُرس ہونی ہے۔

اس دفعہ کا منشا یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم وگمان کے بجائے ''علم'' کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشا کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں، قانون میں، سیاست اور انتظام ملکی میں، علوم وفنون اور نظامِ تعلیم میں، غرض ہر شعبہ حیات میں کی گئی ہے اور اُن بے شمار خرابیوں سے فکر وعمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص یا گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل اصول طے کر دیا گیا کہ محض شبہے پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا اور مار پیٹ کرنا یا حوالات میں دے دینا قطعی ناجائز ہے۔ غیر قوموں کے ساتھ برتاؤ میں یہ پالیسی متعین کر دی گئی کہ تحقیق کے بغیر کسی کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے اور نہ مجرد شبہات پر افواہیں پھیلائی جائیں۔ نظامِ تعلیم میں بھی اُن نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا ہے جو محض ظن وتخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کاٹ دی گئی اور ایمان لانے والوں کو یہ سکھایا گیا کہ صرف اس چیز کو مانیں جو خدا اور رسول کے دیے ہوئے علم کی رو سے ثابت ہو۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۶۱۶ بنی اسرائیل حاشیہ ۴۲)

زمین میں اکڑ کر چلنے کی ممانعت

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۷)
زمین میں اکڑ کر نہ چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو، نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔

مطلب یہ ہے کہ جباروں اور متکبروں کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت بھی انفرادی طرزِ عمل اور قومی رویے دونوں پر یکساں حاوی ہے اور یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ مدینہ طیبہ میں جو حکومت اس منشور پر قائم ہوئی اس کے فرماں رواؤں، گورنروں اور سپہ سالاروں کی زندگی میں جباری اور کبریائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا، حتیٰ کہ عین حالتِ جنگ میں بھی کبھی ان کی زبان سے فخر و غرور کی کوئی بات نہ نکلی۔ ان کی نشست و برخاست، چال ڈھال، لباس، مکان، سواری اور عام برتاؤ میں انکسار و تواضع، بلکہ فقیری و درویشی کی شان پائی جاتی تھی اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب بٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۶۱۷ بنی اسرائیل حاشیہ ۴۳)

سورۃ الفرقان میں ارشادِ الٰہی ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمَٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا. (الفرقان ۲۵:۶۳)
رحمان کے اصلی بندے وہ ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں۔

یعنی تکبر کے ساتھ اکڑتے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے، جباروں اور مفسدوں کی طرح اپنی رفتار سے اپنا زور جتانے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ ان کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع اور نیک مزاج آدمی کی سی چال ہوتی ہے۔ ''نرم چال'' سے مراد ضعیفانہ اور مریضانہ چال نہیں ہے اور نہ وہ چال ہے جو ایک ریاکار آدمی اپنے انکسار کی نمائش کرنے یا اپنی خدا ترسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تصنّع سے اختیار کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اس طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے کہ گویا نشیب کی طرف اُتر رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے متعلق روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے ایک جوان آدمی کو مریل چال چلتے دیکھا تو روک کر پوچھا کیا تم بیمار ہو؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے درہ اٹھا کر اسے دھمکایا اور بولے قوت کے ساتھ چلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نرم چال سے مراد ایک بھلے مانس کی سی فطری چال ہے نہ کہ وہ جو بناوٹ سے منکسرانہ بنائی گئی ہو یا جس سے خواہ مخواہ کی مسکنت اور ضعیفی ٹپکتی ہو۔

مگر غور طلب پہلو یہ ہے کہ آدمی کی چال میں آخر وہ کیا اہمیت ہے جس کی وجہ سے اللہ کے نیک بندوں کی خصوصیات

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گناتے ہوئے سب سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا؟ اس سوال کو ذرا تأمل کی نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی چال محض اس کے انداز رفتار ہی کا نام نہیں ہے بلکہ درحقیقت وہ اس کے ذہن اور اس کی سیرت و کردار کی اولین ترجمان بھی ہوتی ہے۔ ایک عیار آدمی کی چال، ایک غنڈے بدمعاش کی چال، ایک ظالم و جابر کی چال، ایک خود پسند متکبر کی چال، ایک باوقار مہذب آدمی کی چال، ایک غریب مسکین کی چال اور اسی طرح مختلف اقسام کے دوسرے انسانوں کی چالیں ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ہر ایک کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کس چال کے پیچھے کس طرح کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ پس آیت کا مدعا یہ ہے کہ رحمان کے بندوں کو تو تم عام آدمیوں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھ کر ہی بغیر کسی سابقہ تعارف کے الگ پہچان لو گے کہ یہ کس طرز کے لوگ ہیں۔ اس بندگی نے ان کی ذہنیت اور ان کی سیرت کو جیسا کچھ بنا دیا ہے اس کا اثر ان کی چال تک میں نمایاں ہے۔ ایک آدمی انھیں دیکھ کر پہلی نظر میں جان سکتا ہے کہ یہ شریف اور حلیم اور ہمدرد لوگ ہیں ان سے کسی شر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

(تفہیم القرآن ج ۳ الفرقان حاشیہ ۷۹)

سورۂ القمان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔ (لقمان ۳۱:۱۸)

نہ زمین میں اکڑ کر چل۔

بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ تیز بھی نہ چل اور آہستہ بھی نہ چل، بلکہ میانہ روی اختیار کر۔ لیکن سیاق کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفتار کی تیزی و سستی زیر بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا اپنے اندر کوئی اخلاقی حسن و قبح نہیں رکھتا اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جا سکتا۔ آدمی کو جلدی کا کوئی کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے اور اگر وہ محض تفریحاً چل رہا ہے تو آخر آہستہ چلنے میں کیا قباحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار ہو بھی تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے اسے ایک قاعدہ کلیہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اس کیفیت کی اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تبختر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت، اقتدار، حسن، علم، طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے۔ کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضع اور دکھاوے کی درویشی و خدارسیدگی کا روپ دھارتا ہے اور یہ چیز اس کی چال میں نمایاں نظر آتی ہے اور کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مریل چال چلنے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لگتا ہے۔ لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دور کر اور ایک سیدھے سادے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو، نہ مریل پن اور نہ ریاکارانہ زہد و انکسار۔

صحابہ کرام کا ذوق اس معاملے میں جیسا کچھ تھا اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے [جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے] کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو سر جھکائے ہوئے چلتے دیکھا تو پکار کر فرمایا: سر اٹھا کر چل اسلام مریض نہیں ہے۔ ایک اور شخص کو انھوں نے مریل چال چلتے دیکھا تو فرمایا: ظالم، ہمارے دین کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔ ان دونوں واقعات سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے نزدیک دینداری کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ آدمی بیماروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھے اور خواہ مخواہ مسکین بنا چلا جائے۔ کسی مسلمان کو ایسی چال چلتے دیکھ کر انھیں خطرہ ہوتا تھا کہ یہ چال دوسروں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی کرے گی اور خود مسلمانوں کے اندر افسردگی پیدا کر دے گی۔ ایسا ہی واقعہ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کو پیش آیا۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحب بہت مضمحل بنے ہوئے چل رہے ہیں۔ پوچھا انھیں کیا ہو گیا؟ عرض کیا گیا کہ یہ قراء میں سے ہیں [یعنی قرآن پڑھنے پڑھانے والے اور تعلیم و عبادت میں مشغول رہنے والے] اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: عمر سید القراء تھے، مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب چلتے تو زور سے چلتے، جب بولتے تو قوت کے ساتھ بولتے اور جب پیٹتے تو خوب پیٹتے تھے۔

(تفہیم القرآن ج ۴ لقمان حاشیہ ۳۳)

تفرقہ پردازی کے محرکات اور ان کے نتائج

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ (الشوریٰ ۴۲:۱۴)

لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

تفرقے کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں اس وجہ سے لوگ راہِ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذاہب اور مدارس فکر اور نظامِ زندگی خود ایجاد کر بیٹھے، بلکہ یہ تفرقہ ان میں اللہ کی طرف سے علم آ جانے کے بعد رونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ لوگ خود اس کے ذمہ دار ہیں جنھوں نے دین کے صاف صاف اصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے مذاہب و مسالک بنائے۔

اس تفرقہ پردازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا، بلکہ یہ اپنی نرالی اُپج دکھانے کی خواہش، اپنا الگ جھنڈا بلند کرنے کی فکر، آپس کی ضدم ضدا، ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔ ہوشیار اور حوصلہ مند لوگوں نے دیکھا کہ بندگانِ خدا اگر سیدھے سیدھے خدا کے دین پر چلتے رہیں تو بس ایک خدا ہو گا جس کے آگے لوگ جھکیں گے۔ ایک رسول ہو گا جس کو لوگ پیشوا اور رہنما مانیں گے، ایک کتاب ہو گی جس کی طرف لوگ رجوع کریں گے اور ایک صاف عقیدہ اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بے لاگ ضابطہ ہوگا جس کی پیروی وہ کرتے رہیں گے۔ اس نظام میں ان کی اپنی ذات کے لیے کوئی مقام امتیاز نہیں ہو سکتا جس کی وجہ سے ان کی مشیخت چلے اور لوگ ان کے گرد جمع ہوں اور ان کے آگے سر بھی جھکائیں اور جیبیں بھی خالی کریں۔ یہی وہ اصل سبب تھا جو نئے نئے عقائد اور فلسفے، نئے نئے طرزِ عبادت اور مذہبی مراسم اور نئے نئے نظامِ حیات ایجاد کرنے کا محرک بنا اور اسی نے خلق خدا کے ایک بڑے حصے کو دین کی صاف شاہراہ سے ہٹا کر مختلف راہوں میں پراگندہ کر دیا۔ پھر یہ پراگندگی ان گروہوں کی باہمی بحث و جدال اور مذہبی و معاشی اور سیاسی کش مکش کی بدولت شدید تلخیوں میں تبدیل ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ نوبت ان خونریزیوں تک پہنچی جن کے چھینٹوں سے تاریخ انسانی سرخ ہو رہی ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۴۹۳-۴۹۴ الشوریٰ حواشی ۲۲-۲۳)

شاہراہِ شریعت پر قائم رہنے کا حکم

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۴۵:۱۸)

اس کے بعد اب اے نبیؐ، ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ [شریعت] پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔

مطلب یہ ہے کہ جو کام پہلے بنی اسرائیل کے سپرد کیا گیا تھا وہ اب تمھارے سپرد کیا گیا ہے۔ انھوں نے علم پانے کے باوجود اپنی نفسانفسی سے دین میں ایسے اختلافات برپا کیے اور آپس میں ایسی گروہ بندیاں کر ڈالیں جن سے وہ اس قابل نہ رہے کہ دنیا کو خدا کے راستے پر بلا سکیں۔ اب اسی دین کی صاف شاہراہ پر تمھیں کھڑا کیا گیا ہے تاکہ تم وہ خدمت انجام دو جسے بنی اسرائیل چھوڑ چکے ہیں اور ادا کرنے کے اہل بھی نہیں رہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۵۸۷ الجاثیہ حاشیہ ۲۳)

اہلِ ایمان کو مخالفین کی ایذا رسانیوں پر درگزر کا حکم

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۴۵:۱۴)

اے نبیؐ، ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے برے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے، ان کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔

مفسرین نے اس آیت کے دو مطلب بیان کیے ہیں اور آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔

ایک یہ کہ اہلِ ایمان اس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ اُن کو اپنی طرف سے ان کے صبر و حلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہِ خدا میں جو اذیتیں انھوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر عطا فرمائے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اس گروہ سے درگزر کریں تاکہ اللہ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اسے دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت تک تھا جب تک مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ پھر جب اس کی اجازت آ گئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے۔ ''درگزر'' کا لفظ اس معنی میں کبھی نہیں بولا جاتا کہ جب آدمی کسی کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو اس سے درگزر کرے، بلکہ اس موقع پر صبر، تحمل اور برداشت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو چھوڑ کر جب یہاں درگزر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اہلِ ایمان انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود ان لوگوں کی زیادتیوں کا جواب دینے سے پرہیز کریں جنھیں خدا سے بے خوفی نے اخلاق و آدمیت کی حدیں توڑ ڈالنے پر جری کر دیا ہے۔ اس حکم کا کوئی تعارض ان آیات سے نہیں ہے جن میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگ کی اجازت کا تعلق اُس حالت سے ہے جب مسلمانوں کی حکومت کسی کافر قوم کے خلاف باقاعدہ کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پائے اور عفو و درگزر کا حکم ان عام حالات کے لیے ہے جن میں اہلِ ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے سابقہ پیش آئے اور وہ انھیں اپنی زبان و قلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔

اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر ان پست اخلاق لوگوں سے الجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بے ہودگی کا جواب دینے پر نہ اتر آئیں جب تک شرافت اور معقولیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مدافعت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے مگر جہاں بات ان حدود سے گزرتی نظر آئے وہاں چپ سادھ لی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمان ان سے خود نہ الجھیں گے تو اللہ ان سے نمٹنے کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا۔ درگزر سے کام لیں گے تو اللہ خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۵۸۵-۵۸۶ الجاثیہ حاشیہ ۱۹)

راعنا کی جگہ انظرنا کہنے کا حکم

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے اور ان اطراف میں اسلام کی دعوت پھیلنی شروع ہوئی، تو یہودی جگہ جگہ مسلمانوں کو مذہبی بحثوں میں الجھانے کی کوشش کرتے تھے، اپنی موشگافیوں اور تشکیکات اور سوال میں سوال نکالنے کی بیماری ان سیدھے سادھے اور سچے لوگوں کو بھی لگانا چاہتے تھے اور خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آ کر پر فریب مکارانہ باتیں کر کے اپنی گھٹیا درجے کی ذہنیت کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

یہودی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے، تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کا بخار

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ اور کہہ دیتے اور ظاہری ادب آداب برقرار رکھتے ہوئے در پردہ وہ آپؐ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ قرآن میں آگے چل کر اس کی متعدد مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں جس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے، یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو کے دوران میں یہودیوں کو کبھی یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ٹھیریے، ذرا ہمیں یہ بات سمجھ لینے دیجیے، تو وہ راعنا کہتے تھے۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم تو یہ تھا کہ ذرا ہماری رعایت کیجیے یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا، جس کے معنی تھے ''سن، تو بہرا ہو جائے۔'' اور خود عربی میں اس کے ایک معنی صاحب رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے اور گفتگو میں یہ ایسے موقع پر بھی بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کہ تم ہماری سنو، تو ہم تمھاری سنیں اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا لیا جاتا تھا، جس کے معنی ''اے ہمارے چرواہے'' کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو اور اس کے بجائے انظرنا کہا کرو۔ یعنی ہماری طرف توجہ فرمایئے یا ذرا ہمیں سمجھ لینے دیجیے۔ پھر فرمایا کہ ''توجہ سے بات کو سنو''۔ یعنی یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبیؐ کی بات پر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تقریر کے دوران میں وہ اپنے ہی خیالات میں الجھے رہتے ہیں، مگر تمھیں غور سے نبیؐ کی باتیں سننی چاہییں تاکہ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ پیش آئے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۰-۱۰۱ البقرہ حاشیہ ۱۰۷-۱۰۸)

غیر مسلموں کے معبودوں اور پیشواؤں کو گالیاں دینے کی ممانعت

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۝ (الانعام ۶:۱۰۸)

[اے ایمان والو] یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث و تکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۷۱ الانعام حاشیہ ۷۲)

اللہ کے عہد کو پورا کرنے کا حکم

وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (الانعام ۶:۱۵۲-۱۵۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمھیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔ نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمھیں پراگندہ کر دیں گے۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمھارے رب نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

سورۂ النحل میں ارشاد ہے:

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ۔ (النحل ۱۶:۹۱)

اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم نے اس سے کوئی عہد باندھا ہو۔

اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے اور وہ بھی جو انسان اور خدا اور انسان اور انسان کے درمیان اسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے دونوں عہد شعوری و ارادی ہیں اور یہ تیسرا عہد ایک فطری عہد Natural Contract ہے جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی و نفسانی قوتوں سے، اس کے دیے ہوئے جسمانی آلات سے اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین اور رزق اور ذرائع سے فائدہ اُٹھانا اور اُن مواقع زندگی سے متمتع ہونا جو قوانین قدرت کی بدولت فراہم ہوتے ہیں، خود بخود فطرۃً خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے اور اس طرح آدمی کا ایک ماں کے پیٹ میں اس کے خون سے پرورش پانا، ایک باپ کی محنتوں سے بسے ہوئے گھر میں پیدا ہونا اور ایک اجتماعی زندگی کے بے شمار مختلف اداروں سے مختلف صورتوں میں متمتع ہونا علی قدر مراتب اس کے ذمہ بہت سے افراد اور اجتماعی اداروں کے حقوق بھی عائد کر دیتا ہے۔ انسان کا خدا سے اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا، مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے۔ انسان نے اسے شعور و ارادے کے ساتھ نہیں باندھا، مگر اس کا پورا وجود اسی عہد کا رَہینِ منت ہے۔ اسی عہد کی طرف سورۂ بقرہ آیت ۲۷ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو اس کی استواری کے بعد توڑتے ہیں اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اور اسی کا ذکر سورۂ اعراف آیت ۱۷۲ میں آتا ہے کہ اللہ نے ازل میں آدم کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکال کر ان سے شہادت طلب کی تھی کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اور انھوں نے اقرار کیا تھا کہ ہم گواہ ہیں۔

اس عہد کا لازمی اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستے پر چلے، کیونکہ اس کے امر کی پیروی سے منہ موڑنا اور خودسری و خودمختاری یا بندگی غیر کی جانب قدم بڑھانا انسان کی طرف سے اس عہد کی اولین خلاف ورزی ہے جس کے بعد ہر قدم پر اس کی دفعات ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس نہایت نازک، نہایت وسیع اور نہایت پیچیدہ عہد کی ذمہ داریوں سے انسان ہرگز عہدہ برآ نہیں ہوسکتا جب تک وہ خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کو قبول نہ کرنے کے دو زبردست نقصان ہیں۔ ایک یہ کہ ہر دوسرے راستے کی پیروی لازماً انسان کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو خدا کے قریب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس راہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں سامنے آجاتی ہیں جن میں بھٹک کر پوری نوعِ انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے اور اس پراگندگی کے ساتھ ہی اس کے بلوغ وارتقا کا خواب بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ انھی دونوں نقصانات کو اس فقرے میں بیان کیا گیا ہے کہ دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمھیں اس کے راستے سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۰۱-۶۰۲ الانعام حواشی ۱۳۴-۱۳۵)

فاسق کی لائی ہوئی خبر کی تحقیق کا حکم

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ○ (الحجرات ۴۹:۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔

اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی مُعَیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلۂ بنی المُصطَلِق جب مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو بھیجا تا کہ ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر لائیں۔ یہ ان کے علاقے میں پہنچے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور اہلِ قبیلہ سے ملے بغیر مدینہ واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی کہ انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ یہ خبر سن کر سخت ناراض ہوئے اور آپؐ نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک دستہ روانہ کریں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپؐ نے وہ دستہ روانہ کر دیا تھا اور بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپ روانہ کرنے والے تھے۔ بہرحال اس بات پر سب متفق ہیں کہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضِرار [ام المؤمنین حضرت جویریہ کے والد] اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئے اور انھوں نے عرض کیا کہ خدا کی قسم ہم نے تو ولید کو دیکھا تک نہیں کجا کہ زکوٰۃ دینے سے انکار اور اس کے قتل کے ارادے کا کوئی سوال پیدا ہو۔ ہم ایمان پر قائم ہیں اور ادائے زکوٰۃ سے ہمیں ہرگز انکار نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس قصے کو امام احمد، ابنِ ابی حاتم، طبرانی اور ابنِ جریر نے حضرات عبداللہؓ بن عباس، حارث بن ضرار، مجاہد، قتادہ، عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ، یزید بن رومان، ضحاک اور مقاتل بن حیان سے نقل کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ کی روایت میں یہ پورا قصہ بیان تو اسی طرح ہوا ہے مگر اس میں ولید کے نام کی تصریح نہیں ہے۔

اس نازک موقع پر جبکہ ایک بے بنیاد خبر پر اعتماد کر لینے کی وجہ سے ایک عظیم غلطی ہوتے ہوتے رہ گئی، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ اصولی ہدایت دی کہ جب کوئی اہمیت رکھنے والی خبر، جس پر کوئی بڑا نتیجہ مترتب ہوتا ہو، تمھیں ملے تو اس کو قبول

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ خبر لانے والا کیسا آدمی ہے۔ اگر وہ کوئی فاسق شخص ہو، یعنی جس کا ظاہر حال یہ بتا رہا ہو کہ اس کی بات اعتماد کے لائق نہیں ہے، تو اس کی دی ہوئی خبر پر عمل کرنے سے پہلے تحقیق کر لو کہ امر واقعہ کیا ہے۔ اس حکم ربانی سے ایک اہم شرعی قاعدہ نکلتا ہے جس کا دائرہ اطلاق بہت وسیع ہے۔ اس کی رُو سے مسلمانوں کی حکومت کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا قوم کے خلاف کوئی کارروائی ایسے مخبروں کی دی ہوئی خبروں کی بنا پر کر ڈالے جن کی سیرت بھروسے کے لائق نہ ہو۔ اسی قاعدے کی بنا پر محدثین نے علم حدیث میں جرح و تعدیل کا فن ایجاد کیا تاکہ ان لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں جن کے ذریعے سے بعد کی نسلوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پہنچی تھیں اور فقہا نے قانونِ شہادت میں یہ اصول قائم کیا کہ کسی ایسے معاملے میں جس سے کوئی شرعی حکم ثابت ہوتا ہو، یا کسی انسان پر کوئی حق عائد ہوتا ہو، فاسق کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ اس امر پر اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ عام دنیوی معاملات میں ہر خبر کی تحقیق اور خبر لانے والے کے لائق اعتماد ہونے کا اطمینان کرنا ضروری نہیں ہے، کیونکہ آیت میں لفظ نبا استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ہر خبر پر نہیں ہوتا بلکہ اہمیت رکھنے والی خبر پر ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہا کہتے ہیں کہ عام معاملات میں یہ قاعدہ جاری نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ کسی کے ہاں جاتے ہیں اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اندر سے کوئی آ کر کہتا ہے کہ آ جاؤ۔ آپ اس کے کہنے پر اندر جا سکتے ہیں قطع نظر اس سے کہ صاحب خانہ کی طرف سے اذن کی اطلاع دینے والا فاسق ہو یا صالح۔ اسی طرح اہلِ علم کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ جن لوگوں کا فسق جھوٹ اور بدکرداری کی نوعیت کا نہ ہو بلکہ فسادِ عقیدہ کی بنا پر وہ فاسق قرار پاتے ہوں، ان کی شہادت بھی قبول کی جا سکتی ہے اور روایت بھی۔ محض ان کے عقیدے کی خرابی ان کی شہادت یا روایت قبول کرنے میں مانع نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۷۲ تا ۷۴ الحجرات حاشیہ ۸)

اہلِ ایمان کو فساق و فجار کی روش سے بچنے کا حکم (کی تلقین)

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّ رِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ○ (الانفال ۸: ۴۷)

اور ان لوگوں کے سے رنگ ڈھنگ نہ اختیار کرو جو اپنے گھروں سے اِتراتے اور لوگوں کو اپنی شان دکھاتے ہوئے نکلے اور جن کی روش یہ ہے کہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

اشارہ ہے کفارِ قریش کی طرف، جن کا لشکر مکہ سے اس شان سے نکلا تھا کہ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں، جگہ جگہ ٹھیر کر رقص و سرود اور شراب نوشی کی محفلیں برپا کرتے جا رہے تھے، جو قبیلے اور قریے راستے میں ملتے تھے ان پر اپنی طاقت و شوکت اور اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے سروسامان کا رعب جماتے تھے اور ڈینگیں مارتے تھے کہ بھلا ہمارے مقابلے میں کون سر اٹھا سکتا ہے۔ یہ تو تھی ان کی اخلاقی حالت۔ اور اس پر مزید لعنت یہ تھی کہ ان کے نکلنے کا مقصد ان کے اخلاق سے بھی زیادہ ناپاک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ وہ اس لیے جان و مال کی بازی لگانے نہیں نکلے تھے کہ حق اور راستی اور انصاف کا علم بلند ہو، بلکہ اس لیے نکلے تھے کہ ایسا نہ ہونے پائے اور وہ اکیلا گروہ بھی جو دنیا میں اس مقصد کے لیے اٹھا ہے ختم کر دیا جائے تاکہ اس علم کو اٹھانے والا دنیا بھر میں کوئی نہ رہے۔ اس پر مسلمانوں کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ تم کہیں ایسے نہ بن جانا۔ تمھیں اللہ نے ایمان اور حق پرستی کی جو نعمت عطا کی ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمھارے اخلاق بھی پاکیزہ ہوں اور تمھارا مقصدِ جنگ بھی پاک ہو۔

یہ ہدایت اُسی زمانے کے لیے نہ تھی، آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ کفار کی فوجوں کا جو حال اس وقت تھا وہی آج بھی ہے۔ قحبہ خانے اور فواحش کے اڈے اور شراب کے پیپے ان کے ساتھ جزو لاینفک کی طرح لگے رہتے ہیں۔ خفیہ طور پر نہیں، بلکہ علی الاعلان نہایت بے شرمی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ راشن مانگتے ہیں اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی شہوت کا کھلونا بننے کے لیے پیش کرے۔ پھر بھلا کوئی قوم ان سے کیا امید کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کی سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اٹھا رکھیں گے۔ رہا ان کا تکبر اور تفاخر تو ان کے ہر سپاہی اور ہر افسر کی چال ڈھال اور اندازِ گفتگو میں وہ نمایاں دیکھا جا سکتا ہے اور ان میں سے ہر قوم کے مدبرین کی تقریروں میں **لاغالب لکم الیوم** اور **من اشد منا قوۃ** کی ڈینگیں سنی جا سکتی ہیں۔ ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کا مقاصد جنگ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نہایت مکاری کے ساتھ دنیا کو یقین دلاتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر انسانیت کی فلاح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر درحقیقت ان کے پیشِ نظر ایک فلاح انسانیت ہی نہیں ہے باقی سب کچھ ہے۔ ان کی لڑائی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے اس پر تنہا ان کی قوم متصرف ہو اور دوسرے اس کے چاکر اور دست نگر بن کر رہیں۔ پس اہلِ ایمان کو قرآن کی دائمی ہدایت ہے کہ ان فساق و فجار کے طور طریقوں سے بھی بچیں اور ان ناپاک مقاصد میں بھی اپنی جان کھپانے سے پرہیز کریں جن کے لیے یہ لوگ لڑتے ہیں۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۱۴۸ تا ۱۵۰، الانفال حاشیہ ۳۸)

اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے رفاقت و دوستی کی ممانعت

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (المائدہ ۵:۵۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انھی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِينَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (المائدہ ۵:۵۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تمھارے پیش رو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے، انھیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ۔ اللہ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

اہلِ ایمان کو نظر انداز کر کے کفار کو رفیق بنانے کی ممانعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○ (النساء ۴:۱۴۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو۔

یہود و نصاریٰ کو رفیق بنانے کی ممانعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (المائدہ ۵:۵۱)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، یہ آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انھی میں ہے، یقیناً اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

اپنی فکر کرنے کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ (المائدہ ۵:۱۰۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمھارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔

بجائے اس کے کہ آدمی ہر وقت یہ دیکھتا رہے کہ فلاں کیا کر رہا ہے اور فلاں کے عقیدے میں کیا خرابی ہے اور فلاں کے اعمال میں کیا برائی ہے، اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خود کیا کر رہا ہے۔ اسے فکر اپنے خیالات کی، اپنے اخلاق اور اعمال کی ہونی چاہیے کہ وہ کہیں خراب نہ ہوں۔ اگر آدمی خود اللہ کی اطاعت کر رہا ہے، خدا اور بندوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کر رہا ہے اور راست روی و راست بازی کے مقتضیات پورے کر رہا ہے، جن میں لازماً امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی شامل ہے، تو یقیناً کسی شخص کی گمراہی و کج روی اس کے لیے نقصان دہ نہیں ہو سکتی۔

اس آیت کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ آدمی بس اپنی نجات کی فکر کرے۔ دوسروں کی اصلاح کی فکر نہ کرے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اس غلط فہمی کی تردید کرتے ہوئے ایک خطبے میں فرماتے ہیں "لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ برائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں، ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائیں گے، پھر تمھارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۱۰-۵۱۱، المائدہ حاشیہ ۱۱۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سچے لوگوں کا ساتھ دینے کا حکم

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ○ (التوبہ ۹:۱۱۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کا ساتھ دو۔

انصاف کے علم بردار اور خدا واسطے کے گواہ بننے کا حکم

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو، کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے ہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو، تمھارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اٹھنا ہے۔ تمھیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمھارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

تمھاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی رو رعایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمھارے مدنظر نہ ہو۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۰۵-۴۰۶ النسآء حواشی ۱۶۴-۱۶۵)

السلام علیکم [شعارِ اسلام] کی ضرورت و اہمیت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَى إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا۔ (النساء ۴:۹۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو دوست دشمن میں تمیز کرو اور جو تمھاری طرف اسلام سے تقدیم کرے اُسے فوراً نہ کہہ دو کہ تو مومن نہیں ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابتدائے اسلام میں ''السلام علیکم'' کا لفظ مسلمانوں کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنی میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمھارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں، میرے پاس تمھارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے، لہٰذا نہ تم مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو۔ جس طرح فوج میں ایک لفظ شعار (Password) کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ فوج مخالف کے آدمیوں سے ممیز ہوں، اسی طرح سلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اس زمانے میں اس شعار کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نومسلموں اور کافروں کے درمیان لباس، زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو۔

لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آجاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے ''السلام علیکم'' یا ''لا الٰہ الا اللّٰہ'' پکارتا تھا۔ مگر مسلمانوں کو اس پر یہ شبہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے، اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر بیٹھتے تھے اور اس کی چیزیں غنیمت کے طور پر لوٹ لیتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی۔ مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔

آیت کا منشا

آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس کے متعلق تمھیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہوسکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے، تو قتل کر دینے میں اس کا امکان بھی ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمھارے ہاتھ سے مارا جائے اور بہر حال تمھارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا زیادہ بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا.

آخر اسی حالت میں تم خود بھی تو اس سے پہلے مبتلا رہ چکے ہو، پھر اللہ نے تم پر احسان کیا، لہٰذا تحقیق سے کام لو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

یعنی ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے، اپنے اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے اور تمھارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔ اب یہ اللہ کا احسان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی صحیح شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں مبتلا ہیں ان کے ساتھ تم نرمی و رعایت سے کام نہ لو۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۸۵-۳۸۶ النسآء حاشیہ ۱۲۶-۱۲۷)

مغفرت اور جنت کے حصول کے لیے مسابقت کا حکم

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ (الحدید ۵۷:۲۱)

دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے۔

اصل میں لفظ سَابِقُوْٓا استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم محض "دوڑو" کے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ مسابقت کے معنی مقابلے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کی دولت اور لذتیں اور فائدے سمیٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی جو کوشش کر رہے ہو اسے چھوڑ کر اس چیز کو ہدف مقصود بناؤ اور اس کی طرف دوڑنے میں بازی جیت لے جانے کی کوشش کرو۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۱۸، الحدید حاشیہ ۳۷)

ایفاء عقود کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۭ۬ (المائدہ ۵:۱)

اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔

یعنی ان حدود اور قیود کی پابندی کرو جو اس سورہ میں تم پر عائد کی جا رہی ہیں اور جو بالعموم خدا کی شریعت میں تم پر عائد کی گئی ہیں۔ اس مختصر سے تمہیدی جملے کے بعد ہی ان بندشوں کا بیان شروع ہو جاتا ہے جن کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۳۷ سورۃ المائدہ حاشیہ ۱)

سورۃ کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے اور روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد ۶ ہجری کے اواخر یا ۷ ہجری کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی القعدہ ۶ ہجری کا واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ مگر کفار قریش نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا اور بڑی رد و کد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آئندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارت کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتائے جائیں تاکہ آئندہ سال عمرے کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے اور دوسری طرف انھیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے اُن کو عمرہ سے روک کر جو زیادتی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں۔ اس لیے کہ بہت سے کافر قبیلوں کے حج کا راستہ اسلامی مقبوضات سے گزرتا تھا اور مسلمانوں کے لیے یہ ممکن تھا کہ جس طرح انھیں زیارتِ کعبہ سے روکا گیا ہے اسی طرح وہ بھی ان کو روک دیں۔ آگے چل کر تیرھویں رکوع میں پھر اسی مسئلے کو چھیڑا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے رکوع سے چودھویں رکوع تک ایک ہی سلسلۂ تقریر چل رہا ہے۔

(زمانۂ نزول، سورۃ المائدہ تفہیم القرآن ج ۱ص: ۴۳۴)

سورۂ آلِ عمران اور سورۂ نساء کے زمانۂ نزول سے اس سورہ کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت بڑا تغیر واقع ہو چکا تھا۔ یا تو وہ وقت تھا کہ جنگِ احد کے صدمے نے مسلمانوں کے لیے مدینہ کے قریبی ماحول کو بھی پُر خطر بنا دیا تھا، یا اب یہ وقت آ گیا کہ عرب میں اسلام ایک ناقابلِ شکست طاقت نظر آنے لگا اور اسلامی ریاست ایک طرف نجد تک، دوسری طرف حدودِ شام تک، تیسری طرف ساحل بحر احمر تک اور چوتھی طرف مکہ کے قریب تک پھیل گئی۔ اب اسلام محض ایک عقیدہ و مسلک ہی نہ تھا جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو، بلکہ ایک ریاست بھی تھا جس کی حکمرانی عملاً اپنے حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط تھی۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک ہو چکے تھے کہ جس مسلک پر وہ ایمان لائے تھے، بے روک ٹوک اس کے مطابق زندگی بسر کر سکیں اور اس کے سوا کسی دوسرے عقیدہ و مسلک یا قانون کو اپنے دائرہ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔

پھر ان چند برسوں میں اسلامی اصول اور نقطۂ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق، معاشرت، تمدن، ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممیز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نماز با جماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین دیوانی و فوجداری بڑی حد تک تفصیل کے ساتھ بن چکے تھے اور اپنی عدالتوں کے ذریعے سے نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح اور طلاق کے قوانین، پردۂ شرعی اور استیذان کے احکام اور زنا و قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نشست و برخاست، بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ، جن کا اپنا ایک الگ تمدن بن چکا ہے، پھر کبھی اُن میں آملیں گے۔

یہ حالات تھے جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی۔ یہ سورۂ حسب ذیل تین بڑے بڑے مضامین پر مشتمل ہے:

(۱) مسلمانوں کی مذہبی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے متعلق مزید احکام و ہدایات۔ اس سلسلے میں سفرِ حج کے آداب مقرر کیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گئے ۔شعائر اللہ کے احترام اور زائرین کعبہ سے عدم تعرض کا حکم دیا گیا، کھانے پینے کی چیزوں میں حرام وحلال کے قطعی حدود قائم کیے گئے اور دور جاہلیت کی خود ساختہ بندشوں کو توڑ دیا گیا، اہلِ کتاب کے ساتھ کھانے پینے اور ان کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی، وضو اور غسل اور تیمّم کے قاعدے مقرر کیے گئے، بغاوت اور فساد اور سرقہ کی سزائیں معین کی گئیں، شراب اور جوئے کو قطعاً حرام کر دیا گیا، قسم توڑنے کا کفارہ مقرر کیا گیا اور قانونِ شہادت میں مزید چند دفعات کا اضافہ کر دیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو نصیحت ۔اب چونکہ مسلمان ایک حکمران گروہ بن چکے تھے، ان کے ہاتھ میں طاقت تھی، جس کا نشہ قوموں کے لیے اکثر گمراہی کا سبب بنتا رہا ہے، مظلومی کا دور رخاتمے پر تھا اور اس سے زیادہ سخت آزمائش کے دور میں وہ قدم رکھ رہے تھے، اس لیے ان کو خطاب کرتے ہوئے بار بار نصیحت کی گئی کہ عدل پر قائم رہیں، اپنے پیش رُو اہلِ کتاب کی روش سے بچیں، اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اور اس کے احکام کی پیروی کا جو عہد انھوں نے کیا ہے اس پر ثابت قدم رہیں اور یہود و نصاریٰ کی طرح اس کو توڑ کر اس انجام سے دوچار نہ ہوں جس سے وہ دوچار ہوئے۔ اپنے جملہ معاملات کے فیصلوں میں کتاب الٰہی کے پابند رہیں اور منافقت کی روش سے اجتناب کریں۔

(۳) یہودیوں اور عیسائیوں کو نصیحت ۔یہودیوں کا زور اب ٹوٹ چکا تھا اور شمالی عرب کی تقریباً تمام یہودی بستیاں مسلمانوں کے زیرنگیں آ گئی تھیں۔اس موقع پر ان کو ایک بار پھر ان کے غلط رویے پر متنبہ کیا گیا ہے اور انھیں راہ راست پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔نیز چونکہ صلح حدیبیہ کی وجہ سے عرب اور متصل ممالک کی قوموں میں اسلام کی دعوت پھیلانے کا موقع نکل آیا تھا اس لیے عیسائیوں کو بھی تفصیل کے ساتھ خطاب کر کے ان کے عقائد کی غلطیاں بتائی گئی ہیں اور انھیں نبی عربی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ہمسایہ ممالک میں سے جو قومیں بت پرست اور مجوس تھیں اُن کو براہ راست خطاب نہیں کیا گیا، کیونکہ اُن کی ہدایت کے لیے وہ خطاب کافی تھے جو اُن کے ہم مسلک مشرکین عرب کو خطاب کرتے ہوئے مکہ میں نازل ہو چکے تھے۔

(شان نزول ومباحث، سورۃ المائدہ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۳۵، ۴۳۶)

اہلِ ایمان کو تقویٰ اختیار کرنے کا حکم

قُلْ یٰعِبَادِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةٌ ؕ وَ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ؕ ۔ الآیۃ (الزمر ۲۹:۱۰)

[اے نبیؐ] کہو کہ اے میرے بندو جو ایمان لائے ہو، اپنے رب سے ڈرو۔جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک رویہ اختیار کیا ہے ان کے لیے بھلائی ہے اور خدا کی زمین وسیع ہے۔

یعنی صرف مان کر نہ رہ جاؤ بلکہ اس کے ساتھ تقویٰ بھی اختیار کرو۔جن چیزوں کا اللہ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرو، جن سے روکا ہے ان سے بچو اور دنیا میں اللہ کے مواخذے سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۳۶۳ الزمر حاشیہ ۲۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اہلِ ایمان کو صبر کا دامن تھامے رکھنے کا حکم قرآنی مفہوم کی روشنی میں

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ (الانفال ۸:۴۶)

اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعنی اپنے جذبات وخواہشات کو قابو میں رکھو۔ جلد بازی، گھبراہٹ، ہراس، طمع اور نامناسب جوش سے بچو۔ ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوتِ فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمھارے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ وغضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرانے پائے۔ مصائب کا حملہ ہو اور حالات بگڑتے نظر آ رہے ہوں تو اضطراب میں تمھارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں۔ حصولِ مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا کسی نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمھارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں اور اگر کبھی دنیوی فوائد ومنافع اور لذاتِ نفس کی ترغیبات تمھیں اپنی طرف لبھا رہی ہوں تو ان کے مقابلے میں بھی تمھارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔ یہ تمام مفہومات صرف ایک لفظ ''صبر'' میں پوشیدہ ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ ان تمام حیثیات سے صابر ہوں، میری تائید انھی کو حاصل ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۱۴۸ الانفال حاشیہ ۳۷)

صبر کا لغوی معنیٰ

صبر کے لغوی معنیٰ روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اس سے مراد ارادے کی مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور خواہشاتِ نفس کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں اپنے قلب وضمیر کے پسند کیے ہوئے راستے پر لگاتار بڑھتا چلا جائے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۷۳ البقرہ حاشیہ ۶۰)

صابر وہ شخص ہے جو زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے ذہن کے توازن کو برقرار رکھے۔ وقت کی ہر گردش سے اثر لے کر اپنے مزاج کا رنگ بدلتا نہ چلا جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویے پر ہر حال میں قائم رہے۔ اگر کبھی حالات سازگار ہوں اور وہ دولت مندی اور اقتدار اور ناموری کے آسمانوں پر چڑھا چلا جا رہا ہو تو بڑائی کے نشے میں مست ہو کر بہکنے نہ لگے اور اگر کسی دوسرے وقت مصائب ومشکلات کی چکی اسے پیسے ڈال رہی ہو تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں ضائع نہ کر دے۔ خدا کی طرف سے آزمائش خواہ نعمت کی صورت میں آئے یا مصیبت کی صورت میں، دونوں صورتوں میں اس کی بُردباری اپنے حال پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

قائم رہے اور اس کا ظرف کسی چیز کی بھی چھوٹی یا بڑی مقدار سے چھلک نہ پڑے۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۲۶-۳۲۷ ھود حاشیہ ۱۱)

سورۃ الفرقان آیت ۷۵ میں ارشاد ہے:

يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا۔

اپنے صبر کا پھل منزلِ بلند کی شکل میں پائیں گے۔

صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا، دین حق کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا، ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر ثابت قدم رہنا۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرغم فرض کو بجالانا، حرام سے پرہیز کرنا اور حدود اللہ پر قائم رہنا، گناہ کی ساری لذتوں اور منفعتوں کو ٹھکرا دینا اور نیکی و راستی کے ہر نقصان اور اس کی بدولت حاصل ہونے والی ہر محرومی کو انگیز کر جانا غرض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۴۷۱ الفرقان حاشیہ ۹۴)

سورہ القصص آیت ۸۰ میں ارشاد ربانی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝

مگر جو لوگ علم رکھنے والے تھے وہ کہنے لگے "افسوس تمہارے حال پر، اللہ کا ثواب بہتر ہے اُس شخص کے لیے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو۔

صبر سے مراد ہے اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو رکھنا، لالچ اور حرص و آز کے مقابلے میں ایمانداری اور راستبازی پر ثابت قدم رہنا، صداقت و دیانت سے جو نقصان بھی ہوتا ہو یا جو فائدہ بھی ہاتھ سے جاتا ہوا سے برداشت کر لینا۔ ناجائز تدبیروں سے جو منفعت بھی حاصل ہو سکتی ہو اسے ٹھوکر مار دینا، حلال کی روزی خواہ بقدرِ سدِّ رمق ہی ہو اس پر قانع و مطمئن رہنا، حرام خوروں کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر رشک و تمنا کے جذبات سے بے چین ہونے کے بجائے اس پر ایک نگاہِ غلط انداز بھی نہ ڈالنا اور ٹھنڈے دل سے یہ سمجھ لینا کہ ایک ایماندار آدمی کے لیے اس چمکدار گندگی کی بہ نسبت وہ بے رونق طہارت ہی بہتر ہے جو اللہ نے اپنے فضل سے اس کو بخشی ہے۔ رہا یہ ارشاد کہ " یہ دولت نہیں ملتی مگر صبر کرنے والوں کو" تو اس دولت سے مراد اللہ کا ثواب بھی ہے اور وہ پاکیزہ ذہنیت بھی جس کی بنا پر آدمی ایمان و عمل صالح کے ساتھ فاقہ کشی کر لینے کو اس سے بہتر سمجھتا ہے کہ بے ایمانی اختیار کر کے ارب پتی بن جائے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۶۶۳-۶۶۴ القصص حاشیہ ۱۰۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مومن معاشرے میں ایک دوسرے کو صبر اور رحم کی تلقین کا حکم

ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البلد ۹۰:۱۷)

پھر آدمی ان لوگوں میں شامل ہو جو ایمان لائے اور جنھوں نے ایک دوسرے کو صبر اور [خلق خدا پر] رحم کی تلقین کی۔

یہ مومن معاشرے کی دو اہم خصوصیات ہیں جن کو دو مختصر فقروں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کریں اور دوسری یہ کہ وہ ایک دوسرے کو رحم کی تلقین کریں۔ جہاں تک صبر کا تعلق ہے...... قرآن مجید جس وسیع مفہوم میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے اُس کے لحاظ سے مومن کی پوری زندگی صبر کی زندگی ہے اور ایمان کے راستے پر قدم رکھتے ہی آدمی کے صبر کا امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کی فرض کردہ عبادتوں کے انجام دینے میں صبر درکار ہے۔ خدا کے احکام کی اطاعت و پیروی میں صبر کی ضرورت ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچنا صبر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اخلاق کی برائیوں کو چھوڑنا اور پاکیزہ اخلاق اختیار کرنا صبر چاہتا ہے۔ قدم قدم پر گناہوں کی ترغیبات سامنے آتی ہیں جن کا مقابلہ صبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ بے شمار مواقع زندگی میں ایسے پیش آتے ہیں جن میں خدا کے قانون کی پیروی کی جائے تو نقصانات، تکالیف، مصائب اور محرومیوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اس کے برعکس نافرمانی کی راہ اختیار کی جائے تو فائدے اور لذتیں حاصل ہوتی نظر آتی ہیں۔ صبر کے بغیر ان مواقع سے کوئی مومن بخیریت نہیں گزر سکتا۔ پھر ایمان کی راہ اختیار کرتے ہی آدمی کو اپنے نفس اور اس کی خواہشات سے لے کر اپنے اہل و عیال، اپنے خاندان، اپنے معاشرے، اپنے ملک و قوم اور دنیا بھر کے شیاطین جن و انس کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ راہ خدا میں ہجرت اور جہاد کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ ان سب حالات میں صبر ہی کی صفت آدمی کو ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ ایک ایک مومن اکیلا اکیلا اس شدید امتحان میں پڑ جائے تو ہر وقت شکست کھا جانے کے خطرے سے دوچار ہو گا اور مشکل ہی سے کامیاب ہو سکے گا۔ بخلاف اس کے اگر ایک مومن معاشرہ ایسا موجود ہو جس کا ہر فرد خود بھی صابر ہو اور جس کے سارے افراد ایک دوسرے کو صبر کے اس ہمہ گیر امتحان میں سہارا بھی دے رہے ہوں تو کامرانیاں اُس معاشرے کے قدم چومیں گی۔ بدی کے مقابلے میں ایک بے پناہ طاقت پیدا ہو جائے گی۔ انسانی معاشرے کو بھلائی کے راستے پر لانے کے لیے ایک زبردست لشکر تیار ہو جائے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۳۴۴ البلد حاشیہ ۱۴)

ایمان لانے سے پہلے کھائے پیے پر گرفت نہیں

لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ (المائدہ ۵:۹۳)

جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک عمل کرنے لگے انھوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں، پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمانِ الٰہی ہو اسے مانیں، پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ رکھیں۔ اللہ نیک کردار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔

قانونی احکام کے بیان کے بعد مختصر وعظ ونصیحت

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًاۢ بَصِيْرًا ۝ (النساء: ۱۳۴)

جو شخص محض ثوابِ دُنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی، اور اللہ سمیع وبصیر ہے۔

بالعموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے ان پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے چند پر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ [اوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔] لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا ہے کہ چند باتیں اہلِ ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں۔

ایک یہ کہ تم کبھی اس بھلاوے میں نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمھارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اُس سے ہاتھ کھینچ لوگے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمھاری اور اس کی سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالک زمین وآسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمھیں اور تمھاری طرح پچھلے تمام انبیاؑ کی امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمھاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی تمام اُمتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ لیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اُس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمھاری پروا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سربلند کر دے گا اور تمھارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمھارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اُس میں سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چندروزہ فائدوں ہی پر ریجھتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا یہی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا، مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمھارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمھاری کھیتی کو

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ابد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے، مگر یہ تمھارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلے کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمھارے حصہ میں آئیں۔

آخر میں فرمایا اللہ سمیع و بصیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی شاہِ بے خبر کی طرح اندھا دھند کام کرے اور اپنی عطا و بخشش میں بھلے اور برے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پوری باخبری کے ساتھ اپنی اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کے ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے۔ ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے۔ اسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے ان بخششوں کی امید نہیں کر سکتے جو اس نے صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص کی ہیں۔

(تفہیم القرآن ج ۱ص ۴۰۵-۴۰۶ النسآء حاشیہ ۱۶۳)

نبی کو تسبیح کرنے کے حکم سے کیا مراد ہے؟

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝ (الطور ۵۲: ۴۸-۴۹)

اے نبیؐ اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہ میں ہو۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، رات کو بھی اس کی تسبیح کرو اور ستارے جب پلٹتے ہیں اس وقت بھی۔

(صبر کرو کا) دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ صبر و استقامت کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی تعمیل پر ڈٹے رہو۔ ہم تمھاری نگہبانی کر رہے ہیں۔ تمھیں تمھارے حال پر چھوڑ نہیں دیا ہے۔ تم جب اٹھو تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اس ارشاد کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں اور بعید نہیں کہ وہ سب ہی مراد ہوں۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ جب بھی تم کسی مجلس سے اٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح کر کے اٹھو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس پر عمل فرماتے تھے اور آپؐ نے مسلمانوں کو بھی یہ ہدایت فرمائی تھی کہ کسی مجلس سے اٹھتے وقت اللہ کی حمد و تسبیح کر لیا کریں، اس سے ان تمام باتوں کا کفارہ ادا ہو جاتا ہے جو اس مجلس میں ہوئی ہوں۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے حضرت ابو ہریرہؓ کے واسطے سے حضورؐ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی مجلس میں بیٹھا ہو اور اس میں خوب قیل و قال ہوئی ہو، وہ اگر اٹھنے سے پہلے یہ الفاظ کہے تو اللہ ان باتوں کو معاف کر دیتا ہے جو وہاں ہوں:

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ، اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ

خداوندا، میں تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتا ہوں، میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اور تیرے حضور توبہ کرتا ہوں۔

دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم نیند سے بیدار ہو کر اپنے بستر سے اٹھو تو اپنے رب کی تسبیح کے ساتھ اس کی حمد کرو۔ اس پر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود عمل فرماتے تھے اور اپنے اصحاب کو آپؐ نے یہ تعلیم دی تھی کہ نیند سے جب بیدار ہوں تو یہ الفاظ کہا کریں:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ [مسند احمد، بخاری بروایت عبادہ بن الصامت]

تیسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو اس حکم کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی کہ نماز کی ابتدا تکبیر تحریمہ کے بعد ان الفاظ سے کی جائے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ جب تم اللہ کی طرف دعوت دینے کے لیے اٹھو تو اللہ کی حمد و تسبیح سے اس کا آغاز کرو۔ یہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معمول تھا کہ آپؐ ہمیشہ اپنے خطبوں کا آغاز حمد و ثنا سے فرمایا کرتے تھے۔

مفسر ابن جریر نے اس کا ایک اور مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ جب تم دوپہر کو قیلولہ کر کے اٹھو تو نماز پڑھو اور اس سے مراد نماز ظہر ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۱۸۴-۱۸۵ الطور حواشی ۳۸ تا ۴۰)

بدعت، تعریف اور اقسام

سوال: کیا ”بدعت“ کی دو قسمیں ہیں (۱) حسنہ اور (۲) سیۂ؟ بعض صاحبان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول ”نعمة البدعة“ سے بدعت کے ”حسنہ“ ہونے پر دلیل لاتے ہیں۔ حدیث شریف میں کس قسم کی ”بدعت“ کو ضلالت کہا گیا ہے؟

جواب: شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اس کی کوئی قسم حسنہ نہیں ہے، بلکہ ہر بدعت سیۂ اور ضلالہ ہی ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کل بدعة ضلالة۔ البتہ لغوی اعتبار سے محض نئی بات کے معنی میں بدعت حسنہ بھی ہو سکتی ہے اور سیۂ بھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز تراویح با جماعت کے بارے میں نعمت البدعة هذه کے الفاظ جو فرمائے تھے ان میں بدعت سے مراد اصطلاحی بدعت نہیں بلکہ لغوی بدعت ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسے بدعت کی ایک قسم ”حسنہ“ قرار دینے کے لیے دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے بدعت کا شرعی مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا نماز تراویح با جماعت کا طریقہ رائج کرنا اس مفہوم کے اعتبار سے بدعت کی تعریف میں آتا بھی ہے؟

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

عربی زبان میں بدعت کا لفظ قریب قریب اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے جس میں لفظ ''جدت'' ہم اردو میں استعمال کرتے ہیں۔ یعنی ایک نئی بات جو پہلے نہ ہوئی ہو یا جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو۔ لیکن شریعت میں یہ لفظ اس وسیع مفہوم میں استعمال نہیں ہوتا۔ نہ اس مفہوم میں ہر نئی چیز یا ہر نئے کام اور طریقے کو گمراہی قرار دیا گیا ہے۔ شرعی اصطلاح میں بدعت سے مراد یہ ہے کہ جن مسائل و معاملات کو دین اسلام نے اپنے دائرے میں لیا ہے، ان میں کوئی ایسا طرز فکر یا طرزِ عمل اختیار کرنا جس کے لیے دین کے اصلی مآخذ میں کوئی دلیل و حجت موجود نہ ہو۔[1] اس تعریف کی رو سے وہ مسائل و معاملات یا مسائل و معاملات کے

---

(1) کسی فعل کو بدعت مذمومہ قرار دینے کے لیے صرف یہی بات کافی نہیں ہے کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہ ہوا تھا۔ لغت کے اعتبار سے تو ضرور ہر نیا کام بدعت ہے۔ مگر شریعت کی اصطلاح میں جس بدعت کو ضلالت قرار دیا گیا ہے اس سے مراد وہ نیا کام ہے جس کے لیے شرع میں کوئی دلیل نہ ہو، جو شریعت کے کسی قاعدے یا حکم سے متصادم ہو، جس سے کوئی ایسا فائدہ حاصل کرنا یا کوئی ایسی مضرت رفع کرنا متصور نہ ہو جس کا شریعت میں اعتبار کیا گیا ہے۔ جس کا نکالنے والا اسے خود اپنے اوپر یا دوسروں پر اس ادعا کے ساتھ لازم کرلے کہ اس کا التزام نہ کرنا گناہ اور کرنا فرض ہے۔ یہ صورت اگر نہ ہو تو مجرد اس دلیل کی بنا پر کہ فلاں کام حضورؐ کے زمانے میں نہیں ہوا، اسے ''بدعت'' بمعنی ضلالت نہیں کہا جا سکتا۔ بخاری نے کتاب الجمعہ میں چار حدیثیں نقل کی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ عہد رسالت اور عہد شیخین میں جمعہ کی صرف ایک اذان ہوتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے دور میں ایک اذان کا اور اضافہ کردیا۔ لیکن اسے بدعتِ ضلالت کسی نے بھی قرار نہیں دیا بلکہ تمام امت نے اس نئی بات کو قبول کرلیا۔ بخلاف اس کے انہی حضرت عثمانؓ نے منیٰ میں قصر کرنے کے بجائے پوری نماز پڑھی تو اس پر اعتراض کیا گیا۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر صلوٰۃ ضحیٰ کے لیے خود بدعت اور احداث کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ انها لمن احسن ما احدثوا [یہ ان بہترین نئے کاموں میں سے ہے جو لوگوں نے نکال لیے ہیں] بدعة و نعمت البدعة [بدعت اور اچھی بدعت ہے] ما احدث الناس شیا احب الی منها [لوگوں نے کوئی ایسا نیا کام نہیں کیا ہے جو مجھے اس سے زیادہ پسند ہو] حضرت عمرؓ نے تراویح کے بارے میں وہ طریقہ جاری کیا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں نہ تھا۔ وہ خود اسے نیا کام کہتے ہیں اور پھر فرماتے ہیں نعمت البدعة هذه [یہ اچھا نیا کام ہے] اس سے معلوم ہوا کہ مجرد نیا کام ہونے کی وجہ سے کوئی فعل بدعت مذمومہ نہیں بن جاتا بلکہ اسے بدعت مذمومہ بنانے کے لیے کچھ شرائط ہیں۔

امام نووی شرح مسلم [کتاب الجمعہ] میں کل بدعة ضلالة کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: علماء نے کہا ہے کہ بدعت [یعنی باعتبار لغت نئے کام] کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایک بدعت واجب ہے۔ دوسری بدعت مندوب ہے یعنی پسندیدہ ہے جسے کرنا شریعت میں مطلوب ہے، تیسری بدعت حرام ہے۔ چوتھی مکروہ ہے اور پانچویں مباح ہے اور ہمارے اس قول کی تائید حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو انھوں نے نماز تراویح کے بارے میں فرمایا۔

علامہ عینی عمدۃ القاری [کتاب الجمعہ] میں عبد بن حمید کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ جب مدینہ کی آبادی بڑھ گئی اور دور دور مکان بن گئے تو حضرت عثمانؓ نے تیسری اذان کا [یعنی اس اذان کا جواب جمعہ کے روز سب سے پہلے دی جاتی ہے] حکم دیا اور اس پر کسی نے اعتراض نہ کیا، مگر منیٰ میں پوری نماز پڑھنے پر اعتراض کیا گیا۔

علامہ ابن حجر فتح الباری [کتاب التراویح] میں حضرت عمرؓ کے قول نعمت البدعة هذه کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بدعت ہر اس نئے کام کو کہتے ہیں جو کسی مثال سابق کے بغیر کیا گیا ہو۔ مگر شریعت میں یہ لفظ سنت کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اور اسی بنا پر بدعت کو مذموم کہا جاتا ہے اور تحقیق یہ ہے کہ جو نیا کام شرعاً مستحسن کی تعریف میں آتا ہو وہ اچھا ہے اور جو شرعاً برے کام کی تعریف میں آتا ہو وہ برا ہے، ورنہ پھر مباح کی قسم میں سے ہے۔

(رسائل و مسائل چہارم ص ۱۳۳ تا ۱۳۵ اشاعت اول بحوالہ ترجمان القرآن جلد ۶۰، عدد ۱، اپریل ۱۹۶۳ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ پہلو جن سے دین نفیاً یا اثباتاً کوئی تعرض نہیں کرتا، جن کے متعلق صاحب شریعت نے خود فرما دیا کہ انتم اعلم بامور دنیاکم، بدعت وسنت کی بحث سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔ کسی چیز کے بدعت ہونے یا نہ ہونے کا سوال صرف انھی امور میں پیدا ہوتا ہے جن میں انسان کی رہنمائی کرنا دین نے اپنے ذمہ لیا ہے اور جن میں اللہ اور اس کے رسول نے احکام دیے ہیں یا اصولی ہدایات عطا فرمائی ہیں، خواہ وہ عقائد اور خیالات وتصورات کے باب سے تعلق رکھتے ہوں یا اخلاق سے، یا عبادات اور مذہبی رسوم سے، یا معاشرت، تمدن، سیاست، معیشت اور دوسری ان چیزوں سے جنھیں عام طور پر دنیوی معاملات سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان امور میں جب کوئی ایسی بات کی جائے گی جس کے ماخذ کا حوالہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی تعلیم وہدایت میں نہ دیا جا سکتا ہو، یا جس کے حق میں دین کے ان مآخذ اصلیہ سے کوئی معقول دلیل نہ پیش کی جاسکتی ہو، تو وہ بدعت ہوگی اور اگر کتاب وسنت کی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہو تو اس پر محض بدعت کا نہیں بلکہ فسق اور معصیت کا اطلاق ہوگا۔

بدعت کے شرعی مفہوم کی اس تشریح کے بعد یہ بات محتاج کلام نہیں رہتی کہ اس معنی میں جو چیز بدعت ہو اس کے حسنہ ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ تو لازماً سیہ ہی ہوگی اور اس کو سیۂ ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ دین نام ہے اس نظام کا جو خدا اور اس کے رسول کی تعلیم وہدایت پر مبنی ہو اور اس نظام میں بہر حال ایسی کوئی چیز داخل نہیں ہوسکتی جو اس تعلیم وہدایت پر مبنی نہ ہو۔ ایسی کوئی چیز جب بھی اس میں داخل ہوگی اس نظام کے مزاج اور اس کی ترکیب کو بگاڑ دے گی۔ پھر کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بگاڑنے والی چیز حسنہ بھی ہو۔

اب دیکھیے کہ حضرت عمرؓ نے جس چیز کو ''اچھی بدعت'' کہا تھا کیا وہ واقعی اس معنی میں بدعت تھی جس میں کوئی شے اصطلاح شرع میں بدعت قرار پاسکتی ہے؟

جہاں تک نفسِ تراویح کا تعلق ہے، یعنی رمضان میں نمازِ عشا کے بعد قیام لیل، وہ تو صرف جائز ہی نہیں، مندوب اور مسنون بھی ہے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب دی ہے، اس کو دوسرے دنوں کے قیام لیل سے زیادہ اہمیت دی ہے اور خود اس پر عمل فرمایا ہے۔ جہاں تک اس کے جماعت کے ساتھ پڑھنے کا تعلق ہے اس پر بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں عمل ہوا ہے اور آپؐ نے اسے جائز رکھا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ مسجد نبوی میں مختلف مقامات پر مختلف لوگ رمضان میں رات کے وقت نماز پڑھتے تھے۔ جس کو جتنا قرآن یاد ہوتا وہ اتنا ہی پڑھتا اور کسی کے ساتھ ایک، کسی کے ساتھ پانچ، کسی کے ساتھ سات یا کم وبیش مقتدی کھڑے ہو جاتے تھے۔ پھر جہاں تک ایک جماعت میں سب کو جمع کر کے ایک امام کے پیچھے تراویح پڑھنے کا تعلق ہے، اس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی مرتبہ عمل فرمایا ہے، ترمذی، ابوداؤد اور دوسری کتب سنن میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ایک رمضان کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ مہینہ ختم ہونے میں سات دن باقی تھے کہ رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو نماز پڑھائی یہاں تک کہ ایک تہائی شب گزر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گئی، پھر ایک دن چھوڑ کر ایک روز سحری کے وقت تک پڑھاتے رہے۔

بخاری اور مسلم میں حضرت عائشہؓ رضی اللہ عنہا ایک اور رمضان کا حال بیان فرماتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو یا تین دن مسلسل نماز تراویح پڑھائی۔ پھر تیسرے یا چوتھے روز جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نماز پڑھانے کے لیے نہ نکلے اور بعد میں اس کی وجہ یہ بیان کی کہیں یہ فرض نہ قرار دے دی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ تو مسنون تھا۔ اب جس چیز کو نئی بات کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس طریقے کو ہمیشہ کے لیے جاری کر دیا۔ اس چیز کو بدعت اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھانے کی وجہ صرف یہ بیان فرمائی تھی کہ کہیں یہ لوگوں پر فرض نہ قرار دے دی جائے۔ یہ وجہ خود اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ آپؐ کے نزدیک یہ طریقہ رائج ہونا اور تمام حیثیتوں سے تو پسندیدہ تھا۔ البتہ فرض قرار پا جانے کا اندیشہ اس میں مانع تھا کہ آپؐ اسے رائج فرمائیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس اندیشے کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ کیونکہ کسی دوسرے شخص کا عمل کسی چیز کے لیے شریعت میں فرض ہونے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس لیے حضرت عمرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس منشا کو پورا کر دیا جو آپؐ کی اس توجیہ میں مضمر تھا۔ یعنی یہ کہ یہ طریقہ رائج تو ہو مگر مشروع اور مسنون طریقے کی حیثیت سے، نہ کہ فرض کی حیثیت سے۔ اس پر بعض لوگوں کو جب بدعت ہونے کا شبہ ہوا تو حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ یہ اچھی بدعت ہے۔ یعنی یہ نئی بات تو ہے مگر اس نوعیت کی نئی بات نہیں ہے جسے شریعت میں مذموم قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے بالاتفاق اس طریقے کے رواج کو قبول کیا اور اُن کے بعد ساری اُمت اس پر عمل کرتی رہی۔ ورنہ کون یہ تصور کر سکتا تھا کہ شرعی اصطلاح میں جس چیز کو بدعت کہتے ہیں، اسے رائج کرنے کا ارادہ حضرت عمرؓ کے دل میں پیدا ہوتا اور صحابہؓ کی پوری جماعت بھی آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیتی۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۳۵۷ تا ۳۶۲ اشاعت ششم جولائی ۱۹۷۶ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن محرم، صفر ۱۳۷۷ھ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۷ء)

❀❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل سوم

فنونِ لطیفہ

[مصوری، مجسمہ سازی، شاعری وغیرہ]

گڑیوں کا حکم

سوال: کیا بچوں کے کھیل کا سامان، مثلاً چینی کی گولیاں، تاش، ربڑ کی چڑیاں اور لڑکیوں کے لیے گڑیاں وغیرہ فروخت کرنا جائز ہے۔ نیز ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں بھی کیا بیچی جا سکتی ہیں؟

جواب: بچوں کے کھلونے بیچنا بجائے خود ناجائز نہیں ہے الا یہ کہ کسی خاص کھلونے یا کھیل کے سامان میں کوئی شرعی قباحت ہو، رہے جانوروں اور آدمیوں کے مجسمے تو ان کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پوری باریکی سے تمام خدوخال کے ساتھ انھیں بنایا گیا ہو۔ دوسرے یہ کہ محض ایک سرسری ساڈھانچہ کسی جاندار کا ہو، جیسے لکڑی کے گھوڑے اور کپڑے کی گڑیاں۔ پہلی قسم کے مجسموں کی فروخت جائز نہیں ہے۔ البتہ دوسری قسم کے کھلونے آپ بیچ سکتے ہیں۔ رہیں ہندوؤں کی ضرورت کی گڑیاں تو اگر وہ مشرکانہ تخیلات کی نمائندہ ہوں، مثلاً کرشن جی کی مورتی یا رام چندر جی کا مجسمہ وغیرہ، تو ان کی فروخت حرام ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۴۰۳-۴۰۴ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

اسلام اور سینماٹوگرافی

سوال: میں ایک طالب علم ہوں۔ میں نے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ خدا کے فضل سے مجھ میں نمایاں ذہنی و عملی انقلاب رونما ہوا ہے۔ مجھے ایک زمانے سے سینماٹوگرافی سے گہری فنی دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ نظریات کی تبدیلی کے بعد میری دلی خواہش ہے کہ اگر شرعاً ممکن ہو تو اس فن سے دینی و اخلاقی خدمت لی جائے۔ آپ براہ نوازش مطلع فرمائیں کہ اس فن سے استفادے کی گنجائش اسلام میں ہے یا نہیں۔ اگر جواب اثبات میں ہو تو پھر یہ بھی واضح فرمائیں کہ عورت کا کردار پردۂ فلم پر دکھانے کی بھی کوئی جائز صورت ممکن ہے یا نہیں؟

جواب: میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ سینما بجائے خود جائز ہے، البتہ اس کا ناجائز استعمال

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کو ناجائز کر دیتا ہے۔ سینما کے پردے پر جو تصویر نظر آتی ہے وہ دراصل ''تصویر'' نہیں بلکہ پرچھائیں ہے، جس طرح آئینے میں نظر آیا کرتی ہے، اس لیے وہ حرام نہیں، رہا وہ عکس جو فلم کے اندر ہوتا ہے، تو وہ جب تک کاغذ یا کسی دوسری چیز پر چھاپ نہ لیا جائے، نہ اس پر تصویر کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ وہ ان کاموں میں سے کسی کام کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے باز نہ رہنے ہی کی خاطر شریعت میں تصویر کو حرام کیا گیا ہے۔ ان وجوہ سے میرے نزدیک سینما بجائے خود مباح ہے۔

جہاں تک اس فن کو سیکھنے کا تعلق ہے، کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو اس سے منع کیا جائے۔ آپ کا اس طرف میلان ہے تو آپ اسے سیکھ سکتے ہیں، بلکہ اگر مفید کاموں میں اسے استعمال کرنے کا ارادہ ہو تو آپ اسے ضرور سیکھیں۔ کیونکہ یہ قدرت کی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسے بھی دوسری فطری طاقتوں کے ساتھ خدمت حق اور مقاصد خیر کے لیے استعمال کیا جائے۔ خدا نے جو چیز بھی دنیا میں پیدا کی ہے، انسان کی بھلائی کے لیے اور حق کی خدمت کے لیے پیدا کی ہے۔ یہ ایک بدقسمتی ہوگی کہ شیطان کے بندے تو اسے شیطانی کاموں کے لیے خوب خوب استعمال کریں اور خدا کے بندے اسے خیر کے کاموں میں استعمال سے پرہیز کرتے رہیں۔

اب رہا فلم کو اسلامی اغراض اور مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سوال تو اس میں شک نہیں کہ بظاہر ایسے معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی اور تاریخی فلم بنانے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی جو فواحش اور جنسی مہیجات اور تعلیم جرائم سے پاک ہوں اور جن کا اصل مقصد بھلائی کی تعلیم دینا ہو۔ لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں دو بڑی قباحتیں ہیں جن کا کوئی علاج ممکن نہیں ہے۔

اول یہ کہ کوئی ایسا معاشرتی فلم بنانا سخت مشکل ہے جس میں عورت کا سرے سے کوئی پارٹ نہ ہو۔ اب اگر عورت کا پارٹ رکھا جائے تو اس کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں ایک یہ کہ اس میں عورت ہی ایکٹر ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں مرد کو عورت کا پارٹ دیا جائے۔ شرعاً ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے۔

دوم یہ کہ کوئی معاشرتی ڈرامہ، بہرحال ایکٹنگ کے بغیر نہیں بن سکتا اور ایکٹنگ میں ایک عظیم الشان اخلاقی خرابی یہ ہے کہ ایکٹر آئے دن مختلف سیرتوں اور کرداروں کا سوانگ بھرتے بھرتے بالآخر اپنا انفرادی کیرکٹر بالکل نہیں تو بڑی حد تک کھو بیٹھتا ہے۔ اس طرح چاہے ہم فلمی ڈراموں کو معاشرے کی اصلاح اور اسلامی حقائق کی تعلیم وتبلیغ ہی کے لیے کیوں نہ استعمال کریں، ہمیں بہرحال چند انسانوں کو اس بات کے لیے تیار کرنا پڑے گا کہ وہ ایکٹر بن کر اپنا انفرادی کریکٹر کھو دیں یعنی دوسرے الفاظ میں اپنی شخصیت کی قربانی دیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ معاشرے کی بھلائی کے لیے، یا کسی دوسرے مقصد کے لیے، خواہ وہ کتنا ہی پاکیزہ اور بلند مقصد ہو، کسی انسان سے شخصیت کی قربانی کا مطالبہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ جان، مال، عیش، آرام ہر چیز تو قربان کی جا سکتی ہے اور مقاصد عالیہ کے لیے کی جانی چاہیے، مگر یہ وہ قربانی ہے جس کا مطالبہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے بھی نہیں کیا ہے، کجا کہ کسی اور کے لیے اس کا مطالبہ کیا جاسکے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ان وجوہ سے میرے نزدیک سینما کی طاقت کو فلمی ڈراموں کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طاقت اور کس کام میں لائی جا سکتی ہے؟ میرا جواب یہ ہے کہ ڈرامے کے سوا دوسری بہت سی چیزیں بھی ہیں جو فلم میں دکھائی جا سکتی ہیں اور وہ ڈرامے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید ہیں۔ مثلاً ہم جغرافی فلموں کے ذریعہ سے اپنے عوام کو زمین اور اس کے مختلف حصوں کے حالات سے اتنی وسیع واقفیت بہم پہنچا سکتے ہیں کہ گویا وہ دنیا بھر کی سیاحت کر آئے ہیں۔ اسی طرح ہم مختلف قوموں اور ملکوں کی زندگی کے بے شمار پہلوان کو دکھا سکتے ہیں جن سے ان کو بہت سے سبق بھی حاصل ہوں گے اور ان کا نقطۂ نظر بھی وسیع ہوگا۔

ہم علم ہیئت کے حیرت انگیز حقائق اور مشاہدات ایسے دلچسپ طریقوں سے پیش کر سکتے ہیں کہ لوگ شہوانی فلموں کی دلچسپیاں بھول جائیں اور پھر یہ فلم اتنے سبق آموز بھی ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کے دلوں پر توحید اور اللہ کی ہیبت کا سکہ بیٹھ جائے۔

ہم سائنس کے مختلف شعبوں کو سینما کے پردے پر اس طرح پیش کر سکتے ہیں کہ عوام کو ان سے دلچسپی بھی ہو اور ان کی سائنٹفک معلومات بھی ہمارے انڈر گریجویٹوں کے معیار تک بلند ہو جائیں۔

ہم صفائی اور حفظانِ صحت اور شہریت (Civics) کی تعلیم بڑے دلچسپ انداز سے لوگوں کو دے سکتے ہیں جس سے ہمارے دیہاتی اور شہری عوام کی محض معلومات ہی وسیع نہ ہوں گی بلکہ وہ دنیا میں انسانوں کی طرح جینے کا سبق بھی حاصل کریں گے۔ اس سلسلے میں ہم دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے مفید نمونے بھی لوگوں کو دکھا سکتے ہیں تاکہ وہ ان کے مطابق اپنے گھروں اور اپنی بستیوں اور اپنی اجتماعی زندگی کو درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں۔

ہم مختلف صنعتوں کے ڈھنگ، مختلف کارخانوں کے کام، مختلف اشیا کے بننے کی کیفیت اور زراعت کے ترقی یافتہ طریقے سینما کے پردے پر دکھا سکتے ہیں جن سے ہماری صنعت پیشہ اور زراعت پیشہ آبادی کے معیارِ علم اور معیارِ کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہم سینما سے تعلیم بالغاں کا کام بھی لے سکتے ہیں اور اس کام کو اتنا دلچسپ بنایا جا سکتا ہے کہ ان پڑھ عوام اس سے ذرا نہ اُکتائیں۔

ہم اپنے عوام کو فنِ جنگ کی، سول ڈیفنس کی، گوریلا وار فیر کی، گلیوں اور کوچوں میں دفاعی جنگ لڑنے کی اور ہوائی حملوں سے تحفظ کی ایسی تعلیم دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے بہترین طریقے پر تیار ہو سکیں۔ نیز ہوائی اور بری اور بحری لڑائیوں کے حقیقی نقشے بھی ان کو دکھا سکتے ہیں تاکہ وہ جنگ کے عملی حالات سے پیشگی باخبر ہو جائیں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے دوسرے مفید استعمالات سینما کے ہو سکتے ہیں۔ مگر ان میں سے کوئی تجویز بھی اس وقت تک

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ ابتداً حکومت کی طاقت اور اس کے ذرائع اس کی پشت پر نہ ہوں۔ اس کے لیے اولین ضرورت یہ ہے کہ عشق بازی اور جرائم کی تعلیم دینے والے فلم یک لخت بند کر دیے جائیں، کیونکہ جب تک اس شراب کی لت زبردستی لوگوں سے چھڑائی نہ جائے گی، کوئی مفید چیز ان کے منہ کو لگنی محال ہے۔ دوسری اہم ضرورت یہ ہے کہ ابتدا میں مفید تعلیمی فلم حکومت کو خود اپنے سرمائے سے تیار کرانے ہوں گے اور ان کو عوام میں رواج دینے کی کوشش کرنی ہوگی، یہاں تک کہ جب کاروباری حیثیت سے یہ فلم کامیاب ہونے لگیں گے تب نجی سرمایہ اس صنعت کی طرف متوجہ ہوگا۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۶۲ تا ۲۶۷ اشاعت تیرھویں ۱۹۸۲ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن ذی القعدہ ۱۳۷۱ھ مطابق اگست ۱۹۵۲ء)

فوٹو کی اسلام میں حیثیت

سوال: میرے ایک فوٹو گرافر دوست کا خیال ہے کہ اسلام نے تصویر کے متعلق جو امتناعی حکم دیا ہے وہ فوٹو پر عائد نہیں ہوتا، بالخصوص جب کہ فحش منظر کا فوٹو نہ لیا جائے۔ کیا اس حد کو قائم رکھتے ہوئے فوٹو گرافی کو پیشہ بنایا جا سکتا ہے؟ قومی لیڈروں، جلسوں اور جلوسوں کی تصویریں لینے میں کیا حرج ہے؟

جواب: فوٹو کے متعلق اصولی بات یہ سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام جاندار چیزوں کی مستقل شبیہ محفوظ کرنے کو بالعموم روکنا چاہتا ہے کیونکہ انسانی تاریخ کا طویل تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ چیز اکثر فتنے کی موجب بنی ہے۔ اب چونکہ اصل فتنہ صورت کا محفوظ ہونا ہے لہٰذا اس سے بحث نہیں کی جائے گی کہ اس کو کس طریقے سے محفوظ کیا جاتا ہے۔ طریقہ خواہ سنگ تراشی ہو یا موقلم یا عکاسی یا اور کوئی جو آئندہ ایجاد ہو، بہرحال وہ ناجائز ہی رہے گا کیونکہ یہ سارے طریقے اصل فتنے کا سبب بننے میں یکساں ہیں۔ پس فوٹو گرافی اور مصوری میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا اور ممانعت چونکہ جاندار اشیا کی تصویروں کی ہے اس لیے تمام تصویریں حرام رہیں گی، خواہ وہ فحش ہوں یا غیر فحش۔ البتہ فحش تصویر میں ایک وجہ حرمت کی اور بڑھ جاتی ہے۔

اس عام حکم کے اندر اگر کوئی استثنا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جہاں تصویر لینے کا کوئی حقیقی تمدنی فائدہ ہو یا جبکہ تصویر کسی بڑی تمدنی مصلحت کے لیے ناگزیر ہو تو صرف اس غرض کو پورا کرنے کی حد تک یہ فعل جائز ہوگا۔ مثلاً پاسپورٹ، پولیس کا مجرموں کی شناخت کے لیے تصویریں محفوظ کرنا، ڈاکٹروں کا علاج کے لیے یا فن طب کی تعلیم کے لیے مریضوں کی تصویریں لینا اور جنگی اغراض کے لیے فوٹو گرافی کا استعمال۔ ① یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے استعمالات حکم عام سے مستثنیٰ قرار پائیں گے، بشرطیکہ وہ غرض جس کے لیے اس استثناء سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہو، بجائے خود حلال ہو۔ لیکن لیڈروں کی تصویریں اور جلسوں اور جلوسوں کی

① یہ استثناء اسی اصول پر مبنی ہے جس کی بنیاد پر علمائے سلف نے لڑکیوں کی تربیت اور کھیل کے لیے گڑیوں کے استعمال کی اجازت دی ہے اور جس کا ثبوت حدیث سے ملتا ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تصویریں کسی طرح بھی جائز اور حقیقی ضرورت کی تعریف میں نہیں آتیں۔خصوصاً لیڈروں کی تصویریں تو بندگانِ خدا کو اس خطرہ سے بہت ہی قریب پہنچا دیتی ہیں، جس کی وجہ سے تصویر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔یہ کانگرس کے اجلاس میں گاندھی جی کا باون فٹ لمبا فوٹو، یہ پولینڈ پر روسی قبضے کے بعد ہی اسٹالین کی تصویروں کا پولینڈ کے ایک ایک گاؤں میں درآمد کیا جانا، یہ روس میں ہر جگہ اسٹالین اور پولٹ بیورو کے ارکان کی تصویروں کا لوگوں کے سروں پر مسلط رہنا، یہ جرمن سپاہیوں کا ہٹلر کی تصویر کو سینے سے لگائے پھرنا اور ہسپتال میں مرتے وقت اس کی تصویر کو آنکھوں سے لگا کر جان دینا، یہ سینما میں شاہِ انگلستان کی تصویر سامنے آتے ہی لوگوں کا کھڑا ہو جانا، یہ سکوں پر بادشاہ کی تصویر کا بطور علامت حاکمیت ثبت کیا جانا، کیا یہ سب بت پرستی کی جڑیں نہیں ہیں؟ آخر اسی لیے تو اسلام نے تصویر کو حرام کیا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر خدا کے سوا کسی دوسرے کی کبریائی کا نقش قائم نہ ہونے پائے۔میں تو چھوٹے بچوں کی تصویریں لینے کو بھی اسی لیے حرام سمجھتا ہوں کہ معلوم نہیں ان بچوں میں آگے چل کر کس کو خدا بنا لیا جائے اور اس کی تصویر فتنے کی موجب بن جائے۔کنھیا جی کی بچپن کی تصویر آج تک بِک رہی ہے۔لہٰذا آپ اپنے دوست کو سمجھا دیجیے کہ ان کا پیشہ شریعت کے نقطۂ نظر سے جائز نہیں ہے۔اگر وہ خدا کا خوف رکھتے ہیں تو بتدریج اس پیشے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا ذریعۂ معاش تلاش کر لیں اور اگر یہی کام کرنا چاہتے ہیں تو اسے خواہ مخواہ حلال بنانے کی کوشش نہ کریں۔اخلاقی تنزل کا بدترین مرتبہ یہ ہے کہ آدمی جس گناہ میں مبتلا ہو اسے جھوٹی تاویلوں سے صواب ٹھیرا لے۔اس گڑھے میں گرنے کے بعد پھر آدمی کے سنبھلنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۱۸۹ تا ۱۹۲ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن رجب شعبان ۶۲ھ جولائی اگست ۱۹۴۳ء)

مصوری اور مجسمہ سازی

يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ۔ الآیۃ (سبا ۳۴:۱۳)

وہ اُس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا، اونچی عمارتیں، تصویریں۔

اصل میں لفظ تَمَاثِیل استعمال ہوا ہے جو تِمثال کی جمع ہے۔تمثال عربی زبان میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی قدرتی شے کے مشابہ بنائی جائے، قطع نظر اس سے کہ وہ کوئی انسان ہو یا حیوان، کوئی درخت ہو یا پھول یا دریا یا کوئی دوسری بے جان چیز۔التمثال اسم للشئ المصنوع مشبها بخلق من خلق الله [لسان العرب] ''تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے مانند بنائی گئی ہو۔'' التمثال کل ماصور علی صورة غیره من حیوان و غیر حیوان [تفسیر کشاف] ''تمثال ہر اس تصویر کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز کی صورت کے مماثل بنائی گئی ہو، خواہ وہ جان دار ہو یا بے جان۔'' اس بنا پر قرآن مجید کے اس بیان سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جو ''تماثیل'' بنائی جاتی تھیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہ ضرور انسانوں اور حیوانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے ہی ہوں گے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پھول پتیاں اور قدرتی مناظر اور مختلف قسم کے نقش ونگار ہوں جن سے حضرت سلیمانؑ نے اپنی عمارتوں کو آراستہ کرایا ہو۔

کیا حضرت سلیمانؑ نے انبیاؑ اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں؟

غلط فہمی کا منشا بعض مفسرین کے یہ بیانات ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیا اور ملائکہ کی تصویریں بنوائی تھیں۔ یہ باتیں ان حضرات نے بنی اسرائیل کی روایات سے اخذ کرلیں اور پھر ان کی توجیہ یہ کی کہ پچھلی شریعتوں میں اس قسم کی تصویریں بنانا ممنوع نہ تھا۔لیکن ان روایات کو بلاتحقیق نقل کرتے ہوئے ان بزرگوں کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جس شریعت موسوی کے پیرو تھے اس میں بھی انسانی اور حیوانی تصاویر اور مجسمے اسی طرح حرام تھے جس طرح شریعت محمدیہ میں حرام ہیں اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ کو حضرت سلیمانؑ سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر انھوں نے آنجناب کو شرک و بت پرستی اور جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا ہے۔اس لیے ان کی روایات پر اعتماد کرکے اس جلیل القدر پیغمبر کے بارے میں کوئی ایسی بات ہرگز قبول نہ کرنی چاہیے جو خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت کے خلاف پڑتی ہو۔ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیا بھی آئے ہیں وہ سب توراۃ کے پیرو تھے اور ان میں سے کوئی بھی نئی شریعت نہ لایا تھا جو توراۃ کے قانون کی ناسخ ہوتی۔اب توراۃ کو دیکھیے تو اس میں بار بار بصراحت یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔

’’تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان میں یا نیچے زمین یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔‘‘ [خروج باب ۲۰ آیت ۴]

’’تم اپنے لیے بت نہ بنانا اور نہ تراشی ہوئی مورت یا لاٹ اپنے لیے کھڑی کرنا اور نہ اپنے ملک میں کوئی شبیہ دار پتھر رکھنا کہ اسے سجدہ کرو۔‘‘ [احبار باب ۲۶ آیت ۱]

’’تا نہ ہو کہ تم بگڑ کر کسی شکل یا صورت کی کھودی ہوئی مورت اپنے لیے بنالو جس کی شبیہ کسی مرد یا عورت یا زمین کے کسی حیوان یا ہوا میں اڑنے والے کسی پرند یا زمین میں رینگنے والے جاندار یا مچھلی سے جو زمین کے نیچے پانی میں رہتی ہے ملتی ہو۔‘‘ [استثناء باب ۴ آیت ۱۶-۱۸]

’’لعنت اس آدمی پر جو کاریگری کی صنعت کی طرح کھودی ہوئی یا ڈھالی ہوئی مورت بنا کر جو خداوند کے نزدیک مکروہ ہے اس کو کسی پوشیدہ جگہ میں نصب کرے۔‘‘ [استثناء باب ۲۷ آیت ۱۵]

ان صاف اور صریح احکام کے بعد یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے انبیا اور ملائکہ کی تصویریں یا ان کے مجسمے بنانے کا کام جنوں سے لیا ہوگا اور یہ بات آخر ان یہودیوں کے بیان پر اعتماد کرکے کیسے تسلیم کرلی جائے جو حضرت سلیمانؑ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ اپنی مشرک بیویوں کے عشق میں مبتلا ہو کر بت پرستی کرنے لگے تھے۔[۱-سلاطین باب ۱۱]

’’ محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ ‘‘

www.KitaboSunnat.com

مفسرین کی صراحت

تاہم مفسرین نے تو بنی اسرائیل کی یہ روایات نقل کرنے کے ساتھ اس امر کی صراحت کردی تھی کہ شریعت محمدیہ میں یہ فعل حرام ہے اس لیے اب کوئی شخص حضرت سلیمانؑ کی پیروی میں تصویریں اور مجسمے بنانے کا مجاز نہیں ہے۔

اہلِ مغرب کی تقلید میں بعض لوگوں کا مصوری اور بت تراشی کو حلال کرنا

لیکن موجودہ زمانے کے بعض لوگوں نے، جو اہلِ مغرب کی تقلید میں مصوری و بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کی اس آیت کو اپنے لیے دلیل ٹھیرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب ایک پیغمبر نے یہ کام کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کتاب میں اس کے اس فعل کا ذکر کیا ہے اور اس پر کسی ناپسندیدگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا ہے تو اسے لازماً حلال ہی ہونا چاہیے۔

مقلدین مغرب کے استدلال کی غلطی

ان مقلدین مغرب کا یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ اوّل یہ کہ لفظ تماثیل جو قرآن مجید میں استعمال کیا گیا ہے، انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنی میں صریح نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق غیر جاندار اشیا کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے، اس لیے محض اس لفظ کے سہارے یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ قرآن کی رو سے انسانی اور حیوانی تصاویر حلال ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہایت کثیر التعداد اور قوی الاسناد اور متواتر المعنی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی روح اشیا کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اس معاملے میں جو ارشادات حضورؐ سے ثابت ہیں اور جو آثار اکابر صحابہؓ سے منقول ہوئے ہیں انھیں ہم نقل کرتے ہیں۔

ارشاداتِ نبویؐ

(۱) عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّ اُمَّ حَبِيْبَةَ وَاُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتَا كَنِيْسَةً رَأَيْنَهَا بِالْحَبَشَةِ فِيْهَا تَصَاوِيْرُ، فَذَكَرَتَا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اِنَّ اُولٰٓئِكَ اِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ فَاُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللّٰهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [بخاری، كتاب الصلوة، مسلم كتاب المساجد، نسائی كتاب المساجد]

ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت اُم حبیبہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ نے حبش میں ایک کنیسہ دیکھا تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس کا ذکر انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ حضورؐ نے فرمایا: ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی صالح شخص ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد وہ اس کی قبر پر ایک عبادت گاہ بناتے اور اس میں یہ تصویریں بنالیا کرتے تھے۔ یہ لوگ قیامت کے روز اللہ کے نزدیک بدترین خلائق قرار پائیں گے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

(۲) عَنْ اَبِیْ جُحَیْفَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ الْمُصَوِّرَ [بخاری، کتاب البیوع کتاب الطلاق و کتاب اللباس]

ابوجُحَیفہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصور پر لعنت فرمائی ہے۔

(۳) عَنْ اَبِیْ زُرْعَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ اَبِیْ هُرَیْرَةَ دَارًا بِالْمَدِیْنَةِ فَرَاٰی اَعْلَاهَا مُصَوِّرًا یُصَوِّرُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ یَخْلُقُ کَخَلْقِیْ فَلْیَخْلُقُوْا حَبَّةً اَوْلِیَخْلُقُوْ اَذْرَةً [بخاری، کتاب اللباس، مسند احمد اور مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ مروان کا گھر تھا]

ابوزرعہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابوہریرۃ کے ساتھ ایک مکان میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مکان کے اوپر ایک مصور تصویریں بنا رہا ہے۔ اس پر حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرے۔ یہ لوگ ایک دانہ یا ایک چیونٹی تو بنا کر دکھائیں۔"

(۴) عَنْ اَبِیْ مُحَمَّدِ الْهُذَلِیِّ عَنْ عَلِیٍّ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْ جَنَازَةٍ فَقَالَ اَیُّکُمْ یَنْطَلِقُ اِلَی الْمَدِیْنَةِ: فَلَا یَدَعُ بِهَاوَثَنًا اِلَّا کَسَرَهُ وَلَا قَبْرًا اِلَّا سَوَّاهُ وَلَا صُوْرَةً اِلَّا لَطَخَهَا۔ فَقَالَ رَجُلٌ اَنَا یَارَسُوْلَ اللّٰهِ فَانْطَلَقَ۔ فَهَابَ اَهْلَ الْمَدِیْنَهِ: فَرَجَعَ فَقَالَ عَلِیٌّ اَنَا اَنْطَلِقُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ فَانْطَلِقْ فَانْطَلَقَ ثُمَّ رَجَعَ۔ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ لَمْ اَدَعْ بِهَاوَثَنًا اِلَّا کَسَرْتُهُ وَلَاقَبْرًا اِلَّا سَوَّیْتُهُ وَلَا صُوْرَةً اِلَّا لَطَخْتُهَا۔ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ عَادَ لِصَنْعَةِ شَیْءٍ مِنْ هٰذَا فَقَدْ کَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ [مسند احمد، مسلم کتاب الجنائز اور نسائی کی کتاب الجنائز میں بھی اسی مضمون کی ایک حدیث منقول ہوئی ہے]

ابومحمد ہذلی حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے میں شریک تھے۔ آپ نے فرمایا تم لوگوں میں سے کون ہے جو جا کر مدینہ میں کوئی بت نہ چھوڑے جسے توڑ نہ دے اور کوئی قبر نہ چھوڑے جسے زمین کے برابر نہ کر دے اور کوئی تصویر نہ چھوڑے جسے مٹا نہ دے۔ ایک شخص نے عرض کیا میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ چنانچہ وہ گیا مگر اہل مدینہ کے خوف سے یہ کام کیے بغیر پلٹ آیا۔ پھر حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں جاتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اچھا تم جاؤ۔ حضرت علیؓ گئے اور واپس آ کر انھوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی بت نہیں چھوڑا جسے توڑ نہ دیا ہو، کوئی قبر نہیں چھوڑی جسے زمین کے برابر نہ کر دیا ہو اور کوئی تصویر نہیں چھوڑی جسے مٹا نہ دیا ہو۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا اب اگر کسی نے ان چیزوں میں سے کوئی چیز بنائی تو اس نے اس تعلیم سے کفر کیا جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی ہے۔

(۵) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ...... وَمَنْ صَوَّرَ صُوْرَةً عُذِّبَ وَکُلِّفَ اَنْ یَّنْفُخَ فِیْهَا وَلَیْسَ بِنَافِخٍ [بخاری کتاب التعبیر، ترمذی، ابواب اللباس، نسائی کتاب الزینه، مسند احمد]

ابن عباسؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں .... اور جس شخص نے تصویر بنائی اسے عذاب دیا جائے گا اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس میں روح پھونکے اور وہ نہ پھونک سکے گا۔

(۶) عَنْ سَعِیْدِ بْنِ اَبِی الْحَسَنِ قَالَ کُنْتُ عِنْدَ بْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اِذْ اَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ یَا اَبَا عَبَّاسٍ اِنِّیْ اِنْسَانٌ اِنَّمَا مَعِیْشَتِیْ مِنْ صَنْعَةِ یَدِیْ وَاِنِّیْ اَصْنَعُ هٰذِهِ التَّصَاوِیْرَ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَا اُحَدِّثُکَ اِلَّامَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ۔ سَمِعْتُہُ یَقُوْلُ مَنْ صَوَّرَ صُوْرَۃً فَاِنَّ اللّٰہَ مُعَذِّبُہُ حَتّٰی یَنْفُخَ فِیْھَا الرُّوْحَ۔ وَلَیْسَ بِنَافِخٍ فِیْھَا اَبَدًا۔ فَرَبَا الرَّجُلُ رَبْوَۃً شَدِیْدَۃً وَاَصْفَرَّ وَجْھُہٗ۔ فقال ویحک ان ابیت الا ان تصنع فَعَلَیْکَ بِھٰذَا الشَّجَرِ کُلُّ شَیْءٍ لَیْسَ فِیْہِ رُوْحٌ۔ [بخاری، کتاب البیوع، مسلم کتاب اللباس، نسائی کتاب الزینۃ، مسند احمد]

سعید بن ابی الحسن کہتے ہیں کہ میں ابن عباسؓ کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ اے ابن عباس میں ایک ایسا شخص ہوں جو اپنے ہاتھ سے روزی کماتا ہے اور میرا روزگار یہ تصویریں بنانا ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ میں تم سے وہی بات کہوں گا جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے۔ میں نے حضورؐ سے یہ بات سنی ہے کہ جو شخص تصویر بنائے گا اللہ اسے عذاب دے گا اور اسے نہ چھوڑے گا جب تک کہ وہ اس میں روح نہ پھونکے اور وہ کبھی روح نہ پھونک سکے گا یہ بات سن کر وہ شخص سخت برافروختہ ہوا اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس پر ابن عباسؓ نے کہا بندۂ خدا، اگر تجھے بنانی ہی ہے تو اس درخت کی بنا، یا کسی ایسی چیز کی بنا جس میں روح نہ ہو۔

(۷) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰہِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ الْمُصَوِّرُوْنَ [بخاری کتاب اللباس، مسلم کتاب اللباس، نسائی کتاب الزینۃ، مُسندِ احمد]

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا قیامت کے روز اللہ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔

(۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الَّذِیْنَ یَصْنَعُوْنَ ھٰذِہِ الصُّوَرَ یُعَذَّبُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یُقَالُ لَھُمْ اَحْیُوْا مَا خَلَقْتُمْ [بخاری کتاب اللباس، مسلم کتاب اللباس، نسائی کتاب الزنیۃ، مُسند احمد]

عبداللہؓ بن عمر نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو لوگ یہ تصویریں بناتے ہیں ان کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اسے زندہ کرو۔

(۹) عَنْ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا اَنَّھَا اشْتَرَتْ نَمْرِقَۃً فِیْھَا تَصَاوِیْرُ فَقَامَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِالْبَابِ وَلَمْ یَدْخُلْ۔ فَقُلْتُ اَتُوْبُ اِلَی اللّٰہِ مِمَّا اَذْنَبْتُ۔ قَالَ مَاھٰذِہِ النُّمْرِقَۃُ؟ قُلْتُ: لِتَجْلِسَ عَلَیْھَا وَتَوَسَّدَھَا۔ قَالَ: اِنَّ اَصْحَابَ ھٰذِہِ الصُّوَرِ یُعَذَّبُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ، فَقَالَ لَھُمْ اَحْیُوْا مَاخَلَقْتُمْ۔ وَاِنَّ الْمَلَائِکَۃَ لَا تَدْخُلُ بَیْتًا فِیْہِ الصُّوْرَۃُ [بخاری کتاب اللباس، مسلم کتاب اللباس، نسائی کتاب الزینۃ، ابن ماجہ کتاب التجارات، مؤطا کتاب الاستیذان]

”حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک تکیہ خریدا جس میں تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دروازے ہی میں کھڑے ہو گئے۔ اندر داخل نہ ہوئے۔ میں نے عرض کیا کہ میں خدا سے توبہ کرتی ہوں ہر اس گناہ پر جو میں نے کیا ہو۔ حضورؐ نے فرمایا یہ تکیہ کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا یہ اس غرض کے لیے ہے کہ آپ یہاں تشریف رکھیں اور اس پر ٹیک لگائیں۔ فرمایا ان تصویروں کے بنانے والوں کو قیامت کے روز عذاب دیا جائے گا۔ ان سے کہا جائے گا کہ جو کچھ تم نے بنایا ہے اس کو زندہ کرو اور ملائکہ [یعنی ملائکہ رحمت] کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویریں ہوں۔

(۱۰) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَیَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مُتَسَتِّرَۃٌ بِقِرَامٍ فِیْہِ صُوْرَۃٌ فَتَلَوَّنَ وَجْھُہٗ۔

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

ثُمَّ تَنَاوَلَ السِّتْرَ فَهَتَكَهُ ثُمَّ قَالَ اِنَّ مِنْ اَشَدِّ النَّاسِ عَذَابًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ الَّذِيْنَ يُشَبِّهُوْنَ بِخَلْقِ اللّٰهِ [مسلم كتاب اللباس، بخاری كتاب اللباس، نسائی كتاب الزينة]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس میں تصویر تھی۔ آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی تخلیق کے مانند تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔

(۱۱) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَدِمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ سَفَرٍ وَقَدْ سَتَرْتُ عَلٰى بَابِىْ دُرْنُوْكًا فِيْهِ الْخَيْلُ ذَوَاتُ الْاَجْنِحَةِ، فَاَمَرَنِىْ فَنَزَعْتُهُ. [مسلم كتاب اللباس، نسائی كتاب الزينة]

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس تشریف لائے اور میں نے اپنے دروازے پر ایک پردہ لٹکا رکھا تھا، جس میں پردار گھوڑوں کی تصویریں تھیں حضورؐ نے حکم دیا کہ اسے اتار دو اور میں نے اتار دیا۔

(۱۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الصُّوْرَةِ فِى الْبَيْتِ وَنَهٰى اَنْ يَصْنَعَ ذَالِكَ [ترمذی ابواب اللباس]

جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا کہ گھر میں تصویر رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرمادیا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔

(۱۳) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنْ اَبِىْ طَلْحَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَدْخُلِ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيْهِ كَلْبٌ وَّلَا صُوْرَةٌ [بخاری كتاب اللباس]

ابن عباسؓ اور ابوطلحہؓ انصاری سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ملائکہ [یعنی ملائکہ رحمت] کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا پلا ہوا ہو اور نہ ایسے گھر میں جس میں تصویر ہو۔

(۱۴) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ وَعَدَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جِبْرِيْلُ فَرَاثَ عَلَيْهِ حَتّٰى اشْتَدَّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَرَجَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَقِيَهٗ فَشَكَا اِلَيْهِ مَاوَجَدَ. فَقَالَ لَهٗ اِنَّا لَانَدْخُلُ بَيْتًا فِيْهِ صُوْرَةٌ وَّلَا كَلْبٌ [بخاری كتاب اللباس۔ اس مضمون کی متعدد روایات بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے متعدد صحابہ سے نقل کی ہیں]

عبداللہؓ بن عمر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جبریلؑ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کا وعدہ کیا مگر بہت دیر لگ گئی اور نہ آئے۔ حضورؐ کو اس سے پریشانی ہوئی اور آپ گھر سے نکلے تو وہ مل گئے۔ آپؐ نے ان سے شکایت کی تو انھوں نے کہا ہم کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔

تصویر کے معاملے میں رخصت پائی جانے والی روایات

ان روایات کے مقابلے میں کچھ روایتیں ایسی بھی پیش کی جاتی ہیں جن میں تصاویر کے معاملے میں رخصت پائی جاتی ہے۔ مثلاً ابوطلحہ انصاری کی یہ روایت کہ جس کپڑے میں تصویر کڑھی ہوئی ہو اس کا پردہ لٹکانے کی اجازت ہے [بخاری، کتاب

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللباس] اور حضرت عائشہؓ کی یہ روایت کہ تصویر دار کپڑے کو پھاڑ کر جب انھوں نے گدا بنالیا تو حضورؐ نے اسے بچھانے سے منع نہ فرمایا [مسلم کتاب اللباس] اور سالم بن عبداللہ ابن عمر کی یہ روایت کہ ممانعت اس تصویر کی ہے جو نمایاں مقام پر نصب کی گئی ہو، نہ کہ اس تصویر کی جو فرش کے طور پر بچھادی گئی ہو [مسند احمد]

ان روایات کی اصل حقیقت

لیکن ان میں سے کوئی حدیث بھی دراصل ان احادیث کی تردید نہیں کرتی جو اوپر نقل کی گئی ہیں۔ جہاں تک تصویر بنانے کا تعلق ہے اس کا جواز ان میں سے کسی حدیث سے بھی نہیں نکلتا۔ یہ احادیث صرف اس مسئلے سے بحث کرتی ہیں کہ اگر کسی کپڑے پر تصویر بنی ہوئی ہو اور آدمی اس کو لے چکا ہو تو کیا کرے۔ اس باب میں ابوطلحہ انصاری والی روایت کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ بکثرت دوسری صحیح احادیث سے ٹکراتی ہے جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویر دار کپڑا لٹکانے سے نہ صرف منع فرمایا ہے بلکہ اسے پھاڑ دیا ہے۔ نیز خود حضرت ابوطلحہؓ کا اپنا عمل جو ترمذی اور موطا میں منقول ہوا ہے وہ یہ ہے کہ تصویر دار پردہ لٹکانا تو درکنار وہ ایسا فرش بچھانے میں بھی کراہت محسوس کرتے تھے جس میں تصاویر ہوں۔ رہیں حضرت عائشہؓ اور سالم ابن عبداللہ کی روایات تو ان سے صرف اتنا جواز نکلتا ہے کہ اگر تصویر احترام کی جگہ پر نہ ہو بلکہ ذلت کے ساتھ فرش میں رکھی جائے اور اسے پامال کیا جائے تو وہ قابل برداشت ہے۔ ان احادیث سے آخر اس پوری ثقافت کا جواز کیسے نکالا جاسکتا ہے جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی کے آرٹ کو تہذیب انسانی کا قابل فخر کمال قرار دیتی ہے اور اسے مسلمانوں میں رواج دینا چاہتی ہے۔

اس بارے میں امت کے لیے آنحضورؐ کا چھوڑا ہوا ضابطہ

تصاویر کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخر کار امت کے لیے جو ضابطہ چھوڑا ہے اس کا پتہ اکابر صحابہ کے اس طرز عمل سے چلتا ہے جو انھوں نے اس باب میں اختیار کیا۔ اسلام میں یہ اصول مسلم ہے کہ معتبر اسلامی ضابطہ وہی ہے جو تمام تدریجی احکام اور ابتدائی رخصتوں کے بعد حضورؐ نے اپنے آخر عہد میں مقرر کردیا ہو اور حضورؐ کے بعد اکابر صحابہ کا کسی طریقے پر عمل درآمد کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اسی طریقے پر حضورؐ نے امت کو چھوڑا تھا۔ اب دیکھیے کہ تصویروں کے ساتھ اس مقدس گروہ کا کیا برتاؤ تھا۔

اکابر صحابہ کے مقدس گروہ کا تصویروں کے ساتھ برتاؤ

قَالَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اِنَّا لَا نَدْخُلُ کَنَائِسَکُمْ مِنْ اَجْلِ التَّمَاثِیْلِ الَّتِیْ فِیْھَا الصُّوَرُ [بخاری کتاب الصلوٰۃ]

حضرت عمرؓ نے عیسائیوں سے کہا کہ ہم تمھارے کنیسوں میں اس لیے داخل نہیں ہوتے کہ ان میں تصویریں ہیں۔

عَنْ اَبِی الْھَیَّاجِ الْاَسَدِیِّ، قَالَ لِیْ عَلِیٌّ: اَلَا اَبْعَثُکَ عَلٰی مَابَعَثَنِیْ عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ لَا تَدَعَ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تِمْثَا لاَ اِلَّا طَمَسْتَهٗ وَلَا قَبْرًا مُشْرِفًا اِلَّا سَوَّيْتَهٗ وَلَا صُوْرَةً اِلَّا طَمَسْتَهَا [مسلم كتاب الجنائز، نسائی كتاب الجنائز]

بوالھیاج اسدی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے مجھ سے کہا کیا نہ بھیجوں میں تم کو اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا؟ اور وہ یہ ہے کہ تم کوئی مجسمہ نہ چھوڑو جسے توڑ نہ دو اور کوئی اونچی قبر نہ چھوڑو جسے زمین کے برابر نہ کر دو اور کوئی تصویر نہ چھوڑو جسے مٹا نہ دو۔

عَنْ حَنَشٍ الْكِنَانِيِّ عَنْ عَلِيٍّ اَنَّهٗ بَعَثَ عَامِلَ شُرْطَتِهٖ فَقَالَ لَهٗ اَتَدْرِیْ عَلٰى مَا اَبْعَثُكَ؟ عَلٰى مَابَعَثَنِیْ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَنْحَتَ كُلَّ صُوْرَةٍ وَاَنْ اُسَوِّیَ كُلَّ قَبْرٍ [مسند احمد]

حنش الکنانی کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنی پولیس کے کوتوال سے کہا کہ تم جانتے ہو میں کس مہم پر تمھیں بھیج رہا ہوں؟ اس مہم پر جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بھیجا تھا۔ یہ کہ میں ہر تصویر کو مٹا دوں اور ہر قبر کو زمین کے برابر کر دوں۔

اسی ثابت شدہ اسلامی ضابطے کو فقہائے اسلام نے تسلیم کیا ہے اور قانونِ اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا ہے چنانچہ علامہ بدر الدین عینی توضیح کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ہمارے اصحاب [یعنی فقہائے احناف] اور دوسرے فقہا کہتے ہیں کہ کسی جاندار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے، خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو، یا کسی دوسری غرض کے لیے۔ ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیونکہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مشابہت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار یا درہم یا پیسے میں یا کسی برتن میں یا دیوار میں، بہر حال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جاندار کے سوا کسی دوسری چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے ان تمام امور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہی رائے امام مالکؒ، سفیانؒ ثوری، امام ابوحنیفہؒ اور دوسرے علماء کی ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ اس سے لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں مگر امام مالکؒ ان کے خریدنے کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ [عمدۃ القاری ج ۲۲ ص ۷۰۔ اسی مسلک کو امام نووی نے شرح مسلم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو شرح نووی، مطبوعہ مصر ج ۱۴ ص ۸۱-۸۲]

دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ

یہ تو ہے تصویر سازی کا حکم۔ رہا دوسرے کی بنائی ہوئی تصویر کے استعمال کا مسئلہ تو اس کے بارے میں فقہائے اسلام کے مسالک علامہ ابن حجر نے اس طرح نقل کیے ہیں:

"مالکی فقیہ ابن عربی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ پڑتا ہو اس کے حرام ہونے پر تو اجماع ہے قطع نظر اس سے کہ وہ تحقیر کے ساتھ رکھی گئی ہو یا نہ۔ اس اجماع سے صرف لڑکیوں کی گڑیاں مستثنیٰ ہیں......... ابن عربی یہ بھی کہتے ہیں کہ جس تصویر کا سایہ نہ پڑتا ہو وہ اگر اپنی حالت پر باقی رہے [یعنی آئینے کی پرچھائیں کی طرح نہ ہو بلکہ چھپی ہوئی تصویر کی طرح ثابت و قائم ہو] تو وہ بھی حرام ہے، خواہ اسے حقارت کے ساتھ رکھا گیا ہو یا نہ۔ البتہ اگر اس کا سر کاٹ دیا گیا ہو یا اس کے اجزا الگ الگ کر دیے گئے ہوں تو اس کا استعمال جائز

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے..........امام الحرمین نے ایک مسلک یہ نقل کیا ہے کہ پردے یا تکیے پر اگر تصویر ہو تو اس کے استعمال کی اجازت ہے۔ مگر دیوار یا چھت پر جو تصویر لگائی جائے وہ ممنوع ہے کیونکہ اس صورت میں اس کا اعزاز ہوگا، بخلاف اس کے پردے اور تکیے کی تصویر حقارت سے رہے گی..........ابن ابی شیبہ نے عکرمہؒ سے نقل کیا ہے کہ زمانۂ تابعین کے علما یہ رائے رکھتے تھے کہ فرش اور تکیے میں تصویر کا ہونا اس کے لیے باعث ذلت ہے۔ نیز ان کا یہ خیال بھی تھا کہ اونچی جگہ پر جو تصویر لگائی گئی ہو وہ حرام ہے اور قدموں میں جسے پامال کیا جاتا ہو وہ جائز ہے۔ یہی رائے ابن سیرین، سالم بن عبداللہ، عکرمہ بن خالد اور سعید بن جبیر سے بھی منقول ہے۔'' [فتح الباری، ج ۱۰، ص ۳۰۰]

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات، صحابہ کرامؓ کے عمل اور فقہائے اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثر لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

چند باتیں جنھیں سمجھ لینا ضروری ہے

اس سلسلے میں چند باتیں اور بھی سمجھ لینی ضروری ہیں تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریق تصویر سازی کے لحاظ سے ہے اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے۔ لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اول تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج خود برعظیم ہندو پاکستان میں کروڑوں بت پرست مشرکین موجود ہیں اور دنیا کے مختلف خطوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہلِ کتاب بھی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ اور اپنے متعدد اولیا کی تصاویر اور مجسموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہییں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں، یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کے بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی، بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔ تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ برسر عروج ہے۔ تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جارہی ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔ شارع نے مطلقاً جاندار اشیا کی تصویر کو روکا ہے۔ ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علت حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل ''بے ضرر'' قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے، یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مفسدات سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس معاملے میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے علت حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فلاں چیز میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔ علاوہ بریں یہ لوگ اسلامی شریعت کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دھندلی اور مبہم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کر سکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اس حد کو پار کر گیا ہے، بلکہ ایسا واضح خط امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روزِ روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جانداروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیا کی تصویریں حلال ہیں۔ اس خط امتیاز میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ لیکن اگر جانداروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھیرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کر دینے کے بعد بھی جواز وعدم جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہو سکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اشتباہ باقی رہ جاتا ہے کہ انھیں حدِ جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صاف حد قائم کر دیتا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حد فاصل قائم نہ کی جا سکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کر سکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رک جانا چاہیے۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۸۰ تا ۱۸۹ سبا حاشیہ ۲۰)

امتحان دینے کے لیے فوٹو کھنچوانا

فوٹو کھنچوانا اگرچہ ناجائز ہے لیکن جہاں کسی حقیقی تمدنی نقصان سے بچنے یا کسی حقیقی تمدنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فوٹو کا استعمال ناگزیر ہو، وہاں صرف اس ضرورت کی حد تک ایسا کرنا جائز ہے۔ امتحانات کے سلسلے میں چونکہ یہ تجربہ ہوا ہے کہ بہت سے لوگ دھوکہ دے کر کسی دوسرے شخص کو اپنے بجائے امتحان دینے کے لیے بھیج دیتے ہیں، اس لیے درخواست کے ساتھ تصویر لگانا لازم کیا گیا ہے۔ اس ضرورت کو تصویر کے سوا کسی دوسرے طریقے سے پورا کرنا مشکل ہے اور دھوکے اور فریب کا سد باب بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لیے تصویر کھچوانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک پاسپورٹ، تفتیش جرائم، طبی تحقیقات وضروریات، جہاد اور ناگزیر تعلیمی اغراض کے لیے بھی فن تصویر کا استعمال درست ہے۔ اصول فقہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات۔ یعنی انسان کی حقیقی ضروریات کے لیے وہ چیزیں جائز ہو جاتی ہیں جو بجائے خود ناجائز ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۱۹۲-۱۹۳ بحوالہ ترجمان القرآن رجب شعبان ۶۲ھ جولائی اگست ۴۳ھ)

سوال: بعض سینما ایسے ہیں جن میں صرف دنیا کی خبریں دکھائی جاتی ہیں یا دنیا کے بعض اہم واقعات پردۂ فلم پر دکھاتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات کارٹون دکھائے جاتے ہیں اور ان میں ایسی شکلیں دکھائی جاتی ہیں جن کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ اسی طرح کے معلومات فلم دیکھنے کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: جس سینما میں علمی یا واقعاتی فلم دکھائے جاتے ہوں اس کے دیکھنے میں مضائقہ نہیں۔ ہمارے ملک میں تو سینما ہاؤس جانا بجائے خود ایک موضع تہمت ہے، اس لیے علمی ومعلوماتی فلم دیکھنے کے لیے بھی اس خرابات میں قدم نہیں رکھا جا سکتا۔ انگلستان میں آپ چاہیں تو اس طرح کے فلم دیکھ لیں۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۳۱ اور ۲۳۴ تیرھویں اشاعت)

(بحوالہ ترجمان القرآن رمضان شوال ۷۱ھ جون جولائی ۱۹۵۲ء)

اشاعتِ فحش کے جملہ ذرائع ووسائل کا سد باب

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۙ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ؕ وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝

(النور ۲۴:۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

موقع ومحل کے لحاظ سے تو آیت کا براہِ راست مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اس طرح کے الزامات گھڑ کر اور انھیں اشاعت دے کر مسلم معاشرے میں بداخلاقی پھیلانے اور امت مسلمہ کے اخلاق پر دھبہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن آیت کے الفاظ فحش پھیلانے کی تمام صورتوں پر حاوی ہیں۔ ان کا اطلاق عملاً بدکاری کے اڈے قائم کرنے پر بھی ہوتا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اور بد اخلاقی کی ترغیب دینے والے اور اس کے لیے جذبات کو اکسانے والے قصوں، اشعار، گانوں، تصویروں اور کھیل تماشوں پر بھی۔ نیز وہ کلب اور ہوٹل اور دوسرے ادارے بھی ان کی زد میں آجاتے ہیں جن میں مخلوط رقص اور مخلوط تفریحات کا انتظام کیا جاتا ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ سب لوگ مجرم ہیں۔ صرف آخرت ہی میں نہیں دنیا میں بھی ان کو سزا ملنی چاہیے۔ لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اشاعت فحش کے ان تمام ذرائع و وسائل کا سد باب کرے۔ اس کے قانونِ تعزیرات میں ان تمام افعال کو مستلزم سزا، قابلِ دست اندازی پولیس ہونا چاہیے جن کو قرآن یہاں پبلک کے خلاف جرائم قرار دے رہا ہے اور فیصلہ کر رہا ہے کہ ان کا ارتکاب کرنے والے سزا کے مستحق ہیں۔

تم لوگ نہیں جانتے کہ اس طرح کی ایک ایک حرکت کے اثرات معاشرے میں کہاں کہاں تک پہنچتے ہیں، کتنے افراد کو متاثر کرتے ہیں اور مجموعی طور پر ان کا کس قدر نقصان اجتماعی زندگی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس چیز کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرو اور جن برائیوں کی وہ نشان دہی کر رہا ہے انھیں پوری قوت سے مٹانے اور دبانے کی کوشش کرو۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں نہیں ہیں جن کے ساتھ رواداری برتی جائے۔ دراصل یہ بڑی باتیں ہیں جن کا ارتکاب کرنے والوں کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۳۷۰-۳۷۱ النور حاشیہ ۱۶)

شعر و شاعری، اسلام میں اس کے حدود

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ (الشعراء ۲۶:۲۲۷)

”رہے شعراء، تو ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ چلا کرتے ہیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں اور ایسی باتیں کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اور اللہ کو کثرت سے یاد کیا۔“

دینی اور شعری مجلسوں میں فرق

شاعروں کے ساتھ لگے رہنے والے لوگ اپنے اخلاق، عادات و خصائل اور افتادِ مزاج میں ان لوگوں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمھیں نظر آتے ہیں۔ دونوں گروہوں کا فرق ایسا کھلا ہوا فرق ہے کہ ایک نظر دیکھ کر ہی آدمی جان سکتا ہے کہ یہ کیسے لوگ ہیں اور وہ کیسے۔ ایک طرف انتہائی سنجیدگی، تہذیب، شرافت، راستبازی اور خدا ترسی ہے۔ بات بات میں ذمہ داری کا احساس۔ برتاؤ میں لوگوں کے حقوق کا پاس و لحاظ ہے۔ معاملات میں کمال درجہ کی دیانت و امانت ہے اور زبان جب کھلتی ہے خیر ہی کے لیے کھلتی ہے، شر کا کلمہ کبھی اس سے ادا نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ یہ کہ ان لوگوں کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے ایک بلند اور پاکیزہ نصب العین ہے جس کی دُھن میں یہ رات دن لگے ہوئے ہیں اور ان

” محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ “

www.KitaboSunnat.com

کی ساری زندگی ایک مقصدِ عظیم کے لیے وقف ہے۔ دوسری طرف حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور حاضرین اچھل اچھل کر ان پر داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زنِ بازاری یا کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوعِ سخن ہے اور سننے والے اس پر مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی مواصلت کی حکایت بیان ہو رہی ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت مسلط ہے۔ کہیں ہزل بکا جا رہا ہے یا مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور مجمع میں ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کہیں کسی کی ہجو اُڑائی جا رہی ہے اور لوگ اس سے لطف لے رہے ہیں۔ کہیں کسی کی بے جا تعریف ہو رہی ہے اور اس پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں اور کہیں کسی کے خلاف نفرت، عداوت اور انتقام کے جذبات بھڑکائے جا رہے ہیں اور سننے والوں کے دلوں میں ان سے آگ سی لگ جاتی ہے۔ ان مجلسوں میں شاعروں کے کلام سننے کے لیے جو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگتے ہیں اور بڑے بڑے شاعروں کے پیچھے جو لوگ لگے پھرتے ہیں ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ اخلاق کی بندشوں سے آزاد، جذبات و خواہشات کی رو میں بہنے والے اور لطف و لذت کے پرستار، نیم حیوان قسم کے لوگ ہیں جن کے ذہن کو کبھی یہ خیال چھو کر بھی نہیں گیا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے زندگی کا کوئی بلند تر مقصد و نصب العین بھی ہو سکتا ہے۔

جاہل شعرا کی حالت

(ان لوگوں کی) کوئی ایک متعین راہ نہیں ہے جس پر وہ سوچتے اور اپنی قوتِ گویائی صرف کرتے ہوں، بلکہ ان کا توسنِ فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے اور جذبات یا خواہشات و اغراض کی ہر نئی رو ان کی زبان سے ایک نیا مضمون ادا کراتی ہے جسے سوچنے اور بیان کرنے میں اس بات کا کوئی لحاظ سرے سے ہوتا ہی نہیں کہ یہ بات حق اور صدق بھی ہے۔ کبھی ایک لہر اٹھی تو حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگیں اور کبھی دوسری لہر آئی تو اسی زبان سے انتہائی گندے سفلی جذبات کا ترشح شروع ہو گیا۔ کبھی کسی سے خوش ہوئے تو اسے آسمان پر چڑھا دیا اور کبھی بگڑ بیٹھے تو اسی کو تحت الثریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم و اسفندیار پر فضیلت دینے میں انھیں ذرا تامل نہیں ہوتا اگر اس سے کوئی غرض وابستہ ہو۔ اس کے برعکس کسی سے رنج پہنچ جائے تو اس کی پاک زندگی پر دھبہ لگانے اور اس کی عزت پر خاک پھینکنے میں، بلکہ اس کے نسب پر طعن کرنے میں بھی ان کو شرم محسوس نہیں ہوتی۔ خدا پرستی اور دہریت، مادہ پرستی اور روحانیت، حسنِ اخلاق اور بداخلاقی، پاکیزگی اور گندگی، سنجیدگی اور ہزل، قصیدہ اور ہجو سب کچھ ایک ہی شاعر کے کلام میں آپ کو پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔

جس قسم کے مضامین سے عرب کی شاعری لبریز تھی وہ یا تو شہوانیت اور عشق بازی کے مضامین تھے، یا شراب نوشی کے، یا قبائلی منافرت اور جنگ وجدل کے، یا نسلی فخر و غرور کے۔ نیکی اور بھلائی کی باتیں ان میں بہت ہی کم پائی جاتی تھیں۔ پھر جھوٹ، مبالغہ، بہتان، ہجو، بے جا تعریف، ڈینگیں، طعن، پھبتیاں اور مشرکانہ خرافات تو اس شاعری کی رگ رگ میں پیوست تھیں۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہدایت یافتہ شعرا کی خصوصیات

شعرا کی اس عام مذمت سے، جو اوپر بیان ہوئی، ان شعراء کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار خصوصیات کے حامل ہوں:

۱۔ ایمان: اول یہ کہ وہ مومن ہوں، یعنی اللہ اور اس کے رسول اور اس کی کتابوں کو سچے دل سے مانتے ہوں اور آخرت پر یقین رکھتے ہوں۔

۲۔ عمل صالح: دوسرے یہ کہ اپنی عملی زندگی میں صالح ہوں، بدکار اور فاسق و فاجر نہ ہوں، اخلاق کی بندشوں سے آزاد ہو کر جھک نہ مارتے پھریں۔

۳۔ یادِ الٰہی: تیسرے یہ کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہوں، اپنے عام حالات اور اوقات میں بھی اور اپنے کلام میں بھی۔ یہ نہ ہو کہ شخصی زندگی تو زہد و تقویٰ سے آراستہ ہے مگر کلام سراسر رندی و ہوسنا کی سے لبریز اور یہ بھی نہ ہو کہ شعر میں تو بڑی حکمت و معرفت کی باتیں بگھاری جا رہی ہیں مگر ذاتی زندگی کو دیکھیے تو یادِ خدا کے سارے آثار سے خالی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں یکساں مذموم ہیں۔ ایک پسندیدہ شاعر وہی ہے جس کی نجی زندگی بھی خدا کی یاد سے معمور ہو اور شاعرانہ قابلیتیں بھی اس راہ میں وقف رہیں جو خدا سے غافل لوگوں کی نہیں بلکہ خدا شناس، خدا دوست اور خدا پرست لوگوں کی راہ ہے۔

۴۔ حق پرستی: چوتھی صفت ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ شخصی اغراض کے لیے تو کسی کی ہجو نہ کریں، نہ ذاتی یا نسلی و قومی عصبیتوں کی خاطر انتقام کی آگ بھڑکائیں، مگر جب ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے ضرورت پیش آئے تو پھر زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و شمشیر سے لیتا ہے۔ ہر وقت گھگھیاتے ہی رہنا اور ظلم کے مقابلے میں نیازمندانہ معروضات ہی پیش کرتے رہنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہے۔ اسی کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ کفار و مشرکین کے شاعر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف الزامات کا جو طوفان اٹھاتے اور نفرت و عداوت کا جو زہر پھیلاتے تھے اس کا جواب دینے کے لیے حضورؐ خود شعرائے اسلام کی ہمت افزائی فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ کعب بن مالکؓ سے آپؐ نے فرمایا اُهْجُهُمْ فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَهُوَ اَشَدُّ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبْلِ ''ان کی ہجو کہو، کیونکہ اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمھارا شعر ان کے حق میں تیر سے زیادہ تیز ہے۔'' حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا اُهْجُهُمْ وَ جِبْرِیْلُ مَعَكَ اور قُلْ وَرُوْحُ الْقُدُسِ مَعَكَ ''ان کی خبر لو اور جبریل تمھارے ساتھ ہے'' ''کہو اور روح القدس تمھارے ساتھ ہے۔'' آپؐ کا ارشاد تھا کہ اِنَّ الْمُؤْمِنَ یُجَاهِدُ بِسَیْفِهٖ وَلِسَانِهٖ ''مومن تلوار سے بھی لڑتا ہے اور زبان سے بھی۔''

(تفہیم القرآن، ج ۳ ص ۵۴۶ تا ۵۵۰ الشعراء حواشی ۱۴۲-۱۴۳-۱۴۵)

www.KitaboSunnat.com

فصل چہارم

اسلام، طب جدید اور سائنس

پوسٹ مارٹم

سوال: سابق خط کے جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی۔ آپ نے لکھا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی ضرورت بھی مسلم ہے اور احکام شرعیہ میں شدید ضرورت کے بغیر اس کی گنجائش بھی نظر نہیں آتی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ طبی نقطہ نگاہ سے کم از کم اس مریض کی لاش کا پوسٹ مارٹم تو ضرور ہونا چاہیے جس کے مرض کی تشخیص نہ ہو سکی ہو یا ہونے کے باوجود علاج بیکار ثابت ہوا ہو۔ اسی طرح ''طبی قانونی'' (Medico legal) نقطۂ نظر سے بھی نوعیت جرم کی تشخیص کے لیے پوسٹ مارٹم لازمی ہے۔ علاوہ ازیں اناٹومی، فزیالوجی اور آپریٹو سرجری کی تعلیم بھی جسد انسانی کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ واضح فرمائیں کہ ان صورتوں پر شرعاً شدید ضرورت کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: پوسٹ مارٹم کے مسئلے میں، جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، مجھے خود بڑا خلجان ہے اور کوئی فیصلہ کن بات میرے لیے مشکل ہے۔ اس معاملے کے دو مختلف پہلو ہیں جن کے تقاضے ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں۔

ایک طرف شرعی احکام ہیں جو مرنے والے انسانوں کے جسم کا احترام کرنے اور ان کو عزت کے ساتھ دفن کر دینے کی تاکید کرتے ہیں اور اگر وہ مسلمان ہوں تو ان کی تجہیز و تکفین کر کے نماز جنازہ پڑھنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ان شرعی احکام کی تائید ان لطیف انسانی حسیات سے بھی ہوتی ہے جو [شاید ڈاکٹروں اور بالکل سائنٹسٹ قسم کے لوگوں کے سوا سب ہی انسانوں میں موجود ہوتے ہیں۔ کوئی آدمی خوشی سے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے باپ، بیٹے، بیوی، بہن اور ماں کی لاشیں ڈاکٹروں کے حوالے کی جائیں اور وہ ان کی چیر پھاڑ کریں یا وہ میڈیکل کالج کے طالب علموں کو دے دی جائیں تا کہ وہ ان کے ایک ایک عضو کا تجزیہ کریں اور پھر ان کی ہڈیاں سکھا کر رکھ لیں۔ اسی طرح کوئی قوم بھی یہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے لیڈر اور پیشوا مرنے کے بعد پوسٹ مارٹم کے تختۂ مشق بنائے جائیں۔ ابھی حال میں گاندھی جی اور لیاقت علی خاں مرحوم گولی کے شکار ہوئے ہیں۔ ''طبی قانونی'' نقطۂ نظر سے ضروری تھا کہ ان کا پوسٹ مارٹم کر کے سبب موت کی تشخیص کی جاتی۔ مگر اس سے احتراز کیوں کیا گیا؟ صرف

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس لیے کہ قومی جذبات اپنے محترم لیڈروں کی لاشوں کا چیرنا پھاڑنا برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

دوسری طرف طبی اور قانونی اغراض کے لیے پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہے۔ طب کے مختلف شعبوں کی تعلیم اور طبی تحقیقات کی ترقی کے لیے اس کی ضرورت کا انکار نہیں کیا جا سکتا اور ایک حد تک قانون بھی اس کا تقاضا کرتا ہے کہ قتل کے مقدمات میں سبب موت کا تعین کیا جائے۔

اب یہ ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے کہ ان دونوں متصادم تقاضوں کے درمیان مصالحت کیسے کی جائے۔ اس کا یہ حل تو میرے نزدیک سخت مکروہ ہے کہ امیروں اور غریبوں، بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں، خاندان والوں اور لاوارثوں کی لاشوں کے بارے میں ہمارے پاس دو مختلف معیارِ اخلاق اور دو مختلف طرزِ عمل ہوں۔ اس لیے لامحالہ اس کا اور ہی حل سوچنا پڑے گا۔ مگر وہ حل کیا ہو۔ اس باب میں میری قوتِ فیصلہ بالکل عاجز ہے۔ یہ چیز کسی ایسی مجلس میں زیر بحث آنی چاہیے جس میں علمائے دین بھی شامل ہوں اور شعبۂ طب اور شعبہ عدالت کے نمائندے بھی۔ ممکن ہے یہ لوگ سر جوڑ کر اس کا کوئی حل نکال سکیں۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۴۹ اور ۲۵۱-۲۵۲ اشاعت تیرھویں)

(بحوالہ ترجمان القرآن، محرم، صفر ۷۲ ۱۳ھ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

پوسٹ مارٹم، شق صدر

سوال: اسلامی حکومت میں نعشوں کی چیر پھاڑ (Post Mortom) کی کیا صورت اختیار کی جائے گی؟ اسلام تو لاشوں کی بے حرمتی کی اجازت نہیں دیتا۔ پوسٹ مارٹم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک (Medico Legal) زیادہ تر تفتیش کے لیے، دوسرے علم الامراض کی (Pathological) ضروریات کے لیے۔ ممکن ہے کہ اول الذکر کی کچھ زیادہ اہمیت اسلامی حکومت میں نہ ہو، لیکن مؤخر الذکر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس طریقے سے امراض کی تشخیص اور طبی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

سوال ۲: سنا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا گیا تھا اور اس کو تمام آلائشوں سے پاک کیا گیا تھا، تاکہ نبوت کے تقاضے کو پورا کر سکیں اور معصومیت کی صفت پیدا ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کا دل زیادہ روشن ہو جائے۔ اچھے اور پاکیزہ خیالات دل میں آئیں اور گناہ کے خیالات نہ آنے پائیں۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟

سوال ۳: اسی کے ساتھ ساتھ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ سے یہ خیال آتا ہے کہ گویا دل خیال کی ایک جلوہ گاہ (Agency) ہے۔ شاید اس زمانے میں جالینوس کے نظریات کے تحت "دل" کو سرچشمۂ افکار (Originator of thought) سمجھا جاتا تھا لیکن آج کل طبی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ دل صرف دورانِ خون کو جاری رکھنے والا ایک عضو ہے اور ہر قسم کے خیالات اور حسیات اور ارادوں اور جذبات کا مرکز دماغ ہے۔ اس تحقیق کی وجہ سے ہر اس موقع پر الجھن پیدا ہوتی ہے جہاں "دل" سے کوئی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ایسی چیز منسوب کی جاتی ہے جس کا تعلق حقیقت میں دماغ سے ہوتا ہے۔

جواب: پوسٹ مارٹم کے مسئلے پر میں اب تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکا ہوں۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کے لیے یہ ناگزیر ہے، مگر اس کے باوجود طبیعت میں سخت کراہت پاتا ہوں اور احکام شرعیہ میں بھی انتہائی ناگزیر صورت کے بغیر اس کے لیے کوئی گنجائش مجھے نظر نہیں آتی۔ بہرحال یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے ایک اسلامی حکومت میں اہلِ علم باہمی مشورے سے طے نہ کر سکتے ہوں۔

جواب ۲: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک کے چاک کیے جانے کا معاملہ متشابہات کے قبیل سے ہے۔ اسے سمجھنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے اس پر کسی تحقیق کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔

جواب ۳: دل کا لفظ ادب کی زبان میں کبھی اس معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے جس میں یہ لفظ علم تشریح (Anatomy) اور علم وظائف الاعضاء (Physiology) میں استعمال ہوتا ہے۔ ادب میں "دماغ" (Reason) کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کے برعکس "دل" جذبات وحسیات اور خواہش اور ارادے کا مرکز مانا جاتا ہے۔ ہم رات دن بولتے ہیں کہ میرا دل نہیں مانتا، میرے دل میں یہ خیال آیا، میرا دل یہ چاہتا ہے۔ انگریزی میں (Qualities of Head and Heart) کا فقرہ بکثرت استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ بولتے وقت کوئی شخص بھی علم تشریح والا دل مراد نہیں لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا آغاز اسی نظریہ کے تحت ہوا ہو جو جالینوس کی طرف منسوب ہے۔ لیکن ادب میں جو الفاظ رائج ہو جاتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے ابتدائی معنی کے تابع نہیں رہتے۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ۲۴۶ تا ۲۴۸ اشاعت تیرھویں)

(بحوالہ ترجمان القرآن رجب، شعبان ۱۳۷۱ھ اپریل، مئی ۱۹۵۲ء)

علمِ طب سے متعلق چند سوالات

سوال ۱: کسی مریض کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون داخل کرنا بعض علماء کے نزدیک ناجائز ہے۔ آپ کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

جواب: آدمی کی جان بچانے کے لیے اس کے جسم میں خون داخل کرنا میرے نزدیک تو جائز ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اس کو حرام کہنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ غالباً اسے خون پینے اور خون کھانے پر قیاس کر کے کسی صاحب نے حرام کیا ہوگا۔ لیکن میرے نزدیک ان دونوں چیزوں میں فرق ہے۔ غذا کے طور پر خون پینا اور کھانا بلاشبہ حرام ہے مگر جان بچانے کے لیے مریض یا زخمی آدمی کے جسم میں خون داخل کرنا اسی طرح جائز ہے جس طرح حالت اضطرار میں مردار یا خنزیر کھانا۔

سوال ۲: بعض دواؤں کے اجزا انسانی یا حیوانی پیشاب، خون یا گوشت سے حاصل کیے جاتے ہیں اور بعض دوائیں

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

وہیل مچھلی کے غدود سے نکالی جاتی ہیں۔ ایسی دواؤں کا استعمال شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

جواب: مختلف حیوانی دواؤں کے بارے میں جو سوالات آپ نے کیے ہیں ان کا جواب یہ ہے کہ اصولاً ہر وہ چیز حرام ہے جو مردار یا حرام جانور سے حاصل کی جائے، یا حلال جانور کی کسی ناپاک یا حرام چیز سے حاصل کی جائے اور اصولاً ایک حرام چیز کا استعمال صرف اُسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ انسانی جان بچانے کے لیے وہ ناگزیر ہو۔ ان دو اصولوں کو مدنظر رکھ کر مسلمان اہل فن کو دواؤں کا جائزہ لینا چاہیے اور پھر خود رائے قائم کرنی چاہیے۔ کیونکہ اپنے فن کو وہ آپ ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اس وقت جو اہل فن پائے جاتے ہیں وہ نہ محقق، موجد اور مکتشف ہیں اور نہ دوا سازی کی صنعت ہی ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی فن دانی اس سے آگے نہیں جاتی کہ دوسروں نے [اور یہ دوسرے وہ ہیں جو عملاً کسی کتاب الٰہی اور کسی شریعت نبوی کے پیرو نہیں ہیں] جو کچھ اپنی تحقیق و اکتشاف سے نکالا ہے صرف اس سے واقف ہو جائیں اور پھر وہی لوگ جو کچھ جس طرح بنا کر بھیج دیں اسے یہ استعمال کر لیں۔ یہ بیچارے اس قابل بھی نہیں ہیں کہ انھوں نے اگر کسی مرض کی دوا حرام طریقے سے پیدا کی ہے تو یہ اپنی تحقیق سے اس کا کوئی دوسرا جائز بدل پیدا کر سکیں، یا محققانہ طریقے پر کم از کم یہی کہہ سکیں کہ اس کا بدل نہیں مل سکتا اور اس کا استعمال فی الواقع ناگزیر ہے۔ اس حالت میں ہم غیر فنی لوگ محض حلال و حرام کی بحث کر کے آخر کیا مفید خدمت کر سکتے ہیں۔

وہیل مچھلی جائز ہے۔ اسی قسم کی ایک مچھلی صحابۂ کرام ایک جنگی سفر کے دوران میں کھا چکے ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جائز رکھا ہے۔

سوال ۳: ڈاکٹر کے لیے فیس کا تعین یا اُس کا مطالبہ جائز ہے یا اسے مریض کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے۔

جواب: ڈاکٹر کی فیس اصولاً تو جائز ہے مگر ڈاکٹروں نے بالعموم فیس کے معاملے میں ایسے طریقے اختیار کرنے شروع کر دیے ہیں جو گناہ اور ظلم اور سخت قساوت کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی بنا پر ہماری یہ رائے ہے کہ تمام ڈاکٹروں کو حکومت کی طرف سے کافی وظیفے ملنے چاہییں اور انھیں مریضوں کا مفت علاج کرنا چاہیے۔

غذاؤں اور دواؤں کی حلت و حرمت

سوال: غذاؤں اور دواؤں کی حلت و حرمت کے بارے میں شرعی احکام کیا ہیں؟

جواب: دواؤں اور غذاؤں میں کیا چیزیں پاک ہیں اور کیا ناپاک، اس کو جاننے کے لیے آپ کو کچھ نہ کچھ حدیث اور فقہ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جہاں تک احکام قرآنی کا تعلق ہے اس سلسلے میں آپ کو تفہیم القرآن سے کافی مدد مل جائے گی۔ مگر پھر بھی حدیث اور فقہ کے مطالعے کی ضرورت باقی رہتی ہے تاکہ آپ اصولی احکام سے بھی واقف ہو جائیں اور جزئی مسائل سے بھی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

افسوس ہے کہ ہمارے ہاں اب تک میڈیکل کالج کی تعلیم میں شرعی احکام کی تعلیم شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔ آخر ہم کیسے اس چیز کی ضرورت محسوس کرلیں جسے ہمارے استاذ [انگریز] نے غیر ضروری سمجھا تھا۔

علم طب میں مسلمانوں کی خدمات

سوال: مسلم اطبا نے طب کو اسلام کا پابند بنانے کے سلسلے میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں؟

جواب: مسلم حکما نے فن طب کو کس طرح مسلمان بنایا تھا۔ اس مسئلے پر تفصیلی گفتگو تو کوئی صاحب علم طبیب ہی کرسکتا ہے۔ میں اس کے متعلق صرف ایک مجمل بات ہی کہہ سکتا ہوں کہ ابتدائی دور کے مسلم حکما نے محض اندھے مقلدوں کی طرح اس فن کو غیر مسلم استادوں سے جوں کا توں نہیں لے لیا تھا بلکہ اسے مشرف با سلام کیا تھا اور ان کا یہ کارنامہ محض نسخوں پر "ھوالشافی" لکھ دینے تک محدود نہ تھا۔ انھوں نے فن طب میں جو کتابیں لکھیں ان کو دیکھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خدا پرست لوگوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو خدا کی حمد اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و سلام سے کلام کی ابتدا کرتے ہیں اور بیچ بیچ میں جگہ جگہ خدا کی حکمت اور قدرت اور اس کی شانِ تخلیق اور آفاق و انفس میں اس کی آیات کی طرف اشارے کرتے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کا حال موجودہ زمانے کی طبی کتابوں کا سا نہیں ہے، جن میں کہیں اشارے کنایے میں بھی خدا کا ذکر نہیں آتا۔ اس سے فرق یہ واقع ہوتا ہے کہ پہلے ایک طالب علم کے ذہن میں تشریح بدن اور وظائف اعضاء اور اسباب امراض اور خواصِ ادویہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ خدا پر یقین اور اس کے خالق اور حکیم اور مدبر ہونے پر اعتقاد بڑھتا جاتا تھا اور اب یہی ساری چیزیں پڑھنے کے دوران میں ایک خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر آپ سے آپ پرورش پاتا چلا جاتا ہے الا یہ کہ کوئی طالب علم باہر کہیں سے ایمان باللہ ساتھ لایا ہو اور یہاں اناٹومی اور فزیالوجی وغیرہ پڑھتے ہوئے وہ بطور خود آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ بھی کرتا رہے۔

قدیم زمانے میں ہمارے حکما نے یہ طریقہ مقرر کر رکھا تھا کہ فن طب کی تعلیم علوم دینی کی تکمیل کے بعد دی جاتی تھی۔ ایک طالب علم مدرسۂ طب میں آتا ہی اس وقت تھا جب وہ ملک کی عمومی ثانوی تعلیم سے فارغ ہو چکا ہو اور اس ثانوی تعلیم کا جزو لازم علم دین ہوتا تھا۔ اس لیے ہمارے ہاں کے طبیب نرے طبیب ہی نہ ہوتے تھے بلکہ عالم دین بھی ہوتے تھے۔ اب معاملہ اس کے برعکس ہے کہ میڈیکل کالج کے درجۂ فراغ کو پہنچا ہوا ایک طالب علم حدودِ حلال وحرام کی ابتدائی معلومات تک نہیں رکھتا۔

مزید برآں ہمارے پرانے زمانے کے اطبا بالعموم زاہد و عابد لوگ ہوتے تھے۔ لالچ کے بغیر خدمت خلق کرتے تھے۔ فیس لینے سے اکثر اور دوا فروشی سے کلیۃً اجتناب کرتے تھے اور ان کی ذاتی زندگی بڑی پاکیزہ ہوتی تھی۔ اس لیے طبی تعلیم کا سارا ماحول پاک اور دیندارانہ ہوتا تھا اور استادوں کے عمدہ اوصاف خود بخود شاگردوں میں سرایت کر جاتے تھے، بغیر اس کے کہ طلبہ کو دیندار اور با اخلاق بنانے کے لیے کوئی مصنوعی کوشش کرنی پڑتی۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اس کے ساتھ دوا سازی کے فن کی جو اصلاح ان لوگوں نے کی اس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ وہ لوگ حرام چیزوں کو صرف اسی صورت میں استعمال کرتے تھے جبکہ مریض کے علاج کے لیے ان کا استعمال ناگزیر ہو۔ ورنہ بالعموم انھوں نے اپنی دواؤں کو حرام اور ناپاک اجزا سے پاک رکھا تھا۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۵۸-۲۵۹ اشاعت ۱۳ ادیں)

(بحوالہ ترجمان القرآن محرم، صفر ۱۳۷۲ھ اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء)

کیا شدتِ مرض کی وجہ سے انتہائی کرب میں علاج بذریعہ موت جائز ہے؟

سوال: اگر کسی مریض کے جاں بر ہونے کی قطعاً امید نہ رہی ہو اور شدتِ مرض کی وجہ سے وہ انتہائی کرب میں مبتلا ہو، یہاں تک کہ نہ غذا جاتی ہو نہ دوا، تو کیا ایسے حالات میں کوئی طبیبِ حاذق اس کو تکلیف سے نجات دینے کے لیے کوئی زہر دے کر اس کی زندگی کی دردناک گھڑیاں کم کر سکتا ہے؟ اس قسم کی موت وارد کرنے سے کیا اس پر شرعاً قتل کا الزام آئے گا؟ حالانکہ اس کی نیت بخیر ہے؟

جواب: یقیناً اس پر قتل کا الزام آئے گا۔ اس معاملے میں نیت کے بخیر ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے۔ جس جان کا وہ مالک نہیں ہے اور جس کے خلاف کوئی شرعی حق بھی قائم نہیں ہوا ہے، اس کو اگر اس نے قصداً ہلاک کیا ہے تو وہ قطعی طور پر قتل عمد کا مجرم ہے۔

طبیب کو اللہ نے جو علم دیا ہے اس کی غرض انسانی جان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنا ہے نہ کہ اس کی موت کے لیے۔ جب تک کسی شخص کے اندر زندگی موجود ہو، طبیب کا فرض ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کرتا رہے اور جس حد تک اس کے امکان میں ہو، اس کی تکلیف کو کم کرنے کے لیے بھی سعی کرے۔ لیکن یہ بات ایک طبیب کے اخلاقی و شرعی حدودِ عمل سے بالکل خارج ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ کرے کہ کون آدمی ہلاک کر دیئے جانے کا مستحق ہے۔ بلکہ یہ بات خود اس مریض کے اپنے حدودِ اختیار سے بھی باہر ہے کہ وہ اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کرے۔ اس لیے اگر مریض کا اپنا مطالبہ بھی ہو تب بھی طبیب کے لیے ایسا کوئی فعل ہرگز جائز نہیں ہے جو اسے ہلاک کرنے کی خاطر ہو۔

علاوہ بریں یہ بھی ایک قطعی غلط مفروضہ ہے کہ کوئی ڈاکٹر کسی مریض کے بارے میں یہ بالکل یقین کے ساتھ جان سکتا ہے کہ وہ مر جائے گا۔ ایسی مثالیں نادر نہیں ہیں جن میں ایک طبیب نے نہیں بلکہ متعدد طبیبوں نے بالاتفاق رائے قائم کی ہے کہ مریض نہیں بچے گا اور پھر ان کے اندازوں کے بالکل خلاف اس کی جان بچ گئی ہے اس لیے جو ڈاکٹر محض اندازے سے کسی شخص کے جانبر نہ ہونے کا فیصلہ کرے گا اور اس کی تکلیف دور کرنے کے لیے اسے ہلاک کرے گا وہ دراصل ایک بہت بڑا مظلمہ اپنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گردن پر لے گا۔ اپنے علم پر ایسا بے جا اعتماد ایک کافر ڈاکٹر تو کر سکتا ہے، مگر یہ ایک مسلمان ڈاکٹر کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۱۲ تا ۲۱۴ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۵ھ دسمبر ۱۹۴۵ء)

کیا طبی مقاصد کے لیے لاشوں کی چیر پھاڑ درست ہے؟

مولانا نے فرمایا'' ہمارے ہاں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ میں نے جہاں تک اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے مجھے کوئی ایسی روایت دکھائی نہیں دی۔ طب میں مسلمانوں نے بہت کام کیا ہے۔ بڑی مفید خدمات انجام دی ہیں، طبی تحقیقات میں ان کا حصہ کسی سے کم نہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے کام یا اپنی تحقیقات کے لیے لاشوں کو نہیں چیرا پھاڑا۔ خود یورپ میں اسی چیز کو پسند نہیں کیا جاتا تھا اور گزشتہ صدی تک یہ حالت تھی کہ لاشوں کو چرا کر ہی یہ کام ہو سکتا تھا۔ چنانچہ لاشیں چرانے والوں کے گروہ بن گئے تھے جو ان ''طبی تحقیقات'' میں مدد دیتے تھے۔

مولانا! پوسٹ مارٹم رپورٹ کے لیے بھی تو لاش کو چیرنا پھاڑنا پڑتا ہے۔

مولانا نے فرمایا: یہ کام طب اور سائنس کے نام پر کیا جائے یا پوسٹ مارٹم رپورٹ کی خانہ پری کے لیے انجام دیا جائے، آپ دیکھیں گے کہ صرف غریبوں ہی کی لاشیں ان مقاصد کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ آخر صدر کینیڈی بھی گولی کا نشانہ بنے ہیں اور گاندھی بھی۔ کیا ان کی لاشوں کی بھی چیر پھاڑ ہوئی؟ معلوم یہ ہوا کہ یہ طب کی وہ ترقی اور قانون کی وہ ضرورت ہے جو صرف غریبوں اور لاوارثوں کی لاشوں سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔

(۵ اے ذیلدار پارک مرتبہ مظفر بیگ، مطبوعہ البدر پبلی کیشنز طبع اول اپریل ۱۹۷۸ء ص ۳۱)

کیا اعضائے انسانی کو عطیۃً دیا جاسکتا ہے؟ خصوصاً جبکہ اس کا مقصد انسانی خدمت ہو

مولانا نے فرمایا: ''سوال یہ ہے کہ اس چیز کا کوئی تعلق خود انسانیت سے بھی ہے؟ اِدھر ایک شخص کی موت واقع ہوتی اور اس کے گھر میں کہرام مچا اور اُدھر آنکھوں والے اس کی آنکھیں نکالنے آگئے، ہاتھوں اور ٹانگوں کے شعبے سے اس کے ہاتھ اور ٹانگیں کاٹ کر لے جانے والے آگئے اور دل کے ڈیپارٹمنٹ سے آلات لیے اس کا سینہ چیر کر دل نکالنے والے آگئے۔ کیا واقعی انسانیت یہی سکھاتی ہے؟ ایک مسلمان معاشرے میں یہ چیز چل نکلے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ عزیز و اقربا مرنے والے کا کیا بچا کھچا منہ دیکھنے آئیں گے، نماز جنازہ کیا چیز سامنے رکھ کر پڑھی جائے گی اور قبر میں کیا شے لے جا کر دفن کی جائے گی۔''

مولانا کچھ لوگ اپنی خوشی سے آنکھوں وغیرہ کا عطیہ دینے کا اعلان کرتے ہیں کیا اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی؟

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مولانا نے فرمایا: ''اصل سوال یہ ہے کہ آپ اپنے جسم کے مالک خود کب ہیں؟ مذہب ہی نہیں خود قانون بھی آپ کو اپنے جسم کا مالک قرار نہیں دیتا۔ اگر اپنے جسم کے مالک آپ خود ہیں تو پھر آپ کو خودکشی کی اجازت کیوں حاصل نہیں؟ آپ اپنے آپ کو بیچ کیوں نہیں سکتے؟ اب جس جسم پر جیتے جی آپ کے اختیارات کا یہ عالم ہے، اسی جسم کے حصے بخرے کرنے کا آپ اس وقت کیا اختیار رکھتے ہیں جب آپ اسے چھوڑ کر جا چکے ہوتے ہیں۔ اس وقت اگر ایسی کوئی اجازت آپ کو قانون دیتا ہے تو یہ قانون کا سقم ہے مذہب کا نہیں۔

(۵ اے ذیلدار پارک، مرتبہ مظفر بیگ، مطبوعہ البدر پبلی کیشنز طبع اول ۱۹۷۸ء اپریل ص ۳۱-۳۲)

وصیۃ العینین

سوال: کیا ایک مسلمان زندگی میں اپنی آنکھیں عطیہ کرسکتا ہے کہ موت کے بعد کسی مریض کے لیے استعمال ہوسکیں؟ کیا یہ قربانی گناہ تو نہ ہوگی اور قیامت میں یہ شخص اندھا تو نہ اُٹھے گا؟

جواب: آنکھوں کے عطیے کا معاملہ صرف آنکھوں تک ہی محدود نہیں رہتا۔ بہت سے دوسرے اعضا بھی مریضوں کے کام آسکتے ہیں اور ان کے دوسرے مفید استعمال بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ دروازہ اگر کھول دیا جائے تو مسلمان کا قبر میں دفن ہونا مشکل ہو جائے گا۔ اس کا سارا جسم ہی چندے میں تقسیم ہو کر رہے گا۔ اسلامی نظریہ یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے جسم کا مالک نہیں ہے۔ اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے جسم کو تقسیم کرنے یا چندہ میں دینے کی وصیت کر دے۔ جسم اس وقت تک اس کے تصرف میں ہے جب تک وہ اس جسم میں خود رہتا ہے۔ اس کے نکل جانے کے بعد اس جسم پر اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ اس معاملے میں اس کی وصیت نافذ ہو۔ اسلامی احکام کی رو سے یہ زندہ انسانوں کا فرض ہے کہ اس کا جسم احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔

اسلام نے انسانی لاش کی حرمت کا جو حکم دیا ہے وہ دراصل انسانی جان کی حرمت کا ایک لازمہ ہے، ایک دفعہ اگر انسانی لاش کا احترام ختم ہو جائے تو بات صرف اس حد تک محدود نہ رہے گی کہ مردہ انسانوں کے بعض کارآمد اجزا زندہ انسانوں کے علاج میں استعمال کیے جانے لگیں، بلکہ رفتہ رفتہ انسانی جسم کی چربی سے صابن بھی بننے لگیں گے [جیسے کہ فی الواقع جنگ عظیم دوم کے زمانے میں جرمنوں نے بنائے تھے]۔ انسانی کھال اتار کر اس کو دباغت دینے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اس کے جوتے یا سوٹ کیس، یا منی پرس بنائے جاسکیں۔ [چنانچہ یہ تجربہ بھی چند سال قبل مدراس کی ایک ٹینری کر چکی ہے]۔ انسان کی ہڈیوں اور آنتوں اور دوسری چیزوں کو استعمال کرنے کی بھی فکر کی جائے گی، حتیٰ کہ اس کے بعد ایک مرتبہ انسان پھر اس دورِ وحشت کی طرف پلٹ جائے گا جب آدمی آدمی کا گوشت کھاتا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ اگر ایک دفعہ مردہ انسان کے اعضا نکال کر علاج میں استعمال کرنا جائز قرار دے دیا جائے تو پھر کس جگہ حد بندی کر کے آپ اسی جسم کے دوسرے مفید استعمالات کو روک سکیں گے اور

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کس منطق سے اس بندش کو معقول ثابت کریں گے۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۹۲-۲۹۴ اشاعت ششم جولائی ۱۹۷۶ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن جنوری ۱۹۶۲ء)

نظریہ ارتقا کے متعلق سوال [Evolution]

ایک نوجوان نے کہا: مولانا آپ Evolution کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ مولانا نے فرمایا: ''آپ کس Evolution کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔ Evolution ارتقا کو کہتے ہیں اور اس سلسلے میں مختلف نظریات ہیں۔ آپ کون سے نظریے کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہیں۔''

نوجوان نے کہا: ''میں ڈارون کے نظریہ ارتقا کے بارے میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں۔'' مولانا نے فرمایا: ''ڈارون کا نظریہ ارتقا کوئی ثابت شدہ حقیقت یا کوئی سائنٹفک فیکٹ نہیں ہے۔ یہ محض ایک نظریہ ہے اور ایک صدی سے زیادہ مدت گزر جانے کے باوجود یہ ایک تھیوری، ایک نظریے بلکہ ایک تخیل سے زیادہ کوئی چیز نہیں بن سکا۔ جب نظریات یوں تصنیف کیے جائیں کہ مشاہدہ ایک ہو اور اس کے ساتھ ایک لاکھ قیاسات ہوں، تو ان کا انجام اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ نوجوان نے کہا ''ان قیاسات کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی ضرورت Missing links کی وجہ سے پڑتی ہے۔''

مولانا نے فرمایا ''یہ بات بھی اس نظریے کے خلاف جاتی ہے۔ اس نظریے کے حامیوں سے پوچھنا چاہیے کہ جب تمام درمیانی کڑیاں بھی غائب ہیں اور تم اپنی بات کے لیے کوئی دوسرا ثبوت بھی نہیں رکھتے تو پھر اسے کس بنیاد پر تسلیم کرنے کا مطالبہ کرتے ہو؟''

مزید فرمایا: ''ڈارون کا نظریہ ارتقا کہتا ہے کہ انسان حیوانات میں سے بتدریج ترقی کرتا ہوا مختلف شکلوں سے گزرنے کے بعد انسان بنا ہے اور یہ عمل لاکھوں برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ لاکھوں برسوں کا یہ عمل تمھارے علم میں کیسے آیا؟ تم اس کے لیے کیا ثبوت رکھتے ہو؟ کیا Missing links کو ثبوت کا درجہ دیا جا سکتا ہے؟ ان missing links کا بھی یہ حال ہے کہ جہاں کھدائی میں کوئی ہڈی یا دانت مل گیا تو شور مچ گیا کہ ایک غائب شدہ کڑی مل گئی ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ محض ایک مغالطہ تھا۔ جب مغالطوں کی اتنی فراوانی ہے اور کوئی درمیانی کڑی موجود ہی نہیں، تو فیصلہ کس بنیاد پر دیا جا رہا ہے۔

دیکھیے یہ تھیوری کہتی ہے کہ زرافے کی گردن اس لیے لمبی ہوتی چلی گئی اور موجودہ شکل کو اس لیے پہنچی کہ زرافہ درختوں سے پتے کھانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ تھیوری اس سوال کا جواب نہیں دیتی کہ پھر بکری کی گردن کیوں چھوٹی رہ گئی، وہ بھی تو درختوں کے پتے کھانے کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ تھی اور نہ ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ گفتگو مولانا محترم کے ان الفاظ پر اختتام کو پہنچی "اللہ تعالیٰ نے ایک چیونٹی سے لے کر اس پوری کائنات تک ہر چیز مکمل پیدا کی ہے۔اس کے نظام میں ہر چیز اپنی جگہ مکمل ہے۔گندم بویا جاتا ہے تو اس میں سے آم نہیں نکل آتے۔خالق نے گندم کے دانے میں گندم کی پوری مشینری بنادی ہے۔چنانچہ ہزاروں برس پہلے بھی گندم بو کر گندم ہی کاٹا جاتا تھا اور آج بھی ہم گندم بوئیں گے تو گندم ہی کاٹیں گے۔ڈارون کی تھیوری کے باوجود حقائق بہر حال حقائق ہی رہیں گے۔

(۵ اے ذیلدار پارک مرتبہ مظفر بیگ مطبوعہ البدر پبلی کیشنز طبع اول ۱۹۷۸ء ص ۹۱-۹۲-۹۳)

اسلام اور سائنس

سوال: سائنس کے مختلف شعبوں کے مطالعہ کرنے کے سلسلے میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے؟

جواب: سائنس کے مختلف شعبوں کے مطالعے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک مفصل مضمون چاہتا ہے، مگر میں مختصراً آپ کو اس کے لیے چند اشارے دیتا ہوں۔

سائنس کا جو شعبہ بھی آپ لیں، وہ بہر حال کائنات کے کسی ایک جز کی ماہیت اور خصوصیات کو اور ان قوانین فطرت کو جو اس میں کارفرما ہیں، مشاہدے اور تجربے کی مدد سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔اس تحقیق و تجسّس میں دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک یہ کہ تحقیق کرنے والا انسان پہلے بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا [جس کے کسی جز پر وہ اپنی توجہ مرکوز کر رہا ہے] ایک صحیح و جامع تصور رکھتا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ خود اپنی حقیقت اور حیثیت کو اور اپنے حدود کو ٹھیک سمجھتا ہو۔ان دو چیزوں کے بغیر الگ الگ اجزا کی تحقیقات [جو بہر حال صرف تجربے و مشاہدے میں آنے والے امورِ واقعیہ تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ کسی نہ کسی فلسفیانہ نظریے کی تشکیل بھی کرتی ہے] مشکل ہی سے کسی صحیح نتیجے پر انسان کو پہنچا سکتی ہے۔اس کا حاصل عملی ایجادات سے قطع نظر، فلسفیانہ حیثیت سے اگر کچھ ہے تو یہ کہ ایسی تحقیقات سے ہمارے مجموعی تصور کائنات و انسان کو مکمل اور واضح کرنے کے بجائے الٹا ناقص اور مسخ ہی کرتی چلی جائے گی۔

اسلام دراصل ہماری اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔وہ ہر قسم کی تحقیقات کے لیے جو نقطۂ آغاز ہم کو دیتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر کے یا بہت سے خداؤں کی رزمگاہ سمجھ کر تحقیق کی ابتداء نہ کرو بلکہ یہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھنا شروع کرو کہ یہ ایک خالق کی تخلیق اور ایک قادرِ مطلق کی سلطنت اور ایک حکیم کی دانائی کا کرشمہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے آپ کو [اور فی الجملہ نوعِ انسانی کو] غیر محکوم و غیر مسئول، یا مجبورِ محض، یا مختارِ کل سمجھتے ہوئے مطالعے کی ابتدا نہ کرو بلکہ اس حیثیت سے مطالعہ شروع کرو کہ تم سلطنت کائنات میں ایک ایسی رعیت ہو جس کی طرف کچھ اختیار منتقل کیا گیا ہے اور اس اختیار کے صحیح و غلط استعمال میں تم مسئول ہو۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

بس یہی ہر مطالعہ و تحقیق کے لیے ایک صحیح نقطۂ آغاز ہے۔ رہے دورانِ تحقیق میں پیش آنے والے وہ بہت سے جزئیات جن سے انسان کو مختلف علمی شعبوں میں سابقہ پیش آتا ہے، تو ان میں اسلام اس کے سوا کسی بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ ہمارے اخذ کردہ نتائج ان حقائق سے نہ ٹکرائیں، جن کی صراحت کتاب اللہ میں پائی جاتی ہو۔ اگر فی الفرض کسی جگہ بعض حقائق مشہودہ (Observed Facts) سے ہم کو ایسے نتائج نکلتے نظر آئیں جو تصریحات کتاب سے متصادم ہوتے ہوں، تو پھر ہمیں غور سے دیکھنا چاہیے کہ کہیں ہمارے مشاہدے یا طریقۂ استنتاج میں تو کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ خیال رہے کہ تصادم اگر ہو سکتا ہے تو حقائق و واقعات اور تصریحات کتاب میں نہیں بلکہ نتائج مستخرجہ اور تصریحات کتاب میں ہو سکتا ہے اور اس صورت میں نظر ثانی کتاب پر نہیں بلکہ نتائج مستخرجہ پر ہونی چاہیے، کیونکہ نتائج مستخرجہ حقائق مشہودہ کی طرح کوئی یقینی چیز نہیں ہیں۔

(رسائل و مسائل حصہ دوم ص ۲۵۵ تا ۲۵۷ اشاعت ۱۳ ویں مارچ ۱۹۸۲ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن محرم، صفر ۷۲ ۱۳ھ اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل پنجم

آیاتِ محکمات و متشابہات

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ (آل عمران ۳:۷)

وہی خدا ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات۔

محکمات

محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔" آیاتِ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں، جن کی زبان بالکل صاف ہے، جن کا مفہوم متعین کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے، جن کے الفاظ معنی و مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں، جنھیں تاویلات کا تختہ مشق بنانے کا موقع مشکل ہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔ یہ آیات" کتاب کی اصل بنیاد ہیں" یعنی قرآن جس غرض کے لیے نازل ہوا ہے، اُس غرض کو یہی آیتیں پورا کرتی ہیں۔ اُنھی میں اسلام کی طرف دُنیا کو دعوت دی گئی ہے، اُنھی میں عبرت اور نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں، اُنھی میں گمراہیوں کی تردید اور راہِ راست کی توضیح کی گئی ہے۔ اُنھی میں دین کے بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اُنھی میں عقائد، عبادات، اخلاق، فرائض اور امر و نہی کے احکام ارشاد ہوئے ہیں۔ پس جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لیے قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہو کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے، اس کی پیاس بجھانے کے لیے آیات محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرۃً اُنھی پر اس کی توجہ مرکوز ہوگی اور وہ زیادہ تر اُنھی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

متشابہات

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ (آل عمران ۳:۷)

جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یعنی وہ آیات جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے زندگی کا کوئی راستہ تجویز نہیں کیا جا سکتا، جب تک کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

انجام اور اس میں انسان کی حیثیت اور ایسے ہی دوسرے بنیادی امور کے متعلق کم سے کم ضروری معلومات انسان کو نہ دی جائیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جو چیزیں انسان کے حواس سے ماوراء ہیں، جو انسانی علم کی گرفت میں نہ کبھی آئی ہیں، نہ آ سکتی ہیں، جن کو اس نے نہ کبھی دیکھا، نہ چھوا، نہ چکھا، ان کے لیے انسانی زبان میں نہ ایسے الفاظ مل سکتے ہیں جو انھی کے لیے وضع کیے گئے ہوں اور نہ ایسے معروف اسالیب بیان مل سکتے ہیں، جن سے ہر سامع کے ذہن میں ان کی صحیح تصویر کھنچ جائے۔ لامحالہ یہ ناگزیر ہے کہ اس نوعیت کے مضامین کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور اسالیب بیان وہ استعمال کیے جائیں، جو اصل حقیقت سے قریب تر مشابہت رکھنے والی محسوس چیزوں کے لیے انسانی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعی مسائل کے بیان میں قرآن کے اندر ایسی ہی زبان استعمال کی گئی ہے اور متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں، جن میں یہ زبان استعمال ہوئی ہے۔

متشابہات سے اہلِ فتنہ کی غیر معمولی دلچسپی

لیکن اس زبان کا زیادہ سے زیادہ فائدہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی کو حقیقت کے قریب تک پہنچا دے یا اس کا ایک دُھندلا سا تصور پیدا کر دے۔ ایسی آیات کے مفہوم کو متعین کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کی جائے گی، اتنے ہی زیادہ اشتباہات و احتمالات سے سابقہ پیش آئے گا، حتیٰ کہ انسان حقیقت سے قریب تر ہونے کے بجائے اور زیادہ دور ہوتا چلا جائے گا۔ پس جو لوگ طالب حق ہیں اور ذوقِ فضول نہیں رکھتے، وہ تو متشابہات سے حقیقت کے اس دھندلے تصور پر قناعت کر لیتے ہیں جو کام چلانے کے لیے کافی ہے اور اپنی تمام تر توجہ محکمات پر صرف کرتے ہیں، مگر جو لوگ بوالفضول یا فتنہ جو ہوتے ہیں، ان کا تمام تر مشغلہ متشابہات ہی کی بحث و تنقیب ہوتا ہے۔

جب لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم ہی نہیں جانتے تو ایمان کیسے لے آئے

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِندِ رَبِّنَا ۗ۔ (آل عمران ۳:۷)

حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب ہی کی طرف سے ہیں۔

یہاں کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ جب وہ لوگ متشابہات کا صحیح مفہوم جانتے ہی نہیں، تو ان پر ایمان کیسے لے آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک معقول آدمی کو قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین محکمات کے مطالعے سے حاصل ہوتا ہے نہ کہ متشابہات کی تاویلوں سے اور جب آیات محکمات میں غور و فکر کرنے سے اس کو یہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب واقعی اللہ ہی کی کتاب ہے، تو پھر متشابہات اس کے دل میں کوئی خلجان پیدا نہیں کرتے۔ یہاں تک ان کا سیدھا سادھا مفہوم اس کی سمجھ میں آ جاتا ہے، اس کو وہ لے لیتا ہے اور جہاں پیچیدگی رونما ہوتی ہے، وہاں کھوج لگانے اور موشگافیاں کرنے کے بجائے وہ اللہ کے کلام پر مجمل ایمان

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لاکر اپنی توجہ کام کی باتوں کی طرف پھیر دیتا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ا ص ۲۳۴-۲۳۵ آل عمران حاشیہ ۵-۶-۷)

محکمات اور متشابہات کا ایک اور مفہوم

آیات متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں انسانی حواس سے ماورا حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ حقیقتیں چونکہ براہِ راست انسان کے تجربے اور مشاہدے میں نہیں آئی ہیں اور اس بنا پر انسانی زبان میں ان کے لیے ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں جو انھی کے لیے وضع کیے گئے ہوں، اس لیے لامحالہ ان کو بیان کرنے میں وہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں جو انسان نے دراصل محسوس اشیا کے لیے وضع کیے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے لیے زندگی، بینائی، سماعت، گویائی وغیرہ الفاظ کا استعمال یا اس کے لیے عرش اور کرسی ثابت کرنا اور یہ کہ وہ آسمان میں ہے، یا یہ کہنا کہ وہ محبت کرتا ہے یا غضب ناک ہوتا ہے۔ اس طرح کے الفاظ اور اسالیب بیان حقیقت کا ایک مجمل تصور تو دے سکتے ہیں اور وہی دینا مقصود بھی ہے۔ لیکن ان الفاظ اور بیانات کی مدد سے حقیقت کا پورا پورا تفصیلی تصور حاصل کرنا اور ماورائے حواس حقائق کی پوری پوری کیفیت اور نوعیت (Nature) معلوم کر لینا بہر حال ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن ان کی تاویل کی کوشش کرنے والوں کو غلط ذہنیت کا شکار قرار دیتا ہے کیونکہ وہ الفاظ اس کے متحمل ہیں ہی نہیں کہ انسان ان کے معانی متعین کر سکے یا ان کی کوئی ایسی تعبیر کر سکے جس سے اصل حقیقت اس کے ادراک کی گرفت میں آ جائے۔ اس کے برعکس آیات محکمات وہ آیات ہیں جو انسان اور کائنات سے تعلق رکھنے والے محسوس حقائق اور تجربے و مشاہدے میں آنے والے مسائل و معاملات سے بحث کرتی ہیں۔ یا انسان کو وہ احکام اور ہدایات دیتی ہیں جن پر اسے عمل کرنا ہے۔ ان آیات میں چونکہ وہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اس لیے انسان ان کی تاویل و تعبیر کر سکتا ہے۔ ان کے معانی متعین کرنے کی کوشش ممکن بھی ہے اور جائز بھی، بلکہ وہ شریعت میں مطلوب ہے۔ کیونکہ قرآن کے منشا کو سمجھنے اور اس سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ یہ کوشش نیک نیتی کے ساتھ ہو، رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ہو اور ان معقول طریقوں کے مطابق ہو جو دنیا میں کسی کلام کا حقیقی مفہوم و مراد معلوم کرنے کے لیے [نہ کہ اس کی اپنی خواہشات اور اپنے نظریات کے مطابق ڈھالنے کے لیے] استعمال کیے جاتے ہیں۔

''آیات محکمات'' کا یہ مطلب ہے ہی نہیں کہ وہ ایسی آیات ہیں ''جن کی تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے برعکس قرآن مجید تو آیات متشابہات کی تاویل سے منع کر کے محکم آیات کی طرف انسان کی توجہ اسی غرض کے لیے پھیرتا ہے کہ غور و فکر اور بحث و تحقیق اور تاویل و تعبیر کی کوششوں کا صحیح رخ یہ آیات ہیں نہ کہ آیات متشابہات۔ آیات محکمات میں وہ سب چیزیں ہیں جن کے معنی ہم لغت سے، قواعدِ زبان سے، سیاق و سباق سے، قرآن کے دوسرے بیانات سے اور سنت، اجماع اور قیاس کی مدد

www.KitaboSunnat.com

سے متعین کرسکتے ہیں۔اسی طرح قرآن کی وہ تمام آیات محکم ہیں جن میں انسان سے کسی چیز کے ماننے یا کسی چیز کا انکار کرنے، یا کسی چیز پر عمل کرنے یا کسی چیز کو چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے نیز وہ سب آیات محکم ہیں جو محسوس ومشہود اشیا کا ذکر کرتی ہیں یا ان امور ومسائل سے بحث کرتی ہیں جو انسان کے تجربے میں آتے ہیں۔

(رسائل و مسائل سوم ص ۲۲ تا ۲۴ طبع ۲۸)

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ۝ (المعارج ۷۰: ۴)

ملائکہ اور روح اس کے حضور چڑھ کر جاتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

یہ سارا مضمون متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جاسکتے۔ہم نہ فرشتوں کی حقیقت جانتے ہیں، نہ ان کے چڑھنے کی کیفیت سمجھ سکتے ہیں، نہ یہ بات ہمارے ذہن کی گرفت میں آسکتی ہے کہ وہ زینے کیسے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی مقام پر رہتا ہے، کیونکہ اس کی ذات زمان ومکان کی قیود سے منزہ ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۸۷ المعارج حاشیہ ۴)

اللہ تعالیٰ اور تجسیم: محکمات اور متشابہات کی روشنی میں

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی تجسیم کا مفہوم نکلتا ہے۔گویا اللہ تعالیٰ ایک مقام محدود میں مقیم ہے۔جہاں فرشتے ان کے پاس رپورٹ لے کر پہنچتے ہیں۔اس اشکال کا کیا حل ہے؟

ایسے اشکالات تو بے شمار چیزوں سے پیدا ہوتے ہیں۔مثلاً معراج ہی کو لیجیے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے ایک آدمی یہ تصور کرسکتا ہے کہ کوئی خاص مقام ایسا تھا جہاں اللہ تعالیٰ تشریف فرما تھا[نعوذ باللہ] اور حضورؐ وہاں پہنچے، ورنہ معراج اسی زمین پر بھی ہوسکتی تھی.......... اصل میں یہ وہ چیزیں ہیں کہ جب آپ ان کی کھوج لگانا شروع کریں گے تو آپ جتنی کھوج لگاتے جائیں گے اپنے لیے اتنے ہی فتنے پیدا کرتے جائیں گے۔اس کھوج سے آپ ایسے ایسے سوال پیدا کرلیں گے جن کا جواب دنیا میں کوئی نہیں دے سکتا۔آدمی جو جواب بھی ان سوالات کا اختیار کرے گا، اس میں فتنہ موجود ہوگا۔چنانچہ اس سلسلے میں یہ اصول اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جو چیزیں آپ کے محسوسات سے ماوراء ہیں ان کے بارے میں مجملاً اتنی بات ہی آپ کو جاننی اور ماننی چاہیے جتنی بیان کی گئی ہے۔اس سے زائد تفصیلات طے کرنے کی جب بھی آپ کوشش کریں گے تو لامحالہ اپنی شامت خود بلائیں گے۔مثلاً قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ [بیعت رضوان میں اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے] ظاہر بات ہے کہ جب اللہ کے لیے ہاتھ کا لفظ استعمال کیا گیا تو ایک آدمی یہ خیال کرسکتا ہے کہ اس سے مراد یہ پانچ انگلیوں والا اور ایک کلائی میں لگا ہوا ہاتھ ہے جو ایک جسم کا حصہ ہے۔چنانچہ اگر آدمی اس کھوج میں پڑے اور لفظ "یَدْ" [ہاتھ] کا تعین شروع کردے تو اس کے لیے فتنے میں مبتلا ہوجانا ایک بدیہی امر ہے۔کیونکہ اس کے پاس اس کے تعین کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔جب کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حواس سے ماورا ایک ہستی ہے۔آدمی تو انھی چیزوں کے متعلق تصور کرسکتا ہے جو اس کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

محسوسات کی گرفت میں آتی ہیں۔ لیکن جو چیزیں محسوسات سے ماوراء ہیں ان کا تصور دلانے کے لیے ہم انھی الفاظ کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں جو انسان کی زبان میں پائے جاتے ہیں اور انسان کی زبان میں کوئی لفظ ایسا نہیں پایا جاتا جو محسوسات سے ماوراء چیزوں کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ انسان کی زبان کا ہر لفظ صرف محسوسات کے لیے رکھا گیا ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب ماورائے محسوسات کے لیے انسانی زبان استعمال کی جائے گی تو ان کا لازماً اور بعینہٖ وہ مفہوم نہیں ہوسکتا جو انسانی زبان میں مراد ہوتا ہے۔ انسان قریب ترین جو تصور کرسکتا ہے وہ ان الفاظ سے کرسکتا ہے۔ اسی لیے وہ الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اب وہ شخص اپنے نفس پر بڑا ظلم کرنے والا ہوگا جو ان الفاظ کے معنی متعین کرنے کے لیے بیٹھ جائے۔ اسی لیے قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو متشابہات ہیں ان کے معنی متعین کرنے میں وہی لوگ سر کھپاتے ہیں جن کے دلوں میں زیغ (ٹیڑھ) ہے۔ وہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے معنی متعین کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جو شخص بھی ایسی کوئی کوشش کرتا ہے وہ حقیقت میں اپنے نفس پر ہی ظلم کرتا ہے۔ یہ بڑے بڑے گمراہ فرقے اسی وجہ سے پیدا ہوئے کہ لوگ متشابہات کے معنی متعین کرنے کے پیچھے پڑ گئے۔ [چنانچہ میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس سے بچیے اور خود بھی خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کبھی اس فتنے میں پڑوں]۔

(استفسارات اول ص ۱۲۹ تا ۱۳۱ طبع اول)

جبرئیلؑ اور انسانی اعمال کی رپورٹ اللہ کے حضور

سوال: آپ نے سورۂ معارج کی آیت تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَیۡهِ کی تشریح میں فرمایا ہے کہ ملائکہ اور الروح [جبریل علیہ السلام] رپورٹ لے کر اللہ تعالیٰ کی طرف چڑھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس چیز کی کیا احتیاج ہوسکتی ہے کہ ملائکہ اسے رپورٹ دیں، تب اسے ان چیزوں کا علم ہو؟

جواب: بات اصل میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ براہِ راست علم اپنی جگہ ایک الگ چیز ہے اور جن ہستیوں کے سپرد وہ کوئی خدمت کرتا ہے ان کا اپنے کام کی رپورٹ اللہ کے حضور پیش کرنا ایک دوسری چیز ہے اور اس کا اپنا ایک الگ مفہوم ہے۔ میں اس کی مختصر طور پر وضاحت کرتا ہوں۔

مثال کے طور پر دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہر چیز کو جانتا ہے اور دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ فلاں مقام پر فلاں آدمی جرم کر رہا ہے لیکن قیامت کے روز جب اس پر مقدمہ قائم کیا جائے گا اور عدالت میں اس کا معاملہ پیش کیا جائے گا تو کیا یہ طریقہ انصاف کے مطابق ہوگا کہ اس کے خلاف کوئی شہادت قائم کیے بغیر اسے سزا دینے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ عدالت اور انصاف کا یہ ایک بڑا اہم اصول ہے کہ جج کا براہِ راست خود مجرم کو جرم کرتے ہوئے دیکھ لینا کوئی شہادت (EVIDENCE) نہیں ہے جس کی بنیاد پر وہ اس کی سزا کا فیصلہ کرلے۔ اصول قانون، اصول انصاف اور اصولِ عدالت میں سے ایک اہم چیز شہادت اور ریکارڈ فراہم کرنا ہے۔ فیصلے کے لیے جج کا علم نہیں، بلکہ گواہوں اور ریکارڈ کی موجودگی ضروری ہے۔ چنانچہ فرشتے اس بات کی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

گواہی دیں گے کہ ہمارے سامنے اس شخص نے یہ فعل کیا تھا۔ خود انسان گواہ ہوں گے۔ یا اگر انسان گواہ نہ ہوں گے تو مجرم کے اپنے جسم کے اعضا اور در و دیوار تک اس بات کی گواہی دیں گے کہ اس شخص نے یہ فعل کیا تھا۔ فرشتے ہر انسان کا نامۂ اعمال تیار کر رہے ہیں۔ ان کی شہادت سے اور ریکارڈ سے جب یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ اس شخص نے یہ فعل کیا تھا، تب اسے سزا دی جائے گی۔ اسی طرح یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایک عظیم الشان سلطنت کا نظام چلا رہا ہے اور اس نے یہ نظام چلانے کے لیے خود ایسے کارکن پیدا کیے ہیں جو اس کے احکام کو نافذ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نبی کی طرف وحی بھیجنے کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ نہیں کرتا کہ خود وحی لے کر پہنچے، یا براہِ راست نبی کے کان میں پھونک دے۔ وہ اس غرض کے لیے ایک فرشتے کو مقرر کرتا ہے کہ وہ یہ وحی لے کر جائے۔ اب یہ اس فرشتے کا فرض ہے کہ اس کے سپرد وحی پہنچانے کی جو خدمت کی گئی ہے وہ اسے پورا کرے اور پھر یہ بھی اس کا فرض ہے کہ وہ پلٹ کر اللہ کے حضور میں جائے اور جا کر اطلاع دے کہ حضور جو خدمت میرے سپرد کی گئی تھی وہ میں نے انجام دے دی۔ یہ ایک قاعدے کی بات ہے کہ ملازم یا خادم کا یہ کام ہوتا ہے کہ وہ اپنی کارگزاری کی اطلاع اپنے آقا کو دے۔ قطع نظر اس سے کہ آقا کو براہِ راست بھی یہ معلوم ہو کہ اس نے فلاں کام کر لیا ہے۔ کیونکہ ملازم یا خادم کے اپنے قدرتی اور فطری فرائض میں یہ چیز داخل ہے کہ جو خدمت اس کے سپرد کی جائے وہ اس کی رپورٹ اپنے آقا کو پیش کرے۔

(استفسارات اول ص ۱۲۸-۱۲۹ طبع اول)

وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ (الحاقۃ ۶۹:۱۷)

اور آٹھ فرشتے اُس روز رب کا عرش اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

یہ آیت متشابہات میں سے ہے جس کے معنی متعین کرنا مشکل ہے۔ ہم نہ یہ جان سکتے ہیں کہ عرش کیا چیز ہے اور نہ یہی سمجھ سکتے ہیں کہ قیامت کے روز آٹھ فرشتوں کے اس کو اٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی۔ مگر یہ بات بہر حال قابلِ تصور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوگا، اور آٹھ فرشتے اس کو عرش سمیت اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ آیت میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ عرش پر بیٹھا ہوا ہوگا اور ذات باری کا جو تصور ہم کو قرآن مجید میں دیا گیا ہے وہ بھی یہ خیال کرنے میں مانع ہے کہ وہ جسم اور جہت اور مقام سے منزہ ہستی کسی جگہ متمکن ہو اور کوئی مخلوق اسے اٹھائے۔ اس لیے کھوج کرید کر کے اس کے معنی متعین کرنے کی کوشش کرنا اپنے آپ کو گمراہی کے خطرے میں مبتلا کرنا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی حکومت و فرمانروائی اور اس کے معاملات کا تصور دلانے کے لیے لوگوں کے سامنے وہی نقشہ پیش کیا گیا ہے جو دنیا میں بادشاہی کا ہوتا ہے اور اس کے لیے وہی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو انسانی زبانوں میں سلطنت اور اس کے مظاہر و لوازم کے لیے مستعمل ہیں، کیونکہ انسانی ذہن اسی نقشے اور انھی اصطلاحات کی مدد سے کسی حد تک کائنات کی سلطانی کے معاملات کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ سب کچھ اصل حقیقت کو انسانی فہم سے قریب تر کرنے کے لیے ہے۔ اس کو بالکل لفظی معنوں میں لے لینا درست نہیں ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۶ ص ۷۵ الحاقۃ حاشیہ ۱۱)

❀❀❀❀❀❀❀

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ششم

عالمِ بَرزخ

عالمِ برزخ اور زندگی

قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ انسان کی ایک حالت وہ تھی جب وہ محض رُوح تھا، جسم نہ تھا۔ اب دوسری حالت یہ ہے کہ رُوح ایک جسم کے اندر ہے۔ تیسری صورت یہ ہوگی کہ رُوح جسم سے نکل جائے گی اور چوتھی حالت وہ ہوگی جب روح دوبارہ جسم میں داخل ہوگی۔ یہ وہ موقع ہوگا جب قیامت برپا ہوگی۔ موجودہ زندگی کے بعد کی حالت جو قیامت تک رہے گی اسے عالمِ برزخ کا نام دیا گیا ہے۔ عالمِ برزخ میں روح ہوگی مگر جسم نہیں ہوگا مگر روح اس پوری شخصیت کو لیے ہوئے ہوگی جو ہم نے (Develope) کی ہے۔ اس رُوح سے خاص نوعیت کے سوالات و جوابات ہوں گے۔ مثلاً ایک آدمی اگر نیک کام کرکے دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو موت کے دروازے پر اس کا استقبال مہمان کی حیثیت سے ہوگا اور اسے اس وقت تک مہمان کی حیثیت سے رکھا جائے گا جب تک کہ عالم آخرت میں فیصلے نہیں ہو جاتے۔ دوسری طرح کا انسان وہ ہے جو بدقماش اور ظالم ہے۔ موت کے دروازے سے اسے زیرِحراست لے لیا جائے گا، جیسے ایک مجرم کو پولیس پکڑ لیتی ہے اور جب تک مقدمہ عدالت کے سامنے پیش نہیں ہو جاتا اسے حراست میں رکھتی اور (Interrogate) کرتی ہے۔ یہ سیدھی سادھی بات ہے حیرت کی بات نہیں۔ نیک انسان سے ایک قسم کا معاملہ ہوگا اور بُرے انسان سے دوسری قسم کا سلوک ہوگا۔ موت کے بعد رُوح اپنے پورے احساسات کے ساتھ موجود ہوتی ہے۔ نیک انسان کی رُوح راحت محسوس کرتی ہے اور بدآدمی کی رُوح مصیبت کا شکار ہوتی ہے۔

(۵ اے ذیلدار پارک دوم ص ۷۷-۷۸)

موت کے بعد ہی [برزخ میں] جزاوسزا کا آغاز

لَهُم مَّا يَشَآءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ۚ ذَٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِينَ ○ (الزمر ۳۹:۳۴)

انھیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہاں فی الجنة [جنت میں] نہیں بلکہ عِندَ رَبِّهِمْ [ان کے رب کے ہاں] کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنے رب کے ہاں تو بندہ مرنے کے بعد ہی پہنچ جاتا ہے۔اس لیے آیت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں پہنچ کر ہی نہیں بلکہ مرنے کے وقت سے دخول جنت تک کے زمانے میں بھی مومن صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی رہے گا۔ وہ عذاب برزخ سے، روز قیامت کی سختیوں سے، حساب کی سخت گیری سے، میدانِ حشر کی رسوائی سے، اپنی کوتاہیوں اور قصوروں پر مواخذے سے لازماً بچنا چاہے گا اور اللہ جل شانہ اس کی یہ ساری خواہشات پوری فرمائے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۳۷۴ الزمر حاشیہ ۵۳)

سماعِ موتی

مرنے کے بعد نہ اہلِ ایمان سب کچھ سنتے ہیں اور نہ اہلِ کفر۔ یہ بات تو واضح ہے کہ مرنے والے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) نیک آدمی جو بحیثیت مہمان خدا کے حضور پہنچے ہیں۔ (۲) بدکردار لوگ جو مجرم کی حیثیت سے اس کے حضور پیش ہوتے ہیں۔

اب یہ عقل عام میں آنے والی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مہمانوں کو کوئی ایسی بات تو نہیں سنوائے گا جس سے ان کی دل آزاری ہو اور انھیں تکلیف پہنچے بلکہ ان کی تعریف اور ایصال ثواب کے لیے دعائیں انھیں پہنچائی جائیں گی۔ اسی طرح بدکردار لوگوں کی تعریف میں دنیا میں نعرے بھی لگ رہے ہوں گے تو اس کے بجائے انھیں وہ آوازیں سنوائی جائیں گی جو ان کی مذمت اور لعنت پر مشتمل ہوں گی۔

(استفسارات اول ص ۲۰۶ طبع اول)

تجہیز و تکفین کیوں؟

یہ دراصل جسم کے محفوظ رکھنے کے لیے نہیں بلکہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے نے جب اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس کی لاش کو کیا کرے۔ اس وقت ایک کوے نے جس نے اس کے سامنے دوسرے مردہ کوے کو زمین میں گڑھا کھود کر دفن کیا تھا، اس طرف متوجہ کیا کہ تو بھی اسی طرح اسے دفن کر دے۔

دراصل یہ انسانی جان کا احترام ہے۔ جو شخص کل تک باپ، بیٹا یا اسی طرح کا کوئی تعلق محبت رکھتا تھا۔ یہ قساوت قلبی کی ایک سنگین مثال ہوگی کہ اگر اسے مرتے ہی اپنے ہاتھوں جلا کر ہوا میں اس کی خاک اڑا دی جائے۔ احترام آدمیت کا یہ تقاضا ہے کہ زمین کی امانت کو جب وقت آئے تو جوں کا توں اس کا احترام اور محبت ملحوظ رکھتے ہوئے زمین کو واپس دے دیا جائے۔

(استفسارات اول ص ۲۰۷ طبع اول)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

مقابرِ صلحا پر عمارتیں اور مسجدیں تعمیر کرنا

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا۔ (الکہف ۱۸:۲۱)

مگر جو لوگ اُن کے معاملات پر غالب تھے انھوں نے کہا'' ہم تو ان پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھیرا کر مقابرِ صلحا پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی اسے انھوں نے ارتکاب شرک کے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبور صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات اس کی نہی میں موجود ہیں۔

لَعَنَ اللّٰهُ تَعَالٰى زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ [مسند احمد، ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ]

اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔

اَلَا وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَآءِ هِمْ مَسَاجِدَ، فَاِنِّيْ اَنْهٰكُمْ عَنْ ذٰلِكَ [مسلم]

خبردار رہو، تم سے پہلے لوگ اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمھیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لَعَنَ اللّٰهُ تَعَالٰى الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآءِ هِمْ مَسَاجِدَ [احمد، بخاری، مسلم، نسائی]

اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

اِنَّ اُولٰٓئِكَ اِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَّ صَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ۔ اُولٰٓئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ [احمد، بخاری، مسلم، نسائی]

ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل و حجت ٹھیرائے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۸-۱۹ الکہف حاشیہ ۲۱)

اصحابِ قبور کے ساتھ ہمارے معاملے کی نوعیت

اصحابِ قبور کے ساتھ جو معاملہ ہمیں کرنا چاہیے کیا اس کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات اور اپنے عمل سے ہمارے لیے کوئی ہدایت چھوڑی ہے یا نہیں؟ اگر ہدایت چھوڑی ہے تو کیا وہ یہی ہے کہ ہم زندوں کی طرح ان کے پاس جا کر بیٹھیں اور ان سے کہیں کہ '' آپ کو خدا کے ہاں تقرب حاصل ہے، آپ کی دعا مقبول ہے، ہمارے لیے بھی دعا فرمائیے کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ اپنی محبت کی راہ ہمارے لیے آسان فرمادے اور جس طرح کا فضل اس نے آپ پر کیا ہے کیا عجب کہ آپ کی دعا کی برکت سے ایسا ہی فضل ہم گناہ گاروں پر بھی فرمائے؟'' اور یہ کہ ان کے باقاعدہ عرس منائے جائیں۔ مقررہ اوقات میں لوگ کھنچ کھنچ کران کی خدمت میں حاضر ہوں وغیرہ وغیرہ۔

احادیث کا شاید کوئی مجموعہ ایسا نہیں ہے جس میں تفصیل کے ساتھ وہ روایات جمع نہ ہوں جو قبور اور اصحاب قبور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پر مشتمل ہیں۔ ان سب کا جائزہ لے کر کوئی صاحب ان باتوں کا ثبوت فراہم کر دیں اور اگر ان باتوں کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے تو آخر حضورؐ کی عملی اور قولی ہدایات سے تجاوز کر کے اپنے استدلالوں اور اپنی مرضی و پسند سے ان چیزوں کا اضافہ کس حق کی بنا پر کر لیا گیا ہے؟ کیا وجہ ہے کہ زیارت قبور کے متعلق اُن ہدایات پر اور اصحاب قبور کے متعلق اُس نقطہ نظر پر جو حدیث اور قرآن سے مستفاد ہے اکتفانہ کیا جائے اور کچھ مزید عقیدے اور مزید طرزِ عمل اپنی طرف سے ایجاد کیے جائیں؟ پھر جب کہ صدیوں کے علمی اور اعتقادی انحطاط کی بدولت قبور اور اصحاب قبور کے متعلق عام طور پر مسلمانوں کے اندر ایسی صریح اعتقادی اور عملی گمراہیاں پھیل چکی ہیں جو شرک کی حد تک پہنچی ہوتی ہیں اور جن کا مشاہدہ آج ہر مشہور بہ ولایت بزرگ کی قبر پر ہو رہا ہے، اُن کو دیکھتے ہوئے کیا کسی متبع احکام خدا اور رسول کا یہی کام ہے کہ ان خرابیوں کو روکنے کے بجائے وہ خود ان مقامات پر جائے جہاں یہ مشرکانہ حرکات ہو رہی ہیں اور بلا نکیر ان حرکات کو دیکھتا رہے اور خود اپنی شرکت سے لوگوں کے لیے ان حرکات کے جمع رہنے کا ایک سبب فراہم کرے۔

پھر کیا حیات شہدا و اولیاء کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ اس کے معنی بالکل ویسی ہی حیات کے ہیں جیسی ہماری آپ کی مادّی وجسمانی زندگی ہے کیا ان لوگوں کی شہادت یا وفات کے بعد ان کو دفن نہیں کیا گیا؟ کیا ان کا ورثہ تقسیم نہیں ہوا اور ان کی بیواؤں کے عقد ثانی نہیں ہوئے؟ اس پہلو پر غور کرنے سے یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حیات بعینہ اس معنی میں نہیں ہے جس میں زندہ انسانوں کی حیات ہوتی ہے۔ دراصل اس حیات سے مراد حیات برزخی ہے اور یہ حیات باختلاف مدارج انبیاء شہداء صلحاء کفار، فجار سب کے لیے ہے۔ بلاشبہ عالم برزخ میں ان کے مدارج ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ مگر بحیثیت مجموعی قرآن اور حدیث اس حیات پر ناطق ہیں۔ لیکن جو شخص قرآن اور حدیث سے اس حیات پر استدلال کرتا ہے وہ اس معاملے میں بھی قرآن وحدیث ہی سے کیوں نہیں ہدایت مانگتا کہ ان برزخی حیات رکھنے والوں کے ساتھ ہم دنیوی حیات رکھنے والوں کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اور اس تعلق کی عملی صورت کیا ہونی چاہیے؟ یہ عجیب بات ہے کہ نفس حیات پر استدلال کرنے کی حد تک تو قرآن وحدیث کی طرف رجوع کیا جاتا ہے مگر اس کے بعد کے تمام معاملات خود اپنے نفس اور اس کی خواہشات اور اپنے منطقی استدلال سے طے کیے جاتے ہیں۔ جس خدا نے اور جس رسول نے اس حیات کی خبر دی ہے اسی سے کیوں نہیں پوچھتے کہ ان لوگوں کے ساتھ ہم کیا برتاؤ کریں اور یہ ہمارے کس کام آسکتے ہیں اور کس کام نہیں آسکتے۔

(مکاتیب دوم ص ۳۶ تا ۱۳۸ اشاعت اول ۱۹۷۲ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فصل ہفتم

کفار و منافقین

کفار سے عفو و درگزر کرنے کا حکم

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ (الزخرف:۸۹)

اچھا، اے نبیؐ، ان سے درگزر کرو اور کہہ دو کہ سلام ہے تمھیں، عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔

یعنی ان کی سخت باتوں اور تضحیک و استہزاء پر نہ ان کے لیے بددعا کرو اور نہ ان کے جواب میں کوئی سخت بات کہو، بس سلام کر کے ان سے الگ ہو جاؤ۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۵۵۴، الزخرف حاشیہ ۷۱)

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (الجاثیہ ۴۵:۱۴)

اے نبیؐ ایمان لانے والوں سے کہہ دو کہ جو لوگ اللہ کی طرف سے بُرے دن آنے کا کوئی اندیشہ نہیں رکھتے، اُن کی حرکتوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ خود ایک گروہ کو اس کی کمائی کا بدلہ دے۔

مفسرین نے اس آیت کے دو مطلب بیان کیے ہیں، آیت کے الفاظ میں دونوں معنوں کی گنجائش ہے۔

ایک یہ کہ اہلِ ایمان اس ظالم گروہ کی زیادتیوں پر درگزر سے کام لیں تاکہ اللہ ان کو اپنی طرف سے ان کے صبر و حلم اور ان کی شرافت کی جزا دے اور راہِ خدا میں جو اذیتیں انھوں نے برداشت کی ہیں ان کا اجر عطا فرمائے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اس گروہ سے درگزر کریں تاکہ اللہ خود اس کی زیادتیوں کا بدلہ اسے دے۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حکم اُس وقت تک تھا جب تک مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہ دی گئی تھی۔ پھر جب اس کی اجازت آگئی تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کا یہ دعویٰ درست نہیں ہے۔ ''درگزر'' کا لفظ اس معنی میں کبھی نہیں بولا جاتا کہ جب آدمی کسی کی زیادتیوں کا بدلہ لینے پر قادر نہ ہو تو اس سے درگزر کرے، بلکہ اس موقع پر صبر، تحمل اور برداشت کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو چھوڑ کر

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جب یہاں درگزر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے تو اس سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اہلِ ایمان انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود ان لوگوں کی زیادتیوں کا جواب دینے سے پرہیز کریں جنھیں خدا سے بے خوفی نے اخلاق وآدمیت کی حدیں توڑ ڈالنے پر جری کر دیا ہے۔ اس حکم کا کوئی تعارض اُن آیات سے نہیں ہے جن میں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ جنگ کی اجازت کا تعلق اس حالت سے ہے جب مسلمانوں کی حکومت کسی کافر قوم کے خلاف باقاعدہ کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجہ پائے اور عفو ودرگزر کا حکم ان عام حالات کے لیے ہے جن میں اہلِ ایمان کو خدا سے بے خوف لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح سے سابقہ پیش آئے اور وہ انھیں اپنی زبان وقلم اور اپنے برتاؤ سے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔

حکم کا مقصود

اس حکم کا مقصود یہ ہے کہ مسلمان اپنے مقام بلند سے نیچے اتر کر ان پست اخلاق لوگوں سے الجھنے اور جھگڑنے اور ان کی ہر بیہودگی کا جواب دینے پر نہ اُتر آئیں۔ جب تک شرافت اور معقولیت کے ساتھ کسی الزام یا اعتراض کا جواب دینا یا کسی زیادتی کی مدافعت کرنا ممکن ہو، اس سے پرہیز نہ کیا جائے۔ مگر جہاں بات ان حدود سے گزرتی نظر آئے وہاں چپ سادھ لی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا جائے۔ مسلمان ان سے خود الجھیں گے تو اللہ ان سے نمٹنے کے لیے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دے گا۔ درگزر سے کام لیں گے تو اللہ خود ظالموں سے نمٹے گا اور مظلوموں کو ان کے تحمل کا اجر عطا فرمائے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۵۸۵-۵۸۶ الجاثیہ حاشیہ ۱۹)

جن پر اللہ کا غضب ہوا ان سے دوستی کی ممانعت

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ۝ (الممتحنہ ۶۰: ۱۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے، جو آخرت سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح قبروں میں پڑے ہوئے کافر مایوس ہیں۔

تخریب کاری کے لیے منتخب یا تعمیر شدہ عمارت کے افتتاح کی ممانعت

وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ (التوبہ ۹: ۱۰۷-۱۰۸)

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی اس غرض کے لیے کہ [دعوتِ حق کو] نقصان پہنچائیں، اور [خدا کی بندگی کرنے کی بجائے] کفر کریں اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالیں، اور [اس بظاہر عبادت گاہ کو] اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا مگر اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اول روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں [عبادت کے لیے] کھڑے ہو، اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔

مسجدِ ضرار کی تعمیر کی غرض وغایت [ایک ناپاک سازش]

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجد قبا جو شہر کے مضافات میں تھی، دوسری مسجد نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی ضرورت نہ تھی اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کارِ ثواب ہو قطع نظر اس سے کہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس تعمیرِ نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ (حالانکہ اس کے بالکل برعکس ابو عامر راہب) اور منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی تھی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنالیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی علیحدہ جتھہ بندی اس طرح کی جاسکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہہ نہ کیا جاسکے اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آیندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں، بلکہ ابو عامر کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھیر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے تحت وہ مسجد تیار کی گئی تھی۔

افتتاح کے لیے آنے کے بجائے مسجدِ ضرار کو مسمار کرنے کا حکم

ان پاکیزہ ارادوں کی نمایش کے ساتھ جب یہ مسجدِ ضرار بن کر تیار ہوئی تو یہ اشرار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں۔ مگر آپؐ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس آکر دیکھوں گا۔ اس کے بعد آپؐ تبوک کی طرف روانہ ہوگئے اور آپؐ کے پیچھے یہ لوگ مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتیٰ کہ انھوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ اُدھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور ادھر یہ فوراً ہی عبداللہ بن اُبی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیں۔ لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کے قریب ذِی اوان کے مقام پر پہنچے تو یہ آیات نازل ہوئیں اور آپؐ نے اسی وقت چند آدمیوں کو مدینہ کی طرف بھیج دیا تاکہ آپؐ کے شہر میں داخل ہونے سے پہلے پہلے وہ اس مسجد کو مسمار کر دیں۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۳۳-۲۳۴ التوبہ حاشیہ ۱۰۲)

مشرکین کے معبودوں کو گالیاں نہ دو

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ - (الانعام ۶:۱۰۸)

(اے ایمان لانے والو) یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شرک سے آگے بڑھ کر جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

یہ نصیحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کو کی گئی ہے کہ اپنی تبلیغ کے جوش میں وہ بھی اتنے بے قابو نہ ہو جائیں کہ مناظرے اور بحث وتکرار سے معاملہ بڑھتے بڑھتے غیر مسلموں کے عقائد پر سخت حملے کرنے اور ان کے پیشواؤں اور معبودوں کو گالیاں دینے تک نوبت پہنچ جائے، کیونکہ یہ چیز ان کو حق سے قریب لانے کے بجائے اور زیادہ دور پھینک دے گی۔

(تفہیم القرآن ج ۱ ص ۵۷۱ الانعام حاشیہ ۷۲)

کیا مسلمانوں کو امتیازی حقوق دینا غیر مسلموں پر اکراہ ہے؟

سوال: اکراہ کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ لفظ قہر (Coercion) سے زیادہ وسیع نہیں ہے؟ اگر موجودہ زمانے کی ایک ریاست میں مسلمانوں کو ٹیکس میں رعایات ملیں یا شہریت کے زیادہ فوائد حاصل ہوں تو کیا یہ بھی غیر مسلموں کے حق میں اکراہ نہ ہوگا؟ یقیناً ایک ایسا تاجر جو تھوڑے منافع پر کام کر رہا ہو، اپنی روزی محفوظ رکھنے کے لیے ایسے حالات میں اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو سکتا ہے؟

جواب: مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹیکس عاید کرنے کے معاملے میں کوئی امتیاز اسلامی قانون کے اندر نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی اسلامی دور میں عملاً غیر مسلم تاجروں سے مسلمان تاجروں کی بہ نسبت زیادہ تجارتی محصول لیا جاتا تھا۔ مگر دراصل وہ کسی مستقل شرعی حکم کی بنا پر نہ تھا اور نہ اس سے مقصود غیر مسلم تاجروں کو اسلام لانے پر مجبور یا آمادہ کرنا تھا، بلکہ وہ ایک وقتی تدبیر تھی جو مسلمانوں کو تجارت کی طرف مائل کرنے کے لیے اختیار کی گئی تھی، کیونکہ اس وقت مسلمان اکثر وبیشتر فوجی اور سول خدمات میں لگ گئے تھے اور نو مفتوح ممالک کی پوری پوری معاشی زندگی [تجارت، صنعت وحرفت، زراعت وغیرہ] بالکل غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس پر اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ اس ترجیح کے نتیجے میں قلیل منافع پر کام کرنے والا تاجر (Marginal Businessman) اپنی روزی برقرار رکھنے کے لیے مسلمان ہونے پر مجبور ہو سکتا تھا، تو میں کہوں گا کہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

آپ کا یہ قیاس صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان ہوتے ہی اس پر زکوٰۃ عائد ہو جاتی جس کا بار جزیے اور محصول تجارت کے مجموعے سے زیادہ تھا۔ زکوٰۃ اس کے تمام تجارتی سرمائے اور گھر کے زیورات اور جمع شدہ رقم پر ڈھائی فی صدی سالانہ کے حساب سے لگتی۔ بخلاف اس کے بڑے سے بڑے مال دار غیر مسلم کو بھی ۴۸ درہم [تقریباً ۳ ڈالر] سالانہ سے زیادہ جزیہ نہ دینا پڑتا تھا اور محصول تجارت میں اس کو مسلمان کی بہ نسبت حد سے حد صرف ۵۰ فی صد زیادہ دینا ہوتا تھا۔

(رسائل و مسائل حصہ سوم ص ۲۵-۲۶ اشاعت دوم جون ۱۹۶۷ء)

آیت لا اکراہ فی الدین اور قادیانیوں کا معاملہ

سوال: قرآن کہتا ہے کہ ''دین میں کوئی جبر نہیں ہے'' (البقرہ ۲:۲۵۶) کیا پاکستان میں قادیانیوں کے خلاف ہنگامے اس آیت کے خلاف نہ تھے؟ اگر نہ تھے تو کیوں؟

جواب: پاکستان میں قادیانیوں کے معاملے پر آپ کا سوال سخت غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کسی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ قادیانیوں کو ملک سے نکال دیا جائے، یا مٹا دیا جائے، یا زبردستی قادیانیت چھوڑنے پر مجبور کیا جائے، یا حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ مطالبہ صرف یہ تھا اور ہے کہ جب وہ بنیادی عقیدے اور مذہبی اعمال اور معاشرتی نظام میں مسلمانوں سے خود الگ ہو چکے ہیں تو اس علیحدگی کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے اور انھیں بغیر کسی معقول وجہ کے مسلم سوسائٹی کا ایک حصہ نہ قرار دیا جائے۔ آپ خود غور کیجیے کہ یہ مطالبہ آخر کس منطق کی رو سے قرآن مجید کی زیر بحث آیت کے خلاف پڑتا ہے؟ کیا دین میں جبر نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس گروہ کو تمام مسلمان دین سے خارج سمجھتے ہیں اور خود بھی تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان سے عملاً الگ ہو چکا ہے، اسے دین میں داخل کرنے پر مسلمانوں کو مجبور کرنا چاہیے؟ رہے وہ فسادات جو مارچ ۵۳ء میں ہوئے تھے، تو یہ بات بالکل خلاف واقعہ ہے کہ وہ قادیانیوں کے خلاف تھے۔ ان کو قادیانیوں کے خلاف ہنگاموں (Anti Qadiani Disturbance) کا نام بالکل غلط دیا گیا ہے، جن سے ناواقف حال لوگوں کو خواہ مخواہ یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ یہاں کے عام مسلمان شاید قادیانیوں کو قتل و غارت کرنے پر تل گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ فسادات حکومت اور عوام کے درمیان اس کشمکش کی وجہ سے برپا ہوئے تھے کہ ایک طرف عوام قادیانیوں کے بارے میں مذکورۂ بالا مطالبہ تسلیم کرانے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالنا چاہتے تھے اور دوسری طرف حکومت ان کے اس ایجی ٹیشن کو طاقت سے دبا دینا چاہتی تھی۔ پس تصادم دراصل حکومت اور عوام کے درمیان ہوا تھا نہ کہ قادیانیوں اور عوام کے درمیان۔ قادیانیوں کی جان و مال پر عوام نے صرف اس وقت حملہ کیا جب انھیں یقین ہو گیا [اور اس یقین کے لیے اچھے خاصے وزنی وجوہ تھے] کہ فسادات کے دوران میں پولیس اور فوج کی وردیاں پہن کر بعض قادیانی مسلمانوں کو قتل کرتے پھر رہے تھے۔ (ملاحظہ ہو تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ ص ۱۵۶)

(رسائل و مسائل سوم ص: ۲۳ تا ۲۵ اشاعت دوم ۱۹۶۷ء)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

فریب دنیا میں مبتلا لوگوں کو نظر انداز کرنے کا حکم

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ ڰ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ۝ (الانعام ۶:۷۰)

چھوڑو ان لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جنھیں دنیا کی زندگی فریب میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ ہاں مگر یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے، اور گرفتار بھی اس حال میں ہو کہ اللہ سے بچانے والا کوئی حامی و مددگار اور کوئی سفارشی اس کے لیے نہ ہو اور اگر وہ ہر ممکن چیز فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہے تو وہ بھی اس سے قبول نہ کی جائے گی، کیونکہ ایسے لوگ تو خود اپنی کمائی کے نتیجے میں پکڑے جائیں گے، ان کو تو اپنے انکارِ حق کے معاوضے میں کھولتا ہوا پانی پینے کو اور دردناک عذاب بھگتنے کو ملے گا۔

کفار کو اللہ کے دین کا مذاق اڑاتے نہ سنو

الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِھَا وَيُسْتَهْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰي يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ ۭ (النساء ۴:۱۳۹-۱۴۰)

اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ مژدہ سنا دو کہ اُن کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انھی کی طرح ہو۔

''عزت'' کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اردو میں عزت اور محض احترام اور قدر و منزلت کے معنی میں آتا ہے۔ مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ ''عزت ناقابل ہتک حرمت'' کا ہم معنی ہے۔

اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی ان صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہوئے سنتا ہے، تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

(تفہیم القرآن النسآء حاشیہ ۱۷۰)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو رفیق نہ بنانے کا حکم

يَآيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِينَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○ (النساء ۴: ۱۴۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟

منافقین کے ساتھ طرزِ عمل

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ○ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ○ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ○ (النساء ۴: ۸۹ تا ۹۱)

وہ تو چاہتے ہیں کہ جس طرح وہ خود کافر ہیں اسی طرح تم بھی کافر ہو جاؤ تا کہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کر کے نہ آ جائیں اور اگر وہ ہجرت سے باز رہیں تو جہاں پاؤ انھیں پکڑو اور قتل کرو اور ان میں سے کسی کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ البتہ وہ منافق اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسی قوم سے جاملیں جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔ اس طرح وہ منافق بھی مستثنیٰ ہیں جو تمھارے پاس آتے ہیں اور لڑائی سے دل برداشتہ ہیں، نہ تم سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے۔ اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ بھی تم سے لڑتے۔ لہٰذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمھاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمھارے لیے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔ ایک اور قسم کے منافق تمھیں ایسے ملیں گے جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب کبھی فتنہ کا موقع پائیں گے اس میں کود پڑیں گے۔ ایسے لوگ اگر تمھارے مقابلہ سے باز نہ رہیں اور صلح و سلامتی تمھارے آگے پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو جہاں وہ ملیں انھیں پکڑو اور مارو، اور ان پر ہاتھ اٹھانے کے لیے ہم نے تمھیں کھلی حجت دے دی ہے۔

یہ حکم اُن منافق مسلمانوں کا ہے جو برسرِ جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ کارروائیوں میں عملاً حصہ لیں۔

یہ استثنا اس حکم سے نہیں ہے کہ ''انھیں دوست اور مددگار نہ بنایا جائے''، بلکہ اس حکم سے ہے کہ ''انھیں پکڑا اور مارا جائے۔'' مطلب یہ ہے کہ اگر واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے حدود میں جا پناہ لیں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو چکا ہو، تو اس کے علاقے میں ان کا تعاقب نہیں کیا جائے گا اور نہ یہی جائز ہو گا کہ دارالاسلام کا کوئی مسلمان غیر جانبدار ملک میں کسی واجب القتل منافق کو پائے اور اسے مار ڈالے۔ احترام دراصل منافق کے خون کا نہیں بلکہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

معاہدے کا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۱ص ۳۸۱-۳۸۲ النسآء حواشی ۱۱۸-۱۱۹)

جھوٹے مدعی ایمان کا معاملہ

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۔ (التوبہ ۹:۱۰۵)

اور اے نبیؐ، ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمھارا طرزِ عمل اب کیا رہتا ہے۔

جو شخص ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر فی الواقع خدا اور اس کے دین اور جماعت مومنین کے ساتھ کوئی خلوص نہیں رکھتا اس کے عدم اخلاص کا ثبوت اگر اس کے طرزِ عمل سے مل جائے تو اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جائے گا۔ خدا کی راہ میں صرف کرنے کے لیے وہ کوئی مال پیش کرے تو اسے رد کر دیا جائے گا، مر جائے تو نہ مسلمان اس کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور نہ کوئی مومن اس کے لیے دعائے مغفرت کرے گا چاہے وہ اس کا باپ یا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ بخلاف اس کے جو شخص مومن ہو اور اس سے کوئی غیر مخلصانہ طرزِ عمل سرزد ہو جائے وہ اگر اپنے قصور کا اعتراف کر لے تو اس کو معاف بھی کیا جائے گا۔ اس کے صدقات بھی قبول کیے جائیں گے اور اس کے لیے دعائے رحمت بھی کی جائے گی۔ اب رہی یہ بات کہ کسی شخص کو غیر مخلصانہ طرزِ عمل کے صدور کے باوجود منافق کے بجائے محض گناہ گار مومن سمجھا جائے گا، تو یہ تین معیاروں سے پرکھی جائے گی۔

وہ اپنے قصور کے لیے عذرات لنگ اور تاویلات وتوجیہات پیش نہیں کرے گا بلکہ جو قصور ہوا ہے اسے سیدھی طرح صاف صاف مان لے گا۔

اس کے سابق طرزِ عمل پر نگاہ ڈال کر دیکھا جائے گا کہ یہ عدم اخلاص کا عادی مجرم تو نہیں ہے۔ اگر پہلے وہ جماعت کا ایک صالح فرد رہا ہے اور اس کے کارنامۂ زندگی میں مخلصانہ خدمات، ایثار وقربانی اور سبقت الی الخیرات کا ریکارڈ موجود ہو تو باور کر لیا جائے گا کہ اس وقت جو قصور اس سے سرزد ہوا ہے وہ ایمان واخلاص کے عدم کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض ایک کمزوری ہے جو وقتی طور پر رونما ہو گئی ہے۔

اس کے آئندہ طرزِ عمل پر نگاہ رکھی جائے گی کہ آیا اس کا اعترافِ قصور محض زبانی ہے یا فی الواقع اس کے اندر کوئی گہرا احساسِ ندامت موجود ہے۔ اگر وہ اپنے قصور کی تلافی کے لیے بے تاب نظر آئے اور اس کی بات بات سے ظاہر ہو کہ جس نقص ایمانی کا نقش اس کی زندگانی میں ابھر آیا تھا اسے مٹانے اور اس کا تدارک کرنے کی وہ سخت کوشش کر رہا ہے تو سمجھا جائے گا کہ وہ حقیقت میں نادم ہے اور یہ ندامت ہی اس کے ایمان واخلاص کی دلیل ہو گی۔

محدثین نے ان آیات کی شانِ نزول میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ مضمون آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ وہ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کہتے ہیں کہ یہ آیات (۱۰۲ تا ۱۰۴) ابولبابہ بن عبدالمنذر اور ان کے چھ ساتھیوں کے معاملہ میں نازل ہوئی تھیں۔ ابولبابہ ان لوگوں میں سے تھے جو بیعتِ عقبہ کے موقع پر ہجرت سے پہلے اسلام لائے تھے۔ پھر جنگِ بدر، جنگِ احد اور دوسرے معرکوں میں برابر شریک رہے۔ مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر نفس کی کمزوری نے غلبہ کیا اور یہ کسی عذر شرعی کے بغیر بیٹھے رہ گئے۔ ایسے ہی مخلص ان کے دوسرے ساتھی بھی تھے اور ان سے بھی یہ کمزوری سرزد ہوگئی۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے اور ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ اور رسول کی کیا رائے ہے تو انھیں سخت ندامت ہوئی۔ قبل اس کے کہ کوئی باز پرس ہوتی انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا کہ ہم پر خواب وخور حرام ہے جب تک ہم معاف نہ کر دیے جائیں، یا پھر ہم مر جائیں۔ چنانچہ کئی روز وہ اسی طرح بے آب ودانہ اور بے خواب بندھے رہے حتیٰ کہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ آخر کار جب انھیں بتایا گیا کہ اللہ اور رسول نے تمھیں معاف کر دیا تو انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہماری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی آسائش نے ہمیں فرض سے غافل کیا اسے اور اپنے تمام مال کو خدا کی راہ میں دے دیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں، صرف ایک تہائی کافی ہے۔ چنانچہ وہ انھوں نے اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔ اس قصے پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے ہاں معافی کس قسم کی کمزوریوں کے لیے ہے۔ یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا پچھلا کارنامۂ زندگی ان کے اخلاصِ ایمانی پر دلیل تھا۔ ان میں سے کسی نے عذرات نہیں تراشے بلکہ اپنے قصور کو خود ہی قصور مان لیا۔ انھوں نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نہایت نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔

اس سلسلے میں ایک اور مفید نکتے پر بھی نگاہ رہنی چاہیے جو ان آیات میں ارشاد ہوا ہے۔ وہ یہ کہ گناہوں کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے اور عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہوا تھا، دور ہو جاتی ہے اور خیر کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کر لے۔ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت بری جائے قرار سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔ پھر اس کا صدقہ وخیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔

www.kitabosunnat.com

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۲۹ تا ۲۳۱ التوبہ حاشیہ ۹۹)

نام کے مسلمانوں کو تنبیہ

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ○ (الحدید ۵۷ :۱۶)

کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدت ان پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں۔

یہاں پھر "ایمان لانے والوں" کے الفاظ تو عام ہیں مگر ان سے مراد تمام مسلمان نہیں بلکہ مسلمانوں کا وہ خاص گروہ ہے جو ایمان کا اقرار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں شامل ہو گیا تھا اور اس کے باوجود اسلام کے درد سے اس کا دل خالی تھا۔ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کفر کی تمام طاقتیں اسلام کو مٹا دینے پر تلی ہوئی ہیں، چاروں طرف سے اُنھوں نے اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت پر نرغہ کر رکھا ہے، عرب کی سرزمین میں جگہ جگہ مسلمان تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے ہیں، ملک کے گوشے گوشے سے مظلوم مسلمان سخت بے سروسامانی کی حالت میں پناہ لینے کے لیے مدینے کی طرف بھاگے چلے آ رہے ہیں، مخلص مسلمانوں کی کمر ان مظلوموں کو سہارا دیتے دیتے ٹوٹی جا رہی ہے، اور دشمنوں کے مقابلے میں بھی یہی مخلص مومن سر بکف ہیں، مگر یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ایمان کا دعویٰ کرنے والا یہ گروہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر اُن لوگوں کو شرم دلائی جا رہی ہے کہ تم کیسے ایمان لانے والے ہو؟ اسلام کے لیے حالات نزاکت کی اس حد کو پہنچ چکے ہیں، کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ کا ذکر سن کر تمھارے دل پگھلیں اور اس کے دین کے لیے تمھارے دلوں میں ایثار و قربانی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو؟ کیا ایمان لانے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اللہ کے دین پر بُرا وقت آئے اور وہ اس کی ذرا سی ٹیس بھی اپنے دل میں محسوس نہ کریں؟ اللہ کے نام پر انھیں پکارا جائے اور وہ اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں؟ اللہ اپنی نازل کردہ کتاب میں خود چندے کی اپیل کرے اور اسے اپنے ذمے قرض قرار دے اور صاف صاف یہ بھی سنا دے کہ ان حالات میں جو اپنے مال کو میرے دین سے عزیز تر رکھے گا وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہو گا، اس پر بھی ان کے دل نہ خدا کے خوف سے کانپیں، نہ اس کے حکم کے آگے جھکیں؟

یہود و نصاریٰ تو اپنے انبیا کے سینکڑوں برس بعد آج تمھیں اس بے حسی اور رُوح کی مُردنی اور اخلاق کی پستی میں مبتلا نظر آ رہے ہیں۔ کیا تم اتنے گئے گزرے ہو کہ ابھی رسول تمھارے سامنے موجود ہے، خدا کی کتاب نازل ہو رہی ہے، تمھیں ایمان لائے کچھ زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا ہے اور ابھی سے تمھارا حال وہ ہو رہا ہے جو صدیوں تک خدا کے دین اور اس کی آیات سے کھیلتے رہنے کے بعد یہود و نصاریٰ کا ہوا ہے؟

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۳۱۳-۳۱۴ الحدید حواشی ۲۸-۲۹)

قول اور عمل میں مطابقت کا حکم [منافقت سے اجتناب کا حکم]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ○ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ○ (الصف ۶۱ :۲-۳)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔

اس ارشاد کا ایک مدعا تو عام ہے جو اس کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے اور ایک مدعا خاص ہے جو بعد والی آیت کو اس کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ پہلا مدعا یہ ہے کہ ایک سچے مسلمان کے قول اور عمل میں مطابقت ہونی چاہیے۔ جو کچھ کہے اسے کر کے دکھائے اور کرنے کی نیت یا ہمت نہ ہو تو زبان سے بھی نہ نکالے۔ کہنا کچھ اور کرنا کچھ، یہ انسان کی ان بدترین صفات میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہایت مبغوض ہیں، کجا کہ ایک ایسا شخص اس اخلاقی عیب میں مبتلا ہو جو اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تصریح فرمائی ہے کہ کسی شخص میں اس صفت کا پایا جانا اُن علامات سے ہے جو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

منافق کی نشانیاں

ایۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ [زَادَ مُسْلِمٌ وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُسْلِمٌ] اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ (بخاری و مسلم)

منافق کی تین نشانیاں ہیں اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزہ رکھتا ہو اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔ یہ کہ جب بولے تو جھوٹ بولے اور جب وعدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے اور جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کر گزرے۔

ایک اور حدیث میں آپ کا ارشاد ہے:

اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا، اِذَا اُؤْتُمِنَ خَانَ، وَاِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (بخاری و مسلم)

چار صفتیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے، اور جس میں کوئی ایک صفت ان میں سے پائی جائے اس کے اندر نفاق کی ایک خصلت ہے جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے۔ یہ کہ جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بولے تو جھوٹ بولے، اور جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کر جائے، اور جب لڑے تو اخلاق و دیانت کی حدیں توڑ ڈالے۔

فقہائے اسلام کا اس بات پر قریب قریب اتفاق ہے کہ کوئی شخص اگر اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد کرے [مثلاً کسی چیز کی نذر مانے]، یا بندوں سے کوئی معاہدہ کرے، یا کسی سے کوئی وعدہ کرے، تو اسے وفا کرنا لازم ہے، الا یہ کہ وہ کام بجائے خود گناہ ہو جس کا اس نے عہد یا وعدہ کیا ہو۔ اور گناہ ہونے کی صورت میں وہ فعل تو نہیں کرنا چاہیے جس کا عہد یا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اس کی پابندی سے آزاد ہونے کے لیے کفارۂ یمین ادا کرنا چاہیے جو سورۂ مائدہ آیت ۸۹ میں بیان کیا گیا ہے۔

[احکام القرآن للجصّاص وابنِ عربی]

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ تو ہے ان آیات کا عام مدعا رہا وہ خاص مدعا جس کے لیے اس موقع پر یہ آیات ارشاد فرمائی گئی ہیں تو وہ بعد والی آیت کو ان کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ مقصود ان لوگوں کو ملامت کرنا ہے جو اسلام کے لیے سرفروشی و جانبازی کے لمبے چوڑے وعدے کرتے تھے، مگر جب آزمائش کا وقت آتا تھا تو بھاگ نکلتے تھے۔ ضعیف الایمان لوگوں کی اس کمزوری پر قرآن مجید میں کئی جگہ گرفت کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ نساء آیت ۷۷ میں فرمایا ''تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟ اب جو انھیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ لوگوں سے ایسا ڈر رہے ہیں جیسا خدا سے ڈرنا چاہیے، یا اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔ کہتے ہیں خدایا، یہ ہم پر لڑائی کا حکم کیوں لکھ دیا؟ کیوں نہ ہمیں ابھی کچھ اور مہلت دی۔'' اور سورۂ محمد آیت ۲۰ میں فرمایا ''جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل کی جاتی [جس میں جنگ کا حکم دیا جائے] مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی جس میں جنگ کا ذکر تھا تو تم نے دیکھا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمھاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت چھا گئی ہو۔'' جنگِ اُحد کے موقع پر یہ کمزوریاں خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آئیں جن کی طرف سورۂ آل عمران میں تیرھویں رکوع سے سترھویں رکوع تک مسلسل اشارات کیے گئے ہیں۔

مفسرین نے ان آیات کی شانِ نزول میں ان کمزوریوں کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں جن پر یہاں گرفت کی گئی ہے۔ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ جہاد فرض ہونے سے پہلے مسلمانوں میں کچھ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ کاش ہمیں وہ عمل معلوم ہو جائے جو اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے تو ہم وہی کریں۔ مگر جب بتایا گیا کہ وہ عمل ہے جہاد، تو ان پر اپنی اس بات کو پورا کرنا بہت شاق ہو گیا۔ مُقاتِل بن حَیّانؒ کہتے ہیں کہ احد کی جنگ میں ان لوگوں کو آزمائش سے سابقہ پیش آیا اور یہ حضورؐ کو چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ ابنِ زید کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یقین دلاتے تھے کہ آپؐ کو دشمنوں کے مقابلے کے لیے نکلنا پڑا تو ہم آپؐ کے ساتھ نکلیں گے۔ مگر جب وقت آیا تو ان کے وعدے جھوٹے نکلے۔ قتادہ اور ضحاک کہتے ہیں کہ بعض لوگ جنگ میں شریک ہوتے بھی تھے تو کوئی کارنامہ انجام نہ دیتے تھے مگر آ کر یہ ڈینگیں مارتے تھے کہ ہم یوں لڑے اور ہم نے یوں مارا۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ملامت کی ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۴۵۴ تا ۴۵۶ الصف حاشیہ ۲)

کس صورت میں منافقت پر حکمِ کفر لگایا جا سکتا ہے؟

سَیُصِیۡبُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ۔ (التوبہ ۹:۹۰)

ان بدویوں میں سے جن جن لوگوں نے کفر کا طریقہ اختیار کیا ہے عنقریب وہ دردناک سزا سے دوچار ہوں گے۔

منافقانہ اظہارِ ایمان، جس کی تہ میں فی الواقع تصدیق، تسلیم، اخلاص اور اطاعت نہ ہو اور جس کے ظاہری اقرار کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

باوجود انسان خدا اور اس کے دین کی بہ نسبت اپنے مفاد اور اپنی دنیوی دلچسپیوں کو عزیز تر رکھتا ہو، اصل حقیقت کے اعتبار سے کفر و انکار ہی ہے۔ خدا کے ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو منکروں اور باغیوں کے ساتھ ہوگا، چاہے دنیا میں اس قسم کے لوگ کافر نہ ٹھیرائے جاسکتے ہوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ ہوتا رہے۔ اس دنیوی زندگی میں جس قانون پر مسلم سوسائٹی کا نظام قائم کیا گیا ہے اور جس ضابطے کی بنا پر اسلامی حکومت اور اس کے قاضی احکام کی تنفیذ کرتے ہیں، اس کے لحاظ سے تو منافقت پر کفر یا اشتباہ کفر کا حکم صرف انھی صورتوں میں لگایا جاسکتا ہے جبکہ انکار و بغاوت یا غداری و بے وفائی کا اظہار صریح طور پر ہو جائے۔ اس لیے منافقت کی بہت سی صورتیں اور حالتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو قضائے شرعی میں کفر کے حکم سے بچ جاتی ہیں۔ لیکن قضائے شرعی میں کسی منافق کا حکم کفر سے بچ نکلنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ قضائے خداوندی میں بھی وہ اس حکم اور اس کی سزا سے بچ نکلے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۲۲-۲۲۳ التوبہ حاشیہ ۹۱)

مسلم سوسائٹی میں منافقین کے ساتھ برتاؤ کس طرح کیا جائے

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ (التوبہ ۹: ۷۳)

اے نبی! کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

اس وقت تک منافقین کے ساتھ زیادہ تر درگزر کا معاملہ ہو رہا تھا اور اس کے دو وجوہ تھے، ایک یہ کہ مسلمانوں کی طاقت ابھی اتنی مضبوط نہ ہوئی تھی کہ باہر کے دشمنوں سے لڑنے کے ساتھ گھر کے دشمنوں سے بھی لڑائی مول لے لیتے۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کو ایمان و یقین حاصل کرنے کے لیے کافی موقع دینا مقصود تھا۔ یہ دونوں وجوہ اب باقی نہیں رہے تھے۔ مسلمانوں کی طاقت اب تمام عرب کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی اور عرب سے باہر کی طاقتوں سے کشمکش کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا اس لیے ان آستین کے سانپوں کا سر کچلنا اب ممکن بھی تھا اور ضروری بھی ہوگیا تھا، تاکہ یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے ملک میں کوئی اندرونی خطرہ نہ کھڑا کر سکیں۔ پھر ان لوگوں کو پورے ۹ سال تک سوچنے، سمجھنے اور دین حق کو پرکھنے کا موقع بھی دیا جا چکا تھا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے اگر ان میں واقعی خیر کی کوئی طلب ہوتی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس لیے حکم ہوا کہ کفار کے ساتھ ساتھ ان منافقین کے خلاف بھی جہاد شروع کر دیا جائے اور جو نرم رویہ اب تک ان کے معاملے میں اختیار کیا جاتا رہا ہے، اسے ختم کر کے اب ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے۔

منافقین کے خلاف جہاد اور سخت برتاؤ سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان سے جنگ کی جائے۔ دراصل اس سے مراد یہ ہے کہ ان کی منافقانہ روش سے چشم پوشی اب تک برتی گئی ہے، جس کی وجہ سے یہ مسلمانوں میں ملے جلے رہے اور عام مسلمان ان کو اپنی

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہی سوسائٹی کا ایک جز سمجھتے رہے، اور ان کو جماعت کے معاملات میں دخل دینے اور سوسائٹی میں اپنے نفاق کا زہر پھیلانے کا موقع ملتا رہا، اس کو آئندہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

اب جو شخص بھی مسلمانوں میں شامل رہ کر منافقانہ روش اختیار کرے اور جس کے طرزِ عمل سے بھی یہ ظاہر ہو کہ وہ خدا اور رسول اور اہلِ ایمان کا مخلص رفیق نہیں ہے، اسے کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے، علانیہ اس کو ملامت کی جائے، سوسائٹی میں اس کے لیے عزت و اعتبار کا کوئی مقام باقی نہ رہنے دیا جائے، معاشرت میں اس سے قطع تعلق ہو، جماعتی مشوروں سے وہ الگ رکھا جائے، عدالتوں میں اس کی شہادت غیر معتبر ہو، عہدوں اور مناصب کا دروازہ اس کے لیے بند رہے، محفلوں میں اسے کوئی منہ نہ لگائے، ہر مسلمان اس سے ایسا برتاؤ کرے جس سے اس کو خود معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں کہیں بھی اس کا کوئی وقار نہیں اور کسی دل میں بھی اس کے لیے احترام کا کوئی گوشہ نہیں۔ پھر اگر اُن میں سے کوئی شخص کسی صریح غداری کا مرتکب ہو تو اس کے جرم پر پردہ نہ ڈالا جائے، نہ اسے معاف کیا جائے، بلکہ علی رؤس الاشہاد اس پر مقدمہ چلایا جائے اور اسے قرار واقعی سزا دی جائے۔

یہ ایک نہایت اہم ہدایت تھی جو اس مرحلے پر مسلمانوں کو دی جانی ضروری تھی۔ اس کے بغیر اسلامی سوسائٹی کو تنزل و انحطاط کے اندرونی اسباب سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کوئی جماعت جو اپنے اندر منافقوں اور غداروں کو پرورش کرتی ہو اور جس میں گھریلو سانپ عزت اور تحفظ کے ساتھ آستینوں میں بٹھائے جاتے ہوں، اخلاقی زوال اور بالآخر کامل تباہی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نفاق کا حال طاعون کا سا ہے اور منافق وہ چوہا ہے جو اس وبا کے جراثیم لیے پھرتا ہے۔ اس کو آبادی میں آزادی کے ساتھ چلنے پھرنے کا موقع دینا گویا پوری آبادی کو موت کے خطرے میں ڈالنا ہے۔ ایک منافق کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں عزت و احترام کا مرتبہ حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں آدمی غداری و منافقت پر دلیر ہو جائیں اور یہ خیال عام ہو جائے کہ اس سوسائٹی میں عزت پانے کے لیے اخلاص، خیر خواہی اور صداقت ایمانی کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ جھوٹے اظہارِ ایمان کے ساتھ خیانت اور بے وفائی کا رویہ اختیار کر کے بھی یہاں آدمی پھل پھول سکتا ہے۔ یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مختصر سے حکیمانہ فقرے میں بیان فرمایا ہے کہ مَنْ وَقَّرَ صَاحِبَ بِدْعَةٍ فَقَدْ اَعَانَ عَلٰى هَدْمِ الْاِسْلَامِ "جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی تعظیم و توقیر کی وہ دراصل اسلام کی عمارت ڈھانے میں مددگار رہا۔"

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۲۱۵-۲۱۶ التوبہ حاشیہ ۸۲)

جاہلیت کی پکار چھوڑنے کا حکم

مَا بَالُ دَعْوَى الْجَاهِلِيَّةِ؟ مَالَكُمْ وَلِدَعْوَةِ الْجَاهِلِيَّةِ؟ دَعُوْهَا فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ۔

یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں، اور یہ جاہلیت کی پکار کہاں؟ اسے چھوڑ دو، یہ بڑی گندی چیز ہے۔

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہ ایک بڑی اہم بات ہے جو اس موقع پر حضورؐ نے ارشاد فرمائی۔ اسلام کی صحیح روح کو سمجھنے کے لیے اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ دو آدمی اگر اپنے جھگڑے میں لوگوں کو مدد کے لیے پکارنا چاہیں تو وہ کہیں، مسلمانوں، آؤ اور ہماری مدد کرو، یا یہ کہ لوگوں ہماری مدد کے لیے آؤ۔ لیکن اگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے قبیلے، یا برادری یا نسل و رنگ، یا علاقے کے نام پر لوگوں کو پکارتا ہے تو یہ جاہلیت کی پکار ہے، اور اس پکار پر لبیک کہہ کر آنے والے اگر یہ نہیں دیکھتے کہ ظالم کون ہے اور مظلوم کون، اور حق و انصاف کی بنا پر مظلوم کی حمایت کرنے کے بجائے اپنے اپنے گروہ کے آدمی کی حمایت میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جاتے ہیں تو یہ جاہلیت کا فعل ہے جس سے دنیا میں فساد برپا ہوتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گندی اور گھناؤنی چیز قرار دیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ تمھارا اس جاہلیت کی پکار سے کیا واسطہ؟ تم اسلام کی بنیاد پر ایک ملت بنے تھے، اب یہ انصار اور مہاجر کے نام پر تمھیں کیسے پکارا جا رہا ہے، اور اس پکار پر تم کہاں دوڑے جا رہے ہو؟ علامہ سہیلی نے روض الانف میں لکھا ہے کہ فقہائے اسلام نے کسی جھگڑے یا اختلاف میں جاہلیت کی پکار بلند کرنے کو ایک فوجداری جرم قرار دیا ہے۔ ایک گروہ اس کی سزا پچاس ضرب تازیانہ قرار دیتا ہے۔ دوسرا گروہ دس ضرب تجویز کرتا ہے اور تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کی سزا حالات کی مناسبت سے دی جانی چاہیے۔ بعض حالات میں صرف زجر و توبیخ کافی ہے، بعض دوسرے حالات میں ایسی پکار بلند کرنے والے کو قید کرنا چاہیے اور اگر یہ زیادہ شر انگیز ہو تو اس کے مرتکب کو سزائے تازیانہ دینی چاہیے۔

(تفہیم القرآن ج ۵ ص ۵۱۲ المنافقون ذیلی حاشیہ ۱)

اسلامی معاشرے اور ریاست میں بگاڑ و فساد برپا کرنے والوں کے لیے حکم

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلًاۚۛ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚۛ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ۝ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب ۳۳: ۶۰ تا ۶۲)

اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں خرابی ہے، اور وہ جو مدینہ میں ہیجان انگیز افواہیں پھیلانے والے ہیں، اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو ہم ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے تمھیں اٹھا کھڑا کریں گے، پھر وہ اس شہر میں مشکل ہی سے تمھارے ساتھ رہ سکیں گے۔ ان پر ہر طرف سے لعنت کی بوچھاڑ ہوگی، جہاں کہیں پائے جائیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح مارے جائیں گے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو ایسے لوگوں کے معاملے میں پہلے سے چلی آ رہی ہے، اور تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

یعنی یہ اللہ کی شریعت کا ایک مستقل ضابطہ ہے کہ ایک اسلامی معاشرے اور ریاست میں اس طرح کے مفسدین کو کبھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ جب بھی کسی معاشرے اور ریاست کا نظام خدائی شریعت پر قائم ہوگا اس میں ایسے لوگوں کو پہلے متنبہ کر دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی روش بدل دیں، اور پھر جب وہ باز نہ آئیں گے تو سختی کے ساتھ ان کا استیصال کر ڈالا جائے گا۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۲۳ الاحزاب حاشیہ ۱۱۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

جان بچانے کے لیے مجبوراً محض زبان سے کلمۂ کفر کہنا

مَنۡ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ اِيۡمَانِهٖۤ اِلَّا مَنۡ اُكۡرِهَ وَقَلۡبُهٗ مُطۡمَـئِنٌّۢ بِالۡاِيۡمَانِ وَلٰـكِنۡ مَّنۡ شَرَحَ بِالۡكُفۡرِ صَدۡرًا فَعَلَيۡهِمۡ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ‌ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ‏ ○ (النحل ۱۶:۱۰۶)

جو شخص ایمان لانے کے بعد کفر کرے [وہ اگر] مجبور کیا گیا ہو اور دل اس کا ایمان پر مطمئن ہو [تب تو خیر] مگر جس نے دل کی رضا مندی سے کفر کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا غضب اور ایسے سب لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے معاملے سے بحث کی گئی ہے جن پر اُس وقت سخت مظالم توڑے جا رہے تھے اور نا قابلِ برداشت اذیتیں دے دے کر کفر پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ان کو بتایا گیا ہے کہ اگر تم کسی وقت ظلم سے مجبور ہو کر محض جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر زبان سے ادا کر دو، اور دل تمھارا عقیدۂ کفر سے محفوظ ہو، تو معاف کر دیا جائے گا، لیکن اگر دل سے تم نے کفر قبول کر لیا تو دنیا میں چاہے جان بچا لو، خدا کے عذاب سے نہ بچ سکو گے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر کہہ دینا چاہیے بلکہ یہ صرف رخصت ہے۔ اگر ایمان دل میں رکھتے ہوئے آدمی مجبوراً ایسا کہہ دے تو مواخذہ نہ ہوگا۔ ورنہ مقامِ عزیمت یہی ہے کہ خواہ آدمی کا جسم تکا بوٹی کر ڈالا جائے بہر حال وہ کلمۂ حق ہی کا اعلان کرتا رہے۔ دونوں قسم کی نظیریں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں پائی جاتی ہیں۔ ایک طرف حبابؓ بن ارتؓ ہیں جن کو آگ کے انگاروں پر لٹایا گیا یہاں تک کہ ان کی چربی پگھلنے سے آگ بجھ گئی، مگر وہ سختی کے ساتھ اپنے ایمان پر جمے رہے۔ بلال حبشی ہیں جن کو لوہے کی زرہ پہنا کر چلچلاتی دھوپ میں کھڑا کر دیا گیا، پھر تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر گھسیٹا گیا مگر وہ احد احد ہی کہتے رہے۔ حبیب بن زید بن عاصم ہیں جن کے بدن کا ایک ایک عضو مسیلمہ کذاب کے حکم سے کاٹا جاتا تھا اور پھر مطالبہ کیا جاتا تھا کہ مسیلمہ کو نبی مان لیں مگر ہر مرتبہ وہ اس کے دعوائے رسالت کی شہادت دینے سے انکار کرتے تھے یہاں تک کہ اسی حالت میں کٹ کٹ کر انھوں نے جان دے دی۔ دوسری طرف عمار بن یاسر ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے ان کے والد اور ان کی والدہ کو سخت عذاب دے دے کر شہید کر دیا گیا، پھر ان کو اتنی نا قابل برداشت اذیت دی گئی کہ آخر کار انھوں نے جان بچانے کے لیے وہ سب کہہ دیا جو کفار ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر وہ روتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ماتُرِکْتُ حتّٰی سَبَبْتُکَ وَذَکَرْتُ اٰلِھَتَھُمْ بِخَیْرٍ ''یا رسول اللہ مجھے نہ چھوڑا گیا جب تک میں نے آپ کو بُرا اور ان کے معبودوں کو اچھا نہ کہہ دیا'' حضورؐ نے پوچھا کیف تجد قلبک؟ ''اپنے دل کا کیا حال پاتے ہو؟'' عرض کیا مطمئنا بالایمان ''ایمان پر پوری طرح مطمئن'' اس پر حضورؐ نے فرمایا اِنْ عَادُوْا فَعُدْ ''اگر وہ پھر اس طرح کا ظلم کریں تو تم پھر یہی باتیں کہہ دینا۔''

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۵۷۵ النحل حاشیہ ۱۰۹)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ نا قابلِ برداشت اذیت یا نقصان، یا شدید خوف کی حالت میں کسی شخص کا کلمۂ کفر کہہ کر اپنے آپ کو بچالینا شرعاً جائز ہے۔ بشرطیکہ آدمی سچے دل سے ایمان پر ثابت قدم رہے لیکن بہت بڑا فرق ہے اُس مخلص مسلمان میں جو بحالت مجبوری جان بچانے کے لیے کفر کا اظہار کرے، اور اس مصلحت پرست انسان میں جو نظریے کے اعتبار سے اسلام ہی کو حق جانتا اور مانتا ہو مگر ایمانی زندگی کے خطرات و مہالک دیکھ کر کفار سے جا ملے۔ بظاہر ان دونوں کی حالت ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ مگر درحقیقت جو چیز ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مجبوراً کفر ظاہر کرنے والا مخلص مسلمان نہ صرف عقیدے کے اعتبار سے اسلام کا گرویدہ رہتا ہے، بلکہ عملاً بھی اس کی دلی ہمدردیاں دین و اہلِ دین کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی کامیابی سے وہ خوش اور ان کو زِک پہنچنے سے وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں بھی وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے ہر موقع سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ جب بھی اس پر سے اعدائے دین کی گرفت ڈھیلی ہو وہ اپنے اہلِ دین کے ساتھ جا ملے اس کے برعکس مصلحت پرست آدمی جب دین کی راہ کٹھن دیکھتا ہے، اور خوب ناپ تول کر دیکھ لیتا ہے کہ دینِ حق کا ساتھ دینے کے نقصانات کفار کے ساتھ جا ملنے کے فوائد سے زیادہ ہیں، تو وہ خالص عافیت اور منفعت کی خاطر دین اور اہل دین سے منہ موڑ لیتا ہے، کافروں سے رشتۂ دوستی استوار کرتا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ان کی کوئی ایسی خدمت بجالانے سے بھی باز نہیں رہتا جو دین کے سخت خلاف اور اہلِ دین کے لیے نہایت نقصان دہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اِس امکان سے بھی آنکھیں بند نہیں کر لیتا کہ شاید کسی وقت دینِ حق ہی کا بول بالا ہو جائے۔ اس لیے جب کبھی اسے مسلمانوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ ان کے نظریے کو حق ماننے اور ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرنے اور راہِ حق میں ان کی قربانیوں کو خراجِ تحسین ادا کرنے میں ذرہ برابر بخل نہیں کرتا تاکہ یہ زبانی اعترافات سند رہیں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۶۸۱ - ۶۸۲ العنکبوت حاشیہ ۱۵)

ما انزل اللّٰہ کی اتباع اور دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرنے کا حکم [اصولی احکام]

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الاعراف ۷: ۳)

لوگو، جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو مگر تم نصیحت کم ہی مانتے ہو۔

انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے، اپنی اور کائنات کی حقیقت اور اپنے وجود کی غرض و غایت سمجھنے کے لیے جو علم اسے درکار ہے اور اپنے اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے، ان سب کے لیے اسے صرف اللّٰہ رب العالمین کو اپنا رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اسی کی پیروی اختیار کرنی چاہیے جو اللّٰہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے بھیجی ہے۔ اللّٰہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر ایک غلط طریق کار ہے جس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے اور ہمیشہ تباہی کی صورت ہی میں نکلے گا۔

یہاں ''اولیاء'' [سرپرستوں] کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے کہ انسان جس کی رہنمائی پر چلتا ہے اسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے خواہ زبان سے اس کی حمد و ثنا کے گیت گاتا ہو یا اس پر لعنت کی بوچھاڑ کرتا ہو، خواہ اس کی سرپرستی کا معترف ہو یا بہ شدت اس سے انکار کرے۔

سورۃ الشوریٰ آیت ۶ میں ہے:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ۔

جن لوگوں نے اس کو چھوڑ کر اپنے کچھ دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں۔

(تفہیم القرآن ج ۲ ص ۷ الاعراف حاشیہ ۴)

اصل میں لفظ ''اولیاء'' استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم عربی زبان میں بہت وسیع ہے۔ معبودانِ باطل کے متعلق گمراہ انسانوں کے مختلف عقائد اور بہت سے مختلف طرزِ عمل ہیں جن کو قرآن مجید میں ''اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا ولی بنانے'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن پاک کا تتبع کرنے سے لفظ ''مولیٰ'' کے حسب ذیل مفہومات معلوم ہوتے ہیں:

(۱) جس کے کہنے پر آدمی چلے، جس کی ہدایات پر عمل کرے اور جس کے مقرر کیے ہوئے طریقوں، رسموں اور قوانین وضوابط کی پیروی کرے۔ مثلاً سورہ النساء آیات ۱۱۸ تا ۱۲۰ میں ارشاد ہے:

لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًاۙ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ یَّتَّخِذِ الشَّیْطٰنَ وَلِیًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِیْنًاؕ یَعِدُهُمْ وَیُمَنِّیْهِمْ ۚ وَمَا یَعِدُهُمُ الشَّیْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا۝

اور جس کو اللہ نے لعنت زدہ کیا ہے [وہ اس شیطان کی اطاعت کر رہے ہیں] جس نے اللہ سے کہا تھا کہ ''میں تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا، میں انھیں بہکاؤں گا، میں انھیں آرزوؤں میں الجھاؤں گا، میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے خدائی ساخت میں ردوبدل کریں گے۔ اس شیطان کو جس نے اللہ کے بجائے اپنا ولی و سرپرست بنا لیا وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔ وہ ان لوگوں سے وعدے کرتا ہے اور انھیں امیدیں دلاتا ہے، مگر شیطان کے سارے وعدے بجز فریب کے اور کچھ نہیں ہیں۔

اور سورۂ اعراف آیات ۲۷ تا ۳۰ میں ارشاد ہے:

اِنَّا جَعَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَیْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۝ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ ۟ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

الَّذِیْنَ ؕ کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝ فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ یَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے یہ لوگ جب کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقے پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ کا نام لے کر وہ باتیں کہتے ہو جن کے متعلق تمھیں علم نہیں ہے [وہ اللہ کی طرف سے ہیں] اے محمدؐ، ان سے کہو، میرے رب نے تو راستی و انصاف کا حکم دیا ہے اور اس کا حکم تو یہ ہے کہ ہر عبادت میں اپنا رخ ٹھیک رکھو اور اسی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص رکھ کر۔ جس طرح اُس نے تمھیں اب پیدا کیا ہے اسی طرح تم پھر پیدا کیے جاؤ گے۔ ایک گروہ کو تو اس نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، مگر دوسرے گروہ پر گمراہی چسپاں ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ انھوں نے خدا کے بجائے شیاطین کو اپنا سرپرست بنا لیا ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم سیدھی راہ پر ہیں۔

(۲) جس کی رہنمائی [Guidence] پر آدمی اعتماد کرے اور یہ سمجھے کہ وہ اسے صحیح راستہ بتانے والا اور غلطی سے بچانے والا ہے مثلاً سورہ البقرہ آیت ۲۵۷ میں ارشاد ربانی ہے:

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کا حامی و مددگار اللہ ہے اور وہ ان کو تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے اور جو لوگ کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں، ان کے حامی و مددگار طاغوت ہیں اور وہ انھیں روشنی سے تاریکیوں کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ یہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۷ میں ارشاد ہے:

وَ مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ۔

جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جسے وہ گمراہی میں ڈال دے تو اس کے سوا ایسے لوگوں کے لیے تو کوئی حامی و ناصر نہیں پا سکتا۔

سورہ الکہف آیت ۱۷ میں ارشاد ہے:

مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا۔

جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہے اور جسے اللہ بھٹکا دے اس کے لیے تم کوئی ولی مرشد نہیں پا سکتے۔

سورہ الجاثیہ آیت ۱۹ میں ہے:

وَ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ۚ۔

ظالم لوگ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔

(۳) جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ میں دنیا میں خواہ کچھ کرتا رہوں، وہ مجھے اُس کے بُرے نتائج سے اور اگر خدا

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

ہے اور آخرت بھی ہونے والی ہے، تو اس کے عذاب سے بچالے گا۔ مثلاً سورہ النساء آیات ۱۲۳ اور ۱۷۳ میں ارشاد ربانی ہے:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝

انجام کار نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو بھی برائی کرے گا اس کا پھل پائے گا اور اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی ومددگار نہ پاسکے گا۔

اور ۱۷۳ میں ارشاد ہے:

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا۔

اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو اللہ دردناک سزا دے گا اور اللہ کے سوا جن جن کی سرپرستی ومددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

سورہ الانعام آیت ۵۱ میں ہے:

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝

اور اے محمدؐ! تم اس [علم وحی] کے ذریعہ سے ان لوگوں کو نصیحت کرو جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ اپنے رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ اس کے سوا وہاں کوئی [ایسا ذی اقتدار] نہ ہوگا جو ان کا حامی ومددگار ہو، یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ [اس نصیحت سے متنبہ ہوکر] وہ خدا ترسی کی روش اختیار کرلیں۔

سورۃ الرعد آیت ۳۷ میں ہے:

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝

اسی ہدایت کے ساتھ ہم نے یہ فرمانِ عربی تم پر نازل کیا ہے۔ اب اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمھارے پاس آچکا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی تمھارا حامی ومددگار ہے اور نہ کوئی اس کی پکڑ سے تم کو بچا سکتا ہے۔

سورہ العنکبوت آیت ۲۲ میں ہے:

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔

اور اللہ سے بچانے والا کوئی سرپرست اور مددگار تمھارے لیے نہیں ہے۔

یعنی نہ تمھارا اپنا زور اتنا ہے کہ خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ اور نہ تمھارا کوئی ولی وسرپرست یا مددگار ایسا زور آور ہے کہ خدا کے مقابلے میں تمھیں پناہ دے سکے اور اس کے مواخذے سے تمھیں بچالے۔ ساری کائنات میں کسی کی یہ مجال نہیں ہے کہ جن لوگوں نے کفر وشرک کا ارتکاب کیا ہے، جنھوں نے احکام خداوندی کے آگے جھکنے سے انکار کیا ہے، جنھوں نے جرأت وجسارت کے ساتھ خدا کی نافرمانیاں کی ہیں اور اس کی زمین میں ظلم وفساد کے طوفان اٹھائے ہیں ان کا حمایتی بن کر اٹھ سکے اور خدا کے فیصلۂ عذاب کو ان پر نافذ ہونے سے روک سکے، یا خدا کی عدالت میں یہ کہنے کی ہمت کرسکے کہ یہ میرے ہیں اس لیے جو کچھ بھی انھوں نے کیا ہے اسے معاف کردیا جائے۔

(تفہیم القرآن ج ۳ ص ۶۹۰ العنکبوت حاشیہ ۳۵)

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

سورہ الاحزاب آیت ۶۵ میں ہے:

خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا ۝

جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، کوئی حامی و مددگار نہ پاسکیں گے۔

سورہ الزمر آیت ۳ میں ہے:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۝

رہے وہ لوگ جنھوں نے اس کے سوا دوسرے سرپرست بنا رکھے ہیں [اور اپنے اس فعل کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ] ہم تو ان کی عبادت صرف اسی لیے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دیں اللہ یقیناً ان کے درمیان ان تمام باتوں کا فیصلہ کر دے گا جن میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

(۴) جس کے متعلق آدمی یہ سمجھے کہ وہ دنیا میں فوق الفطری طریقے سے اس کی مدد کرتا ہے، آفات و مصائب سے اس کی حفاظت کرتا ہے، اسے روزگار دلواتا ہے، اولاد دیتا ہے، مرادیں بر لاتا ہے اور دوسری ہر طرح کی حاجتیں پوری کرتا ہے۔

مثلاً سورہ ھود آیت ۲۰ میں ہے:

اُولٰٓئِكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ۘ

وہ زمین میں اللہ کو بے بس کرنے والے نہ تھے اور نہ اللہ کے مقابلے میں کوئی ان کا حامی تھا۔

سورہ الرعد کی آیت ۱۶ میں ہے:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ

ان سے پوچھو، آسمان و زمین کا رب کون ہے؟ کہو، اللہ۔ پھر ان سے کہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیا تم نے اسے چھوڑ کر ایسے معبودوں کو اپنا کارساز ٹھیرا لیا جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتے۔

سورہ العنکبوت آیت ۴۱ میں ارشاد ہے:

مَثَلُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اِتَّخَذَتْ بَیْتًا ؕ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُیُوْتِ لَبَیْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝

جن لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنا لیے ہیں اُن کی مثال مکڑی جیسی ہے جو اپنا ایک گھر بناتی ہے اور سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہی ہوتا ہے۔ کاش یہ لوگ علم رکھتے۔

[امم ماضیہ کی مشرک اقوام] کا اپنے معبودوں کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ یہ ہمارے حامی و مددگار اور سرپرست (Guardians) ہیں، ہماری قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتے ہیں، ان کی پوجا پاٹ کر کے اور انھیں نذر و نیاز دے کر جب ہم ان کی سرپرستی حاصل کر لیں گے تو یہ ہمارے کام بنائیں گے اور ہم کو ہر طرح کی آفات سے محفوظ رکھیں گے۔ ان کے

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

تمام عقائد واوہام اُس وقت بالکل بے بنیاد ثابت ہوئے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی بربادی کا فیصلہ کردیا گیا۔ اُس وقت کوئی دیوتا، کوئی اوتار، کوئی ولی، کوئی روح اور کوئی جن یا فرشتہ جسے وہ پوجتے تھے، ان کی مدد کو نہ آیا اور اپنی باطل توقعات کی ناکامی پر کفِ افسوس ملتے ہوئے وہ سب پیوند خاک ہو گئے۔ اب اللہ تعالیٰ مشرکین کو متنبہ کررہا ہے کہ کائنات کے حقیقی مالک وفرمانروا کو چھوڑ کر بالکل بے اختیار بندوں اور سراسر خیالی معبودوں کے اعتماد پر جو توقعات کا گھروندا تم نے بنا رکھا ہے اس کی حقیقت مکڑی کے جالے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ جس طرح مکڑی کا جالا ایک انگلی کی چوٹ بھی برداشت نہیں کرسکتا اسی طرح تمھاری توقعات کا گھروندا بھی خدا کی تدبیر سے پہلا تصادم ہوتے ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گا۔ یہ محض جہالت کا کرشمہ ہے کہ تم اوہام کے اس چکر میں پڑے ہوئے ہو۔ حقیقت کا کچھ بھی علم تمھیں ہوتا تو تم ان بے بنیاد سہاروں پر اپنا نظامِ حیات کبھی تعمیر نہ کرتے۔ حقیقت بس یہ ہے کہ اختیارات کا مالک اس کائنات میں ایک رب العالمین کے سوا کوئی نہیں ہے اور اسی کا سہارا وہ سہارا ہے جس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۚ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ (البقرہ۲:۲۵۶)

جو طاغوت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے وہ مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ (العنکبوت حاشیہ ۷۳)

بعض مقامات پر قرآن میں ولی کا لفظ ان میں سے کسی ایک معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور بعض مقامات پر جامعیت کے ساتھ اس کے سارے ہی مفہومات مراد ہیں آیت زیر تشریح بھی انھی میں سے ہے یہاں اللہ کے سوا دوسروں کو ولی بنانے سے مراد مذکورہ چاروں معنوں میں ان کو اپنا سرپرست بنانا اور حامی ومددگار سمجھنا ہے۔

(تفہیم القرآن ج ۴ ص ۴۸۰-۴۸۱ الشوریٰ حاشیہ ۶)

عذر مجبوری کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت شریعت کی نظر میں

سوال: ایک شخص غیر اللہ مثلاً بادشاہ یا حکومت باطلہ کی اطاعت کرتا ہے اور اعتقاداً بھی اسی کو حق سمجھتا ہے۔ دوسرا شخص اعتقاداً تو اس کی بندگی نہیں کرتا لیکن عملاً اس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے لیے مجبوری کا عذر پیش کرتا ہے کیا ان دونوں کے عمل میں کوئی تفریق کی جاسکتی ہے؟ آپ کی تفسیر ''الٰہ ورب'' کے لحاظ سے تو دونوں ایک ہی درجے میں ہوئے، حالانکہ دونوں میں بعد المشرقین ہے۔''

جواب: میں اپنے مضامین میں کئی جگہ اس بات کو واضح کرچکا ہوں کہ تمام انسان حسب ذیل چار طبقوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

الف: مومن بالغیر و مسلم للغیر۔ یعنی جو غیر اللہ کو مطاع برحق اور ماخذ امر اعتقاداً بھی مانتے ہیں اور عملاً اس

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

www.KitaboSunnat.com

کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ یہ مکمل کافر ہیں۔

ب: مومن بالغیر و مسلم للہ۔ یہ پوزیشن ذمیوں کی اور ایک حد تک منافقوں کی ہے۔

ج: مومن باللہ و مسلم للغیر۔ یعنی اللہ کو اعتقاداً مطاع برحق ماننے والے مگر عملاً غیر اللہ کی اطاعت و بندگی بجالانے والے۔ یہ پوزیشن ان مسلمانوں کی ہے جو کفار کے تابع فرماں ہو جائیں۔ اس حالت میں اگر مسلمان مبتلا ہو تو اسے اس پر نہ راضی ہونا چاہیے نہ مطمئن رہنا چاہیے بلکہ اس کا فرض ہے کہ یا تو اس حالت کو بدلنے کی کوشش کرے یا اس سے نکل جائے۔

د: مومن باللہ و مسلم للہ۔ یہی اصل مسلمانوں کی پوزیشن ہے اور قرآن کی دعوت تمام انسانوں کو یہی ہے کہ وہ یہی پوزیشن اختیار کرنے کی سعی کریں۔ اس پوزیشن میں کوئی رخنہ اس وجہ سے واقع نہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی غیر مسلم نظام میں مجبوراً اپنی کسی کوتاہی سے نہیں بلکہ حالات کے جبر سے گرفتار ہو جائے جس طرح مکہ معظمہ میں مسلمان تھے یا جس طرح بہت سے صحابہ کرام کفار کے ہاتھوں اسیر ہوئے یا جیسا کہ اکثر انبیاء کا حال رہا ہے جو نظامِ کفر ہی میں پیدا ہوئے۔ اس طرح کی مجبورانہ گرفتاری اسلام لغیر اللہ کی تعریف میں نہیں آتی کیونکہ اول تو یہ چیز ان کی اختیار کردہ یا قبول کردہ نہ تھی بلکہ ان پر مسلط شدہ تھی۔ دوسرے جب کوئی شخص مومن باللہ و کافر بالغیر ہو چکا ہو اور اس کے ساتھ جس نے اپنی حد تک مسلم للہ ہونے اور عاصی للغیر ہونے میں بھی کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہو اس پر مسلم للغیر ہونے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

نیز یہ بات یقینی ہے کہ طبقۂ ج کی پوزیشن طبقۂ الف اور ب کے لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ مومن باللہ و مسلم للغیر مشرک اور کافر ہرگز نہیں۔ لیکن اگر وہ اس حالت پر راضی ہیں یا اسے بدلنے اور اس سے نکلنے کی امکانی سعی نہیں کرتے تو سخت گناہ گار ہیں، ایسے گناہ گار کہ ان کی ساری زندگی گناہ بن کر رہ جاتی ہے۔

(رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۰۷ تا ۲۰۹ اشاعت اول ستمبر ۱۹۵۱ء)

(بحوالہ ترجمان القرآن محرم صفر ۱۳۶۴ھ جنوری فروری ۱۹۴۵ء)

www.kitabosunnat.com

❁❁❁❁❁❁❁

"محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ"

www.KitaboSunnat.com

" محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ "

ادارۂ معارف اسلامی